حدیثِ رسول ﷺ کا تشریعی مقام

ملک بک ڈپو ز- کارخانہ بازار- لائلپور

حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تشریعی مقام

تصنیف
ڈاکٹر مصطفےٰ السباعی مرحوم
صدر شعبۂ فقہ اسلامی
جامعہ دمشق

ترجمہ و تحشیہ
پروفیسر غلام احمد حریری ایم اے
شعبۂ علوم اسلامیہ
زرعی یونیورسٹی، لائلپور

ملک برادرز
کارخانہ بازار
برانچ کوتوالی روڈ
لائلپور

مَا آتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا

حدیثِ رسولؐ

کا

تشریعی مقام

تصنیف

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم

صدر شعبہ فقہ اسلامی

جامعہ دمشق

ترجمہ و تحشیہ

پروفیسر غلام احمد حریری ایم اے

شعبہ علوم اسلامیہ

زرعی یونیورسٹی، لائلپور

ناشرین

ملک برادرز پبلشرز، کارخانہ بازار، لائلپور فون نمبر ۵۷۴۳
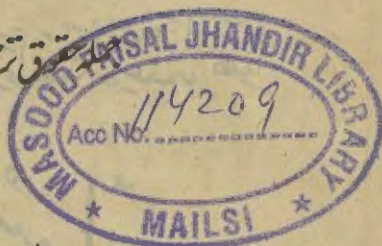
باراول ـــــــ آفسٹ ایڈیشن ـــــــ ۱۹۷۱ء

نام ـــــــ حدیثِ رسول کا تشریعی مقام

مصنف ـــــــ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم۔ دمشق

مترجم ـــــــ پروفیسر غلام احمد حریری ایم۔ اے۔ لائلپور

ناشر ـــــــ ملک غلام رسول

کاتب ـــــــ محمود الحسن خوشنویس بسکنہ حضرت کیلیانوالہ۔ ضلع گوجرانوالہ

مقام اشاعت ـــــــ ملک برادرز۔ کارخانہ بازار۔ لائلپور

تعداد ـــــــ ایک ہزار (۱۰۰۰)

قیمت ـــــــ اکیس روپے ۲۱/۰۰ نیوز پرنٹ کاغذ :- ۱۵/۰۰

مطبع ـــــــ اردو ڈائجسٹ پرنٹرز سرکلر روڈ لاہور

فہرست مضامین

کچھ اس کتاب کے بارے میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی۔ **امّا بعد**

یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں کہ سرزمین پاکستان جو ایک نظریاتی مملکت کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر جلوہ گر ہوئی تھی ربع صدی گزرنے کے باوجود فکر و عمل کے اعتبار سے اسم بامسمیٰ نہ بن سکی۔ اس "ارض پاک" میں الحاد و دہریت کے طوفان اور لادینی کے جھکڑ جس تیزی سے چل رہے ہیں ان کو دیکھ کر ایک حساس مسلمان تڑپ اٹھتا ہے۔ اسلام اور اس کی اخلاقی و دینی روایات نے مسلم معاشرے کے اندر ایک تہذیب اور وحدتِ فکر پیدا رکھی تھی۔ مگر آج باطل ازموں کے پرستاروں نے مسلم معاشرے کے افراد کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔ یہ مسلم معاشرہ جو کبھی شرافت و اخوت کی بناء پر دنیا میں ممتاز تھا آج ہر قسم کی بداخلاقیوں کا مرکز و محور بن کر رہ گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دو سو سال کی غلامی نے عالم اسلامی کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے۔ خدا کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک میں وہی نصاب تعلیم جاری ہے جو انگریز نے اپنی خاص مقاصد کے پیش نظر جاری کیا تھا۔ مسلمانوں کی جو پود نام نہاد درس گاہوں میں پروان چڑھ رہی ہے وہ دین کے نام سے بیزار اور لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے شعر کی مصداق ہے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بد نام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

ایک ملک نہیں بلکہ پورا شرق اوسط اسی راہ پر گامزن ہو کر تباہ و برباد ہوا اور ابھی مزید ہو رہا ہے۔ اسلامی تعلیمات و آداب سے ناآشنا نوجوان جب مغرب میں تعلیم پانے کے بعد مادرِ وطن کی جانب لوٹتے ہیں تو پورے ماحول کو اپنے لیے ناساز گار پاتے ہیں۔ وہ اپنی افتادِ طبع کو بدلنے سے تو قاصر ہوتے ہی ہیں۔ لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اگر ان کے بس میں ہو تو راتوں رات پورے معاشرہ کو اپنے ڈھب پر لے آئیں۔ اس قسم کے نوجوانوں کا دینی پس منظر سے بے بہرہ ہونا ایک طبعی امر ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا کسی بھی لادینی تحریک کا شکار ہو جانا ذرا بھی مشکل نہیں۔ وہ ہر ایسی تحریک کے دام فریب میں آ سکتے اور آ جاتے ہیں جو ان کے لیے تن آسانی عیش کوشی اور معاشی فارغ البالی کے دروازے چوپٹ کھول دے۔ ان کے لیے دین اسلام کی ہر ایسی تعبیر قابل قبول ہے

جو اس کو زیادہ سے زیادہ آسان اور ایسا لچکدار بنا دے کہ وہ پوری غیر دینی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی نام نہاد دین کے دائرہ سے خارج نہ ہوں۔

اس غیر دینی ذہنیت نے پورے عالم اسلامی کو متاثر بلکہ متزلزل کر دیا ہے۔ عرب ممالک جہاں سے دین کے سوتے پھوٹے تھے۔ جہاں سب سے پہلے دین کی شمع روشن ہوئی جس کی تابانی و درخشانی سے یہ ظلمت کدۂ ارضی جگمگا اٹھا تھا۔ آج خود تاریکی میں گھرے ہوئے ہیں۔ تہذیب مغرب نے وہاں وہ گل کھلائے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ یہ اسی کا منطقی نتیجہ ہے کہ وہی عرب جو چند سالوں میں ربع مسکون پر چھا گئے تھے۔ آج چھبیس لاکھ کی قلیل العدد قوم سے بہت بری طرح پٹ رہے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ وہی قوم ہے جس کو کتاب ربانی میں مغضوب وملعون قرار دیا گیا ہے۔

لادینی افکار کی جس یلغار نے عرب ممالک کو برباد کیا تھا بڑے افسوس کی بات ہے کہ اب اس کا رُخ پاکستان کی جانب ہے۔ یہاں مختلف گروہ اپنے اپنے جداگانہ طرز و انداز کے مطابق اپنے نصب العین کی تکمیل کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ انکارِ حدیث کے علم بردار ہونے کی حیثیت سے اُبھرا ہے۔ اس گروہ نے جدید تعلیم یافتہ اور دینی افکار و عقائد سے بے خبر طبقہ کو صراطِ مستقیم سے منحرف کرنے کے لیے صرف عمل ہے۔ اس گروہ کو جو کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ اسی طبقہ میں ہوئی ہے اور صرف اس لیے ہوئی ہے کہ ہمارے معاشرے کا یہ گروہ سے بار بیش کوشش کہ عالم دو بارہ مست کا علم بردار ہے۔ ان کی رائے میں انسانی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان دنیا میں رہتے ہوئے اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سامان راحت و تعیش فراہم کرے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ سامان جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو یا ناروا وسائل سے۔ حلت و حرمت اور جواز عدم جواز کا مسئلہ یہاں خارج از بحث ہے۔

اس لیے انکار حدیث کے فتنہ سے ایسے لوگوں کا متاثر ہونا ایک طبعی امر تھا۔ کیوں کہ انسانی زندگی سے متعلق تفصیلی احکام حدیث نبوی میں ملتے ہیں۔ قرآن کریم ایک اصولی کتاب ہے اور جزئیاتِ دین کی حامل نہیں۔ سیرت نبوی کا آئینہ بھی حدیث رسول ہے جس میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے پورے خدوخال دیکھے جا سکتے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی اہل ایمان کے لیے عملی نمونہ ہے جس کے قالب میں اپنی سیرت کو ڈھال کر وہ جادۂ نبوی پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ سیرتِ رسول کو بالائے طاق رکھ کر ایک شخص اپنی پوری زندگی کو لادینی کے سانچہ میں ڈھال سکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حامل بالقرآن ہونے کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔ حدیثِ رسول ہی

دین کا ایک ایسا ماخذ ہے جو قدم قدم پر انسانی زندگی پر پابندی عائد کرتا ہے۔

یہ وجوہ واسباب تھے جن کی بنا پر اس "ارضِ پاک" میں ایک ایسا طبقہ اُبھرا جو اپنی پرائیویٹ زندگی میں دین دار نہ تھا مگر لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے دینداری کا مدعی تھا۔ یہ طبقہ جس طرزِ زندگی کا رسیا ہو چکا تھا اس کیلئے سرمُو اس ڈگر سے ہٹنا ممکن نہ تھا۔ مغربی اندازِ فکر و نظر اور یورپین طرزِ بود و ماند ان کا لازمۂ حیات بن چکا تھا۔ وہ مغرب کی آنکھ سے دیکھتے۔ مغربی ذہن سے سوچتے اور مغربی آداب و اطوار کے خوگر ہو چکے تھے۔ مگر بایں ہمہ وہ انتہائی بزدل بھی تھے۔ یہ بھی بزدلی کی کرشمہ سازی ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد و افکار سے برملا انکار کی جسارت نہیں کر سکتے تھے۔

اس لیے انہوں نے خیر اسی میں سمجھی کہ ع خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

کے مصداق اپنے قلب و ذہن اور افتادِ طبع کو تبدیل کرنے کے بجائے کیوں نہ اسلام کو اپنے کوائف و احوال کے سانچہ میں ڈھال لیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی باقی رہے۔ اس طرح اس گروہ نے دین اسلام میں تاویلاتِ رکیکہ کا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ دینی عقائد معجزاتِ رسول اور ہر اس چیز کو تحریف کی سان پر چڑھا کر مسخ کر دیا جس کے فہم و ادراک سے ان کی ناقص عقل قاصر تھی۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس تحریف کو دین اسلام کی تعبیر و تفسیر کا نام دیا گیا۔

ان عزائمِ خبیثہ کی تکمیل میں حدیث نبوی ان کی راہ میں بہت بُری طرح حائل تھی۔ حدیث نبوی کے ہوتے ہوئے دین میں تحریف کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لیے اس بظاہر دیندار و بباطن منافق طبقہ نے حدیث نبوی کی حجیت سے انکار کر دیا اور اس نظریہ کا پرچار شروع کیا کہ حدیث کو دین میں صرف تاریخ کا درجہ حاصل ہے۔ مگر وہ دین کا ماخذ و مصدر نہیں ہے۔ سُوءِ اتفاق کی کرشمہ سازی ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لیے حاصل کیے گئے اس ملک میں ایسے لوگ برسرِ اقتدار آتے رہے جو اس شجرۂ خبیثہ کی آبیاری کرتے رہے۔ ایسی حکومتیں وجود میں آئیں جو دامے درمے قدمے سخنے منکرینِ حدیث کی پشت پناہی کرتی رہیں۔ سرکاری خرچ پر ایسے ادارے قائم کیے گئے جو انکارِ حدیث کے عقیدہ کو فروغ دینے کے لیے "تحقیق و تدقیق" کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عیسائی مستشرقین کے ساختہ پرداختہ بلکہ پروردہ لوگوں کو یورپ سے درآمد کر کے اسلامی ریسرچ کے اس ادارہ کا ناظم مقرر کیا گیا۔ اور اس "بدترین محقق" کو اس وقت چلتا کیا گیا۔ جب دیندار عوام اس کے خلاف احتجاج کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر جس ادارے کا ہر شخص چلے جانے والے کا جانشین

ہو وہاں ایک شخص کی کمی سے کیا فرق پڑتا ہے، جانے والا سے پہنچی وہاں وہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔
کے مصداق رخصت ہوا مگر اس ادارے کے شب و روز کا وہی عالم ہے۔ اسلامی ریسرچ کے نام
سے وہاں غیر اسلامی تحقیق کا پارٹ ادا کیا جا رہا ہے۔ یہ بات ایک ادارہ تک محدود نہیں نہ جانے
یہاں اس قسم کے کتنے ادارے حکومت کے خرچ پر چل رہے ہیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ انکار حدیث
نے ہمارے ملک میں ایک فیشن کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہمارے یہاں روشن خیالی کی تکمیل حدیث
نبوی سے انکار کیے بغیر ممکن نہیں۔

یہ ہیں وہ عوامل و محرکات جن کے زیر اثر سنت رسول کے سچے شیدائی اور عشاق حدیث نبوی
تڑپ اٹھے کہ دین اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک میں یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس میں شک نہیں
کہ منکرین حدیث رسول کے بودے دلائل کا تار و پود بکھیرنے کے سلسلہ میں ہمارے صحیح العقیدہ
اہل علم و قلم نے بڑا کام کیا ہے۔ دہلی کے سیکرٹریٹ کے ایک کلرک نے جب سے گلبرگ لاہور میں
حدیث رسول کے خلاف اپنی تخریبی مساعی کا آغاز کیا ہے اس وقت سے تا ہنوز علماء نے حدیث
کی تائید و حمایت میں بڑی جاندار کتابیں لکھی ہیں۔ بحمد اللہ ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے اور رہے گا

راقم آثم کی کتاب "علوم الحدیث" آفسٹ کی حسین و جمیل طباعت سے آراستہ پیراستہ منظر عام
پر آ کر قارئین سے خراج تحسین وصول کر چکی تھی کہ ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی رحمہ اللہ تعالیٰ کی شہرۂ آفاق
کتاب "السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی" پر نظر پڑی۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ دمشق میں شعبہ
فقہ اسلامی کے صدر تھے۔ حال ہی میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔ حدیث رسول کے ساتھ شغف
کے درجہ تک پہنچی ہوئی الفت و محبت اپنے گرامی قدر والد علامہ حسنی سباعی سے ورثہ میں پائی
اپنی علمی بے بضاعتی و کم سوادی کے پیش نظر یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حدیث نبوی
کے دفاع و حمایت میں ایسی زوردار کتاب کم از کم احقر کی نظر سے نہیں گزری ترجمہ کے لیے اس
کتاب کا انتخاب اسی لیے عمل میں آیا۔ خدا کو منظور ہوا تو اس کتاب کی اشاعت سے انکار حدیث
کے ایوان میں زلزلہ آ جائے گا۔ (ان شاء اللہ العزیز)

کتاب آپ کے پیش نظر ہے اور اس کی افادیت سے متعلق کچھ عرض کرنا حکمت بلقمان آموختن
کا مصداق ہے۔ مصنف نے کتاب کو تین ابواب میں منقسم کیا ہے۔ پہلے باب میں حدیث کی تعریف و
حدیث سے متعلق صحابہ کا موقف اور وضع حدیث کے اسباب و وجوہ بیان کیے اور ساتھ ہی
ساتھ بتایا ہے کہ علماء نے حدیث نبوی کے سلسلہ میں کیا مساعی انجام دیں۔ اور اس سے کیا

نتائج برآمد ہوئے۔

دوسرے باب میں حدیث نبوی پر وارد کردہ شکوک و شبہات کا جواب دیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ، منکرین حدیث (قدیم و جدید) کا موقف کیا ہے اور اس کے اثبات میں وہ کیا دلائل دیتے ہیں۔ مستشرقین نے حدیث نبوی کے سلسلہ میں جو تخریبی مساعی انجام دی ہیں اس باب میں ان کی قلعی کھولی گئی اور تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ مصر کے منکرین حدیث ان کے اندھے مقلد تھے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انکارِ حدیث کا شجرۂ خبیثہ مغربی ممالک میں پلا بڑھا۔ یہودی و عیسائی مستشرقین نے اس کو پروان چڑھایا اور پھر مصر کے بے دین اہل علم نے ان کی خوشہ چینی اور اندھی تقلید کا پارٹ ادا کیا۔

مصنف نے مستشرقین کی دسیسہ کاریوں کا راز طشت از بام کرنے کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ حدیث نبوی پر نقد و جرح کرنے کے سلسلہ میں سب سے زیادہ جہد و سعی یہودی مستشرق گولڈ زیہر نے انجام دی ہے۔ مصری مصنفین میں سے انکار حدیث کے فتنہ کو ہوا دینے کا پارٹ ڈاکٹر احمد امین ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر اور محمود ابوریہ نے ادا کیا۔ مصنف نے براہین قاطعہ کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ یہ سب لوگ مستشرقین کے اندھے مقلد تھے اور انہوں نے عداوتِ حدیث و بغض صحابہ و تابعین کے سلسلہ میں جو کچھ بھی کہا ہے وہ سب مستشرقین کی زلہ ربائی اور پس خوردگی ہے۔

تیسرے باب میں مصنف نے دس اکابر محدثین و مجتہدین کے مختصر سیر و سوانح اور حدیث نبوی سے متعلق ان کی خدماتِ جلیلہ کا تذکرہ کیا ہے۔

بہرکیف یہ کتاب قاری کے قلب و ذہن پر اس حقیقت کو مرتسم کر دے گی کہ ہمارے ملک میں جو لوگ انکارِ حدیث کے علم بردار ہیں اس میں ان کی ذاتی کد و کاوش کو کوئی دخل نہیں۔ حدیث رسول کو جن اعتراضات کی آماجگاہ یہ لوگ بنا رہے ہیں یہ سب کچھ یہودی و عیسائی مستشرقین کے خوانِ کرم کی زلہ ربائی کے صدقے میں ہے۔ منکرین حدیث کی یہ ژاژ خائی اور ہرزہ سرائی ایک ناخواندہ شخص کے نزدیک ان کے ذہن کی اختراع ہو سکتی ہے مگر اہل علم کے نزدیک اس کی حقیقت نقل مطابق اصل سے زیادہ نہیں۔

جو لوگ خلوص دل سے حق و صداقت کے طلب گار ہیں یہ کتاب بعونہ تعالیٰ ان کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہو گی اور ان پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح کر دے گی کہ حدیث نبوی کتاب ربانی کے بعد دینی احکام و قوانین کا ماخذ ثانی ہے۔ حدیث نبوی کے بغیر قرآن فہمی کا کوئی امکان نہیں۔

حدیث قرآن حکیم کی شارح و مفسر ہے۔ جو لوگ حدیث نبوی سے روشنی لیے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خود جاہل و گمراہ ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ اطاعتِ رسول صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب حدیث کو دین میں حجت قرار دیا جائے۔ جو شخص اس کے بغیر اطاعتِ رسول کا مدعی ہے اس کے کاذب ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ رسول کریم کی زندگی کو خداوند کریم نے مسلمانوں کے لیے عملی نمونہ ٹھہرایا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا اصلی منبع و ماخذ حدیث رسول ہے۔ لہٰذا جو شخص اسوۂ رسول کی راہ پر گامزن ہونا چاہتا ہے حدیث نبوی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

بارگاہ ربانی میں ملتجی ہوں کہ خداوند غفور رحیم میری ادنیٰ کاوش کو قبول فرمائے اور اس ناچیز خدمت کو میرے اساتذہ و والدین جملہ قارئین کاتب و ناشر اور خود راقم آثم کے لیے وسیلۂ فلاح دارین بنائے ؎

بلوح الخط فی القرطاس دھرا
وکاتبہ رمیمٌ فی التراب

خادم حدیث رسول

غلام احمد حریری

ڈی — ۶۱ پیپلز کالونی لائل پور

یکم جون ۱۹۶۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمۃ الکتاب

الحمد للہ الذی شرع الاحکام لعبادہ بکتاب مبین ○ و اناط تفصیل احکامہ بخاتم النبیین والمرسلین سیدنا محمد بن عبد اللہ صلوات اللہ وسلامہ علیہ علی آلہ وصحبہ نقلۃ الوحی والامناء علی الحق والدعاۃ الی اللہ علی ھذہ صراط مستقیم وعلی من تبعہم باحسان الی یوم الدین ○

امابعد ہم ایسے عصر وعہد میں بود و باش رکھتے ہیں جس میں نظام عالم تہ و بالا ہو چکا ہے اور اس میں اقوام عالم کو امن و سکون اور خوشحالی و فارغ البالی سے روشناس کرانے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ دَورِ حاضر کی اقوامِ غالبہ کے وہ نقائص کچھ بھی ہوں جو موجودہ بے چینی کا سبب بنے اس میں شبہ نہیں کہ دنیا کی بدبختی کی سب سے بڑی وجہ عصرِ حاضر کا وہ نظام ہے جو انسانی مسائل کو حل کرنے سے قاصر رہا اور اس لیے انسانیت کو حرب و پیکار سے نجات دلا کر خون ریز عالمی جنگوں کے بدترین نتائج سے محفوظ نہ رکھ سکا۔ حالانکہ انسانیت عرصہ دراز سے حرب و ضرب کے لامتناہی سلسلہ کی وجہ سے ہلاکت و بربادی کی فضا میں زندگی کے دن کاٹتی چلی آ رہی ہے۔

ہمارا بحیثیت مسلم یہ ایمان ہے کہ اگر یہ کائنات امن و سکون اور طمانیت سے ہمکنار ہونا چاہتی ہے تو اس کا طریقِ وحید یہ ہے کہ اسے خداوندی تعلیمات کی جانب لوٹنا ہوگا۔ یہ تعلیمات تحریف و تبدیل سے پاک اور حشو و زوائد سے مبرا ہیں اور دین اسلام ان کو پھیلانے اور لوگوں تک پہنچانے کے لیے آیا ہے۔ ان تعلیمات میں ہر تاریخی دَور کے ساتھ چلنے اور بنی نوع انسان کی جملہ حاجات و ضروریات کے پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہے خواہ وہ کہیں اور کسی

زمانہ میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہوں۔

اسلامی شریعت کے اولین مصادر اور ائمہ وفقہاء کی بحث وتمحیص سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ دین اسلام اپنے دامن میں بے حد وسعت رکھتا ہے اور اس میں ہر پیش آمدہ حادثہ کو حل کرنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ اسلام افراد واقوام اور حکومتوں کے درمیان ایک میزان عدل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو ترقی پسند اور بیدار مغز قوم اس کی اطاعت کا دم بھرتی ہے اسلام اُس کو ایک ایسی باانصاف اور صلح پسند حکومت عطا کرتا ہے۔ جو صلح جُو اغیار کے ساتھ صلح کرتی ہے اور جب کوئی گنہگار ظالم یا دھوکہ باز باغی اس کے عقائد واخلاق یا حریت فکر ونظر پر دست درازی کرتا ہے تو وہ اس کا دفاع کرتا ہے۔

اسلامی فقہ کے مصادر وماخذ مسلمانوں کے یہاں جانے پہچانے اور محفوظ ومصئون ہیں اس میں شُبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اسلامی فقہ کا مصدر ثانی یعنی سنّتِ مطہرہ بے حد کشادہ نہایت جامع اور اپنے دامن میں لامحدود وسعت رکھتا ہے۔ قرآن کریم شریعت کے قواعد عامّہ اور اکثر احکام کلیّہ کا جامع ہے۔ اسی جامعیت نے اس کو ایک ابدی اور دائمی حیثیت عطا کی ہے اور جب تک کائنات پر حق قائم ہے وہ بھی قائم ودائم رہے گا۔ سنّتِ نبوی ان قواعد کی شرح وتوضیح کرتی۔ ان کے نظم وربط کو برقرار رکھتی اور کلیات سے جزئیات کا استخراج کرتی ہے۔ یہ ایک ایسی درخشندہ حقیقت ہے جس سے ہر وہ شخص بخوبی آگاہ ہے جو سنّت کے تفصیلی مطالعہ سے بہرہ مند ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد وعہد کے علماء وفقہاء سنت پر اعتماد کرتے چلے آئے ہیں۔ وہ ہمیشہ سنت کے وابستۂ دامن رہے اور نئے حوادث وواقعات کے احکام اس سے اخذ کرتے رہے۔

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ سنت شروع ہی سے بعض نام نہاد اسلامی فرقوں کے شکوک و شبہات کی آماجگاہ رہی ہے۔ یہ فرقے ان شکوک کا حل تلاش کرنے سے قاصر رہے۔ دور حاضر میں بعض متعصب شرق شناسانِ مغرب مشنریوں اور سامراج کے ایجنٹوں نے

فتنہ سامانی کے نقطۂ خیال سے حدیث کو ہدف تنقید بنایا۔ دراصل وہ چاہتے یہ ہیں کہ اسلامی فقہ کے اس عظیم ستون کو گرا کر علم دین کو اس کے گھنے سایہ سے محروم کردیں۔ بدقسمتی سے ہمارے بعض مصنفین بھی ان کے علمی دلائل سے متاثر ہوکر ان کے دام فریب میں آ گئے۔ حالاں کہ مستشرقین کے پیش کردہ دلائل پرکاہ سے زیادہ وزن نہیں رکھتے اور علمی تنقید کے سامنے ٹھہر سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ ان مصنفین کے قلب وذہن میں کچھ نفسانی میلانات و شبہات پائے جاتے تھے۔ جن کا ازالہ یہ علمائے سلف اور راسخ العقیدہ فضلاء کے علمی براہین کی روشنی میں نہ کرسکے اور اس طرح عیسائی مصنفین کے اندھے مقلد بن گئے۔ اس طرح حدیث نبوی کے سلسلہ میں یہ دونوں فریق ایک دوسرے کے ہمنوا بن گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض مسلم مصنفین بھی وہی راگ الاپنے لگے جو قبل ازیں عیسائی مصنفین نے گنگنایا تھا۔ کسی شاعر نے گویا ان ہی کے حق میں کہا ہے ؎

اتانی هواها قبل ان اعرف الهوٰی

فصادف قلبًا خالیًا فتمکّنا

(اس (محبوبہ) کی محبت میرے پاس اس وقت آئی جب میں محبت سے آشنا بھی نہ تھا چنانچہ اسے ایک خالی دل ہاتھ آگیا اور وہ اس میں جم گئی۔)

۱۳۵۸ھ میں مَیں نے اس مرض میں مبتلا بعض مصنفین کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی جو مستشرقین کی صحبت و رفاقت سے ان کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے تھے۔

اس لیے میں نے مصلحت وقت کے تحت کتاب ہٰذا میں یہ بیان کرنا چاہا کہ حدیث کو فقہ اسلامی میں کیا مرتبہ و مقام حاصل ہے؟ نیز یہ کہ حدیث کن تاریخی مراحل وادوار سے گزر کر موجودہ مقام تک پہنچی اور علماء نے اس کی صیانت و تحفظ میں کیا حصہ لیا؟ علاوہ ازیں ماضی وحال میں جن لوگوں نے فن حدیث کو ہدف تنقید و تنقیص بنایا تھا میں نے بڑے پروقار علمی انداز میں ان کی تردید کی۔ میں نے جرح و قدح کے لیے وہ طرز و انداز اختیار کیا جس سے حق نمایاں

ہو جائے اور سنت مطہرہ کا چہرہ درخشاں و تاباں نظر آئے۔ کتاب کے آخر میں میں نے ان شہرہ آفاق مجتہدین و محدثین کے سیر و سوانح پر روشنی ڈالی ہے جنہوں نے سنت کے حفظ و تدوین میں نمایاں خدمات انجام دیں یا حدیث سے شرعی احکام کے استخراج و استنباط میں مدد لی۔

میں نے کتاب زیر تصنیف کو تین ابواب اور ایک خاتمہ میں منقسم کیا ہے۔

پہلا باب :

سنت کے معنی و مفہوم اور نقل و تدوین کے بارے میں۔

اس میں چار فصلیں (SECTIONS) ہیں۔

فصل اول :۔ سنت کے معنی و مفہوم اور تعریف کے بارے میں۔ نیز یہ کہ سنت کے ضمن میں صحابہ کرام رض کا موقف کیا تھا؟

فصل دوم :۔ وضع حدیث کا آغاز کب، کیوں، اور کہاں ہوا؟

فصل سوم :۔ علماء نے حدیث کی چھان پھٹک اور تہذیب و تنقیح کے سلسلہ میں کیا مساعی انجام دیں؟

فصل چہارم :۔ علماء کی مساعی سے کون سے نتائج و ثمرات ظہور میں آئے؟

دوسرا باب :

حدیث کے ضمن میں جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا ان کا ذکر و بیان۔

اس میں سات فصلیں ہیں :۔

فصل اوّل :۔ حدیث نبوی اور خوارج و شیعہ۔

فصل دوم :۔ قدیم منکرین حدیث۔

فصل سوم :۔ جدید منکرین حدیث۔

فصل چہارم :۔ منکرین حجیتِ اخبارِ آحاد۔

فصل پنجم :۔ حدیث نبوی اور معتزلہ و متکلمین۔

فصل ششم:- حدیث نبوی اور مصنفین عصر حاضر۔

فصل ہفتم:- حدیث اور مستشرقین۔

تیسرا باب:

فقہ اسلامی میں حدیث کا مرتبہ و مقام۔ اس میں دو[2] فصلیں ہیں:-

فصل اول:- کتاب و سنت کا باہمی فرق و امتیاز۔

فصل دوم:- قرآن کیونکر حدیث پر مشتمل ہے؟

خاتمہ:

کبار مجتہدین و محدثین کے تراجم۔ وہ دس[10] ہیں۔

۱ ـــ امام ابو حنیفہ۔	۶ ـــ امام مسلم۔
۲ ـــ امام مالک۔	۷ ـــ نسائی۔
۳ ـــ امام شافعی۔	۸ ـــ ابو داؤد۔
۴ ـــ امام احمد۔	۹ ـــ ترمذی۔
۵ ـــ امام بخاری۔	۱۰ ـــ ابن ماجہ

(رحمہم اللہ اجمعین الی یوم الدین۔)

میں بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ مجھے لغزش سے بچائے اور رہِ رشد و ہدایت پر لگائے۔ میرے لیے اپنی بے پایاں رحمت کے خزانے وا کر دے۔ اور مجھے ان لوگوں میں شامل کرے جو بات سن کر جو سب سے اچھی ہوتی ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ والحمد للہ رب العلمین

مترجم	مصنف
احقر العباد غلام احمد حریری	مصطفیٰ حسنی السباعی
ڈی - ۶۱ پیپلز کالونی	قاہرہ
لائل پور	۱۷ رجب ۱۳۶۸ھ - ۱۴ مئی ۱۹۴۹ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمۃ الطبع

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وآلہ و
صحبہ وحملۃ سنتہ والمدافعین عنہا الی یوم الدین۔

میں آج اس کتاب کو طباعت کے لیے پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ یہ کتاب میں
نے ازہر یونیورسٹی کے شریعت کالج سے فقہِ اسلامی اصولِ فقہ اور تاریخ فقہ میں ڈگری لینے
کے لیے ۱۳۶۸ھ بمطابق ۱۹۴۹ء میں تحریر کی تھی۔ مختلف و متنوع وجوہ و اسباب کے پیش نظر
تاہنوز اس کی اشاعت کو ملتوی رکھا۔ تاخیر اشاعت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میں نے یہ
کتاب ایسے ناسازگار احوال وظروف میں تحریر کی تھی۔ جو ایجاز واختصار کے متقاضی تھے۔
میں کتاب کی افادیت کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لیے اس کے شواہد و دلائل میں اضافہ کرنا
چاہتا تھا۔ مجھے یہ خیال دامن گیر تھا کہ موضوع زیر قلم سے متعلق اس میں مزید مباحث کا اضافہ
کیا جائے۔ مگر یہ دیرینہ آرزو تکمیل سے ہمکنار نہ ہو سکی

مزید برآں کتاب ہذا کے بعض مباحث قاہرہ و دمشق کے علمی و ادبی مجلات میں بکمال
اختصار و ایجاز شائع ہو چکے تھے۔ ان علمی رسائل کے قارئین بتاکید مجھ سے ان مضامین کو کتابی
صورت میں شائع کرنے کا تقاضا کر رہے تھے۔ مگر میں کتاب میں مفید اضافے کرنے کے زاویۂ نگاہ
سے اس کی اشاعت کو مناسب وقت تک ملتوی کرنا چاہتا تھا۔ اس پس و پیش کے عالم میں

پروفیسر محمود ابوریّہ کی در سوائے عالم، کتاب "اضواء علی السنۃ المحمدیۃ" منظرِ عام پر آگئی۔ یہ کتاب حدیث نبوی اور راویان حدیث سے متعلق غیر علمی بحثوں سے بھرپور تھی۔ احباب کرام نے کتاب ہذا کی فوری اشاعت کا تقاضا کیا۔ اور اس طرح کتاب کو اسی حالت میں (بلا اضافہ) حوالہ پریس کرنا پڑا۔ البتہ محمود ابوریّہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا میں نے اس کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ بشرط صحت ان شاء اللہ العزیز میں اس آرزو کی تکمیل کر سکوں گا۔[1] میں سمجھتا ہوں کہ پروفیسر محمود ابوریّہ کی کتاب کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل تنقیدی خیالات کا کشف و اظہار میرے لیے از بس ناگزیر ہے۔ ذیل میں اس کتاب کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔ فقہ اسلامی میں حدیث کا مرتبہ و مقام:

اسلامی شریعت میں حدیث کو جو اہمیّت حاصل ہے اور عہد رسالت و صحابہ سے لے کر فقہی مذاہب و مسالک کے قیام تک حدیث نے جو اثر فقہِ اسلامی پر ڈالا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ماضی ہو یا حال جملہ اقوام عالم کی فقہ میں فقہ اسلامی کو عدیم النظیر مقام حاصل ہو گیا۔ جو شخص کتاب و سنت سے آگاہ ہے وہ بخوبی جانتا ہے کہ تشریع اسلامی

---

[1] میرے علم کی حد تک ڈاکٹر سباعی رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً اس آرزو کی تکمیل نہ کر سکے اور اس حسرت کو سینہ میں چھپائے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ عدم تکمیل کی بڑی وجہ ان کی ناتواں ڈول صحت تھی۔ حمایت سنت کا جو داعیہ ان کے سینہ میں پنہاں تھا خداوند کریم اس پر انہیں اجر جزیل عطا کرے گا۔ خاکسار کو ان کی یہ ادا بے حد محبوب تھی اور اسی بناء پر دل میں ان کی بے حد قدر و منزلت ہے۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں جب پنجاب یونیورسٹی نے مجلس مذاکرہ عالمیہ منعقد کی تو عالم عرب کے اعاظم رجال کے ساتھ چند دن گزارنے کا موقع ملا مگر سباعی صاحب مجلس مذاکرہ میں شرکت نہ کر سکے اور اس طرح ان کی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ حدیث نبوی کی حمایت و صیانت کے سلسلہ میں آپ نے جو مساعی انجام دی ہیں اور جس طرح قدیم و جدید منکرین حدیث کے کفر و نفاق کا راز طشت از بام کیا ہے اس پر ہر راسخ العقیدہ محبِ سنت ان کے حق میں درگاہ ایزدی میں دعا گو ہے۔
احقر العباد، غلام احمد حریری۔

کے دائرہ کو وسعت دینے اور اسے عظمت و خلود سے ہمکنار کرنے میں حدیث نبوی نے اہم پارٹ ادا کیا ہے۔ یہ ایک ایسی درخشاں حقیقت ہے کہ جو شخص فقہ اور اس کے مذاہب سے آگاہ و آشنا ہے وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

یہ ہے وہ فقہ اسلامی جس نے دنیا بھر کے علماءِ قانون و فقہ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ جب وہ بکمالِ بسط و تفصیل خوش آیند اسلوب نگارش میں تحریر کردہ فقہِ اسلامی کا مطالعہ کریں گے تو اور بھی خوش ہوں گے۔ جامعہ دِمشق کے شریعت کالج کا شعبہ فقہِ اسلامی اس مقصد کی تکمیل کے درپے ہے۔ اس شعبہ کا مقصد یہ ہے کہ اعداءِ اسلام نے ماضی و حال میں حجیّت حدیث اور اس کے رُواۃ و رجال صحابہ و تابعین کے بارے میں جو شکوک و شبہات پھیلائے ہیں ان کو بے نقاب کر دیا جائے۔ حدیث کے خلاف یہ سازش کرنے والے دشمنانِ دین زنادقہ فارس تھے جنہوں نے اسلامی تہذیب کے دورِ عروج میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ عصرِ حاضر کے اسلام دشمن مستشرقین اور دلدادگانِ تہذیب مغرب بھی یہی خدمت انجام دے رہے ہیں اور اسی طرح یہ دونوں ایک دوسرے کے ہم رنگ و ہم آہنگ ثابت ہوتے ہیں۔

حدیث کے خلاف پیہم و مسلسل کوششوں کا سلسلہ چودہ صدیاں گزرنے پر بھی ختم نہیں ہوا اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک دشمنانِ دین اس کائنات ارضی پر موجود ہیں[1]

[1] مصنف نے سچ فرمایا اب بھی ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور سے انکار حدیث کے سوتے پھوٹ رہے ہیں اور انکار حدیث کے متوالے اپنی من مانی کوششوں میں مصروف ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ مخلص دیندار لوگ ان کے دام فریب میں نہیں آتے۔ ان کے جال میں پھنسنے والے مستشرقین یورپ کے چیلے اور یا دلدادگان تہذیب فرنگ ہیں جو دینی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار کرنے کے عادی اور دین میں سہولتوں کی تلاش میں مگن رہنے والے ہیں۔ ایسے تن آسان لوگوں کے لیے انکار حدیث سے بڑھ کر اور کوئی کارگر حربہ نہیں ہو سکتا۔ انکار حدیث کی صورت میں بڑی آسانی سے بہت سی دینی ذمہ داریوں سے چھٹی مل جاتی ہے۔ اس لیے کہ شرعی احکام کی تفصیل و توضیح زیادہ تر حدیث نبوی کی راہ سے آئی ہے۔ مقام افسوس ہے کہ صدر ایوب کی حکومت نے اس شجرۂ خبیثہ کی آبیاری کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ایک طرف منکرین حدیث کے سرغنہ جناب پرویز کی سرپرستی کی جاری ہے تو دوسری طرف ڈاکٹر فضل رحمن کی۔ (غلام احمد حریری)

دوسری جانب دین اسلام ان کو اور زیادہ غضب آلود کرتا اور اپنی چمک دمک سے ان کی آنکھوں کو خیرہ کرتا رہے گا۔ مگر یہ فرطِ تعصب سے اندھے ہو کر کتاب و سنت اور اجتہاد کے آثار مٹانے کے سلسلہ میں سرگرم عمل رہیں گے۔ ان کی یہ کوشش ہو گی کہ علم بردارانِ سنت یعنی نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابہ کرام اور محدثین و فقہاء کی مذمت کی جائے اور تاریخی و تہذیبی حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا جائے۔

مگر ہم پورے وثوق سے عرض کرتے ہیں کہ اسلام اور اعداء اسلام کے مابین جو کشمکش جاری ہے اس کا نتیجہ آج بھی ان کی شکست کی صورت میں نمودار ہو گا، جیسا کہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کے عزائم قبیحہ منظر عام پر آجائیں گے۔ اور اسلام درمیان میں ان کی شرارتوں سے محفوظ ایک بلند و بالا پہاڑ کی طرح کھڑا رہے گا۔ اس لیے کہ اسلام اور اعداء اسلام (منکرین حدیث) کے مابین جو معرکہ بپا ہے دراصل یہ حق و باطل علم و جہل الفت و عداوت اور نور و ظلمت کی جنگ ہے اور اس کائنات میں سنتِ ربانی یہ رہی ہے کہ وہ ہمیشہ حق و علم اور الفت و نور کو غلبہ عطا کرتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔	بلکہ ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں اور وہ اُسے دبا لیتا ہے۔ پھر باطل رخصت ہو جاتا ہے

۲۔ مستشرقین کے ذہنی غلام:

اس پر جس قدر اظہار افسوس کیا جائے کم ہے، کہ دورِ حاضر میں ہمارے بعض مسلم علماء و مصنفین جن کے صادق الاسلام ہونے پر ہمیں پورا یقین ہے۔ مستشرقین کی جھوٹی علمی تحقیق کے دام فریب میں آکر ان کے اندھے مقلد بن گئے ہیں۔ دراصل مغربی مستشرقین و مورخین اعداء اسلام نے اپنے اصلی مقاصد و عزائم پر جھوٹی تحقیق کے خوشنما پردے ڈال رکھے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی یہودی عیسائی اور سامراجی اسلام کے خلاف جو شکوک و شبہات پیدا کر رہے تھے ہمارے مسلم مصنفین بھی وہی خدمت انجام دینے لگے۔ اور ان کے ساتھ ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔

علم و تاریخ کے میدان میں فریقین میں سے کسی نے بھی کوئی معرکہ سر نہ کیا۔

اس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ جو مسلم مصنفین اسلام دشمن مستشرقین اور مغربی مورخین کے دام فریب میں آتے ہیں ہمارے نزدیک اس کے اہم وجوہ و اسباب چار ہیں :۔

(۱) وہ اسلامی علوم و فنون سے بے گانہ اور اسلام کے چشمۂ صافی سے بے خبر ہیں۔

(۲) وہ مستشرقین کے نام نہاد علمی اسلوب و انداز سے مرعوب اور ان کے ذہنی غلام ہیں۔

(۳) وہ تقلید کا جوا اتار کر حریت فکر و نظر کے مدعی ہیں اور اس طرح شہرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

(۴) وہ ایسی فکری لغزشوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہیں کہ مغربی مصنفین کی آڑ لیے بغیر ان کا اظہار نہیں کر سکتے۔

۳۔ البوریہ کی گمراہ کن کتاب "اضواء علی السنۃ المحمدیۃ"

انہی ظروف و احوال میں پروفیسر البوریہ کی رسوائے عالم کتاب "اضواء علی السنۃ المحمدیہ" چھپ کر منظر عام پر آگئی۔ میں نے اپنی تصنیف "السنۃ و مکانتہا" کو حوالہ پریس کرنے سے پہلے البوریہ کی کتاب کی ورق گردانی کی۔ میں نے دیکھا کہ موصوف نے جہاں بھی جمہور محققین اور علماء سلف کی آراء سے انحراف کیا ہے۔ اس میں اس کے مصادر مندرجہ ذیل مآخذ سے کہیں بھی آگے نہیں بڑھے۔

(۱) معتزلہ کی آراء جو ان کی کتب میں منقول ہیں۔

(۲) غالی شیعہ کے افکار جو ان کی تصانیف میں مرقوم ہیں۔

(۳) مستشرقین کے نظریات جو ان کی تصانیف اور انسائیکلو پیڈیا میں مذکور ہیں۔

(۴) بعض ادبی کتب میں ذکر کردہ حکایات جن کے مؤلفین کی صدق بیانی مشکوک ہے۔

(۵) البوریہ کے ذاتی افکار و آراء جو عرصہ دراز سے اس کے سینہ میں مخزون و مدفون تھے۔

جہاں تک ان اقتباسات کا تعلق ہے جو البوریہ نے صحیح الخیال علماء کی مسلمہ کتب سے نقل کیے ہیں۔ اس کے وجوہ و اسباب حسب ذیل ہیں۔

(۱) جن کتب سے وہ اقتباسات لئے گئے ہیں وہاں ان کا محل ورود اس موقع و مقام سے مختلف تھا جہاں مصنف نے ان کو جگہ دی۔

(۲) مندرجہ حقائق علماء محققین کے نزدیک درست تھے مگر ابوریہ نے ان کو غلط معنی پہنائے اس کا مقصد قارئین کو یہ تاثر دینا ہے کہ یہ علماء بھی اس کے ہمنوا ہیں۔ حالاں کہ یہ بات درحقیقت درست نہیں۔

(۳) ابوریہ نے علمی خیانت سے کام لے کر کتب کی ادھوری عبارتیں تحریر کیں۔ اپنے کام کی عبارت نقل کر دی اور جو خلافِ مقصود تھی اس کو حذف کر دیا۔ اس کتر بیونت کی مثال آپ کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعلق بحث میں ملے گی۔

(۴) ابوریہ نے بعض جگہ یوں کیا ہے کہ علماء نے معتزلہ سے جو اقوال نقل کیے تھے ان کو معتزلہ کے بجائے نقل کرنے والے علماء کی جانب منسوب کر دیا۔ چنانچہ ابن قتیبہ سے ابوریہ نے جو اقوال نقل کیے ہیں۔ اس میں اسی مجرمانہ خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابوریہ نے جن علماء کی عبارتیں نقل کی ہیں وہ بلاشبہ ان گمراہانہ خیالات میں اس کے ہمنوا نہ تھے۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات ابوریہ کا یہ واقعہ بیان کرنا ہے کہ کعب الاحبار نے حضرت عمرؓ کو بتایا کہ آپ کا آخری وقت قریب ہے۔ مگر آپ نے اس طرف توجہ نہ دی۔ اس کی وجہ ابوریہ یہ بیان کرتا ہے کہ حضرت فاروق رضؓ ابوہریرہ رضؓ کی مرویات سے بدظن ہو کر ایسی روایات کو تسلیم نہیں کیا کرتے تھے۔ ابوریہ بظاہر یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ وہ علماء محققین کے لیے اپنے دل میں بڑی عقیدت و ارادت رکھتا ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ انہوں نے حدیث و سنت کی تحقیق کا حق ادا نہیں کیا۔

ایسے علماء جن کے نام کی آڑ لے کر ابوریہ نے اپنے نظریات کی تائید میں بکثرت ان کے اقوال پیش کیے ہیں ان میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ شیخ طاہر الجزائری امام محمد عبدہٗ اور سید

رشید رضا رحمہم اللہ جیسے اکابر شامل ہیں۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی وہ بات نہیں کہی جو ابوریہ ان سے نقل کرتا ہے اور ان کا دامن اس سے پاک ہے۔

خصوصاً اس اتہام سے جو ابوریہ نے حضرت ابوہریرہؓ جیسے جلیل القدر راوی کے سر تھوپا ہے۔ اور ان نتائج سے جو اس نے اس تمام بحث وتحیص سے نکالے ہیں۔

یہ امر واضح ہے کہ ابوریہ نے اپنی کتاب کی اہمیت جتانے کے لیے کثیر مصادر و مآخذ کا نام لیا ہے۔ ابوریہ کی کتب حوالہ فنونِ حدیث وتفسیر وفقہ وعلوم کتاب وسنّت سبھی سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ محوّلہ کتب کی عبارتوں سے جو نتیجہ اس نے نکالا ہے ان کتب میں اس کا کہیں سُراغ نہیں ملتا۔ بلکہ وہ اس کے دعاوی کی کھلم کھلا تردید کرتی ہیں۔ ابوریہ کے ذکر کردہ بعض تاریخی مصادر ایسے ہیں جو تدوین حدیث و تنقید رُواۃ ورجال جیسے اہم مباحث میں علماء کے نزدیک حجت نہیں ہیں۔ اور بہت سے تاریخی مصادر تو جمہور محققین کے نزدیک سرے سے قابل اعتماد ہی نہیں۔ ابوریہ کی بعض کتب حوالہ فنونِ ادب ولغت اور نحو وشعر سے متعلق ہیں جن کا حدیث جیسے اہم موضوع کے ساتھ کچھ بھی ربط وتعلق نہیں۔

باقی رہے وہ مصادر جن پر ابوریہ نے بے حد اعتماد کیا ہے اور جن سے اس کی ”علمی تحقیق“ کا راز طشت از بام ہو جاتا ہے تو وہ ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں۔ یہ کتب ابوریہ کے نزدیک ”علمی تحقیق“ کے انجام دینے میں کسی طرح بھی درجی سے کم نہیں۔ وہ مصادر مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) تاریخ التمدن الاسلامی جُرجی زیدان۔

(۲) العرب قبل الاسلام جُرجی زیدان۔

(۳) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔

(۴) الحضارۃ الاسلامیۃ کریمر۔

(۵) السیادۃ العربیۃ فولٹن۔

(۶) حضارۃ الاسلام فی دار السلام ابراہیم یازجی۔

(۷) تاریخ العرب فلپ ہٹی۔

(۸) تاریخ الشعوب الاسلامیہ کارل بروکلمان۔

(۹) المسیحیۃ فی الاسلام ابراہیم لوقا۔

(۱۰) وجہۃ الاسلام (چند مستشرقین کی تحریر کردہ)۔

(۱۱) العقیدۃ والشریعۃ گولڈزیہر۔

یہ ہیں ابوریہ کے مقبول ترین مصادر۔ مگر اس کے باوصف وہ کتاب کے آخر میں لکھتا ہے کہ اس نے اپنے دعاوی کو مضبوط ترین دلائل سے مدلل و مبرھن کیا ہے۔ (دیکھئے ابوریہ کی کتاب ص ۳۵۴)۔

وہ مزید لکھتا ہے کہ میں نے ایسے مصادر سے استفادہ کیا ہے جن میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں (ص ۱۹۷)

اب ہم ابوریہ کے معتبر ترین مصادرِ خمسہ کا تنقیدی جائزہ لیں گے۔

۴۔ معتزلہ :

جہاں تک اکابر معتزلہ ——— جن کو ابوریہ ارباب عقول صریحہ کے نام سے یاد کرتا ہے ——— کے افکار و نظریات کا تعلق ہے ہم نے آگے چل کر حدیث کے بارے میں معتزلہ کا موقف ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس ضمن میں ان کے دو گروہ ہیں :۔

(۱) معتزلہ کی ایک جماعت کلیتہً منکر حدیث ہے۔

(۲) دوسری جماعت قبولیت حدیث کے سلسلہ میں ایسی پابندیاں عائد کرتی ہے جن کا پایا جانا ناممکنات میں سے ہے۔

ہم نے بتایا ہے کہ اکابر معتزلہ کا وہ گروہ جو صحابہ کو ہدفِ تنقید بناتا ہے ان کی بے دینی کا یہ عالم تھا کہ نماز میں سبقت کرنے والوں کو "گدھے" کہہ کر پکارتے تھے۔ ثمامہ بن اشرس اسی گستاخی کا ارتکاب کیا کرتا تھا۔ معتزلہ کے عرب دشمن افراد جو شعوبیہ کہلاتے تھے۔ ان کا

کہتا تھا "اس عربی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھو لوگوں سے کیا سلوک کر رہا ہے"؟ جو آوارہ مزاج شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسے گستاخانہ کلمات کہہ سکتا ہے۔ وہ صحابہ کے بارے میں کیا کچھ نہ کہتا ہوگا۔ اور وہ حدیث کے بارے میں کیا کیا گل فشانیاں نہ کرتا ہوگا۔ جس کو محدثین و محققین ملت نے مرتب کیا تھا۔

معتزلہ یونانی منطق و فلسفہ اور ہندی فلسفہ و فارسی ادب کی شیفتہ و فریفتہ قوم تھی یہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر فارسی النسل تھے۔ قرآن کو یونانی فلسفہ کے قالب میں ڈھالنے کے لیے یہ اس کی تاویل کرتے تھے جو احادیث نبویہ یونان کے مشرکانہ فلسفہ سے ہم آہنگ نہ ہوتیں وہ ان کی تکذیب کرتے تھے۔ وہ فلاسفۂ یونان کو معصوم عن الخطاء اور عقل کے انبیاء تصور کرتے تھے۔ جمہور مسلم علماء اور معتزلہ کے مابین فکری جنگ بپا تھی۔ مقام افسوس ہے کہ البوریہ امام مالک، شافعی، بخاری، مسلم ابن المسیّب جیسے آئمہ حدیث کے مقابلہ میں ان کو "اصحاب العقول الصریحۃ" کے نام سے یاد کرتا ہے۔

یہ ہیں البوریہ کے مسلّمہ دانشور اور علماء جنہوں نے اقتدار کی کرسی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے خلفاء وقت کو ائمہ مسلمین کے خلاف ابھارا اور سالہا سال تک انہیں قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار کیا۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" میں معتزلہ کے جو اقوال نقل کیے تھے البوریہ ان کو ابن قتیبہ کے اقوال کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور یہ نہیں بتاتا کہ یہ صحابہ و محدثین کے خلاف معتزلہ کے اقوال ہیں جن کو ابن قتیبہ نے نقل کر کے ان کی تردید کی ہے۔ علمی بددیانتی کی مثال اس سے نمایاں تر اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ ہے البوریہ کی "علمی تحقیق" جس پر وہ نازاں ہے۔

۵۔ کتب شیعہ سے البوریہ کا استدلال:

البوریہ نے جن شیعی مصادر سے استناد کیا ہے ان پر گرفت کرنے سے قبل میں اس ضمن میں کچھ تمہیدی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ حضرت علی و حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مابین

خلافت کے سلسلہ میں جو خونیں معرکے بپا ہوئے ہم الم و حسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مزید برآں جو اثرات و نتائج ان پر مرتب ہوئے ہم آج تک انہیں محسوس کر رہے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ اس فتنہ کی آگ کو ہوا دینے والے دشمن خدا یہودی اور بہت سے عجمی لوگ تھے۔ جن کے دیار و امصار میں اسلام نے اپنے قدم جما لیے تھے۔ ان لوگوں نے دجل و فریب کے ہتھکنڈے استعمال کیے اور جھوٹی حدیثیں وضع کر کے مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع کر دی۔ مجھے یقین ہے کہ جمہور اہل اسلام ——— اور وہ اہل سنت ہیں ——— زیادہ باانصاف ہیں اور انہوں نے صحابہ کے ادب و احترام کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ خداوند تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں صحابہؓ کی مدح و ستائش کی اور ہجرت و نصرت دین کی بناء پر ان کی خدمات کو سراہا ہے۔

اس لیے یہ بات نہ جائز ہے نہ عقل و قیاس سے ہم آہنگ اور نہ دین اسلام کی عظمت و فضیلت سے مربوط کہ وہی صحابہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد وہ سب کچھ بن گئے جس کی تصویر ہمیں کتب شیعہ میں ملتی ہے۔ شیعہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں جو کچھ لکھتے اور جو اپنی مجالس میں بیان کرتے ہیں اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ کوئی چوروں اور ڈاکوؤں کی جماعت تھی۔ جن میں نہ دین کی کوئی رمق تھی نہ ضمیر تھا۔ جو انہیں دروغ گوئی اور دنیوی اموال و امتعہ پر فریفتہ ہونے سے باز رکھتا۔ حالاں کہ تاریخ اس بات کی زندہ گواہ ہے کہ ماضی و حال میں انسانیت جس جماعت سے بھی آگاہ و آشنا ہے صحابہ اس سے زیادہ متقی اور سیرت و کردار میں اس پر بدرجہا فائق تھے۔ اسلام انہی کی بدولت اور ان کی سیف و سنان کے بل بوتے پر دنیا کے دور افتادہ گوشوں میں پھیلا۔ انہوں نے خدا کی راہ میں اہل و عیال اور بلاد و امصار کو چھوڑا اور خدا کی راہ میں ایثار و قربانی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ اہل سنت و شیعہ کے مابین نقطۂ نزاع و اختلاف یہ تھا

کہ خلافت کا زیادہ حق دار کون ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ مصدرِ اختلاف عصر حاضر بلکہ عرصہ دراز سے باقی نہیں رہا۔ ہم سامراجیوں کے زیرِ اثر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نہ ہمارا کوئی بادشاہ ہے جس کے زیرِ سایہ ہم جہاد کریں اور نہ خلافت باقی رہی ہے جس کی وجہ سے ہم باہم لڑیں جھگڑیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اختلافات و نزاعات کو ختم کر کے مسلمان ملت کی شیرازہ بندی کریں اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ نیز شیعہ سنی اختلافات کے نتیجہ میں جو حدیثیں چیدہ و برگزیدہ اور حاملین دین متین صحابہؓ کے بارے میں وضع کی گئی تھیں ان پر نظر ثانی کریں۔

جمہور اہل اسلام اہل سنت و شیعہ کو ایک دوسرے کے قریب دیکھنا چاہتے اور انہیں دعوتِ اتفاق و اتحاد دے رہے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ فریقین کے علماء نے اس دعوت پر لبیک کہنا شروع کر دیا ہے۔ علماءِ اہل سنت نے تو صلح پسندی کا عملی ثبوت بھی بہم پہنچایا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے شیعی فقہ کا درس و مطالعہ شروع کر دیا ہے اور اہل سنت کے فقہی مسالک کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ فقہی مکاتبِ فکر کے تقابلی مطالعہ کو اب کالجوں کے نصاب میں شامل کر لیا گیا ہے اور فقہ اسلامی کے موضوع پر جو کتب تصنیف کی جا رہی ہے ان کے مندرجات کا ایک جزو یہ بھی ہے۔ میں ذاتی طور پر بھی اس کے حق میں ہوں۔ میں نے جب سے جامعہ دمشق میں تدریس فقہ کا آغاز کیا ہے اپنے لیکچروں اور تصنیفات میں اسی ڈگر پر گامزن ہوں۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ شیعہ علماء نے تا ہنوز اس سلسلہ میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا نہ دینی مجالس و محافل میں قدرے رواداری کا ثبوت دیا ...... اس کے باوصف اکثر شیعہ ابھی تک سبِ صحابہ اور ان کے خلاف سوءِ ظن میں مشغول ہیں۔ ان کے اسلاف کی تصانیف میں جو روایات و اخبار مذکور ہیں وہ ان پر یقین رکھتے ہیں۔ بعض شیعہ مجالس میں شیعہ سنی کے مابین صلح و امن کی بات چیت کرتے ہیں مگر ان کا عمل اس کے خلاف ہوتا ہے اور وہ مطاعنِ صحابہؓ سے بھرپور کتب بھی شائع کرتے رہتے ہیں۔

۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے کہ میں مشہور شیعہ عالم عبدالحسین کو جبل عامل کے نزدیک واقعہ اس کے شہر "صور" میں ملنے گیا۔ اس کے پاس کچھ شیعہ علماء بیٹھے تھے۔ اہل سنت و شیعہ کے اتفاق واتحاد کی بات چل نکلی۔ کہا گیا کہ فریقین کے علماء کی باہمی ملاقاتیں اور صلح وامن سے متعلق کتب اس ضمن میں اہم پارٹ ادا کر سکتی ہیں۔ عبدالحسین اس کے سرگرم مؤید تھے۔ قرار پایا کہ علماء اہل سنت وشیعہ علماء کی ایک مشترکہ کانفرنس منعقد کی جائے۔ میں اس بات چیت سے مطمئن واپس لوٹا۔

تھوڑی مدت بعد اس غرض کی تکمیل کے لیے میں نے بیروت میں بعض شیعہ علماء اور تجار وُدباء سے ملاقات کی۔ مگر ناساز گار حالات کی بناء پر اس تجویز کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ ابھی تھوڑی مدت گزری تھی کہ اچانک مجھے پتہ چلا کہ عبدالحسین نے حال ہی میں ایک کتاب شائع کی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جی بھر کر گالیاں دی گئی تھیں۔ ہزار کوشش کے باوجود مجھے یہ کتاب آج تک نہ مل سکی۔ چونکہ ابوریّہ نے اپنی کتاب میں جابجا عبدالحسین کی مذکورہ کتاب کے اقتباسات دیے ہیں اس لیے ابوریّہ کی کتاب سے اس کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ ابوریّہ نے جی بھر کر عبدالحسین کی تعریف کی ہے کیونکہ اس جلیل القدر صحابی کے بارے میں دونوں کے خیالات یکساں نوعیت کے ہیں۔

مجھے عبدالحسین کی گفتگو اور اس کی تصنیف کے کھلے ہوئے تضاد سے بڑی حیرت ہوئی اس سے واضح ہوتا ہے کہ شیعہ علماء اتحاد نہیں چاہتے اور نہ ہی ماضی کی تلخیوں کو فراموش کرنے کے خواہاں ہیں۔ میرے نزدیک اتحاد کی دعوت دینے والے شیعہ علماء تاہنوز اسی موقف پر قائم ہیں ان کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ ایک طرف تو مصالحت کی گفتگو کے لیے وقت مقرر کرتے جامعہ ازہر کے علماء سے مراسلت کی سلسلہ جنبانی کرتے اور ان مقاصد پر مشتمل قاہرہ سے جرائد و مجلات شائع کرتے ہیں۔ دوسری طرف عراق و ایران کے شیعہ علماء میں اس کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔ شیعہ کتب جن مطاعن صحابہ سے لبریز ہیں اور ان میں حضرات صحابہؓ کے اختلافات کی جو جھوٹی تصویر کھینچی گئی ہے، شیعہ علماء ابھی تک اس پر مُصر ہیں۔ گویا

دعوتِ تقریب سے ان کا مقصد اہل سنت کو شیعہ مذہب کے قریب لانا ہے نہ یہ کہ فریقین ایک دوسرے کے نزدیک آجائیں اور ان میں امن و اتحاد کی فضا پیدا ہو جائے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ تاریخ حدیث یا مذاہب اسلامیہ سے متعلق جو علمی بحث شیعی نقطۂ نگاہ کے موافق نہ ہو شیعہ علماء اس کے اٹھانے والے کو موردِ طعن ٹھہراتے اور یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ شخص فریقین کے مصالحانہ مساعی کو غارت کرنے والا متعصب آدمی ہے۔ مگر مقام حیرت ہے کہ عبدالحسین کی کتاب جس میں حضرت ابوہریرہؓ جیسے صحابی کو گالیاں دی گئیں ان کے نزدیک ایک تخریبی اور الفت و محبت کا استیصال کرنے والی کوشش نہیں ہے۔

عبدالحسین کی حضرت ابوہریرہؓ کی تنقیصِ شان سے متعلق کتاب اس کی منفرد مثال نہیں ہے بلکہ عراق و ایران میں بکثرت ایسی کتب شائع کی جارہی ہیں جن میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور صحابہ کرامؓ کے بارے میں سب و شتم پر مشتمل ایسے مندرجات موجود ہیں جن کو کوئی باضمیر انسان سننا گوارا نہیں کرتا۔ حالاں کہ اس سے ماضی کی تلخ یادیں تازہ ہوتیں اور نئے سرے سے عداوت کی آگ بھڑکنے لگتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابوریہ کی کتاب بھی انہی کتب میں شامل ہے، جس کے حضرت ابوہریرہؓ سے متعلق مندرجات کی بناء پر شیعہ اسے پسند کرتے ہیں۔ مگر انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کتاب سے اہل سنت و شیعہ کے درمیان عداوت کا دروازہ از سرِ نو کھل جائے گا یا کم از کم ایک دوسرے پر لے دے کا سلسلہ شروع ہو جائیگا اور صحابہ کے بارے میں شیعہ کے افکار و نظریات ایک دفعہ پھر ملت کے سامنے آجائیں گے۔

یہ درست ہے کہ ہم نے ابوریہ کے کتبِ شیعہ سے استناد کرنے پر تنقید کی ہے، اور حدیث کے بارے میں شیعہ کا موقف بھی واضح کر دیا ہے۔ مگر یہ سب کچھ ہم نے علمی و تاریخی حدود کے اندر رہ کر بیان کیا ہے۔ تاریخی حقائق میں کسی مصالحت کا امکان نہیں بشرطیکہ موقع و محل علمی و تحقیقی ہو۔ تنقید کی دوسری وجہ ان اغلاط کی تصحیح ہے جو ابوریہ نے شیعی کتب سے اخذ کی ہیں۔ میں نے کتاب ہذا میں شیعہ کے حدیث سے متعلق موقف کے بارے میں ایک بحث

تحریر کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جو ڈگری حاصل کرنے کے لیے ایک درس گاہ کے علماء کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ بایں ہمہ میں اس کتاب کی اشاعت کو مؤخر کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب مختلف وجوہ و اسباب کی بناء پر اسے پریس کے حوالہ کرنا پڑا۔

کتاب کی اشاعت کو مؤخر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ شیعہ سنی اتحاد کے قیام و بقاء کے لیے شیعہ کے حدیث سے متعلق موقف کی مزید وضاحت کروں۔ اس لیے کہ میرا مقصد اس سے ہرگز یہ نہ تھا کہ شیعہ کے جذبات کو ٹھیس لگے یا ان کی آتشِ عداوت بھڑک اُٹھے۔ کیونکہ میں خود شیعہ سنی اتحاد کے حامیوں اور داعیوں میں سے تھا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ایک علمی و ادبی ماہنامے کے ایڈیٹر نے کتاب ہذا کا ایک ہی مسودہ جو میرے پاس موجود تھا اس عزم کے ساتھ لے لیا کہ وہ اس کے بعض مباحث کو شائع کرے گا میں نے کہا کہ اس کے مباحث ابھی توضیح طلب ہیں اور میں ان میں مزید اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں بیروت میں زیر علاج تھا کہ مجھے پتہ چلا کہ ایڈیٹر نے شیعہ سے متعلق بحث کو رسالہ میں شائع کر دیا ہے۔ نیز یہ کہ شیعہ حلقوں میں اس کا اثر اچھا نہیں ہوا۔ اور ان کے بعض علمی رسائل نے اس پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ یہ بات مجھے عظیم شاعر استاذ احمد صافی نجفی نے بتائی جن کے علم و فضل کا میں بہت مدّاح ہوں۔ میں نے اس بحث کے بارے میں اپنے موقف کو واضح کیا اور بتایا کہ یہ مضمون میری لاعلمی میں شائع ہو گیا ہے۔

میں بار دیگر علماء کی توجہات کو اس امر کی جانب منعطف کرانا چاہتا ہوں کہ کتاب ہذا میں جو کچھ مندرج ہے اس کی حیثیت محض علمی و تاریخی ہے۔ جو شخص فنّ حدیث کی تاریخ بیان کرنا چاہے اور اس کی جمع و تدوین کے مراحل وادوار ذکر کرنے کے درپے ہو اس کے لیے اس کا ذکر و بیان از بس ناگزیر ہے جو عالم عزّت نفس کا خوگر ہو اور چاہے کہ علماء اس کی کتاب کو قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھیں وہ ایسے امور سے پہلو تہی نہیں کر سکتا۔ میں نے اس کتاب میں وہی بات درج کی ہے جس کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ دلیل و برہان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

بایں ہمہ میں نے اس کتاب میں کوئی بات ایسی تحریر نہیں کی جس سے کسی ایسی شخصیت کی توہین و تنقیص ہوتی ہو جو شیعہ کے یہاں قابل احترام ہے۔ مگر شیعہ جمہور صحابہؓ کے بارے میں یہ رویہ نہیں رکھتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت رکھتے اور اسلام میں ان کے مقام و مرتبہ اور علم و فضل کے معترف ہیں۔ حضرت علی رضؓ کی اولاد سے جو اہل بیت ہوئے ہیں ہم ان کا بھی احترام کرتے اور ان کے علم و فضل کے ثنا خواں ہیں۔ اے کاش! اگر شیعہ بھی یہی رویہ روا رکھتے تاکہ ہم اور وہ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے۔

میں پھر مخلص شیعہ علماء کو ——— اور ایسے بااخلاص شیعہ علماء کی کمی نہیں جو دل سے وحدتِ اہل اسلام کے خواہاں ہیں ——— دعوت اتحاد دیتا اور یہ درخواست کرتا ہوں کہ آئیے ہم سب مل کر عالم اسلامی کے مسائل حل کریں اور اس انتشار و خلفشار کا خاتمہ کردیں۔ جس نے سُنی و شیعہ نوجوانوں کے دل سے دین کی محبت و عقیدت کو دور کر دیا ہے اور شاید شیعہ نوجوانوں میں یہ بیماری کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہو۔ ہمارے بلاد عربیہ آج کل جن حوادث و واقعات سے دوچار ہیں ان سے میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔ میں مکرّر دعوت دیتا ہوں کہ فریقین کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے صحیح عملی بنیادیں استوار کی جائیں۔ قولی اساسات کی ضرورت نہیں۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کے عزّ و وقار کے مسئلہ پر اتفاق کیا جائے جن کے ذریعہ نقل ہو کر اسلام ہم تک پہنچا اور جن کے توسط سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں کفر و ضلالت کی تاریکی سے نکال کر نورِ اسلام سے منوّر کیا۔

۶۔ مستشرقین:

۱۹۵۶ء میں یورپ کی سیاحت سے پہلے میں نے اپنی اس کتاب میں مستشرقین کے بارے میں ایک مختصر باب لکھا تھا۔ سیاحت کے موقع پر جب مجھے ان سے ملنے بات چیت اور تبادلۂ افکار کرنے کا موقع ملا تو میرے اس یقین میں مزید اضافہ ہُوا کہ ان کی وجہ سے ہمارا علمی ورثہ خطرہ کی زد میں ہے۔ خواہ یہ علمی میراث دینی علوم ہوں یا ہماری تہذیب و ثقافت

مجھے محسوس ہوا کہ ان کا دل اسلام اہل اسلام اور عربوں کے خلاف بغض و عناد سے لبریز ہے۔

پروفیسر انڈرسن :-

مستشرقین میں سے اولین شخص جس سے میں ملا لنڈن یونیورسٹی کے انسٹیٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے شعبہ قوانین احوالِ شخصیہ کا صدر پروفیسر انڈرسن تھا۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کا فارغ التحصیل اور جنگ عظیم دوم کے موقع پر مصر میں برطانوی فوج کا ایک رکن تھا۔ انڈرسن نے بذات خود مجھے بتایا کہ جامعہ ازھر کے ایک عالم سے اس نے عربی زبان سیکھی جو قاھرہ کی امریکن یونیورسٹی میں عربی پڑھاتے تھے۔ یہ ازھری شیخ ہفتہ بھر میں ایک مرتبہ عربی کا درس دیتے تھے۔ انڈرسن نے اس طرح ایک سال میں عربی سیکھی۔ مصر میں عام بولی جانے والی زبان اس نے عام مصریوں سے دورانِ قیام مصر میں سیکھی۔ جو عمومی لیکچر احمد امین ڈاکٹر طہٰ حسین اور شیخ احمد ابراہیم دیا کرتے تھے ان کی مدد سے اس نے دین اسلام سے متعلق خصوصی معلومات حاصل کر لیے۔ پھر اسی گہرے مطالعہ کی اساس پر اسے "پروفیسر" کا لقب ملا اور لڑائی کے خاتمہ پر اسے لنڈن یونیورسٹی میں شعبہ احوال شخصیہ کی صدارت تفویض ہوئی۔

دین اسلام کے خلاف انڈرسن کے دل میں جو تعصب تھا اس کی مثالیں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ڈاکٹر حمود غرابہ مرحوم ان دنوں لنڈن میں مرکز اسلامی ثقافت کے پرنسپل تھے انہوں نے انڈرسن کے تعصب پر مشتمل بہت سے واقعات سنائے۔ البتہ ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جو خود انڈرسن نے مجھے سنایا۔ کہنے لگا میں نے جامعہ ازھر کے ایک فارغ التحصیل کو لنڈن یونیورسٹی سے فقہِ اسلامی میں ڈاکٹر کی ڈگری لینے سے صرف اس لیے محروم کر دیا کہ اس نے "اسلام میں عورت کے حقوق" کے موضوع پر ایک مقالہ پیش کیا جس میں بدلائل ثابت کیا کہ اسلام نے عورت کو پورے حقوق دیے ہیں۔ میں نے اس پر اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اسے ڈاکٹر کی ڈگری لینے سے کیسے اور کیوں محروم رکھا۔ حالاں کہ تم اپنی یونیورسٹیوں میں آزادیِ فکر و نظر کا پرچار کرتے ہو؟ انڈرسن بولا اس لیے کہ وہ ازھری ہر موقع پر بولی

کہتا کہ "اسلام عورت کو یہ سہولت دیتا ہے اور اسلام نے عورت کے لیے یہ بات طے کی ہے" میں سوچنے لگا کہ آیا وہ چلتا پھرتا اسلام ہے جو خود بول رہا ہے۔ اور آیا وہ ابو حنیفہؒ یا شافعیؒ ہے کہ اس انداز میں بات کرتا ہے۔ عورت کے ان حقوق کا ذکر متقدمین فقہاء نے کہیں نہیں کیا۔ اس لیے یہ آدمی فریب خوردہ ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ یہ اسلام کو ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ سے بھی زیادہ سمجھتا ہے۔

یہ اس مستشرق کی گفتگو ہے جو ہنوز بقید حیات ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ ابھی تک اپنے منصب پر فائز ہے یا ریٹائر ہو چکا ہے۔

اسی طرح مجھے اسکاٹ لینڈ کی ایڈنبرا یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں علوم اسلامیہ کے شعبہ کا صدر "بلباس مدنی" نامی ایک پادری تھا۔ اس نے گھر کے دروازہ پر اپنا نام اور دینی لقب لکھوا رکھا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ ایک با اخلاق شیریں مقال آدمی تھا۔

اسکاٹ لینڈ کی گلاسگو یونیورسٹی میں شعبہ عربی کا صدر ایک پادری تھا۔ جو بیس۲۰ سال تک بیت المقدس میں تبلیغی مشن کا سربراہ رہ چکا تھا اور اہل زبان کی طرح عربی بولتا تھا۔ میں قبل ازیں ۱۹۵۴ء میں بحمدون (لبنان)، کے مقام پر منعقدہ اسلامی مسیحی کانفرنس میں اس سے مل چکا تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبہ عربی و علوم اسلامیہ کا سربراہ ایک یہودی تھا جسے عربی بولنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ وہ قبل ازیں لیبیا میں برطانیہ کے شعبہ جاسوسی میں جنگ عظیم دوم کے زمانہ میں کام کر چکا تھا۔ وہیں اس نے عوامی عربی سیکھی اور اسی قابلیت کے بل بوتے پر اس منصب پر فائز ہوا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جو نصاب وہ مشرقی علوم کے طلبہ کو پڑھا رہا تھا اس میں قرآن کریم کی چند آیات کی تفسیر علامہ زمخشری کی کشاف کے پیش نظر پڑھانا بھی شامل تھا۔ بخدا وہ عربی اخبار کی آسان عبارت سمجھنے پر بھی قادر نہ تھا تو تفسیر کشاف کیا خاک سمجھے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ بخاری و مسلم کی چند احادیث اور حنفیہ و حنابلہ کی فقہی کتب کے چند ابواب بھی شامل تھے۔ میں نے نصاب مذکور کے مصادر کے بارے میں پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ یہ نصاب گولڈ زیہر، مارگولیتھ اور شاخت

جیسے مستشرقین کی تصانیف سے ماخوذ ہے۔ ان مستشرقین کا نام اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ نصاب کس حد تک مسخ شدہ اور خلاف اسلام و اہل اسلام ہوگا۔

آربری :۔

کیمبرج یونیورسٹی میں شعبہ عربی و علوم اسلامیہ کا رئیس مشہور مستشرق آربری ہے جو عربی میں متخصص ہے۔ آربری نے دورانِ گفتگو اس امر کا اعتراف کیا کہ ہم مستشرقین اسلام پر بحث کرتے وقت بہت سی غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں۔ دراصل ہمیں اس میدان میں طبع آزمائی نہیں کرنا چاہیے۔ مسلم عرب اس موضوع پر خامہ فرسائی کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں اور ان میں ہم سے زیادہ اہلیت و صلاحیت پائی جاتی ہے۔

روبسن :۔

مانچسٹر (انگلینڈ) میں مجھے پروفیسر روبسن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ سنن ابی داؤد کو ایک مخطوطہ سے دیکھ کر صحیح کر رہا تھا۔ اس نے تاریخ حدیث کے موضوع پر چند کتب تصنیف کی ہیں جن میں اس نے دیگر مستشرقین کے خیالات کے ساتھ بڑی حد تک اتفاق کیا ہے۔ میں اسے یہ بات بتانے کا آرزومند تھا کہ قبل ازیں علوم مشرقیہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مبنی بر ظلم و تعدی اور بعید از حقیقت ہیں۔ پھر میں نے گولڈزیہر کے خیالات پیش کر کے اس کی علمی و تاریخی غلطیوں کی نشان دہی کی۔ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا:۔

> اس میں شبہ نہیں کہ عصر حاضر کے مستشرقین گولڈزیہر کی نسبت اسلامی مصادر و مآخذ سے زیادہ باخبر ہیں۔ اس لیے کہ دورِ حاضر میں علوم اسلامیہ سے متعلق ایسی کتب منظر عام پر آگئی ہیں جن کا گولڈزیہر کے زمانہ میں کچھ پتہ نہ تھا"

میں نے کہا پھر آج کل مستشرقین کے افکار و آراء گولڈزیہر اور مارگولیتھ کی نسبت اقرب الی الحق والانصاف ہونے چاہئیں۔ روبسن نے کہا:۔

"میرا خیال بھی یہی ہے"

شاخت :-

ہالینڈ کی لیڈن یونیورسٹی میں مجھے مشہور یہودی مستشرق "شاخت" سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہ یہودی مستشرق اسلامی حقائق کو بگاڑنے اور اسلام کے خلاف سازشیں کرنے میں گولڈزیہر کا مثنٰی سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اسے تفصیلاً گولڈزیہر کی علمی غلطیوں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ ہماری کتابوں کی عبارتیں بگاڑ کر پیش کرتا ہے۔ اس نے پہلے انکار کیا۔ میں نے گولڈزیہر کی کتاب "تاریخ سنت" سے ایک مثال پیش کی جو میں نے کتاب ہذا میں بھی ذکر کی ہے۔ میں نے بتایا کہ امام زہری کا قول یوں تھا:۔

ان ھؤلاء الامراء اکرھونا علی کتابۃ الاحادیث۔ ان امراء نے ہمیں حدیثیں لکھنے پر مجبور کیا

گولڈزیہر نے اس کو یوں تبدیل کر دیا "علی کتابۃ احادیث"۔[1]

شاخت بڑا حیران ہوا۔ ہم اس کی ذاتی لائبریری میں بیٹھے تھے اس نے گولڈزیہر کی کتاب کھولی اور کہا آپ سچ فرماتے ہیں۔ گولڈزیہر نے یہاں غلطی کھائی ہے۔ میں نے کہا گولڈزیہر نے ایک نہیں بہت سی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ شاخت غصہ میں آکر بولا "اس کے بارے میں تم سوءِ ظن سے کیوں کام لیتے ہو"؟ پھر میں نے عبدالملک بن مروان کے ساتھ امام زہری کا واقعہ تفصیلاً بیان کیا اور تاریخی حقائق کی روشنی میں گولڈزیہر کی غلطی واضح کی۔ میں نے اس کتاب میں بھی اس واقعہ کی تفصیلات ذکر کی ہیں۔ کافی بحث وتمحیص کے بعد شاخت بولا "یہ بھی گولڈزیہر کی غلطی ہے۔ مگر کیا علماء سے غلطی صادر نہیں ہوتی"؟ میں نے کہا :۔

[1] امام زہری کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ حافظہ پر اکتفاء کرتے تھے۔ مسلم امراء نے ہمیں کتابتِ حدیث پر مجبور کیا۔ گولڈزیہر نے امام زہری کے الفاظ میں جو تحریف کی اس سے یہ مفہوم پیدا ہوا کہ امراء نے ہمیں حدیثیں وضع کرنے پر مجبور کیا اور ہم نے ان کی مدح وثنا پر مشتمل حدیثیں گھڑیں۔ (غلام احمد حریری مترجم)

گولڈزیہر استشراقی مدرسۂ فکر کا اولین بانی و مؤسس ہے اسلامی شریعت کے بارے میں اس کے فیصلے تاریخی حقائق پر مبنی ہونے چاہییں۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ زُھری کے بارے میں گفتگو کرتے وقت گولڈزیہر نے تاریخی مصادر سے کیونکر فائدہ نہ اٹھایا؟ اور اس نے کیوں کر یہ بات کہہ دی کہ زُہری نے عبداللہ بن زبیرؓ کے خلاف عبدالملک کو خوش کرنے کے لیے مسجد اقصیٰ کی فضیلت سے متعلق حدیث وضع کردی؟ حالاں کہ زُھری کی ملاقات عبدالملک کے ساتھ حضرت عبداللہ بن زُبیر کے قتل کے ساتؔ سال بعد ہوئی۔"

یہ بات سن کر شاخت کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ملنے لگا۔ غصّہ اور بے چینی کے آثار چہرہ پر نمودار ہو گئے۔ میں نے یہ کہہ کر سلسلۂ کلام ختم کردیا کہ:۔

"جیساکہ آپ خود تسلیم کرتے ہیں اس قسم کی غلطیاں ماضی میں مستشرقین سے صادر ہوتی رہی ہیں۔ اور ایک مستشرق دوسرے سے ان کو علمی حقائق تصور کر کے نقل کرتا چلا آیا ہے۔ ہم ——— اہل اسلام ——— نے یہ کتب اس وقت مطالعہ کیں۔ جب ان کے لکھنے والے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر اب حالات کا دھارا بدل گیا ہے۔ اب ہم تمہیں تمہاری غلطیوں سے متنبہ کریں گے۔ تاکہ تم اپنی زندگی میں اس سے قبل ان کی اصلاح کرلو کہ انہیں علمی حقائق کی حیثیت حاصل ہو۔"

یہ مستشرق جامعہ قاھرہ میں مدّرس بھی رہ چکا ہے۔ اس نے "تاریخ فقہ اسلامی" کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے جو اس کے استاد و مرشد گولڈزیہر کی تصانیف کی طرح دروغ بافی اور تحریفات کا پلندہ ہے۔

البسلا یونیورسٹی میں میری ملاقات مشہور مستشرق نیبرگ کے ساتھ ہوئی۔ میرے خیال میں یہ وہی مستشرق ہے جس نے ابن الخیاط کی کتاب "الانتصار" ایڈٹ کی اور بہت عرصہ پہلے اس کو قاھرہ کے "بحنۃ التالیف والترجمۃ" نے شائع کیا ہے۔ نیبرگ کے ساتھ طویل

گفتگو ہوئی ۔موضوع گفتگو زیادہ تر مستشرقین کی تصانیف تھیں جو انہوں نے اسلام اور اس کی تاریخ سے متعلق تحریر کی ہیں ۔گولڈزیہر کا تذکرہ گفتگو کا مرکزی موضوع تھا۔ میں نے گولڈزیہر کی اغلاط اور حقائق کی تحریف و تغییر سے متعلق مثالیں بیان کیں ۔نیبرگ نے کہا :۔

"گولڈزیہر ماضی میں علمی شہرت کا حامل اور مستشرقین کا مرکز و محور تھا۔ عصر حاضر میں جب علوم اسلامیہ سے متعلق کتب بلاد عربیہ میں عام طور سے شائع ہو گئی ہیں اب گولڈزیہر کو وہ مرکزیت حاصل نہیں رہی۔ ہماری رائے میں گولڈزیہر کا زمانہ بیت گیا ۔"

یورپ کی سیاحت کے دوران مذکورہ صدر جامعات کے علاوہ مجھے بلجیم ڈنمارک ناروے ہالینڈ جرمنی سوئٹزرلینڈ اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں جانے اور وہاں کے مستشرقین سے ملنے کا اتفاق ہوا ۔جن معلومات کا تذکرہ میں نے ابھی کیا۔ اور مستشرقین سے متعلق جو باتیں میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کی ہیں ان سے مجھے مندرجہ ذیل حقائق معلوم ہوتے ہیں ۔

(۱) اکثر مستشرقین یا تو پادری ہوتے ہیں یا یہودی اور یا سامراجی ۔شاذونادر ہی کوئی مستشرق ہوگا جو ایسا نہ ہو۔

(۲) غیر سامراجی مغربی حکومتوں میں استشراق سامراجی حکومتوں کی نسبت کمزور تر ہوتا ہے ۔ مثلاً سکنڈے نیویا کی غیر سامراجی حکومت میں استشراق کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہے۔

(۳) غیر سامراجی حکومتوں میں بسنے والے معاصر مستشرقین گولڈزیہر کے عزائم خبیثہ سے آگاہ ہونیکے بعد اس سے بیزار ہو چکے ہیں ۔

(۴) استشراق زیادہ تر گرجے کی پیداوار ہے سامراجی حکومتوں میں استشراق گرجے اور وزارت خارجہ کے پہلو بہ پہلو چلتا ہے اور ان دونوں سے ہر قسم کا تعاون حاصل کرتا ہے ۔

(۵) سامراجی حکومتیں مثلاً برطانیہ و فرانس ہمیشہ اس بات کی حریص رہی ہیں کہ استشراق تقلیدی راہ پر گامزن رہے اور اسلام اہل اسلام کی شہرت کو خراب کرنے اور بگاڑنے کا فریضہ انجام دیتا رہے ۔مثال کے طور پر فرانس میں مشہور مستشرق بلاشیر اور ماسینیون موجودہ فرانسیسی

مستشرقین کے سرخیل ہیں۔ یہ دونوں وزارت خارجہ کے شعبہ امور عرب و اہل اسلام میں ملازم ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ انگلینڈ کی یونیورسٹیوں مثلاً لنڈن آکسفورڈ کیمبرج ایڈنبرا اور گلاسگو میں استشراق کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان یونیورسٹیوں میں یہود انگریز پادری اور سامراجی شعبۂ استشراق کی صدارت و سربراہی پر فائز ہیں۔ ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مغرب کے جو طلبہ علوم مشرقیہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا وہ عرب اور مسلم طلبہ جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے یہاں آتے ہیں صرف گولڈزیہر مارگولیتھ اور شاخت جیسے متعصب مستشرقین کی تصانیف کا مطالعہ کریں۔ وہ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ کوئی طالب علم کسی اسلامی موضوع پر داد تحقیق دے اور مستشرقین کے دجل و فریب کا راز طشت از بام کرے۔

ڈاکٹر امین مصری نے جو جامعہ ازہر کے کلیہ اصول الدین آرٹس کالج اور جامعہ قاہرہ کے ٹریننگ سکول کے فارغ التحصیل ہیں۔ مجھے ان مشکلات کی تفصیل بتائی جو اس مقالہ کے موضوع کے متعین کرنے میں پیش آئیں جسے وہ انگلینڈ کی یونیورسٹیوں سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے پیش کرنا چاہتے تھے۔ صاحب موصوف نے چار سال وہاں مقیم رہ کر فلسفہ پڑھا اور وہاں سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری وصول کی۔ جونہی انہیں علوم اسلامیہ کے نصاب کا پتہ چلا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مستشرقین کی جو کتب وہاں داخل درس ہیں ان میں اسلام پر حملے کیے گئے ہیں اور بہت سی غلط باتیں اسلام کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ خصوصاً مستشرق شاخت کی کتب تو دروغ بافی اور دسیسہ کاری کا پلندہ تھیں۔ احمد امین نے طے کیا کہ وہ شاخت کی تصانیف کے نقد و تبصرہ کو اپنے مقالہ کا موضوع قرار دیں گے۔

احمد امین نے پروفیسر انڈرسن سے اس مقالہ کے سلسلہ میں رہنمائی اور امداد کی درخواست کی۔ انڈرسن نے کہا کہ آپ اس موضوع پر تحقیق نہیں کر سکتے۔ جب لنڈن یونیورسٹی میں مایوسی کا سامنا ہوا تو وہ کیمبرج گئے اور وہاں کے اساتذۂ علوم اسلامیہ کی خدمت میں یہی درخواست پیش کی

مگر سب نے اس موضوع پر تحقیق کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ تاہم احمد امین کو اُمید تھی کہ آخرکار اجازت مل جائے گی۔ مگر ان کی یہ آرزو بر نہ آئی اور سب اساتذہ نے یک زبان ہو کر واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ یونیورسٹی شاخت کی کتب کو نقد و جرح کا موضوع بنانے کی اجازت ہرگز نہ دے گی۔ اگر آپ ڈگری لینا چاہتے ہیں تو کسی اور موضوع پر دادِ تحقیق دیں۔ تب احمد امین نے مجبوراً "محدثین کے نزدیک نقدِ حدیث کے پیمانے" کے موضوع کو اپنے مقالہ کا عنوان مقرر کیا اور اس طرح ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آج کل وہ دمشق یونیورسٹی کے شریعت کالج میں استاذ ہیں۔

یہ ہے مستشرقین کے رویّہ کی مختصر داستان جس کا تلخ تجربہ مجھے بذاتِ خود ہوا۔ خصوصاً گولڈزیہر اور اس کے افکار و آراء جن کا اظہار اس نے اسلام کے بارے میں کیا ہے۔ میں نے اس یہودی مستشرق کے زہریلے خیالات پر نقد و تبصرہ کے لیے اس کتاب میں ایک مستقل فصل تحریر کی ہے۔ جس میں تفصیلاً بتایا ہے کہ اس نے کس طرح حقائق کو بگاڑ کر اور مسخ کر کے تحریر کیا ہے۔ عبارتوں میں تحریف کی اور اپنے اغراض و مقاصد کے مطابق تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ حیرت ہے کہ اس نے جن مصادر و مآخذ کا سہارا لیا ہے۔ اہل علم کے نزدیک ان کو کچھ وقعت حاصل نہیں۔ وہ علمی مآخذ جو ہمارے محققین علماء و ائمہ کے نزدیک مسلّمہ حیثیت رکھتے تھے۔ وہ اُن کو تسلیم نہیں کرتا۔

یہ امر بے حد رنج و الم کا موجب ہے کہ اسلامی دیار و بلاد کے طلبہ جن کے یہاں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ انگریزی یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے کے لیے مجبور ہیں۔ جب طلبہ علوم اسلامیہ کی تحصیل کے لیے ان یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے ہیں تو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے اُنہیں جس تعلیمی نصاب کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے وہ یہی زہریلا مواد ہے۔ چونکہ وہ عربی زبان سے نابلد ہوتے ہیں اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ کا یہ پلندہ مسلم علماء و فقہاء کی تصانیف سے ماخوذ ہے۔ (حالانکہ ایسا نہیں ہے)۔

اس ناگزیر ضرورت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی عربی یونیورسٹیوں میں انگریزی میں ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کا ایک شعبہ کھول دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی ممالک کے طلبہ مغربی یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے کے بجائے دیارِ عربیہ کا رُخ کریں گے اور اس طرح متعصب سامراجی مستشرقین کے دجل وفریب سے محفوظ رہیں گے۔

ایک دوسرا نقصان یہ پہنچا کہ ہمارے بہت سے فاضل مصنفین مستشرقین ——— خصوصًا یہودی مستشرق گولڈزیہر ——— کے دام ہمرنگ زمین کا شکار ہو گئے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر احمد امین رحمہ اللہ ڈاکٹر علی حسن، عبدالقادر اور پروفیسر محمود ابوریہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر احمد امین کے بارے میں مَیں نے اس کتاب میں ایک مستقل فصل تحریر کر کے اس کی انہی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے گولڈزیہر کی اندھی تقلید کی وجہ سے وہ جن کا مرتکب ہوا۔

باقی رہے ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر جو میرے علم کی حد تک آج کل لندن میں مرکز ثقافی اسلامی کے ناظمِ اعلیٰ ہیں تو واقعہ بیان کرنے سے پہلے میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ وہ نہایت ملنسار بے حد خلیق ہیں اور جب حق ظاہر ہو جائے تو اس کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ جب ہم ۱۹۳۹ء میں قاہرہ کے شریعت کالج کے شعبہ تاریخِ فقہ واصول میں سال دوم وسوم میں زیرِ تعلیم تھے۔ تو علامہ مراغی نے جو ان دنوں شیخ الازہر تھے ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر کو ہمیں تاریخِ فقہ پڑھانے پر مامور کیا۔ وہ حال ہی میں جرمنی سے تعلیم حاصل کر کے لوٹے تھے۔ وہ کلیہ اصول الدین کے شعبۂ تاریخ کے فارغ التحصیل تھے اور جرمنی میں چار سال مقیم رہ کر فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آئے تھے۔

ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے اپنے پہلے لیکچر میں کہا کہ میں ایک ایسے جدید علمی طریقہ سے آپ کو تاریخ فقہ پڑھاؤں گا کہ ازھر میں کبھی اس طرح نہیں پڑھایا گیا مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ازھر میں چودہ ۱۴ سال تعلیم حاصل کرنے کے باوجود میں اسلام کو نہ سمجھ سکا۔ جب جرمنی پہنچا تو صحیح معنی میں اسلام کو سمجھنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ ہم ——— طلبہ ——— آپس میں

سرگوشیاں کرنے لگے کہ ممکن ہے استاذ محترم جرمنی سے اسلام کے بارے میں ایسے تحقیقی معلومات حاصل کرکے آئے ہوں جن کا ازھر میں کچھ پتا نہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے تاریخ حدیث پر لیکچر کا آغاز کیا۔ ان کے سامنے ایک ضخیم کتاب پڑی تھی اور وہ لفظ بلفظ اس کا ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ وہ کبیر الحجم کتاب یہودی مستشرق گولڈ زیہر کی " علوم اسلامیہ (ISLAMIC STUDIES) ہے۔ بہرکیف لیکچروں کا سلسلہ جاری رہا اور ہم اپنے علم کی حد تک ان سے بحث مباحثہ کرتے رہے۔ مگر ہمارے استاذ گولڈ زیہر کی کسی بات کی خلاف ورزی نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ لیکچرز کا سلسلہ امام زہری تک پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ امام زُھری نے امویوں کے لیے حدیثیں وضع کی تھیں۔ میں نے اس پر اعتراض کیا۔ مجھے اس قدر معلوم تھا کہ زُھری حدیث کے عظیم امام ہیں اور سب علماء ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ مگر صاحب موصوف نے تسلیم نہ کیا۔

میں نے کہا کہ گولڈ زیہر نے امام زُھری کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے آپ اس کا عربی میں ترجمہ کردیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دو ورق ترجمہ پر مشتمل اپنے ہاتھ سے تحریر کردیے۔ میں نے لائبریریوں میں جاکر امام زہری کی سیرت و کردار اور گولڈ زیہر کے اتہامات کی تحقیق کے سلسلہ میں کام شروع کردیا۔ میں نے جامعہ ازھر کی لائبریری اور دار الکتب المصریہ کی مطبوع و غیر مطبوع کوئی کتاب تراجم رواۃ سے متعلق نہ چھوڑی اور جو کچھ ان میں امام زُہری سے متعلق مرقوم تھا سب کچھ لکھ لیا۔ اس میں میرے تین ماہ صرف ہوئے۔ میں کالج سے فارغ ہوکر اواخر شب تک اس میں مشغول رہتا۔ جب میرے پاس صحیح معلومات جمع ہو گئے تو میں نے ڈاکٹر موصوف سے کہا کہ "گولڈ زیہر نے امام زُھری سے متعلق علمائے سلف کی عبارتوں میں تحریف کا ارتکاب کیا ہے"۔ انہوں نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ مستشرقین اور خصوصاً گولڈ زیہر بہت با انصاف علماء ہیں۔ اور وہ حقائق و نصوص کی تحریف کے مرتکب نہیں ہو سکتے"۔

میں نے قاہرہ میں سرائے عابدین کے پاس "جمعیۃ الھدایۃ الاسلامیہ" کے زیر اہتمام اس موضوع پر ایک لیکچر دینے کا ارادہ کیا۔ جمعیت کے اراکین نے جامعہ ازھر کے علماء و طلبہ کو

دعوت نامے بھیج دیے۔ چنانچہ اساتذہ و تلامذہ کی خاصی تعداد نے اجلاس میں شرکت کی۔ ہمارے استاذِ محترم ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر بھی تشریف فرما تھے۔ مجھے پہلے ہی اُمید تھی کہ وہ تشریف لا کر میرے لیکچر پر اظہار خیال فرمائیں گے۔ امام زہری کے بارے میں گولڈ زیہر نے جو کچھ کہا تھا میں نے کھل کر اس کی تردید کی۔ صاحب موصوف پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ میرا لیکچر سنتے رہے۔ میں نے یہ کہہ کر بات ختم کی کہ :۔

"یہ ہیں امام زُھری سے متعلق میرے اور ہمارے علماء کے افکار و آراء اگر استاذِ محترم میرے دلائل سن کر مطمئن نہ ہوئے ہوں۔ اور اس موضوع پر کچھ کہنا چاہتے ہوں تو تشریف لا کر اپنے ارشادات عالیہ سے نوازیں "

یہ سن کر ڈاکٹر صاحب موصوف کھڑے ہوئے اور بآواز بلند کہا جسے سب حاضرین نے سنا کہ :

"مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ زُہری کون ہے اس بات کا علم مجھے اب ہوا ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا میں اس پر کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہتا "

اتنے میں مجمع منتشر ہو گیا۔ ہم صدرِ مجلس پروفیسر سید خضر حسین رحمہ اللہ کے مکان پر آئے جو بعد میں شیخ الازھر کے منصب پر فائز ہوئے۔ استاذ محترم ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے سید خضر حسین کی موجودگی میں کہا :۔

"آپ نے مستشرقین کی بحثوں میں ایک نئی بحث کا دروازہ کھول دیا ہے۔ آپ مجھے اپنے لیکچر کا ایک نسخہ عنایت کریں میں اسے جرمنی کے علمی مجلات میں شائع کراؤں گا جن میں مستشرقین کے علمی و ادبی مقالات شائع ہوا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے مستشرقین کے حلقہ میں ایک تہلکہ مچ جائے گا "

میں نے استاذِ موصوف کا شکریہ ادا کیا اور سمجھا کہ یہ ایک طرح کی حوصلہ افزائی ہے جو اساتذہ اپنے تلامذہ کی کیا کرتے ہیں۔

ابھی چند روز ہی گزرنے پائے تھے کہ استاذ محترم نے مجھے اپنی قیام گاہ پر بلایا۔ ہم نے باتفاقِ رائے طے کیا کہ ہم دونوں موسم گرما میں فرصت کا وقت نکال کر گولڈ زیہر کی کتاب کا ترجمہ کریں اور اس کے مندرجات کی تردید کریں۔ مگر میرے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا کہ دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں برطانوی فوج متعین قاہرہ نے قید کر کے مجھے سات سال کے لیے وہاں سے جلاوطن کر دیا اسی زمانہ میں ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے اپنی کتاب "فقہِ اسلامی کی تاریخ پر ایک نظر" شائع کی میں نے یہ کتاب تین سال بعد اس وقت دیکھی جب مجھے جنگ عظیم ثانی کے وسط میں رہا کیا گیا۔ یہ ہے میرا واقعہ ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر کے ساتھ! اور یہی واقعہ اس کتاب کی تصنیف کا باعث اور محرک ہوا۔ عبرت پذیری کے نقطۂ خیال سے میں نے اس کے ذکر و بیان میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مستشرقین کے بارے میں اپنا موقف تبدیل کر لیا ہے اور وہ اپنی سابقہ رائے پر قائم نہیں رہے۔ خصوصاً گولڈ زیہر کے بارے میں ان کے زاویہ نگاہ کا بدل جانا تو ایک یقینی امر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اخلاص و دیانت کے اوصاف سے متصف ہیں۔ اور نصوص و عبارات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے خوگر نہیں ہیں۔

گولڈ زیہر اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام وغیرہ سے متاثر ہو کر تاریخ حدیث سے متعلق لکھنے والوں میں ابوریہ تیسرا شخص ہے۔ میں نے اس کتاب میں مستشرقین اور ڈاکٹر احمد امین کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے میرا خیال ہے کہ ابوریہ ایک بے تعصب طالبِ حق شخص کی طرح اس کا مطالعہ کرے گا اور ان بہت سے افکار و نظریات سے رجوع کرے گا جن کی اشاعت کے لیے اس نے اپنی کتاب "اضواء علی السنۃ المحمدیۃ" تصنیف کی تھی۔ ان شاء اللہ العزیز وہ ایسا ضرور کرے گا۔

مستشرقین کے بارے میں آخری بات:۔

جب سے صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ ختم ہوا جن میں مغربی عیسائیوں کو بدترین فوجی و سیاسی شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ اسلام اور اہل اسلام سے انتقام لینے کے مختلف طریقے سوچتے رہتے

اس ضمن میں انہوں نے جو پہلا حربہ استعمال کیا وہ اسلامی علوم کا نقد و مطالعہ تھا۔قرونِ وسطی کے مغربی عیسائیوں پر یہ خیال چھایا رہا۔جب عالم اسلامی فوجی سیاسی اقتصادی اور ثقافتی اعتبار سے تنزل و انحطاط کے مراحل سے گزر رہا تھا تو یورپ میں مسلمانوں پر سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے احساس نے کروٹ لی۔مغربی عیسائیوں نے یکے بعد دیگرے عالم اسلامی کے ایک ایک شہر کو ہوس استعمار کا نشانہ بنانے کا آغاز کیا۔ابھی عالم اسلامی کے اکثر دیار و بلاد پر یورپین عیسائیوں کو مکمل سیاسی غلبہ حاصل نہ ہوا تھا کہ اسلامی علوم اور تاریخ سے متعلق اہل یورپ کے نقد و جرح اور تنقید و تبصرہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔اس سے وہ اپنی ہوس استعمار کو اور شہ دینا چاہتے تھے گزشتہ صدی میں ان کی یہ دیرینہ آرزو بر آئی کہ انہوں نے دینی تاریخی اور تہذیبی یعنی تمام گوشوں سے عظیم اسلامی ورثہ کا مطالعہ کر لیا۔یہ فطری بات ہے کہ اس درس و مطالعہ میں وہ دو اسباب کی بناء پر حق و صدق سے ہمیشہ دُور رہے۔

پہلا سبب:

اس کا پہلا سبب یورپ کے فوجی و سیاسی لیڈروں کا مذہبی تعصب تھا۔جب پہلی جنگ عظیم میں اتحادیوں کی فوجیں بیت المقدس میں پہنچیں تو لارڈ "النبی" نے اپنا مشہور فقرہ کہا:

> "فوجی اعتبار سے گو اب صلیبی جنگیں ختم ہو گئیں مگر۔یورپین لوگ دین اسلام اور اس کی حضارت و تہذیب کے بارے میں تحریراً جن خیالات کا اظہار کریں گے اس میں تعصب کے اثرات ہمیشہ باقی رہیں گے"

تاہم وہ مغربی عُلماء و اُدَباء جن پر مذہب کی گرفت چنداں شدید نہیں۔دینِ اسلام اور رسولِ کریم سے بڑی حد تک انصاف کرتے ہیں۔ہم اس کی مثال میں گستاف لیبان کی مشہور کتاب "حضارۃ العرب" کا نام پیش کر سکتے ہیں۔دین اسلام کی تہذیب کے ساتھ عدل و انصاف برتنے کے سلسلہ میں یہ مغربی مصنفین کی عظیم تر تصنیف ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ گستاف لیبان ایک مادی فلسفی ہے اور کسی مذہب کا قائل نہیں۔مصنف موصوف کی لادینیت اور اسلامی تہذیب سے

انصاف کرنے کی بناء پر مغربی حلقوں میں اسے اس قدر و وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جس کا وہ اپنے علم و فضل کی بناء پر مستحق ہے۔ بلاشبہ وہ انیسویں[19] صدی کے عظیم ترین علماء اجتماع و تاریخ میں شمار ہوتا ہے۔ بایں ہمہ مغربی علماء خصوصاً فرانسیسی اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

دوسرا سبب:

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپ نے جو مادی اور علمی ترقی کی ہے اس کی بناء پر وہاں کے علماء و مورخین مغرور ہو گئے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مصری تہذیب کو نکال کر مغربی تہذیب سب تہذیبوں کی اصل و اساس کا حکم رکھتی ہے۔ ان کے خیال میں مغربی عقل بڑی دقیقہ رس اور منطقی انداز میں فہم و ادراک پر قادر ہے۔ ان کے علاوہ دیگر اقوام موٹی عقل کی مالک ہیں اور ان میں باریک بینی اور ژرف نگاہی کا وصف نہیں پایا جاتا۔ چنانچہ مشہور مستشرق گبؔ (GIBB) نے اپنی کتاب "وجہۃ الاسلام" میں انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ گبؔ دراصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ اہل اسلام جزئیات کے واسطہ سے امور و اشیاء کا ادراک کرتے ہیں براہِ راست کلیات کے ادراک سے قاصر ہیں۔ مغربی علماء نے یہ فیصلہ اس وقت صادر کیا جب اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مفتوحہ اقوام نہایت کمزور جہالت زدہ اور زندگی کے ہر گوشہ میں پسماندہ ہیں۔

جب اس صدی کے آغاز میں مغربی تہذیب کے ساتھ ہمارا ربط و تعلق استوار ہوا اور مغربی تہذیب نے ہمارے دیار و بلاد میں بال و پر کھولے تو علماء دین کے علاوہ مغربی تعلیم یافتہ طبقہ نے اپنے قدیم ورثہ کے سلسلہ میں بات چیت کرنے کے لیے کوئی راہ ہموار نہ پائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا علمی ورثہ قدیم اور غیر منظم کتابوں میں بکھرا پڑا تھا اور ان میں اس نظم و ترتیب کا فقدان تھا جو مغربی علماء کی تصانیف کا طرۂ امتیاز رہے۔ لے دے کر صرف مستشرقین کی کتب موجود تھیں جنہوں نے ہماری ثقافت و تہذیب کے مطالعہ اور لائبریریوں . . . . .

سے مصادر و مآخذ کی طلب و تلاش میں عمریں کھپا دی تھیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ بعض مستشرقین نے ہماری تہذیب کے کسی ایک پہلو پر کتاب تصنیف کرنے میں عمر عزیز کے بیس سال صرف کر دیے۔ اور ہمارے قدیم علماء کی تصانیف میں سے جو بھی مل سکیں ان سے استفادہ کیا۔

مغربی علماء میں جو پیہم محنت و کاوش پائی جاتی ہے اور جس کامل ذوق و شوق اور سامراجی و مذہبی دلچسپی کے ساتھ انہوں نے ہماری تہذیب و حضارت پر گفتگو کی تھی اس نے ہمارے مغرب زدہ طبقہ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ اور ان کے عقل و ذہن پر چھا گیا۔ خصوصاً جب کہ انہوں نے مستشرقین کے اسلوب و انداز کا ہماری قدیم علمی کتب کے اندازِ تحریر سے مقابلہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مستشرقین کی علمی وسعت کے فریب میں آ کر ان کی تصانیف سے بکثرت اقتباسات پیش کرنے لگے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ ان کی ہر بات حق و صدق ہے اور انہوں نے جہاں بھی اسلام کی مسلمہ حقیقتوں کی خلاف ورزی کی ہے اس میں ان کی رائے قرینِ صحت و صواب ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک علمی شاہراہ پر گامزن ہیں اور اس سے کبھی نہیں ہٹتے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی مصنفین کے افکار و آراء کو وثوق و اعتماد کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ افسوس ہے کہ ہمارا مغرب گزیدہ طبقہ ان اسلامی مصادر کی ورق گردانی نہ کر سکا جن سے مستشرقین نے یہ مواد اخذ کیا تھا۔ یا تو اس لیے کہ ہمارے مصادر سے استفادہ کرنے میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ جلد اپنے نتائج فکر کو منظر عام پر لانا چاہتے تھے اور مستشرقین کے یہاں سے ان کو تیار مواد مل گیا۔ اس کی تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ علمی و دینی حلقوں میں رائج علمی حقائق کے خلاف جدید معلومات پیش کر کے اپنی جدّت پسندی کا ثبوت دینا چاہتے تھے۔

ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہم خود اپنے عجز و ضعف کے معترف ہو گئے اور مغربی علماء کے مقابلہ میں ہمیں اپنے آپ پر اعتماد نہ رہا۔ ہم مستشرقین کو عزّ و وقار کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان

پر ہمیں کوئی بدگمانی نہ تھی۔ جب ہمارے دیار و بلاد میں سیاسی بیداری کا آغاز ہوا اور ہم نے اہلِ مغرب کے پنجۂ استبداد سے رہائی پائی تو ہمارے اندر حریت فکر و نظر کے احساس نے کروٹ لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اندر اپنی شخصیت اپنی تہذیب اور اپنے گراں قدر علمی ورثہ کا احساس پیدا ہوا۔ ہم اپنے سابقہ موقف پر شرمندہ تھے کہ ہم اپنے قیمتی ورثہ دینی عقائد اور شرعی احکام کے بارے میں غیروں پر اعتماد کرتے رہے۔ ہمارے شائستہ دینی و غیر دینی طبقہ میں یہ احساس اُبھرا چنانچہ ہم نے مستشرقین کے مذہبی و سامراجی اغراض و مقاصد کا کھوج لگانا شروع کر دیا۔ تاہنوز ہم طلب و تلاش کی راہ پر گامزن ہیں اور ہماری مساعی اس ضمن میں ہنوز تشنۂ تکمیل ہیں۔ خدا کی سنت بھی یہی ہے کہ ہر کام محنت و کاوش کا محتاج ہوتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہم ان شاء اللہ العزیز اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ اور ایک دن آئے گا جب ہمارے ابناء و احفاد اس بات پر اظہارِ حیرت کریں گے کہ ہم اپنی سادگی کی بناء پر کس حد تک مستشرقین کے دامِ فریب میں آگئے تھے۔

وہ دن دور نہیں جب ہم مغربی علماء کے علمی ورثہ کی جانب پلٹ کر دیکھیں گے اور ان کے مذہب ان کے علوم اور ان کی تہذیب و حضارت کا جائزہ لیں گے۔ پھر وہ دن بھی آئے گا جب ہمارے ابناء و احفاد نقد و جرح کے انہی معیاروں پر اہلِ مغرب کے علوم و عقائد کو جانچیں پرکھیں گے، جو انہوں نے خود وضع کیے تھے۔ اور ان کے علوم و عقائد انہی اعتراضات کی آماجگاہ قرار پائیں گے، جو انہوں نے ہمارے علوم و افکار پر عائد کیے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوں گے۔

میرا خیال ہے کہ اگر اہلِ اسلام علمی نقد و جرح کے انہی سانچوں اور پیمانوں سے مستشرقین کی کتبِ مقدسہ اور ان کے موروثی علوم و فنون کو جانچنے پرکھنے لگیں جن سے وہ قرآن و حدیث کو ناپتے ہیں تو ان کی مذہبی کتب اور آبائی علوم کا کیا وقار باقی رہے؟ بعینہٖ اسی طرح اگر آگے چل کر اہلِ اسلام تنقید و تبصرہ کے اسی معیار پر مغربی تہذیب اس کے فاتحین اور رؤساء و علماء کو

جا نچنے لگیں۔ جس پر بزعم خود مستشرقین ہماری تاریخ اور ہمارے ائمہ کو پرکھتے ہیں تو کیا ان کی تہذیب و تاریخ پر اس سے زیادہ شکوک و شبہات وارد نہ ہوں گے۔ جو اعتراضات وہ ہماری تہذیب پر وارد کرتے ہیں، کیا ان کی تہذیب کھوکھلی بوسیدہ و فرسودہ دکھائی نہ دے گی؟ اور کیا اس تہذیب کے حامل علماء ادباء اور سیاست دان اخلاق ضمیر اور عزّ و وقار سے عاری اور رعب و رنگ سے خالی دکھائی نہ دیں گے؟

میری یہ دیرینہ آرزو رہی ہے کہ ہم میں سے کچھ اہل علم وقلم فرصت کا وقت نکال کر مغربی تہذیب اور اس کے علماء کی تاریخ اسی اسلوبِ انداز میں لکھیں جس میں مستشرقین لکھنے کے خوگر ہیں۔ ان کے نقائص و معائب تلاش کریں۔ عبارتوں کے معانی و مطالب تبدیل کریں۔ محاسن کو نقائص کی شکل میں بدل دیں۔ اہل مغرب سے جو بھلائی صادر ہو اس کو مشکوک و مشتبہ بنا کر رکھ دیں۔ اگر ہم ایسا کر سکے تو اس تہذیب اور اہل تہذیب کی ایک ایسی گھناؤنی مضحکہ خیز اور رسوا کن تصویر سامنے آئے گی کہ دوسروں سے پہلے خود مستشرقین اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا ہم میں سے کوئی شخص یہ ذمّہ داری اپنے سر لینے کے لیے تیار ہے؟ آیا کوئی اہل قلم ایسا کر سکتا ہے کہ اہل مغرب کے وضع کردہ سانچوں اور پیمانوں کو استعمال کر کے اہلِ مغرب ان کے عقائد اور ان کی تعذیب کی ایک ایسی تصویر کھینچے جسے مستشرقین بذاتِ خود ملاحظہ کر سکیں۔ اگر یہ ممکن ہوا تو مستشرقین کو پتا چل جائے گا کہ جو طریقہ انہوں نے ہمارے مذہب و تاریخ کی "حقیقت" کی جان پہچان کے لیے گھڑا تھا "چاہ کندہ را چاہ درپیش" کے مصداق خود ان کے لیے وبالِ جان ثابت ہوا۔ کچھ بعید نہیں کہ اس طرح وہ تضلیل و تحریف کی دائمی عادت سے شرمسار ہوں۔

میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ وہ دَور رخصت ہوا جب ہم اپنے علمی و تاریخی مصادر کے بارے میں مستشرقین پر بھروسا کرتے تھے۔ حالاں کہ ان کے مصادر و مآخذ ہماری تصنیف کردہ کتب کے سوا اور کوئی نہیں۔ اگر قبل ازیں ہم ان مصادر سے بے خبر تھے تو اب وہ بات

نہیں رہی۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی پیشانیوں سے جہالت اور اسلامی مصادر کے فہم و ادراک میں عربی زبان سے بے گانہ لوگوں پر اعتماد کرنے کے داغ اور عار کو دھو ڈالیں یہ متعصب مستشرقین چاہتے ہیں کہ ہم اپنے دین و مذہب اور علماء کے بارے میں شکوک و شبہات اور بدگمانی میں مبتلا ہو جائیں۔ درحقیقت اس اہم کام کو انجام دینے کا وقت آگیا ہے۔ ہم نے مخطوطات کی گرد جھاڑ کر علم کے مدفون خزانوں کو نفع عام کے لیے اب شائع کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اب ہمارے اندر اپنی خودی اور شخصی آزادی کا احساس بھی بیدار ہوگیا ہے۔

بدقسمتی سے اگر اب بھی کوئی شخص مستشرقین کے فہم و ادراک کے بارے میں حسن ظن رکھتا اور ان کے علوم کو قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو وہ میری یہ کتاب یا اس قسم کی دیگر کتب مطالعہ کرے جن میں مستشرقین کے دجل و فریب کو طشت از بام کیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ العزیز اس پر حقیقتِ واقعی منکشف ہو جائے گی اور اسے معلوم ہو جائے گا کہ مستشرقین کیا کچھ کرنا چاہتے تھے اور ان کے عزائم قبیحہ کیا تھے؟

جب کہ ہم ایک طرف تحریف و تضلیل کے خوگر گولڈ زیہر جیسے مستشرقین کی مذمت کرتے ہیں تو دوسری جانب ان با انصاف مغربی علماء کی مدح و ستائش میں رطب اللسان ہیں جو ہماری نفیس ترین قدیم کتب شائع کرتے اور حقیقت کا کھوج لگانے میں پیہم محنت و کاوش سے کام لے رہے ہیں۔ علم پر کسی خاص قوم و جماعت کی اجارہ داری نہیں۔ اسلام پوری کائنات کا دین ہے اس لیے اس کا فہم و ادراک کسی خاص قوم تک محدود نہیں رہ سکتا۔ جو اسے سمجھنا چاہے بے شک سمجھے بشرطیکہ وہ علماء کی طرح صفاتِ اخلاص و انصاف سے متصف ہونا چاہتا ہو اور خواہش و تعصب سے دور ہو۔ اب میں مستشرقین کے تذکرہ کو علامہ گستاف لیبان کے قول پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ صاحب موصوف مستشرقین کی اسلام دشمنی اور اسلامی تہذیب کی عظمت و فضیلت سے انکار کے وجوہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"قاری یہ پوچھ سکتا ہے کہ جب مغربی علماء حریت فکر و نظر کو بے حد اہمیت دیتے ہیں تو

وہ اسلامی تہذیب کے مغرب پراثر انداز ہونے سے انکار کیوں کرتے ہیں؟ یہ سوال میں اپنے قلب وضمیر سے بھی دریافت کرتا ہوں۔ میرے خیال میں اس کا ایک ہی جواب ہے۔ اور وہ یہ کہ جو فکری آزادی ہمیں حاصل ہوئی ہے وہ صرف ظاہری حد تک ہے اور بہت سی باتوں میں ہم اب تک بدستور غلام چلے آتے ہیں۔ ہمارے خیال میں آدمی دو شخصیتوں کا حامل ہوتا ہے:۔

(۱) عصری شخصیت جو خصوصی مطالعہ اور ایک خاص ماحول وتہذیب کی پیداوار ہوتی ہے۔

(۲) قدیم شخصیت جو طویل ماضی کے زیر اثر آباد و اجداد سے متاثر فہم وشعور سے عاری اور جامد ہوتی ہے۔

دوسری قسم کی شخصیت لوگوں کے عقائد و افکار کو اختلاف زمان و مقام کے باوجود بحال رکھتی اور ان کے افکار و آراء کو ان پر ٹھونستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بظاہر یہ نظریات آزادانہ اور قابل احترام دکھائی دیتے ہیں"۔

حق بات یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو کئی صدیوں تک یورپ کے تمام دشمنوں میں اس کے حق میں زیادہ مہیب اور خطرناک بنے رہے۔ جب اہل اسلام ہمیں اپنے اسلحہ سے خوف زدہ نہ کرتے جیسا کہ شارل مارٹل اور صلیبی جنگوں کے زمانہ میں ہوا تو اپنی تہذیب وثقافت کی فوقیت کے بل بوتے پر ہم کو رسوا کرتے۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد بھی اہل اسلام ہمیں ڈراتے دھمکاتے رہے۔ ہم نے ان کے اثر و اقتدار سے ابھی رہائی حاصل کی ہے۔ دین اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہمارے توہمات میں کئی صدیوں سے اضافہ ہوتا جارہا تھا اور اب وہ ہمارے مزاج کا ایک جزو بن گئے تھے۔ ہماری رگ رگ میں اہل اسلام کی دشمنی اس طرح رچ بس گئی تھی جس طرح نصاریٰ کے خلاف یہود کی عداوت پوشیدہ بھی تھی اور گہری بھی۔ مسلمانوں کے خلاف جو توہمات ہمیں ورثہ میں ملے تھے، جب ہم ان پر اس وہم کا اضافہ

کریں جو ہماری عداوت پسند مدرسی تہذیب کے طفیل دن بدن ترقی پذیر رہا تو بڑی آسانی سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ہم کس لیے عربوں کے یورپین تہذیب پر اثر انداز ہونے سے انکار کرتے رہے۔ ہماری مدرسی تہذیب نے ہمیں یہ سبق سکھایا تھا کہ ماضی میں صرف یونانی اور لاطینی تمام علوم و آداب کا مرکز و محور تھے۔ مغرب کے بعض فضلاء اس بات کو اپنے لیے باعث عار و ننگ سمجھتے ہیں کہ کبھی یورپ قعر ضلالت و جہالت سے نکلنے میں ان "کفلاء" (اہل اسلام) کا مرہون منت ہے۔ (مغربی لوگ مسلمانوں کو کافر کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے) بلاشبہ اس کے عار ہونے میں کیا شک ہے۔ ایسی بات آسانی سے کب تسلیم کی جا سکتی ہے۔

پھر آگے چل کر "لیبان" نے موروثی توہمات کے تہذیبی اوہام کے ساتھ مل جانے کی ایک مثال مشہور مستشرق موسیو رینان کے اس خطبہ سے پیش کی ہے، جو اس نے ساربون یونیورسٹی میں "اسلام" کے موضوع پر دیا تھا۔ (امام محمد عبدہٗ نے اپنے زمانہ میں اس خطبہ کی پرزور تردید کی تھی)، رینان نے ایک طرف تو اس بات کا اعتراف کیا کہ چھ صدیوں تک عرب علوم و فنون پر چھائے رہے اور دوسری جانب یہ بھی کہا کہ مسلمانوں نے جو ممالک فتح کیے وہاں علم و فلسفہ کا نام و نشان نہ رہا۔ اس کے خطبہ میں ایسے متناقض اقوال کی بھرمار ہے۔ رینان نے اپنے خطبہ کو ان الفاظ پر ختم کیا کہ :۔

"میں جب بھی کسی اسلامی ملک میں داخل ہوا مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ اور میں اپنے مسلم نہ ہونے پر اظہار حسرت و ندامت کرنے لگا" (گستاف لیبان کا بیان ختم ہوا)
(حضارۃ العرب گستاف لیبان۔ عربی ترجمہ پروفیسر عادل زعیتر مرحوم۔ ص ۶۸۸، ۶۹۰ طبع ثانی)۔

۷۔ ادبی حکایات :

ابوریہ نے اپنے علمی دعویٰ کے اثبات میں ادب عربی کی کتابوں سے جو کہانیاں نقل کی ہیں وہ موجب حیرت و استعجاب ہیں۔ علمی تحقیق کے میدان میں ایسی کہانیوں کو پیش کرنا بڑا

کارنامہ ہے۔ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ صادق القول ائمہ حدیث و فقہ کے بیان کردہ جو علمی حقائق ابوریّہ کو پسند نہیں وہ انہیں رد کر دیتا ہے اور پھر ایسی کتب کی جانب رخ کرتا ہے جو سرے سے تاریخ رجال اور ان کے سیر و سوانح بیان کرنے کے لیے تصنیف ہی نہیں کی گئیں بلکہ تفریحی مجالس کو گرمانے کے لیے ان میں عجیب و غریب کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ مقام حیرت ہے کہ ابوریّہ ان کہانیوں کو "ابطالِ حدیث و سنّت" جیسے عظیم موضوع پر دلیل و شاہد کے طور پر پیش کرتا ہے۔

کیا علمی تحقیق اسی کا نام ہے؟ البتہ اسے گولڈزیہر کے طریق کار کی پیروی کہہ سکتے ہیں جو مؤطا امام مالک میں ذکر کردہ روایت کی تکذیب کر کے "حیاۃ الحیوان للدمیری" کے بیان کو ترجیح دیتا ہے۔ ہمارے علماء ——— جو ابوریہ کی نام نہاد تحقیق کے خوگر نہیں ہیں ——— کے نزدیک یہ امر مسلم ہے، کہ علم حدیث کو کتب فقہ سے اخذ نہیں کیا جا سکتا، اور علم تفسیر کتب لغت کا مرہونِ منت نہیں ہے" اس لیے کہ ہر علم کے جداگانہ مصادر و مآخذ ہوتے ہیں، جہاں سے اس کے حقائق و مسائل کو اخذ کیا جاتا ہے۔

جدید علم تاریخ میں یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ تاریخی حقائق کو معتبر و موثوق مصادر ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ جو شخص ناقابلِ اعتماد مآخذ سے تاریخی واقعات ذکر کرے گا۔ اس کی تحریر کسی وقعت و اہمیت کی حامل نہ ہو گی اور نہ ہی ایسے شخص کو جماعتِ علماء میں کوئی قدر و منزلت حاصل ہو گی۔

اب ابوریّہ کے بارے میں ہم کیا کہیں؟ مقام حیرت ہے کہ ابوریہ ایک عظیم اہمیت کے حامل موضوع پر قلم اٹھاتا ہے۔ وہ ایک ایسے شخص (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) کو ناقابلِ اعتماد ٹھہراتا ہے جس کو لوگ چودہ صدیوں سے صادق القول مانتے اور عہد صحابہ سے لے کر عصرِ حاضر تک کروڑوں انسان اس کو قدر و وقعت اور ادب و احترام کی نگاہ سے دیکھتے چلے آئے ہیں۔ حیرت بالائے حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس عظیم جسارت میں ابوریّہ نے ثعالبی کی ثمار القلوب مقامات بدیع الزمان ہمدانی اور ابونعیم کی الحلیۃ کی ضعیف اسانید پر اعتماد کیا ہے۔ حالاں کہ

ابو نعیم نے یہ کتاب صوفیاء اور زھاد کے لیے لکھی تھی اور اس میں صحیح و غیر صحیح ہر قسم کا مواد موجود ہے۔ مزید بر آں مصنف نے کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کتاب تاریخ رجال میں مرکز و محور کی حیثیت رکھتی ہے جو شخص بھی اس کتاب کی اسانید سے واقف ہے وہ میری بات کی تائید کرے گا۔

ہم ابوریہ کے بارے میں کیا کہیں ؛ معاملہ دو حال سے خالی نہیں :-

(۱) یا تو ابوریہ اس امر سے آگاہ ہے کہ یہ غیر محققانہ طرز و انداز ہے۔ اس صورت میں وہ غیر محققین کے زُمرہ میں شمار ہوگا۔

(۲) یا اس سے واقف ہی نہیں۔ اندریں صورت وہ جاہل ہے۔

اب ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی تحقیق کس کام کی ہوگی۔ اور پھر تحقیق بھی ایسی نرالی اور انوکھی جو ہزار سال میں کوئی مسلم انجام نہ دے سکا۔

یہ ہے ان مصادر کی حقیقت جن سے ابوریہ نے ایسی رائے کو جنم دیا، جو جمہور محدثین و علماء کے خلاف ہے اس کے علاوہ جن معتبر مصادر کا ذکر اس نے اپنے مآخذ کی فہرست میں کیا ہے۔ تو ہم قبل ازیں بتا چکے ہیں کہ ابوریہ اصل عبارتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ عبارتوں کو بے محل استعمال کرتا ہے اور ان کو غلط معانی پہناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امور کسی کے لیے بھی قابل مدح و ستائش نہیں اور نہ ان کے قائل و فاعل کو بنظر استحسان دیکھا جا سکتا ہے۔ اس پر کم از کم تنقید یہ کی جا سکتی ہے کہ اس نے "تدلیس" (کسی کو فریب دینا) سے کام لیا ہے۔ اور جس شخص سے "تدلیس" کا فعل ایک مرتبہ بھی صادر ہوتا ہے۔ وہ ناقابل اعتماد ٹھہرتا ہے یہ بات امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے۔

۸۔ ابوریہ کی تصنیف کے مندرجات کا خلاصہ :

ابوریہ نے بحث و تمحیص سے جو نتائج نکالے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) حدیث نبوی عہد رسالت میں مُدوَّن نہیں ہوئی تھی۔ جمہور علماء قدیم ہوں یا جدید سب

اسی کے قائل ہیں۔ عدم تدوین کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے روک دیا تھا۔

(۲) ابوریہ کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ عہد رسالت میں حدیث کی عدم تدوین کے باعث مسلمانوں میں فرقہ بازی کا ظہور و شیوع ہوا۔ مزید براں اس سے وضع حدیث اور دروغ گوئی کو شہ ملی جس سے اصلی سنت ضائع ہو گئی اور اس طرح ملت کو عظیم نقصان پہنچا۔ گویا ابوریہ کے نزدیک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کتابت حدیث سے منع کر کے بذات خود اُمت کو نقصان پہنچانے کا موجب بنے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ ذکاوت و فطانت ہوتی جس کا مظاہرہ ابوریہ نے اپنی "تحقیقات نادرہ" میں کیا ہے تو ملت اس عظیم نقصان سے محفوظ رہتی (نعوذ باللہ من ھذہ الخرافات) مجھے نہیں معلوم کہ ابوریہ اس قبیح نتیجہ کو پسند کرے گا؟ اور میرا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول کریمؐ اور روز قیامت پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص اس حد تک فریب خوردہ نہ ہو گا۔ ہم ابوریہ کی جانب سے یہ معذرت پیش کرتے ہیں کہ اس کی تحقیقات کے نتیجہ میں جو بات لازم آرہی ہے وہ اس کا ذاتی نظریہ نہیں ہے۔ اس ضمن میں ہمارے علماء کا قول بھی یہی ہے کہ "لازم المذہب لیس بمذہب"۔

(۳) ابوریہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سنت صحیحہ ——— اگرچہ وہ صرف ابوریہ کے معیار کے مطابق صحیح ہو ——— عمومی دین کی حیثیت نہیں رکھتی جس کی پیروی سب مسلمانوں پر لازم ہو۔ بخلاف ازیں عمومی دین یا تو وہ بات ہے جو قرآن میں مذکور ہو۔ اس لیے کہ قرآن نقل متواتر سے ثابت ہے۔ اور یا عملی سنت۔ کیونکہ وہ عمل کی بناء پر متواتر ٹھہرتی ہے۔ جہاں تک قولی سنت کا تعلق ہے اس پر عمل واجب نہیں۔ جو شخص جس سنت کو چاہے اخذ کرے اور جسے چاہے ترک کرے۔ اس کا چھوڑنا کفر کا موجب نہیں۔ ظاہر ہے کہ جو چیز ایسی ہو ہر مسلم اس پر عمل بھی کر سکتا ہے۔ اور اسے چھوڑ بھی

سکتا ہے۔

ابوریّہ کی یہ رائے کتاب اللہ اور پوری اسلامی شریعت کی روح کے منافی ہے۔ مزید برآں یہ عقیدہ و شریعت کے بارے میں انارکی اور بغاوت کی دعوت پر مشتمل ہے۔ جو شخص اپنی ذات، اپنی شریعت اور دین کے اجتماعی اصول و ضوابط کو قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہو کبھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔

ابوریّہ نے امام محمد عبدہٗ اور ان کے تلمیذ سید رشید رضا رحمہما اللہ کے کلام سے جو استدلال کیا ہے۔ اس کے بارے میں ہماری ایک ذاتی رائے ہے کسی دوسرے کو ہم اس کا پابند نہیں بنانا چاہتے اور اس سے ان کی قدر و منزلت میں بھی کوئی فرق نہیں آتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیخ محمد عبدہٗ عصر حاضر کے عظیم دینی پیشوا، اصلاح کے علم بردار فیلسوف الاسلام دین اسلام کی لسان ناطق ایک مایۂ ناز مفکر اور دفاع اسلام کے لیے ایک زبردست ہتھیار تھے آپ نے فریب خوردہ مغربی علماء اور سامراجیوں کے حملوں سے دین اسلام کے دفاع کا فریضہ انجام دیا۔ عالم اسلامی کئی صدیوں سے جمود کا شکار اور زنگ آلود ہو چکا تھا۔ آپ نے اس کا زنگ دُور کر کے اسے تابانی و درخشانی بخشی۔

شیخ عبدہٗ حدیث میں قلیل البضاعت تھے:

مگر بایں ہمہ شیخ محمد عبدہٗ حدیث نبوی میں کم مایہ تھے۔ اسلام کا دفاع کرنے میں وہ زیادہ تر عقلی و منطقی براہین و دلائل پر اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث نبوی اس کے رُواۃ و رجال، عمل بالحدیث اور اس پر اعتماد کرنے کے بارے میں ان سے ایسے افکار و آراء کا ظہور ہوا جن کو ابوریّہ جیسے شخص نے مسلمانوں کے سامنے دلیل و برہان کی حیثیت سے پیش کیا۔

سید رشید رضا رحمہ اللہ ابتداءً اپنے استاذ محترم شیخ محمد عبدہٗ کے نظریات سے متفق اور ان ہی کی طرح حدیث نبوی اور اس سے متعلق علوم میں قلیل البضاعت تھے۔ شیخ محمد عبدہٗ کی وفات کے بعد جب رشید رضا نے مسلمانوں کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا، حدیث و فقہ کے میدانوں میں

جولانی کے جوہر دکھانے شروع کیے اور اس طرح عالم اسلامی میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے مسائل کی عقدہ کشائی کرنے لگے۔ تو حدیث نبوی اور اس کے متعلقہ علوم میں ماہرانہ بصیرت حاصل کی۔ عمر کے آخری دور میں تو وہ حدیث و سنت کے علم بردار بن گئے تھے اور اس ضمن میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ جب کہ جامعہ ازہر کے علماء حدیث اور اس سے متعلق علوم میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے اور فقہی کلامی اور لغوی مباحث و مذاہب ان کی تمام تر توجہات کا مرکز و محور بن کر رہ گئے تھے۔

زندگی کے آخری دور میں سید رشید رضا رحمتِ ربانی کا خصوصی مورد بن گئے تھے۔ میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہو کر ان کے علم و فہم اور حدیث نبوی کا دفاع کرنے کے سلسلہ میں ان سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ بنابریں اس امر کی شہادت دینا میرا دینی و اخلاقی فریضہ ہے کہ وہ حدیث نبوی سے اخذ و استفادہ کرنے میں بڑی شدت سے کام لیتے اور جو بھی فقہی مذہب حدیث کے خلاف ہوتا اس کی تردید کرتے تھے۔ میں کامل وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جب ابوریہ نے یہ کتاب شائع کی اگر اس وقت سید موصوف بقید حیات ہوتے تو بڑی سختی سے اس کے اکثر مقامات کی تردید کرتے۔

(۴) - ابوریہ کا خیال ہے کہ جن ائمہ اسلام اور فقہاء نے حدیث نبوی کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا وہ احادیث صحیحہ و غیر صحیحہ کے مابین فرق و امتیاز کی اہلیت و صلاحیت سے بے بہرہ تھے۔ البتہ متکلمین معتزلہ اور ادباء کو یہ حق حاصل ہے۔ ابوریہ کی اس رائے کو نقل کر دینا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حدیث نبوی کے بارے میں کس قدر غیرت و حمیت رکھتے اور خدا کے دین میں وہ کس حد تک متقی اور پاکباز واقع ہوئے تھے۔

(۵) - صحابہ کرام تابعین و فقہاء اسلام اور محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ پوری تیرہ[۱۳] صدیوں تک ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کا صحیح مقام متعین نہ کر سکے۔ اور ان کو پتہ نہ چلا کہ وہ کس قدر حقیر آدمی (نعوذ باللہ من ذالک) ہے کہ امویوں کو خوش کرنے کے لیے دروغ گوئی تک سے اجتناب

نہیں کرتا اور یہ حقیقت اس دور میں صرف ابوریہ پر کھلی۔ اہل اسلام کی بدبختی و بدنصیبی اس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ وہ تیرہ صدیوں تک ابوریہ کی مبنی بر بصیرت و فراست رائے صائب سے محروم رہے۔ دین اسلام کی اس محرومی پر جس قدر رویا جائے کم ہے کہ اتنے عرصہ میں اس کو ایسے کم عقل اور غفلت شعار علماء و ائمہ ملے جو اپنی تصانیف اور فقہ و اجتہاد کے سلسلہ میں ایک ایسے حقیر پیٹو اور دروغ باف شخص پر بھروسہ کرتے رہے جس کا واحد نصب العین شکم سیری اور مال و متاع جمع کرنا تھا اور بس۔

(۶)۔ ابوریہ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ چونکہ حدیثوں میں موضوع روایات شامل ہو گئی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ثقہ راویوں نے اپنے الفاظ بھی احادیث کے ساتھ گڈمڈ کر دیے ہیں۔ علاوہ ازیں احادیث میں شذوذ واضطراب اور روایت بالمعنیٰ کی بھرمار ہے۔ اس لیے ان کتب حدیث کی مرویات بھی قابل اعتماد نہیں رہیں، جو التزام صحت کے ساتھ تالیف کی گئی ہیں۔ حدیث اور اس کے متعلقات سے نابلد جو شخص بھی ابوریہ کی کتاب کا مطالعہ کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔ قدیم و جدید متعصب مستشرقین بھی اسی نصب العین کے پیش نظر مشغول جدّوجہد رہے ہیں۔ حیرانی ہے کہ ان تخریبی مساعی کے باوصف ابوریّہ کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ سنّت قولی اس کے تحفظ و دفاع اور رضائے الٰہی کے لیے یہ کتاب تصنیف کر رہا ہے، مجھے آج تک اس بات کا علم نہ تھا کہ کسی چیز کو مشکوک و مشتبہ ثابت کر کے بھی اس کا تحفّظ و دفاع کیا جا سکتا ہے اور اعداء دین اور اس کے سلسلہ میں تخریبی مساعی انجام دینے والوں کے ساتھ مل کر بھی دین کی خدمت انجام دی جا سکتی ہے ——— اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

(۷) ۔ جن احادیث اور آثار صحیحہ میں ایسی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ جو یہود و نصاریٰ کی موجودہ کتب میں پائی جاتی ہیں وہ ابوریہ کے نزدیک مشکوک ہیں اور ان میں یہود و نصاریٰ کا ہاتھ کار فرما رہا ہے۔ اسی طرح احادیث و آثار میں تورات سے جو بیانات منقول ہیں اور

اب اس میں موجود نہیں وہ احادیث کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہیں - یہ ایک ایسا متناقض موقف ہے جسے کوئی محقق عالم اختیار نہیں کرسکتا ۔

خداوند تبارک وتعالیٰ نے تورات وانجیل اور دیگر آسمانی کتب کے بارے میں دو حقیقتیں صراحتہً بیان کی ہیں ۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ان کو انبیاء پر نازل کیا اور ان کے اصول وضوابط جملہ انبیاء کی شریعتوں میں متحد ہیں ۔

(۲) کتبِ مقدسہ کے حاملین نے ان میں تحریف کا ارتکاب کیا ۔ قرآن میں ارشاد ہے :

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهِ   وہ کلمات کو ان کی جگہ سے تبدیل کر دیتے ہیں ۔

ایک مومن عالم کا طریق کار یہ ہے کہ جب اس کے سامنے کوئی صحیح السند حدیث پیش کی جائے تو وہ اسے کتاب اللہ پر پرکھ کر دیکھے ۔ اگر وہ حدیث اس سے ہم آہنگ ہو تو اسے تسلیم کرے اور اگر اس کے خلاف ہو ——— حالانکہ ایک صحیح حدیث بھی ایسی نہیں جو خلافِ قرآن ہو ——— تو وہ اُسے ردّ کرسکتا ہے خواہ اس کے رُواۃ و رجال کیسے بھی ہوں ۔

ہمارے سب علماء ، از عہدِ صحابہؓ تا عہدِ حاضر اسی ڈگر پر گامزن رہے ۔ وہ اہل کتاب سے ہر ایسی بات اخذ کرتے جو قرآن کریم حدیث نبوی اور دینی قواعد سے متصادم نہ ہوتی ۔ اور جو ان کے خلاف ہوتی اسے ردّ کر دیتے ۔

مگر پروفیسر ابوریہ نے ایک نرالا ضابطہ یہ وضع کیا ہے کہ حدیث میں جو بات بھی تورات و انجیل سے منقول ہے وہ یہود و نصاریٰ کی ساختہ پرداختہ ہے ۔ اسی اساس پر وہ ان روایات کی تکذیب کرتا ہے جو حضرت ابوہریرہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم حضرت کعبؓ سے نقل کرتے ہیں کہ تورات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی بتصریح مذکور تھا ۔ ابوریہ اس کی نقل و روایت میں ان صحابہ کو متہم کرتا ہے جو عہدِ رسالت اور بعد ازاں یہود میں سے مشرف باسلام

ہوئے تھے۔ معلوم نہیں ابوریہ جیسے "محقق" نے ایسی بودی بات کس طرح کہہ دی حالانکہ قرآن کریم کی بکثرت آیات میں اس کی صراحت موجود ہے۔

قرآن میں فرمایا:۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ	وہ لوگ جو اس امی نبی کی پیروی کرتے ہیں۔
يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي	جس کا نام وہ تورات و انجیل میں لکھا ہوا
التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (الاعراف ۱۵۷)	پاتے ہیں۔

نیز فرمایا:۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل
اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا	میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں جو میرے
بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا	سامنے جو تورات موجود ہے اس کی تصدیق
بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ	کرتا اور ایک رسول کی بشارت دیتا ہوں
اَحْمَدُ۔ (الصف۔۶)	جو میرے بعد آئیں گے اور جن کا نام احمد ہوگا۔

یہ ہیں قرآن کریم کی آیات جن سے صراحتہً یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی تورات وانجیل میں تبصریح مذکور تھا۔ بعض جگہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا ذکر تشبیہ و تمثیل کے طور پر بھی آیا تھا۔ اب اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟ کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں وہ بہ روایت بیان کریں کہ آپ یا آپ کے صحابہؓ کرام کے اوصاف تورات میں مذکور ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ انوکھی ہے نہ عقل سے ٹکراتی ہے اور اگر صحابہ سے مروی و منقول کوئی بات اس تورات و انجیل میں موجود نہ ہو جو عصر حاضر میں یہود و نصاریٰ کے یہاں رائج اور موجود ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ روایات جھوٹی ہیں؟ یا اس کی اصلی وجہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی کہ یہود و نصاریٰ نے کتب مقدسہ کو تبدیل کر دیا ہے؟

بہر نوع معاملہ دو حال سے خالی نہیں۔

(۱) ابوریہ یا تو تورات وانجیل کو صحیح قرار دیتے ہوئے ان واقعات کو رد کر دے گا جو صحابہ سے منقول ہیں مگر اب ان دونوں کتب میں موجود نہیں۔

(۲) اور یا یہ تسلیم کرے گا کہ تورات وانجیل محرّف ہو چکی ہیں اور صحابہ سے منقول روایات حامل صدق وصواب ہیں اگرچہ تورات وانجیل میں موجود نہیں۔

اگر ابوریہ یہ بات کہے کہ جو روایات تورات وانجیل کے ساتھ ہم آہنگ و یک رنگ ہیں وہ یہود و نصاریٰ کی وضع کردہ ہیں۔ اور جن کا سرے سے تورات وانجیل میں وجود ہی نہیں وہ جھوٹی ہیں۔ تو یہ صریح تناقض اتباع نفس اور محض ظن وتخمین ہے نہ کہ ابوریہ کی نام نہاد "تحقیق"۔

(۸) ۔ابوریہ محدثین سلف پر زبان طعن دراز کرتا ہے کہ وہ نقدِ حدیث کے سانچوں اور پیمانوں سے ناآشنا تھے۔ اور خود یہ مقیاس و معیار وضع کرتا ہے کہ جو حدیث عقل کے ترازو میں پوری اُترے اُسے لے لیا جائے۔ اور جو ایسی نہ ہو اسے ترک کر دیا جائے۔

ابوریہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حدیث نبوی کو عقل کے معیار پر پرکھنے کی حکایت بیہودہ بھی ہے اور فرسودہ بھی۔ یہ دراصل معتزلہ کی عقلیت پسندی کی اُپج ہے جو ہر اس حدیث کو ترک کر دیا کرتے تھے جو انہیں عقلاً ناپسند ہوا کرتی تھی۔ دورِ حاضر میں مستشرقین بھی یہی رٹ لگا رہے ہیں پروفیسر احمد امین مصری (پاکستان میں فضل الرحمان و پرویز) اور اس کے ہمنوا انہی کے خوان کرم کے زلّہ ربا ہیں۔ ابوریہ چند احادیث ذکر کرتا ہے جو اس کی رائے میں خلاف عقل ہیں۔ ہم نے اس کتاب کی ایک جداگانہ فصل میں ابوریہ کی پیش کردہ احادیث کا جواب دیا ہے۔

آج ابوریہ بھی معتزلہ کے پس خوردہ کو چبا رہا ہے اور عقل کو حدیث نبوی کے رد و قبول کے لیے معیار ٹھہراتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ہمارے علماء سلف عقل کو معیار و مقیاس ٹھہراتے تو سنّت شکوک و شبہات کی آماجگاہ نہ بنتی۔

ابوریہ کا یہ پرچار ثقافت زدہ و مغرب گزیدہ طبقہ کے یہاں کس قدر بھی وقعت و اہمیت کا حامل ہو مگر عند التحقیق شرعی علوم میں یہ پرکاہ کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ قبول احادیث میں ملت انارکی کا شکار ہو جائے اور حسبِ خواہش جس حدیث کو چاہے قبول کرے اور جسے چاہے رد کرے۔

اب سوال یہ ہے کہ ابوریہ کی پسندیدہ عقل کیا ہے؟ اس کے حدود و قیود کیا ہیں اور اس پر متحد ہونے کا طرز و انداز کیا ہے؟ اگر عقلِ صریح سے ابوریہ کی مراد وہ بدیہی امور ہیں جن کو عقل قبول کرتی ہے تو حدیث کی تاریخ میں قبل ازیں اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ نقدِ حدیث کے ماہرین نے موضوع حدیث کی جان پہچان کے لیے جو علامات مقرر کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ حدیث عقلِ صریح دین سے متعلق قطعی امور یا تاریخ و طب وغیرہ کے خلاف ہو۔ اس اساس پر محدثین نے ہزاروں احادیث کو رد کر کے ان کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔

اور اگر ابوریہ کا مقصد یہ ہے کہ جس حدیث کو عقل نادر نرالی اور انوکھی تصور کرے اسے رد کر دینا چاہیے۔ تو یاد رہے کہ عقل کا کسی بات کو انوکھا سمجھنا ایک اضافی امر ہے جو تہذیب و ثقافت اور ماحول کے تابع ہوتا ہے اور اس کے لیے نہ کوئی قاعدہ ہے نہ مقیاس و معیار۔ بسا اوقات ایک شخص ایک چیز کو حیرت ناک اور تعجب خیز سمجھتا ہے۔ دوسرے کے نزدیک وہی چیز فطرت و طبیعت سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ مثلاً جب ہمارے دیار و بلاد کے رہنے والوں نے موٹر کے بارے میں سنا تو اس پر اظہارِ حیرت کیا کہ وہ گھوڑوں کے بغیر کیوں کر چلتی ہے؟ حالانکہ مغرب میں لوگ اس سے مانوس ہو چکے تھے۔ جب بدویوں نے پہلے پہل ریڈیو کے بارے میں سنا تو وہ اسے کذب پر محمول کرنے لگے۔ جب پہلی مرتبہ بچشم خود ریڈیو کو دیکھا تو سمجھا کہ اس میں شیطان بول رہا ہے۔

دین اسلام میں یہ امر طے شدہ ہے کہ اس میں کوئی بات ایسی نہیں جسے عقل محال سمجھ کر پھینک دیتی ہو۔ البتہ دیگر آسمانی مذاہب کی طرح اسلام میں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں عقل جن کے تصور سے قاصر

ہے۔ مثلاً نبوت، حشر و نشر اور جنت و جہنم۔ ایک مسلم کی شان یہ ہے کہ جب کوئی بات سنے اگر عقل اُسے رد کرتی ہو تو اسے تسلیم نہ کرے۔ اور جس کو عقل نادر اور انوکھا سمجھتی ہو۔ اس میں جلد بازی سے کام نہ لے بلکہ اس کے صادق یا کاذب ہونے کو یقینی طور پر معلوم کرنے کی کوشش کرے

علم و یقین کے ذرائع :

علم و یقین کے ذرائع اسلام میں تین ہیں :-

(۱) خبرِ صادق جس کے مخبر کے سچے ہونے کا سامع کو یقین ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے کتب مقدسہ میں جو خبریں دی ہیں۔ یا جو خبریں انبیاءؑ نے دی ہیں۔

(۲) تجربہ و مشاہدہ بھی یقینی علم کا موجب ہے بشرطیکہ وہ چیز تجربہ و مشاہدہ کے دائرہ میں آتی ہو۔

(۳) جس چیز کے بارے میں کوئی صحیح خبر منقول نہ ہو۔ تجربہ و مشاہدہ سے بھی اس میں کوئی فیصلہ صادر نہ کیا جا سکتا ہو۔ وہاں عقل کا حکم ناطق ہو گا۔

یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے علم و یقین کے ذرائع سہ گانہ کو مندرجہ ذیل آیت میں جمع کر دیا ہے ——— ارشاد فرمایا :-

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ	جس چیز کا تجھے یقین نہیں اس کے بارے میں
اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ	کچھ نہ کہو بے شک کان آنکھ اور دل سے
اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (الاسراء ۳۶)	پوچھا جائے گا۔

اس آیت میں اعجازِ کامل کا پہلو یہ ہے کہ علم و یقین کے تینوں ذرائع کو بالترتیب ذکر کیا چنانچہ خبرِ صادق کو "سمع" تجربہ و مشاہدہ کو "بصر" اور عقلی فیصلہ کو "فؤاد" سے تعبیر کیا۔ اس سے معلوم ہُوا کہ یہی تین عناصر ہیں، جن سے ہر علم پیدا ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں کوئی علم ایسا نہیں جس کا منشاء و مصدر ان تینوں عناصر میں سے ایک عنصر نہ ہو۔ جو امر مذکورہ صدر عناصرِ ثلاثہ سے صادر نہ ہو وہ قرآن کے نزدیک یا تو ظن (ایک پہلو کا غالب ہونا) ہے اور یا وہم و خیال۔

جہاں تک دینی عقائد کا تعلق ہے ان پر دلیل و بصیرت کی روشنی میں ایسا پختہ یقین ضروری ہے جو واقعہ کے مطابق ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات پر ایمان، رسالت و نبوت ملائکہ اور جنت و جہنم پر ایمان۔ باقی رہے اسلام کے عملی احکام تو ان کے سلسلہ میں ظنّی علم بھی کافی ہے۔ اس لیے بہت سے احکام ظنّی دلائل سے ثابت ہیں اور ان کے بارے میں علم و یقین کی شرط کا پایا جانا دشوار ہے۔ یہ بات شرعی علوم کا درس و مطالعہ کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں۔

جن احادیث کو ہمارے علماء نے صحیح قرار دیا ہے۔ ان میں کوئی بات ایسی نہیں جس کو عقل تسلیم نہ کرتی ہو یا محال سمجھتی ہو۔ اس لیے کہ یا تو ان کا تعلق عقائد سے ہوگا اور ان کا قرآن سے متفق ہونا ضروری ہے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ قرآن میں قطعاً کوئی ایسی بات موجود نہیں جسے عقل فاسد یا باطل اور محال تصور کرتی ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حدیث میں بیان کردہ حکم عبادات، معاملات اور آداب سے متعلق ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہمارے علماء نے جن احادیث کو صحیح قرار دیا ہے ان میں ایک بھی ایسی نہیں جو عقل کے منافی ہو یا کسی امر محال پر مشتمل ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ حدیث میں اُمم سابقہ کا کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہو۔ یا عالم الغیب کے بارے میں کوئی ایسی بات بتائی گئی ہو جو دیکھنے میں نہیں آتی۔ مثلاً آسمانوں کے حالات حشر و نشر اور جنت و جہنم سے متعلق کوائف و احوال۔ ان میں کوئی بات ایسی نہیں جس کو عقل باطل قرار دیتی ہو۔

حدیث میں بعض باتیں ایسی بھی مذکور ہوتی ہیں، عقل جن کے فہم و ادراک سے قاصر ہوتی ہے اس لیے عقل ان کو حیرت و استعجاب کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اگر ایسی احادیث معتبر و معتمد طریقہ سے منقول ہوں جس سے قطعی و حتمی علم حاصل ہوتا ہو تو ان کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اور اگر ایسے طریقہ سے مروی و منقول ہوں جس سے ظنّی علم حاصل ہوتا ہے تو ایک مسلم کی یہ شان نہیں کہ جلدی سے ان کو جھٹلانے لگے۔

مستحیل اور ناقابل ادراک میں فرق و امتیاز:

مندرجہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ لوگوں کی ایک خاص تعداد ان امور میں جو عقل کے منافی ہیں اور ان باتوں میں جن پر عقل اظہارِ حیرت کرتی ہے چنداں فرق و امتیاز نہیں کرتی۔ بلکہ بعجلت تمام دونوں سے انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ عقل جن باتوں کو تسلیم نہیں کرتی وہ ان پر محال ہونے کے اعتبار سے فیصلہ صادر کرتی ہے۔ بخلاف ازیں بعید العقل امور میں عقل کا فیصلہ اس امر پر مبنی ہوتا ہے کہ عقل ان کا تصور نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے کہ مستحیل اور ناقابل ادراک دونوں ایک چیز نہیں ہیں بلکہ ان میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آج جو علمی و فکری انقلاب بپا ہے اس کے نتیجہ میں جو بہت سی باتیں پہلے عقل و فکر میں نہ آتی تھیں اب بازیچۂ طفلاں بن کر رہ گئی ہیں بہت سے علمی حقائق اب ایک مجنون کی بڑ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ جو امور کل تک محال تھے اب حقیقتِ واقعی بن کر رہ گئے ہیں۔ مثالیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک ایسے عصر و عہد میں بود و باش رکھتے ہیں جس میں انسان چاند تک پہنچنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ انسانی ترقی کی یہ حد ہے کہ اب وہ چاند اور دیگر سیاروں میں اترنے کیلیے لنگر لنگوٹے کس رہا ہے اگر ازمنۂ وسطی یا ایک صدی پہلے کا کوئی انسان ایسی بات سوچتا تو اسے پاگل خیال کیا جاتا۔

جو لوگ عقل کو حدیث کی صحت و کذب کے بارے میں حکم ٹھہراتے ہیں اور "محال" اور "مستغرب" (عجیب، نادر الوقوع) کے مابین فرق نہ کرتے ہوئے ہر اس حدیث کو جلدی سے ٹھکرا دیتے ہیں، جو ان کو عجیب نظر آتی ہے۔ یہ عظیم جسارت ہے جس کا منشاء و مصدر ایک طرف تو یہ ہے کہ وہ عقل کے فریب خوردہ ہیں۔ اور دوسری جانب وہ عقل سے مغلوب ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ جو امور عقل کے دائرہ سے خارج ہیں وہ ان کے بارے میں کیسے حکم صادر کر سکتی ہے؟

ہمارا خیال ہے کہ منکرین حدیث، احادیثِ صحیحہ میں سے زیادہ تر انہی احادیث کی تکذیب کرتے ہیں جن میں یا تو اُمم سابقہ کے واقعات بیان کیے گئے ہیں اور یا غیبی امور کا ذکر کیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر ہم ابوریّہ کی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ حدیث پیش کرتے ہیں جو اس نے اس جلیل القدر صحابی کا جھوٹ (نعوذ باللہ من تلک الاباطیل) ثابت کرنے اور یہ ظاہر کرنے کے لیے ذکر کی ہے کہ ابوہریرہؓ اسرائیلی روایات لے کر ان کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیتا ہے۔

وہ حدیث مندرجہ ذیل ہے :-

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "جنت میں ایک اتنا بڑا درخت ہے کہ سوار اس کے سایہ میں سوؔ سال تک چلتا رہے گا" (صحیح مسلم)

ابوریّہ نے مذکورہ صدر حدیث پر اظہار حیرت کیا بلکہ ضمناً اس کی تکذیب بھی کی ہے۔ اس لیے کہ یہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات میں سے ہے۔ اور بقول اس کے ابوہریرہ رضؓ کعب الاحبار رضؓ سے حدیثیں سن کر ان کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔

ابوریّہ سے دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اس حدیث میں کونسا امر موجب حیرت ہے ؟ کیا حیرت کا منشأ و مصدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ "جنت میں ایک اتنا بڑا درخت ہے کہ سوار اس کے سایہ میں سوؔ سال تک چلتا رہے گا" اب سوال یہ ہے کہ آیا جنّت امورِ غیبی میں سے نہیں ہے ؟ کیا اللہ و رسول کے بتلائے ہوئے امور کے علاوہ کسی کو معلوم ہے کہ جنت میں کیا کچھ ہے ؟ کیا اس مادی دنیا میں ایسی ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کے تصوّر سے بھی عقل قاصر ہے ؟ کیا فلکیات کے علماء ہمیں یہ بات نہیں بتاتے کہ سورج کا حجم زمین سے کئی کروڑ گنا زیادہ ہے۔ نیز یہ کہ ہمارا آفتاب ان لاکھوں آفتابوں میں سے ایک ہے جو اس سے

کروڑوں گنا بڑے ہیں۔ کیا ہیئت دان ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ وسیع فضا میں لاتعداد آفتاب ہیں جو لاکھوں سالوں سے وہاں موجود ہیں مگر زمین تک ان کی روشنی نہیں پہنچی۔ دورِ حاضر میں علماء جو اس قسم کی باتیں بتا رہے ہیں کیا عقل انسانی ان کو باور کرتی ہے؟

حیرانی ہے کہ ابوریّہ یہ بات تو تسلیم کرتا ہے کہ علماء ایسی وسیع فضا کی حقیقت سے آگاہ ہیں، جس تک بڑی سے بڑی انسانی عقل کی رسائی بھی محال ہے۔ مگر وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ جس رسول کا آسمانی وحی کے ساتھ ربط و تعلق تھا اور جس کا علم خالق کائنات کے علم سے ماخوذ و مستفاد تھا وہ یہ کہتا ہے "جنت میں ایک درخت ہے جس کے سایہ میں سوار ایک سو سال تک چلتا رہے گا" اس امر پر جس قدر تعجب کیا جائے کم ہے۔ غور کیجیے ان سو سالوں کی ان لاکھوں سالوں کے مقابلہ میں کیا حقیقت ہے جب سے لاکھوں آفتاب فضا میں موجود ہیں۔

ابوریّہ اور اس کے اضراب و امثال کے سامنے مسئلہ یہ نہیں کہ عقل سے کام لیا جائے یا نہ لیا جائے؟ بلکہ اصل مسئلہ مخلوق کی عقل کا عجز و قصور اور خالق کے سامنے اظہار عجز و نیاز ہے حریت فکر و نظر کے یہ مدعی اور دین و شریعت میں عدیم النظیر ہونے کا دعویٰ کرنے والے یہ لوگ دراصل عقل و فہم سے یکسر بے گانہ ہیں۔

ابوریّہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ جن احادیث کی تکذیب کی ہے اس کی ایک دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"جنت و جہنم میں باہم تکرار ہوئی۔ دوزخ نے کہا میرے اندر متکبر و مغرور لوگ داخل ہوں گے۔ جنت نے کہا کیا وجہ ہے کہ میرے اندر گرے پڑے اور کمزور لوگ داخل ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ نے جنت سے کہا تو میری رحمت ہے میں جس پر رحم کرنا چاہوں گا تیرے اندر داخل کر دوں گا۔ دوزخ سے کہا کہ تو میرا عذاب ہے

جسے چاہوں تیرے اندر ڈالوں۔ بھرنا دونوں کا ضروری ہے۔ جہنم اس وقت تک پُر نہ ہو گی جب تک اللہ تعالیٰ اس میں اپنا پاؤں نہ رکھیں گے۔ پھر وہ بھر جائے گی اور کہے گی بس بس۔ اس کے اجزاء ایک دوسرے سے لگ کر سمٹ جائیں گے۔"

(بخاری و مسلم)

ہمیں نہیں معلوم اس حدیث کو نہ ماننے کی وجہ کیا ہے؟

اگر انکار کی وجہ یہ الفاظ ہیں کہ "اللہ تعالیٰ دوزخ میں اپنا پاؤں رکھے گا" تو قرآن کریم میں بھی خداوند تعالیٰ کے لیے ہاتھ، چہرہ، آنکھ اور آنے کا فعل مذکور ہے۔ ایسے الفاظ کے بارے میں علماء کے دو معروف مذاہب پائے جاتے ہیں۔

(۱) اس ضمن میں سلفؒ کا مذہب یہ ہے کہ ہاتھ چہرہ وغیرہ کو بلا تاویل تسلیم کیا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کسی بات میں بھی انسانوں کے مشابہ نہیں۔

(۲) بخلافِ ازیں متاخرین "ید" (ہاتھ) سے قدرت مراد لیتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی مشابہت سے پاک ہے۔ اور یہ ایک ایسا قاعدہ ہے جسے سب لوگ تسلیم کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ پاؤں وغیرہ کے الفاظ قرآن میں بھی موجود ہیں تو جو تاویل یہاں کی جائے گی وہی حدیث میں بھی ملحوظ ہو گی۔

اور اگر اس بناء پر حدیث کو تسلیم نہیں کیا گیا کہ اس میں جنت و جہنم کی گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے تو یہ گفتگو قرآن میں بھی مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

إِنَّ اللّٰهَ قَالَ لِلسَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ۔ — اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین سے کہا کہ بخوشی یا ناخوشی آؤ دونوں نے کہا ہم بخوشی حاضر ہیں۔

اور اگر حدیث کو نہ ماننے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے جہنم کی طرف آنے کا ذکر کیا گیا ہے تو خداوند تعالیٰ کے لیے روزِ قیامت آنے کا فعل ثابت کیا ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۔ — تیرا رب اور فرشتے قطار اندر قطار آئیں گے

قرآن حکیم میں فرمایا :۔

يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ (سورۃ ق)

جس روز ہم جہنم سے کہیں گے کیا تو بھر گئی ہے ؟ اور وہ کہے گی کچھ اور بھی ہے ؟

خلاصۂ کلام یہ کہ الوہیت اور صفاتِ باری کے مسئلہ میں عقل کو فیصل ٹھہرانا کم عقلی کی دلیل ہے ان فریب خوردگانِ عقل کے نزدیک اس کا نتیجہ زیادہ تر الحاد کی صورت میں برآمد ہوتا ہے ۔ عقل کو چاہیے کہ اپنے دائرہ میں محدود رہے اور انہی امور پر غور و فکر کرے جو اس کی استطاعت کی حدود میں داخل ہیں ۔ جب عقل انسانی زندگی کا راز دریافت کرنے سے قاصر ہے اور اس عجیب و غریب کائنات کے اس قدر چھوٹے جزو کا بھی احاطہ نہیں کر سکتی جس کی مقداریت کا ایک ذرہ ہوتا ہے تو خالقِ کائنات کی حقیقت دریافت کرنا اس کے لیے کیسے ممکن ہے ؟ جو چیونٹی کوہ ہمالیہ کی نچلی سطح پر رینگ رہی ہو وہ اس کی بلندی وسعت اور اس کے قطر کا احاطہ کیوں کر سکتی ہے ؟ اللہ تعالیٰ مشہور شاعر احمد صافی نجفی کا بھلا کرے اس نے کیسی عمدہ بات کہی ہے کہ ؎

يَعْتَرِضُ الْعَقْلُ عَلَىٰ خَالِقٍ
مِنْ بَعْضِ مَخْلُوقَاتِهِ الْعَقْلُ

(عقل اس خالق پر معترض ہوتی ہے جس کی مخلوقات میں سے وہ بھی ایک مخلوق ہے)

ہم مسئلہ زیرِ قلم پر ایک اور انداز سے نگاہ ڈالتے ہیں ۔

تھوڑی دیر کے لیے ہم فرض کرتے ہیں کہ احادیثِ نبویہ کو جانچنے کے لیے عقل کو معیار بنانا درست ہے ۔ ہم پوچھتے ہیں کہ تم کس عقل کو حکم بنانا چاہتے ہو ؟

(۱) اگر تم فلاسفہ کی عقل کو حکم بنانا چاہتے ہو تو اُن کے مابین شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور ہر پیچھے آنے والا پہلے کے قول کو غلط قرار دیتا ہے ۔

(۲) اگر اُدباء کی عقل کو فیصل قرار دیتے ہو تو یہ ان کا کام نہیں ۔ ان کو تو نوادر حکایات سے

غرض ہوتی ہے اور بس۔

(۳) اگر علماء طب اہل هندسہ اور ریاضی دانوں کی عقل کو فیصل مانتے ہو تو ان کو حدیث سے کیا سروکار؟

(۴) اگر محدثین کی عقل کو معیار بناتے ہو تو وہ تمہیں سرے سے پسند ہی نہیں۔ محدثین کو تو تم سادہ لوح اور کند ذہن تصور کرتے ہو۔

(۵) اور اگر فقہاء کی عقل کو حکم ٹھہراتے ہو تو ان کے بہت سے مذاہب و مسالک ہیں۔ نیز یہ کہ ان کی عقل بھی تو محدثین ہی جیسی ہے۔

(۶) اگر ملحدین کی عقل کو پسند کرتے ہو تو ان کا دعویٰ یہ ہے کہ تمہارا خدا پر ایمان جہالت و حماقت سے کم نہیں۔

(۷) اگر خدا کے وجود پر ایمان لانے والوں کی عقل کو پسند کرتے ہو تو ان کے کئی گروہ ہیں۔

(۸) ان میں سے ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان میں حلول کر جاتا ہے اور وہ خدا بن جاتا ہے۔

(۹) ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ خدا کی روح سمٹ کر ایک جسم میں سما جاتی ہے اور وہ خدا بن جاتا ہے۔

(۱۰) بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوقات ایک وحدت کا مظہر ہیں۔

(۱۱) بعض کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ ذاتِ واحد ہونے کے باوجود اقانیم ثلاثہ سے مرکب ہے۔

(۱۲) بعض گائے، چوہے اور بندر کو لائق عبادت سمجھتے ہیں۔

(۱۳) اگر تم یہ کہو کہ ہم ان اہل اسلام کی عقل کو حکم ٹھہراتے ہیں جو وحدتِ خداوندی پر ایمان رکھتے ہیں تو ہم پوچھتے ہیں کہ اہل اسلام کے کس فرقہ کی عقل تمہیں پسند ہے؟

(۱۴) اگر تم اہل السنت والجماعت کی عقل کو پسند کرتے ہو تو شیعہ و معتزلہ اس کو پسند نہیں کریں گے۔

(۱۵) اگر شیعہ کی عقل تمہارے نزدیک پسندیدہ تر ہے تو اہل سنت اور خوارج اس کو پسند نہیں کرینگے
(۱۶) اور اگر معتزلہ کی عقل تمہیں پسند ہے تو اہل اسلام کے تمام فرقے اس کو پسند نہیں کریں گے۔
اب سوال یہ ہے کہ تم کس عقل کو حکم تسلیم کرو گے ؟

اگر ابوریہ اس کے جواب میں کہے گا کہ میں معتزلہ کی عقل کو پسند کرتا ہوں۔ اس لیے کہ معتزلہ "اصحاب عقولِ صریحہ" ہیں۔ تو ہم ابوریہ کے سامنے ایک حدیث پیش کریں گے جس کو معتزلہ کی عقل نے ناقابل تسلیم ٹھہرایا ہے۔

محدث ابن قُتیبہ اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" میں لکھتے ہیں کہ معتزلہ نے جن احادیث کو ناقابل تسلیم قرار دیا ہے ان میں سے مندرجہ ذیل حدیث بھی ہے کہ :۔

"جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو آپ کی زرہ چند سیر جَو کے عوض ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی"

معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس حدیث کو جھٹلاتی ہے۔ پھر ابن قتیبہ نے معتزلہ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے جس کو بڑی آسانی سے رد کیا جا سکتا ہے۔ (تاویل مختلف الحدیث ص)
کیا فرماتے ہیں ابوریہ اور اس کے ہمنوا معتزلہ کے ایسی احادیث کو ٹھکرانے کے بارے میں؟
ابن قتیبہ نے معتزلہ کی رد کردہ احادیث کا تفصیلی جائزہ لیا اور ان کے جوابات دیے ہیں اس کے بعض جوابات قرین عقل و قیاس ہیں۔ بعض جواب درست نہیں اور علماء نے ان احادیث پر وارد شدہ اعتراضات کے نہایت نفیس اور معقول جواب دیے ہیں۔ اب میں بتاؤں گا کہ محدث ابن قتیبہ اور معتزلہ کی عقل کے مابین کیا خلیج حائل ہے۔

محدث ابن قتیبہ فرماتے ہیں :۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو تین مرتبہ ہاتھ دھوئے بغیر برتن میں نہ ڈالے نہیں کیا خبر تمہارے ہاتھ نے کہاں رات گزاری ہے"

معتزلہ اس حدیث پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی حدیث ہے جس کا آخری حصہ ابتدائی حصہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اگر آخری حصہ نہ ہوتا تو ابتدائی حصہ قابل قبول تھا۔

معتزلہ کہتے ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے ہاتھ نے اسی جگہ رات گزاری جہاں اس کا بدن مقیم رہا۔ اور جہاں اس کے پاؤں ناک کان اور دیگر اعضاء نے شب باشی کی۔ زیادہ سے زیادہ جس امر کا احتمال ہے وہ یہ ہے کہ نیند میں اس کا ہاتھ شرمگاہ کے ساتھ لگ گیا ہو۔ اگر کوئی شخص حالت بیداری میں شرمگاہ کو چھوئے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ چہ جائیکہ نیند کی حالت میں شرمگاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹ جائے۔ نیند کی حالت میں جو فعل صادر ہو اللہ تعالیٰ اس پر گرفت نہیں کرتا۔ سونے والا شخص بعض اوقات بیہودہ بکنے لگتا ہے۔ گاہے اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے یا کفر و افتراء کا ارتکاب کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود نہ اسے دنیا میں کوئی سزا دی جاتی ہے نہ آخرت میں۔

محدث ابن قتیبہ معتزلہ کے مذکورہ صدر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم کہتے ہیں کہ معترض کا یہ اعتراض سے

حَفِظْتَ شَيْئًا وَغَابَتْ عَنْكَ أَشْيَاءُ   تو نے ایک بات یاد رکھی اور بہت سی چیزیں تجھے یاد نہ رہیں۔

کا مصداق ہے اسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ فقہا کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ شرمگاہ کو جاگتے یا حالت خواب میں ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ مذکورہ صدر حدیث کے علاوہ حدیث نبوی:

مَنْ مَسَّ فَرْجَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ۔   جو اپنی شرمگاہ کو چھوئے وہ وضو کرے۔

سے استناد کرتے ہیں۔

اگرچہ ہم شرمگاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں ہیں۔ ہمارا زاویہ نگاہ یہ ہے

کہ شرمگاہ کو چھونے سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وضو کا حکم دیا ہے اس سے
ہاتھ دھونا مراد ہے۔ اس لیے کہ شرمگاہ سے خروجِ نجاست کا امکان ہے۔ جب
شرمگاہ کو چھونے سے صرف ہاتھ کا دھونا لازم آتا ہے تو اس سے یہ حقیقت اجاگر
ہوئی کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے نیند سے بیدار ہونے والے کو حکم دیا کہ
برتن میں ڈالنے سے پہلے اپنا ہاتھ دھولے۔ مبادا وہ شرمگاہ سے چھوا ہو، اور
اس طرح اسے نجاست لگ گئی ہو۔ سونے والے کو خصوصی طور پر یہ حکم اس لیے دیا
کہ لاعلمی میں بسا اوقات اس کا ہاتھ مقامِ نجاست سے چھو جاتا ہے۔ بخلاف
ازیں جو آدمی جاگ رہا ہو اسے نجاست کا علم ہو جاتا ہے۔ اور وہ اسے برتن
میں داخل کرنے یا کھانے پینے اور مصافحہ کرنے سے پہلے دھو لیتا ہے"۔

(تاویل مختلف الحدیث۔ ص ۱۶۰ - ۱۶۲)

یہ ہے معتزلہ کی تیز و نمایاں اور محدثین کی کمزور و ناتوان عقل کی مثال! اس سے بڑھ کر
یہ کہ صحتِ عامہ کے اصول و ضوابط محدثین کے نقطۂ نگاہ کی تائید کرتے ہیں معتزلہ کی نہیں۔
خلاصۂ کلام یہ کہ محدثین و فقہاء احادیث کو صحیح قرار دیتے وقت اپنی عقل کو معطل نہیں کر
دیا کرتے تھے۔ بلکہ جہاں شریعت عقل کو ٹھہرنے کا حکم دیتی ہے وہاں اس کو ٹھہرا دیتے ہیں۔
وہ ان عقلاء کی بھی پیروی کرتے ہیں جو اپنے علم سے فریب خوردہ نہیں ہیں۔

ابوریہ سے متعلق مصنف کا تجزیہ:

اب میں ابوریہ کے بارے میں اپنی ذاتی رائے بیان کرتا ہوں۔ خدا شاہد ہے کہ میں اس کی
قدر و منزلت گھٹانا نہیں چاہتا۔

(۱)۔ ابوریہ نے اپنی کتاب کی ابتداء و انتہاء میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے یہ جدوکاوش
حدیث نبوی کے دفاع اور دین اسلام کی شہرت کو جھوٹے لوگوں کی دروغ بافی سے محفوظ رکھنے
کے لیے انجام دی ہے۔ میں ابوریہ کے اس دعویٰ کی تائید کرتا اور سمجھتا ہوں کہ مجھے اس کی

نیت پر حملہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مگر میرے خیال میں حسن نیت کے ساتھ ساتھ ابوریّہ کی کچھ ذاتی خواہشات کی روشنی میں کیا، میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ابوریّہ کا قلب و ذہن ان ترغیبات و تحریصات سے پاک ہوتا تو اس کی کدوکاوش کا ثمرہ کسی اور صورت میں ظہور پذیر ہوتا۔

(۲)۔ ابوریّہ ان جہود و مساعی کا تذکرہ کرتا ہے جو اسے مورد کی طلب و تلاش اور کتب کی ورق گردانی کے سلسلہ میں انجام دینی پڑیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ بحث و تحقیق کے ضمن میں کسی عالم کی محنت و کاوش بڑی تحسین اور ممنونیت کی موجب ہوتی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ اس کے پہلو بہ پہلو ابوریّہ حدیث نبوی کے ضمن میں سعی و جہد کرنے والے محدثین کی خدمات کا انکار کرتا ہے۔ اس میں حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر عصر حاضر تک علماء شامل ہیں۔ ابوریّہ ان علماء پر یہ الزام دھرتا ہے کہ انہوں نے احادیث کی چھان پھٹک میں کوتاہی سے کام لیا اور حدیث کی نقد و جرح کے سلسلہ میں عقل سے کوئی خدمت لینا گوارا نہ کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ مختلف اقسام حدیث مثلاً مُدرَج، مضطرب، شاذ، مُعَلّل وغیرہ کی جان پہچان کے سلسلہ میں جو مساعی انجام دی گئیں وہ علمی بیداری کے زمانہ کا کارنامہ ہیں۔ اسی بناء پر حدیث نبوی شکوک و شبہات کی آماجگاہ ٹھہری۔

خُدّامِ حدیث نے تیرہ صدیوں سے زائد مدت میں حدیث نبوی کے سلسلہ میں جو بے بہا اور عدیم المثال جہود و مساعی انجام دی تھیں ان سے ابوریّہ کے صاف انکار کرنے میں عبرت و موعظت کا بڑا سامان پنہاں ہے۔ ابوریّہ چند سال اپنے وطنِ مالوف میں مقیم رہ کر کتب کی ورق گردانی کرتا رہا۔ پھر کتاب کی تہذیب و تبویب میں بھی اسے بڑی کاوش کا سامنا ہوا۔ اس کی یہ محنت و کاوش بقول اس کے اس قابل ہے کہ اہل علم علوم اسلامیہ کے ماہرین اور مہذب طبقہ پر اس کا احسان دھرا جائے۔ پھر اس سے بھی ایک قدم آگے ابوریّہ حدیثِ نبوی کی اس عظیم خدمت کے عوض خداوند کریم سے اجر و ثواب کی امید بھی رکھتا ہے۔

مقامِ غور و فکر ہے کہ ابوریّہ کی یہ مزعومہ جدوسعی محدثین کی صعوباتِ شاقّہ کے مقابلہ میں کیا حقیقت رکھتی ہے جو پا پیادہ ہزاروں میل مسافت طے کرتے اور دسیوں سالوں تک دُور افتادہ عالمِ اسلامی کی خاک چھانتے رہے۔ وہ راتوں کو جاگتے اور موم بتی یا چراغ کی روشنی میں علمی کام کرتے۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ اہلِ اسلام پر احسان نہیں دھرتے تھے بلکہ بارگاہِ ربانی سے اجر و ثواب کے امیدوار رہتے تھے۔ کیا اسی کا نام قدر شناسی ہے کہ ابوریہ جیسا شخص اُٹھ کر کہے کہ حدیث کے معاملہ میں وہ سہل انگاری کے مرتکب ہوئے؟ گویا ان سے یہ قصور سرزد ہوا کہ وہ گزشتہ ایک ہزار سال میں ابوریّہ جیسی کتاب نہ لکھ سکے۔ ابوریّہ کی کتاب کا قاری اس کے سوا اور کیا جواب دے سکتا ہے؟

(۳) ۔ ابوریہ یہ کہہ کر اپنی کتاب کی مدح و ستائش کرتا ہے کہ:۔

"یہ حدیثِ نبوی کا تفصیلی جائزہ ہے جو ٹھوس تحقیقی بنیادوں پر مبنی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد حیثیت کی حامل ہے اور کسی نے آج تک اس عنوان پر خامہ فرسائی نہیں کی۔"

وہ مزید لکھتا ہے:۔

"مصنف کے سامنے قبل ازیں کوئی نمونہ نہ تھا جس کی وہ پیروی کرتا اور نہ ہمارے پیشروؤں میں سے کسی نے اس کٹھن راستہ کو ہموار کیا تھا۔"

حالانکہ بقول ابوریّہ ایسی کتاب کا ایک ہزار سال پہلے لکھا جانا ضروری تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ ایک عالم کا نمایاں ترین وصف اس کا عجز و انکسار اور عنداللہ و عندالناس اس کی عظیم ترین برائی اس کا اپنے علم پر نازاں ہونا اور اپنی مساعی کو سراہنا ہے۔ ہماری شریعت کا یہ قاعدہ ہے کہ فخر و غرور سے اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔ ہمارے علماء کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ آغازِ کتاب میں خطا و لغزش کے احتمال کا اعتراف کرتے اور علماء سے درخواست کرتے ہیں کہ ان کی غلطیوں کی اصلاح کی جائے اور مؤلفِ کتاب کے لیے دعائے مغفرت کی جائے۔

ابوریہ نے اپنی کتاب کی مدح و ستائش میں جس مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے میں اس کا نفسیاتی تجزیہ پیش نہیں کرنا چاہتا۔ ابوریہ بذاتِ خود تحلیلِ نفسی سے آگاہ ہے۔ البتہ میں ابن عطاء اللہ سکندری رحمہ اللہ کے چند کلمات ضرور عرض کروں گا۔ موصوف فرماتے ہیں:۔

"اگر تم کسی ایسے جاہل کی صحبت و رفاقت میں رہو جو خود پسند نہ ہو تو ایسے عالم کی صحبت سے بہتر ہے جو اپنے آپ پر نازاں اور بر خود غلط ہو۔ خود پسند عالم کے پاس علم تھا کیا ہے اور جو جاہل خود پسند نہیں اس میں جہالت کیسی؟"

(۴)۔ جن اہل علم کے بارے میں ابوریہ کو معلوم تھا کہ اس کی کتاب کو ہدف تنقید بنائیں گے ان کے حق میں وہ بڑا درشت اور مغلوب الغضب ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"کچھ بعید نہیں کہ جن لوگوں کے افکار متعفن اور عقلیں جامد ہو چکی ہیں میری کتاب کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔"

کتاب کے آخری حصہ میں اپنی مساعی جمیلہ کے گن گاتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"اگر حشویہ فرقہ کے لوگ اور کتابوں کے پلندے اٹھانے والے شیوخ الجمل میری کتاب سے تنگ دل ہوں اور انہیں یہ خطرہ دامن گیر ہو کہ حق و صدق ان کے خود ساختہ علم پر حملہ آور ہو جائے گا اور ان کی بدبودار علمی پونجی کی حقیقت جس کے بل بوتے پر وہ لوگوں سے پیسے بٹورتے ہیں لوگوں پر کھل جائے گی اور علمِ صحیح اور حجت بالغہ کی روشنی ان کی جہالت کے پردہ کو چاک کر دے گی تو ہمیں اس کی کچھ پرواہ نہیں اس لیے کہ ایسے لوگ ہماری نگاہ میں کسی قدر و قیمت کے حامل نہیں ہیں۔"

ابوریہ نے جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر ایسے غلیظ اور بے ہودہ الفاظ میں تنقید کی ہے کہ بازاری لوگ بھی ایسا نہیں کرتے اور یہود و نصاریٰ مستشرقین نے بھی ایسی گندہ دہنی اور بدزبانی سے کام نہیں لیا۔

مجھے نہیں معلوم کہ نام نہاد "عدیم المثال علمی تحقیق" کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہو گا

علم کا مدّعی بے ادب اور بیہودہ گو ہو۔ اور جو شخص ان کی تاریخ بیان کرنا چاہے یا ان پر نقد و جرح کے درپے ہو۔ بدزبانی کے ہتھیار سے کر ان پر حملہ آور ہو جائے۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"حیا، ایمان کا جزو ہے اور ایمان جنت میں لے جانے کا موجب ہے۔
بدگوئی درشتی طبع کی علامت ہے اور وہ دوزخ میں لے جائے گی۔"

ممکن ہے ابوریہ اس حدیث کو ماننے سے اس لیے انکار کر دے کہ یہ بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کردہ ہے۔ بنابریں میں اسے زید بن طلحہ بن رکانہ کی روایت کردہ حدیث سنانا چاہتا ہوں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر دین کا ایک اخلاق ہوتا ہے اور اسلام کا اخلاق حیاء ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل سچ فرمایا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مقدمہ ہٰذا میں میں نے ابوریہ کی کتاب کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ میری ذاتی خواہش یہ تھی کہ میں اس کتاب پر تفصیلی نقد و جرح کر سکتا مگر افسوس ہے کہ میری نازک صحت اس امر کی متحمل نہیں ہو سکتی اور مقدمہ نویسی کے دوران تو صحت اور بھی کمزور ہو گئی ہے۔ اس لیے مجھے مجبوراً ان علمی حقائق پر اکتفاء کرنا پڑا جو میں نے حدیثِ نبوی کی تاریخ و تدوین کے ضمن میں علماء سے نقل کیے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حقائق ابوریہ کی کتاب میں مندرج اباطیل کی تنقید و تردید کے لیے کافی ہیں۔ اکتفاء کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کتاب پر بعض فاضل علماء[1] کی جامع تنقید نے مجھے اس خدمت سے

---

[1] ابوریہ کی کتاب کی تنقید کے سلسلہ میں دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) محمد عبدالرزاق حمزہ کی "ظلمات ابی ریۃ امام اضواء السنۃ المحمدیۃ"

یہ بڑی گراں مایہ کتاب ہے مگر افسوس کہ اس میں درشت الفاظ کی بھرمار ہے۔

(۲) محقق عالم عبدالرحمٰن بن یحیٰی معلمی الیمانی کی "الانوار الکاشفۃ لما فی کتاب اضواء علی السنۃ من الزلل والتضلیل والمجازفۃ"

سبکدوش کر دیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حق پر ثابت قدم رکھے۔ خطا و لغزش سے بچائے اور ہمارے لیے رشد و ہدایت کو آسان کر دے۔

مترجم		مصنف
غلام احمد حریری ایم۔اے		ڈاکٹر مصطفیٰ حسنی السباعی
ڈی ۔ ۶۱ پیپلز کالونی۔		صدر شعبہ فقہ اسلامی۔ دمشق یونیورسٹی
لائل پور	دمشق	۱۵۔ شعبان ۱۳۷۹ھ
یکم جنوری ۱۹۶۵ء		۱۲ر فروری ۱۹۶۰ء

باب اوّل

اِس میں چار فصلیں ہیں

فصلِ اوّل : سنت کا مفہوم ومعنی اور تعریف

فصلِ دوم : وضع حدیث سے متعلقہ مباحث

فصلِ سوم : وضع حدیث کے مقابلہ کے لیے علماء کی مساعی

فصلِ چہارم : جہود ومساعی کے ثمرات ونتائج

فصلِ اوّل

سنّت کا مفہُوم و معنی اور تعریف

لغوی مفہوم:

سنت لغت میں راستہ اور طریقہ کو کہتے ہیں خواہ اچھا ہو یا برا۔ اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے:

من سن سنة حسنة فله	جس نے اچھا طریقہ ایجاد کیا تو اسے اس کا
اجرها واجر من عمل بها الی یوم	اجر ملے گا اور قیامت تک جو شخص اس پر عمل
القیمة ومن سن سنة سیئة	کرے گا اس کا بھی۔ اسی طرح جس نے برا طریقہ
فعلیه وزرها ووزر من عمل	ایجاد کیا تو اس پر اس برائی کا گناہ ہوگا اور قیامت
بها الی یوم القیمة (صحیح مسلم)	تک اس پر عمل کرنے والے کا۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

لتتبعنّ سُنن من قبلکم شبرًا	تم بیشک پہلے لوگوں کے راستوں پر چلو گے
بشبر وذراعًا بذراع (بخاری ومسلم)	

اصطلاحی مفہوم:

محدثین کی اصطلاح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قول، فعل، تقریر، جسمانی یا اخلاقی صفت اور سیرت قبل یا بعد از بعثت منقول ہو اس کو سنت کہتے ہیں۔ اس تعریف کے لحاظ سے بعض محدثین کے نزدیک حدیث اور سنت دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ (قواعد التحدیث ص ۳۵-۳۸ و توجیہ النظر ص ۲)

علماء اصول کی اصطلاح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول قول، فعل یا تقریر کو سنت کہتے ہیں۔

۱۔ سُنّت قولی:

شرعی احکام سے متعلق جو بات آپؐ نے کسی موقع پر ارشاد فرمائی ہو اس کو سنت قولی کہتے ہیں۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا:

اِنّما الاعمال بالنیات (بخاری مسلم) اعمال کا انحصار و مدار نیت پر ہے۔

نیز حضورؐ کا یہ ارشاد:

لاوصیة لوارث (دار قطنی) وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں

۲۔ سُنّت فعلی:

صحابہ کرامؓ نے عبادات یا دیگر معاملات سے متعلق حضورؐ کے جو افعال نقل و روایت کیے ہوں ان کو سنت فعلی کہتے ہیں۔ مثلاً نمازوں کی ادائیگی، احکام حج، آداب صیام، یا گواہ اور قسم کی بناء پر فیصلہ صادر کرنا وغیرہ۔

۳۔ سُنّت تقریری:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں جو کام کیا گیا ہو اور آپ نے خاموشی اختیار کی ہو یا اس پر اظہار پسندیدگی فرمایا ہو اس کو سنت تقریری کہتے ہیں۔

(الف) کسی کام کو وقوع پذیر ہوتے دیکھ کر خاموش رہنے کی مثال یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غزوۂ خندق کے بعد صحابہؓ کو حکم دیا تھا کہ عصر کی نماز بنو قریظہ کے قبیلہ میں جا کر ادا کریں۔ بعض صحابہؓ نے اس حکم کو حقیقت پر محمول کیا۔ جب بنو قریظہ کے قبیلہ میں پہنچے تو مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ انہوں نے عصر کی نماز مغرب کے بعد ادا کی۔ بعض نے سمجھا کہ آنحضورؐ کا مقصد یہ تھا کہ صحابہؓ جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کریں، انہوں نے صحیح وقت پر راستہ ہی میں عصر کی نماز پڑھ لی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ واقعہ

معلوم ہوا تو آپؐ نے دونوں میں سے کسی کو بھی معتوب نہ فرمایا۔

(ب) آنحضورؐ کے اظہارِ پسندیدگی فرمانے کی مثال یہ حدیث ہے کہ آپؐ کی خدمت میں پکی ہوئی گوہ پیش کی گئی۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود تھے۔ انہوں نے کھائی، مگر آپ نے نہ کھائی۔ صحابہؓ نے دریافت کیا "کیا اس کا کھانا حرام ہے"؟ فرمایا: "حرام تو نہیں۔ مگر یہ ہمارے ملک میں نہیں ہوتی اس لیے میں اسے پسند نہیں کرتا"

بعض اوقات سنت کا اطلاق ہر اس کام پر کیا جاتا ہے جو شرعی دلیل سے ثابت ہو خواہ وہ:

۱۔ قرآن میں موجود ہو۔

۲۔ نبی کریمؐ سے منقول ہو۔

۳۔ یا صحابہؓ کے اجتہاد پر مبنی ہو۔

مثلاً قرآن کریم کو جمع کرنا۔ حضرت عثمانؓ کا لوگوں کو ایک قراءت پر متحد کرنا اور دفتری نظام قائم کرنا۔

سنت کے مقابلہ میں بدعت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا

علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین من بعدی۔ (الموافقات ج ۴۔ ص ۴/۱۸)	میری اور خلفائے راشدین کی سنت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ ابوداؤد و ترمذی)۔

فقہاء کی اصطلاح:

فقہاء کی اصطلاح میں جو کام آنحضورؐ سے ثابت ہو مگر فرض اور واجب نہ ہو اس کو سنت کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سنت کا مقابل لفظ واجب ہے۔ فقہاء کے یہاں بعض اوقات سنت کا لفظ بدعت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں "طلاق السنۃ کذا و طلاق البدعۃ کذا" (ارشاد الفحول۔ ص ۳۱)

سنت کے معنی و مفہوم میں علماء کا یہ اختلاف ان کے جداگانہ غایات و مقاصد پر مبنی ہے۔

۱۔ محدثین:

محدثین کا مرکز و محور آنحضورؐ کی ذات گرامی ہے جن کو خداوند تعالیٰ نے نمونہ اور پیشوا قرار دیا ہے۔ اس لیے وہ آپؐ سے متعلق جملہ اقوال و افعال، اخبار و شمائل اور اخلاق و عادات نقل و روایت کرتے چلے جاتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان سے کوئی شرعی حکم ثابت ہو یا نہ ہو۔

۲۔ علماء اصول:

علماء اصول کا نصب العین اس رسول کریمؐ کی ذات سے بحث کرنا ہے جو واضع قوانین اور دستور حیات کی شارح و ترجمان تھی۔ اس لیے ان کی توجہات کا مرکز آپؐ کے وہ اقوال و افعال اور تقریرات ہیں جن سے شرعی احکام کا اثبات ہوتا ہے۔

۳۔ فقہاء:

فقہاء کو اس ذاتِ رسول سے سروکار ہے جس کے افعال شرعی احکام پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ احکام واجب، حرام اور مباح سبھی قسم کے ہوتے ہیں۔

سنت سے ہماری مراد اس کتاب میں علماء اصول کی مصطلحہ سنت ہے۔ اس لیے کہ فقہ اسلامی میں اس کو جو مرتبہ و مقام حاصل ہے اسی سے یہاں بحث کرنا مقصود ہے اگرچہ ہم نے اس کتاب میں محدثین کی اصطلاح کے مطابق سنت کے عام معنی و مفہوم کے اعتبار سے بھی سنت کے تاریخی پہلو پر اظہار خیال کیا ہے۔

حیاتِ رسولؐ میں اس کی اطاعت کا وجوب:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم عہد رسالت میں شرعی احکام قرآن کریم سے معلوم کرتے اور

قرآن کریم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا کرتے تھے۔ بسا اوقات آیاتِ قرآنیہ مجمل بلا تفصیل یا مطلق بلا قید و شرط نازل ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً قرآن میں نماز کا حکم مجملاً وارد ہوا۔ نہ اس میں رکعات کا ذکر تھا نہ شکل و صورت اور اوقات کا۔ اسی طرح زکوٰۃ کا حکم مطلقاً نازل ہوا تھا۔ اس میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ کم از کم کتنے مال میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے؟ اس کی مقدار اور شرائط کیا ہیں؟ اسی طرح شریعت کے اکثر احکام مجمل نازل ہوئے کہ ان کے شرائط، ارکان اور مفسدات کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ لہٰذا صحابہؓ کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر احکام کی تفصیلات معلوم کریں۔

اسی طرح صحابہؓ بہت سے ایسے حوادث سے دوچار ہوتے جن کا حل قرآن میں مذکور نہیں۔ اس لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا حکم معلوم کرنا بھی ازبس ضروری تھا۔ کیونکہ آپؐ خداوند تعالیٰ کی جانب سے داعی و مبلغ ہو کر آئے تھے اور خدا کی شریعت، اس کے حدود، اور غایات و مقاصد کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔

خداوند تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منصب پر روشنی ڈالی ہے کہ آپؐ قرآن کریم کے مفسر اور اس کی غایات و مقاصد کے شارح و ترجمان ہیں۔ مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

(۱) وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (النحل-۴۴)	اور ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے لیے اس چیز کی وضاحت کریں جو ان کی طرف اتاری گئی اور تاکہ وہ غور و فکر کریں

قرآن نے رسولؐ کے اس منصب پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ جب حق میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کی توضیح و تشریح اس کا کام ہے۔ ارشاد فرمایا:

(۲) وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ	اور ہم نے آپ پر قرآن کو صرف اس لیے اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لیے اس چیز کی وضاحت

وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ٥ (النحل-٦٤)	کر دیں جس میں ان کے یہاں اختلاف پیدا ہو، اور یہ ایمان لانے والی قوم کے لیے رحمت و ہدایت کا موجب ہے۔

جملہ اختلافات و نزاعات میں آپ کی اطاعت کو ضروری قرار دیا۔

(۳) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ٥ (النساء - ٦٥)	تیرے رب کی قسم، لوگ اس وقت تک مومن نہ ہوں گے جب تک باہمی تنازعات میں آپ کو فیصل نہ بنائیں اور جو فیصلہ آپ صادر کر دیں اس کے بارے میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور آپ کے سامنے سر تسلیم جھکا دیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رسول کریمؐ کو کتاب و حکمت اس لیے عطا ہوئی ہے کہ آپ لوگوں کو دینی احکام سکھائیں۔

(۴) لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ٥ (آل عمران-۱۶۴)	اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا جبکہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج دیا جو ان کو قرآن کی آیات پڑھ کر سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ قبل ازیں وہ ظاہر گمراہی میں تھے

جمہور علماء و محققین کا قول ہے کہ "حکمت" قرآن کے علاوہ ایک چیز ہے۔ حکمت سے دین کے وہ اسرار و احکام مراد ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطلاع دی۔ علماء حکمت کو سنت سے تعبیر کرتے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے یہاں دو چیزوں کا ذکر کیا ہے :

(۱) کتاب ـــــ (۲) حکمت۔

کتاب سے قرآن مراد ہے۔ میرے پسندیدہ ماہرین علوم قرآنیہ نے بتایا کہ حکمت سے حدیثِ رسول مراد لی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ اس لیے کہ یہاں بالترتیب کتاب و حکمت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو تعلیمِ کتاب و سنت کی اساس پر مرہونِ منت قرار دیا۔ اس لیے حکمت سے سنتِ رسول کے سوا اور کون سی چیز مراد لی جا سکتی ہے؟ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ حکمت کا ذکر کتاب کے مقرون و متصل کیا گیا ہے۔ (اس لیے یہ اس امر کا قرینہ ہے کہ حکمت سے حدیث مراد ہے) اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو ایک حتمی و قطعی فریضہ کی حیثیت دی ہے۔ اس لیے فرض بات وہی ہو سکتی ہے، جو کتاب و سنت میں مذکور ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان باللہ و ایمان بالرسول کو باہم لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔"

(الرسالہ للشافعی ؒ۔ ص ۷۸)

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا مذکورہ صدر بیان اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ حکمت و سنت دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ کیونکہ حکمت کا لفظ کتاب کا معطوف ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ دونوں ایک چیز نہیں ہوتے۔ لہٰذا کتاب اور حکمت دونوں جداگانہ چیزیں ہوں گی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت کی تعلیم دینے کی وجہ سے بنی نوع انسان کو ممنون قرار دیا ہے۔ اس لیے حکمت حدیث کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ احسان اسی چیز کا جتلایا جا سکتا ہے جو حق و صواب ہو۔ بنا بریں حکمت قرآن کی طرح واجب الاتباع ہو گی۔ چونکہ ہمارے لیے صرف اللہ اور رسول کی پیروی ضروری ٹھہرائی گئی ہے۔ اس لیے لازماً حکمت سے وہ احکام و اقوال مراد ہیں جو آپ سے شریعت کی تعبیر و تفسیر کے سلسلہ میں۔

صادر ہوئے۔

جب معاملہ یوں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے علاوہ ایک اور چیز بھی دی گئی تھی اور رسول کا اتباع اس چیز کے سلسلہ میں بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں اس پر روشنی ڈالی ہے قرآن میں فرمایا :-

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ	وہ (ہمارا رسول، ان کو نیکی کا حکم دیتا برائی
عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ	سے روکتا، پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ	حلال ٹھہراتا۔ ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا
إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ	ان کے بوجھ کو دور کرتا اور ان پابندیوں سے
عَلَيْهِمْ (الاعراف۔ ۱۵۶)	آزاد کرتا ہے جو اُن پر تھیں۔

مذکورہ صدر آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اس میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں، جن کو قرآن نے حلال یا حرام ٹھہرایا ہے اور وہ بھی جو قرآن کے علاوہ دوسری قسم کی وحی سے ثابت ہیں۔ حضرت مقدامؓ بن معدیکرب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا :-

"مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس جیسی ایک چیز اور بھی" (ابوداؤد)

اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے ——— قرآن کریم میں فرمایا :-

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا	اور رسول جو چیز تمہیں دے وہ لے لو اور
نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ (الحشر)	جس سے روکے اس سے باز رہو۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں اطاعتِ باری تعالیٰ اور اطاعت رسول کو باہم مقرون و متصل ذکر کیا گیا ہے ——— ارشاد فرمایا :-

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ	اور اللہ و رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر

تُرْحَمُوْنَ ۝ (آل عمران-۱۳۲) رحم کیا جائے۔

رسول کریم کی دعوت پر لبیک کہنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا	اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی دعوت
لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا	پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کے لیے
یُحْیِیْكُمْ۔ (الانفال-۲۴)	پکاریں جو تمہیں زندہ کرتی ہے۔

قرآن میں رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اور آپ کی پیروی کو حب خداوندی کا موجب قرار دیا:۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ	جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اللہ
اللّٰهَ۔" (النساء-۸۰)	کی اطاعت کی۔

نیز فرمایا:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ	آپ فرما دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو
یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ	تو میری پیروی کرو خدا تمہیں دوست رکھے
(آل عمران-۳۱)	گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا

احکام رسول کی خلاف ورزی سے منع کرتے ہوئے فرمایا:۔

فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ	جو لوگ رسول کے احکام کی خلاف ورزی
اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ	کرتے ہیں، انہیں ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی آزمائش
یُصِیْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝	میں مبتلا ہوں یا انہیں دردناک عذاب پہنچ
(النور-۶۳)	جائے۔

آپ کے احکام کی خلاف ورزی کو کفر قرار دیا۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ	آپ فرما دیں کہ اللہ کی اطاعت کرو اور اگر
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ	پھر جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند

الکافرین • (آل عمران ۔ ۳۲) نہیں کرتا ۔

اہل ایمان کو ہرگز اس بات کی اجازت نہ دی کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و احکام کی خلاف ورزی کریں :-

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ	کسی مومن مرد و عورت کے لیے زیبا نہیں
إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ	کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا
يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ	فیصلہ صادر کر دیں تو انہیں کوئی اختیار بھی باقی
يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ	رہے اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول
ضَلٰلًا مُّبِيْنًا • (الاحزاب ۔ ۳۶)	کی نافرمانی کرے تو وہ بہت بری طرح گمراہ ہوا ۔

اختلاف و نزاع کے موقع پر رسولؐ کے فیصلہ سے اعراض و انحراف کو علامت نفاق قرار دیتے ہوئے فرمایا :-

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ	اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لائے
وَاَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ	اور اس کی اطاعت کی پھر اس کے بعد ایک
مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَا اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ	فریق ان میں سے پھر جاتا ہے اور وہ مومن
وَاِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	نہیں ہیں اور جب ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ	رسول کی جانب پکارا جاتا ہے کہ ان کے درمیان
مُّعْرِضُوْنَ • اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ	فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک گروہ اعراض
الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَ	کرنے لگتا ہے ۔ جب اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ
رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا	اور اس کے رسول کی جانب دعوت دی جاتی
سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ	ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ
الْمُفْلِحُوْنَ •	کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور یہی
(النور ۔ ۴۷ ۔ ۴۸ ۔ ۵۱)	لوگ ہیں فلاح پانے والے ۔

اس بات کو لوازم ایمان سے قرار دیا کہ جب اہل ایمان رسول کریم کے ہمراہ ہوں تو آپ کی اجازت کے بغیر آپ کو چھوڑ کر نہ جائیں ۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِذَا کَانُوْا مَعَہٗ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْھَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْہُ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْکَ لِبَعْضِ شَاْنِھِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْھُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَھُمُ اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۰ (النور ۶۲)	ایمان والے وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر یقین لائے اور جب اس کے ساتھ کسی جمع ہونے کے کام میں ہوتے ہیں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہیں جاتے جو لوگ تجھ سے اجازت طلب کرتے ہیں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہیں جب آپ سے کسی کام کے لیے اجازت مانگیں تو جس کو چاہیں اجازت دے دیں اور اللہ سے ان کے لیے مغفرت طلب کریں بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :-

"جب ایمان کے لوازم میں یہ بات شامل ہے کہ جب مومن کسی کام کے سلسلہ میں آپ کے ہمراہ ہوتے ہیں تو بلا اجازت آپ کو چھوڑ کر نہیں جاتے تو یہ امر بالاولیٰ لوازمِ ایمان میں شامل ہونا چاہیے کہ آپ کی اجازت کے بغیر کوئی علمی مذہب و مسلک بھی اختیار نہ کیا جائے ۔ آپ کی اجازت کا پتہ آپ کے اس عمل و ارشاد سے چلے گا ۔ جس میں آپ نے اس کام کے کرنے کی اجازت دی ہو گی ۔"

(اعلام الموقعین ۔ ج ۱ ۔ ص ۵۸)

یہی وجوہ و اسباب تھے جن کے پیش نظر صحابہؓ کے لیے بارگاہ رسالت کی جانب رجوع کرنا ازبس ناگزیر تھا ۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے لیے احکام قرآن کی تفسیر بیان کرتے ۔

مشکلات کی توضیح کرتے اور ان کے منازعات و خصومات کے بارے میں فیصلہ صادر فرماتے حضرات صحابہؓ آپ کے اوامر و نواہی کی پابندی کرتے عبادات و معاملات اور اعمال و اخلاق میں ان کی پیروی کرتے ماسوا ان احکام کے جو آپ کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص تھے۔

چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی:۔

صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي (بخاری) جیسے مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو ویسے نماز پڑھو۔

کے پیش نظر صحابہؓ آپؐ سے نماز کے احکام و ارکان سیکھتے۔ آپ کے حکم:۔

خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ۔ (مسلم) احکام حج مجھ سے سیکھ لو۔

کے مطابق آپؐ سے حج کے شعائر و ارکان کا علم حاصل کرتے۔

جب کسی صحابی کے بارے میں پتہ چلتا کہ اس نے کسی کام کے سلسلہ میں آپ کی پیروی نہیں کی تو آپ اظہار ناراضگی فرماتے۔ امام مالکؒ نے مؤطا میں حضرت عطاؒ بن یسار سے روایت کیا ہے کہ ایک صحابی نے اپنی بیوی کو بارگاہ رسالت میں یہ بات دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ اگر ایک روزہ دار شخص اپنی بیوی کا بوسہ لے لے تو اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اس عورت کو بتایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روزہ کی حالت میں اس طرح کر لیا کرتے تھے۔ اس عورت نے آکر اپنے خاوند کو بتایا۔ اس نے کہا میں رسولؐ اللہ کی طرح نہیں ہوں اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے لیے جس چیز کو چاہے حلال ٹھہرائے۔ آپ کو جب پتہ چلا تو بہت ناراض ہوئے اور فرمایا:۔

"میں تم میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اس کی حدود کو سب سے زیادہ جاننے والا ہوں"۔ (الرسالہ للشافعیؒ ص ۴۰۴)

جب صلح حدیبیہ کے موقع پر آپؐ نے صحابہ کو سر منڈا کر احرام سے فارغ ہو جانے کا حکم دیا اور صحابہ پر اس کی تعمیل بڑی ناگوار گزری تو آپ ناراض ہوئے اور سب سے پہلے احرام چھوڑ دیا صحابہؓ نے بھی بہت جلدی آپ کی پیروی کی۔

صحابہ کی اطاعتِ رسول کا یہ عالم تھا کہ جو کام آپ کرتے وہی صحابہ کرتے اور جس کام کو ترک کر دیتے، صحابہ بھی اس کو چھوڑ دیتے۔ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی علت دریافت کرتے اور نہ حکمت و مصلحت کے بارے میں پوچھتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی بنوائی، صحابہؓ نے بھی سونے کی انگوٹھیاں بنوا لیں۔ پھر آپؐ نے یہ کہہ کر اپنی انگوٹھی پھینک دی کہ "میں ہرگز اسے نہیں پہنوں گا" صحابہؓ نے بھی اپنی انگوٹھیاں پھینک دیں۔ (بخاری)

قاضی عیاضؒ "الشفاء" میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو نماز پڑھا رہے تھے کہ اچانک حالت نماز میں آپ نے جوتے اُتار کر بائیں جانب رکھ دیے۔ جب لوگوں نے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے جوتے اُتار دیے۔ جب حضورؐ نماز سے فارغ ہوئے تو دریافت فرمایا "آپ نے اپنے جوتے کیوں اُتارے؟ لوگوں نے کہا "ہم نے دیکھا کہ آپ نے جوتے اُتار دیے ہیں۔ ہم نے بھی اپنے جوتے اُتار دیے" فرمایا "مجھے جبریل نے اطلاع دی تھی کہ ان میں نجاست لگی ہے۔"

(شفاء قاضی عیاض)

ابن سعد نے "طبقات" میں ذکر کیا ہے کہ آپ نے صحابہ کو مسجد نبوی میں ظہر کی ... پھر آپ کو کعبہ کی جانب رُخ کرنے کا حکم دیا گیا۔ آپ اسی حالت میں جانب کعبہ مڑ گئے آپ کو دیکھ کر سب صحابہ بھی کعبہ کی جانب پھر گئے۔

(طبقات کبریٰ، ج ۲۔ ص ۷)

حضرات صحابہؓ کے جذبۂ اطاعتِ رسول کی یہ حالت تھی کہ دنیوی امور و افعال میں بھی آپ کی اطاعت کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ میں آیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سنے کہ "لوگو بیٹھ جاؤ" لوگ یہ سن کر مسجد کے دروازہ پر اسی جگہ بیٹھ گئے، جہاں یہ الفاظ

سنتے تھے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ کو دروازہ پر بیٹھے دیکھ لیا۔ فرمایا "عبداللہ بن مسعود آگے آؤ"۔ (ابوداؤد و ابن عبدالبر)

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات صحابہ کا یہی طرز عمل رہا۔ وہ آپ کے ہر قول و فعل اور تقریر کو ایک واجب الاتباع شرعی حکم تصور کرتے رہے۔ ایک صحابی بھی ان سے مختلف الخیال نہ تھا اور نہ حکم قرآن کی خلاف ورزی کو جائز سمجھتا تھا۔ جب آپ کسی بات کا حکم دیتے تو صحابہ بلا چون وچرا اس کی تعمیل کیا کرتے تھے۔ البتہ مندرجہ ذیل صورتوں میں آپ کے حکم کی حکمت ومصلحت دریافت کیا کرتے تھے۔

(۱) جب آپ کا قول وفعل کسی دنیوی معاملہ کے بارے میں اجتہاد پر مبنی ہوتا جس طرح حضرت حُباب بن مُنذر رضی اللہ عنہ نے اسلامی فوج کے اترنے کی جگہ کے بارے میں آپ سے اختلاف کیا تھا۔

(۲) جب کسی دینی معاملہ میں حکم خداوندی نازل ہونے سے پہلے آپ اجتہاد فرماتے، جس طرح حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر کے قیدیوں اور صلح حُدَیبیہ کے موقع پر آپ سے مختلف رائے پیش کی تھی۔

(۳) جب آپ کوئی ایسی بات فرماتے جو صحابہ کے لیے انوکھی اور نرالی ہوتی تو صحابہ آپ سے اس کی حکمت ومصلحت دریافت کیا کرتے تھے۔

(۴) جب صحابہ سمجھتے کہ فلاں فعل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مختص ہے تو اس کو اپنے لیے واجب الاتباع تصور نہیں کیا کرتے تھے۔

(۵) جب آپ کسی بات کا حکم دیتے اور صحابہ خیال کرتے کہ آپ نے یہ حکم بیان اباحت وجواز کے لیے دیا ہے اور جس بات کا حکم آپ نے نہیں دیا وہ اس سے افضل ہے تو وہ ایسے حکم کو لازم الاتباع نہیں سمجھتے تھے۔

مندرجہ صدر امور واحکام کے علاوہ صحابہ بلا شرط وقید آپ کے ہر حکم کی کامل اطاعت کرتے تھے

وجوب اطاعتِ رسول بعد از وفات :

جس طرح قرآن میں مذکور حکمِ خداوندی کے پیشِ نظر صحابہ کرام رض پر رسول کریم ص کی پیروی اور اطاعت آپ کی زندگی میں فرض تھی۔ اسی طرح آپ کی وفات کے بعد صحابہ اور تمام اہل اسلام پر آپ کی سنت کا اتباع فرض ہے۔ اس لیے کہ جن نصوص میں آپ کی اطاعت کو ضروری قرار دیا گیا ہے عام ہیں۔ نہ ان میں عہدِ رسالت کی تخصیص پائی جاتی ہے اور نہ اس بات کی تصریح کہ یہ حکم صرف صحابہ کو دیا گیا ہے۔ نیز اس لیے کہ صحابہ اور ان کے بعد آنے والوں کے درمیان یکساں قسم کی علت پائی جاتی ہے۔ اور وہ علت یہ ہے کہ صحابہ کے بعد آنے والے لوگ انہی کی طرح آنحضورؐ کے پیرو ہیں اور ان کو بھی آپ کی پیروی و اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ مزید براں حیات و وفات کے مابین بھی علت متحد ہے کیونکہ آپ کے اقوال و افعال اور احکام ایک ایسی صاحبِ شریعت معصوم ہستی سے صادر ہوئے جس کی اطاعت کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اس لیے آپ کی حیات و وفات سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

حدیثِ مُعاذ :

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں بھی اپنی سنت کے اتباع کا حکم دیا تھا جب ایک مسلم آپ کے پاس موجود نہ ہو؛ چنانچہ جب آپ نے حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تو دریافت فرمایا:۔

> "جب کوئی معاملہ پیش آئے گا تو کیسے فیصلہ صادر کریں گے"؟ حضرت معاذ نے عرض کیا "کتاب اللہ کی روشنی میں فیصلہ کروں گا"۔ فرمایا اگر اس کا حل کتاب اللہ میں نہ ہو تو پھر؟ عرض کیا "تو پھر سنت رسول کے مطابق" فرمایا "اگر سنت اس کا حل نہ پیش کرتی ہو تو پھر"؟ معاذ نے کہا "تو پھر اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑوں گا"
> آپ نے معاذؓ کے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا "سب تعریف خدا کے لیے ہے جس نے رسولِ خدا کے فرستادہ کو ایسی بات کی توفیق عطا کی جس سے خدا کا رسول راضی ہو"

(احمد - ابو داؤد - ترمذی - دارمی - ابن عبد البر - ابن سعد فی الطبقات - بیہقی فی المدخل)

وجوب العمل بالحدیث پر مشتمل احادیث :

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں اپنی وفات کے بعد سنّت پر عمل کرنے کو واجب قرار دیا ہے ۔ یہ احادیث اس قدر زیادہ ہیں کہ تواتر معنوی کی حد تک پہنچ جاتی ہیں۔

چند احادیث ملاحظہ ہوں :-

(۱) عبداللہ بن عمر بن عوف اپنے باپ سے اور وہ اس کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

"میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں، جب تک انہیں تھامے رکھو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے وہ اللہ کی کتاب[1] اور میری سنّت[2] ہے "

اس حدیث کو بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے ۔ (جامع بیان العلم، ج ۲ ص ۲۴)

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں ۔ کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

"جو چیز خدا کی کتاب میں موجود ہو اس کو کسی عذر کی بناء پر ترک نہیں کیا جا سکتا اور اگر کوئی چیز کتابِ خداوندی میں موجود نہ ہو تو نبی کی سنت پر عمل کیا جائے ۔" (صحیح مسلم)

(۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضورؐ نے فرمایا " انکار کرنے والے کے سوا ہر شخص جنت میں جائے گا " صحابہ نے عرض کیا " اے اللہ کے رسول ! انکار کون کرتا ہے ؟ " فرمایا " جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا ۔" (بخاری و حاکم)

(۴) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا :

"شیطان تمہارے علاقہ میں معبود بنائے جانے سے مایوس ہو چکا ہے مگر اس بات پر خوش ہے کہ جن باتوں کو تم کچھ اہمیت نہیں دیتے ان کے بارے میں اس کی اطاعت

کی جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے چھوٹے کاموں سے بچا کرو۔ میں تمہارے اندر وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم اس سے وابستہ رہے تو گمراہ نہ ہوگے۔ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت ہے۔" (حاکم)

(۵) عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی پھر اس کے بعد ایسا پرتاثیر وعظ کہا کہ آنکھوں سے آنسوؤں کے دھارے بہنے لگے اور دل کانپنے لگے۔ صحابہ نے عرض کیا "حضور! یہ تو آخری وعظ معلوم ہوتا ہے کچھ وصیت فرمائیے" آپ نے فرمایا:-

"تمہارا امیر اگر حبشی غلام بھی ہو تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ میرے بعد جس کو جینا نصیب ہوا وہ بڑا اختلاف دیکھے گا۔ تم نے میری اور میرے راست رَو ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت کو نہ چھوڑنا ہوگا۔ سنت سے چمٹے رہنا اور بدعتوں سے بچنا اس لیے کہ ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔"

(جامع بیان العلم۔ ج ۲۔ ص ۱۸۲۔ ترمذی۔ ابوداؤد۔ احمد۔ ابن ماجہ)

ابونعیم کہتے ہیں کہ شامی رواۃ سے مروی یہ حدیث بہت اچھی (جیّد) ہے۔ چونکہ سنّت رسولؐ اگلے ادوار میں آنے والے لوگوں کے لیے صحابہ کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت تھی۔ اس لیے صحابہ حدیث نبوی کی تبلیغ واشاعت کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ آنحضورؐ نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں اشاعتِ حدیث کی ترغیب دلائی:-

رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مَقَالَتِي	خدا اس شخص پر رحم فرمائے جس نے میری بات
فَأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا وَرُبَّ مُبَلَّغٍ	سُنی اور اسے جُوں کا تُوں آگے پہنچا دیا جن کو
أَوْعَىٰ مِنْ سَامِعٍ۔	بات پہنچائی جاتی ہے ان میں بہت سے ایسے

ہوتے ہیں کہ وہ براہ راست سننے والوں سے بھی زیادہ یاد رکھتے ہیں۔

(جامع بیان العلم ج ۱۔ ص ۳۹۔ نیز ابن حبان۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ بیہقی)

صحابہؓ کے یہاں اخذ حدیث کا طرز و انداز:

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ اور ان کے درمیان کوئی ستر و حجاب حائل نہ تھا۔ گویا آپ کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی۔ آپ ان سے مسجد و بازار گھر اور سفر و حضر میں ملتے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم آپ کے افعال و اقوال کو بڑی قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ضلالت و ظلمت سے نکال کر ہدایت و نور کی جانب رہنمائی فرمائی تھی آپ کی ذات گرامی ان کی دینی و دنیوی زندگی کا مرکز و محور بن کر رہ گئی تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی طلب و تلاش کے سلسلہ میں بعض صحابہ کی حرص کا یہ عالم تھا کہ ہر روز باری باری آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے۔ امام بخاری حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے بسند متصل روایت کرتے ہیں کہ میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی مدینہ کی بالائی جانب رہتے تھے۔ ہم نے باہم یہ طے کر رکھا تھا کہ ایک دن وہ اور ایک دن میں بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا کریں گے۔ چنانچہ ہم میں سے ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور جو بات چیت سنتا، اُس سے دوسرے کو آگاہ و آشنا کر دیتا۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صحابہ حضور کو اپنا رہنما و پیشوا تصور کرتے تھے اور آپ کے آراء و افعال کو اتباع و اطاعت کے نقطۂ خیال سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ حقیقت محتاج دلیل نہ تھی کہ آپ کی پیروی واجب اور آپ کے اوامر و نواہی کی تعمیل ایک ناگزیر امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے جو قبیلے مدینہ سے دُور بود و باش رکھتے تھے وہ اسلامی احکام سیکھنے کے لیے بعض افراد کو آپ کی خدمت میں بھیجتے۔ وہ واپس جا کر لوگوں کو شرعی احکام سکھایا کرتے تھے۔

بعض صحابہ صرف ایک شرعی مسئلہ دریافت کرنے کے لیے مسافتِ بعیدہ طے کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنی ضرورت پوری کر کے کسی اور جانب توجہ دیئے بغیر

واپس لوٹ جاتے۔ امام بخاریؒ اپنی صحیح میں حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ کسی عورت نے انہیں بتایا کہ اس نے عقبہ اور ان کی بیوی دونوں کو دودھ پلایا ہے عُقبہ اسی وقت مکہ سے عازم مدینہ ہوئے اور اس شخص کے بارے میں شرعی حکم دریافت کیا جو لاعلمی میں اس عورت سے نکاح کرے جو اس کی رضاعی بہن ہو اور دودھ پلانے والی ان دونوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرے۔ حضورؐ نے فرمایا "جب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے تو آپ نکاح کے باقی رہنے کی صورت کیا ہے"؟ چنانچہ عقبہ نے طلاق دے دی اور اس نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا۔

صحابہؓ کی یہ عادت تھی کہ وہ امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہنَّ سے عائلی مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ ہم قبل ازیں اس صحابی کا واقعہ بیان کر چکے ہیں جس نے اپنی بیوی کو تقبیل صائم کا مسئلہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ حالتِ روزہ میں اس طرح کر لیا کرتے تھے۔

عورتیں امہات المومنینؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر طبقۂ نسواں سے متعلق مسائل دریافت کیا کرتی تھیں۔ جب عورتوں کے سامنے کسی نسوانی مسئلہ کی تشریح آپ کے لیے ممکن نہ ہوتی تو آپ اپنی بیویوں میں سے کسی کو یہ مسئلہ سمجھانے کے لیے مامور فرماتے۔ ایک عورت نے آپ سے دریافت کیا کہ وہ حیض سے طہارت کیونکر حاصل کرے؟ آپ نے فرمایا "کپڑے کا ایک خوشبودار ٹکڑا لے کر اس کے ساتھ پاکیزگی حاصل کر لیا کرو" عورت نے پوچھا "کیسے طہارت حاصل کروں؟" آپ نے پھر وہی الفاظ دہرائے۔ وہ عورت پھر بھی نہ سمجھ سکی۔ آپ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو سمجھانے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے تعمیل ارشاد کر دی کہ صاف روئی کا ایک ٹکڑا لے کر اسے خون نکلنے کی جگہ پر رکھو اگر خون کا رنگ سفید ہو تو یہ طہارت کی علامت ہے۔ (بخاری مسلم ونسائی از عائشہ)

البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال اقوال کے سلسلہ میں تمام صحابہ کا مبلغِ علم یکساں

نہ تھا۔ ان میں شہری بھی تھے اور دیہاتی بھی۔ آجر بھی تھے اور مستاجر بھی مقیم بھی تھے اور مسافر بھی ایسے زاہد شب زندہ دار بھی تھے جن کو عبادت کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم شاذونادر ہی ایسی عام مجلس میں تعلیم و تدریس کے لیے بیٹھتے تھے جس میں تمام صحابہؓ شرکت کر سکیں۔ البتہ عیدین اور جمعہ کے دن یا گاہے گاہے ایسا ہوتا تھا کہ آپ عمومی مجلس میں تشریف فرما ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "ہمیں کچھ دنوں کے ناغہ سے وعظ و نصیحت فرمایا کرتے مبادا ہم اکتا جائیں"۔ (بخاری)

مشہور تابعی حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

"میں صحابۂ رسولؐ کی صحبت میں بیٹھا ہوں۔ میں نے ان کو حوض کی طرح پایا۔ بعض حوض ایسے ہوتے ہیں جو صرف ایک آدمی کو سیر کر سکتے ہیں۔ بعض دو کو۔ بعض دس آدمیوں کو۔ بعض ایک سو کو اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ اگر سب اہل زمین پانی پینے آجائیں تو سب کو سیراب کر دیں"۔

یہ فطری بات ہے کہ صحابہؓ میں سنتِ رسولؐ کے سب سے بڑے عالم وہ صحابہؓ تھے جن کو سبقتِ اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ مثلاً خلفاء اربعہ اور عبداللہ بن مسعودؓ یا وہ صحابہؓ جو زیادہ عرصہ آپؐ کی صحبت و رفاقت میں رہے۔ اور آپ کی احادیث تحریر کر لیا کرتے تھے۔ جیسے ابوہریرہؓ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

عہد رسالت میں عدمِ تدوینِ حدیث کے وجوہ:

علماءِ سیرت و سنّت اور جمہور اہل اسلام اس ضمن میں متحد الخیال ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ نے قرآن کریم کے ساتھ بے حد اعتناء کیا تھا جس کے نتیجہ میں اسے سینوں سفینوں چمڑے کے ٹکڑوں شاخوں اور پتھر کی سلوں پر لکھ کر محفوظ کر لیا گیا تھا۔ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عالمِ جاودانی کو تشریف لے گئے تو قرآن یوں تو ہر لحاظ سے محفوظ و مرتب تھا۔

البتہ اسے کتابی صورت میں یکجا نہیں کیا گیا تھا۔

البتہ حدیث کا معاملہ یکسر مختلف تھا۔ حالانکہ عہد رسالت میں حدیث کو فقہ اسلامی کے مصادر میں ایک اہم مقام حاصل ہو چکا تھا۔ اس سے ایک شخص بھی اختلاف نہیں کر سکتا کہ قرآن کی طرح حدیث کی تدوین عہد رسالت میں تکمیل پذیر نہیں ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیئیس ۲۳ برس صحابہ کے درمیان بقید حیات رہے۔ اس لیے آپ کے اقوال و اعمال اور کلمات و معاملات کو صحیفوں اور چمڑے کے ٹکڑوں میں مدوّن کرنا یک گونہ دشوار تھا۔ اس کٹھن کام کے لیے صحابہ کی ایک کثیر جماعت کا فارغ ہونا ضروری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر محتاج دلیل نہیں کہ عہد رسالت میں لکھنے والوں کی تعداد اس قدر کم تھی کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ چونکہ قرآن فقہ اسلامی کا مصدر اساسی اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معجزہ تھا اس لیے لکھنے والوں کی توجہات کا مرکز و محور قرآن کریم تھا، حدیث نہ تھی کاتبینِ وحی کا منشاء و مقصد یہ تھا کہ قرآن کریم کو اس طرح محفوظ و منضبط کر دیں کہ اس میں ایک حرف کی بھی کمی نہ رہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عربوں کا حافظہ ضرب المثل کی حد تک مشہور تھا۔ عرب جس چیز کو محفوظ کرنا چاہتے تھے اس کو اپنے حافظہ میں جگہ دیتے۔ چونکہ قرآن قسط وار تدریجاً چھوٹی چھوٹی آیتوں اور سورتوں میں نازل ہوا تھا۔ اس لیے اس کو سینوں اور سفینوں میں محفوظ کرنا آسان تھا۔ بخلاف ازیں حدیث نبوی مختلف اطراف و اکناف میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں آپ کے قولی اقوال بھی تھے اور وہ بھی جو آغازِ رسالت سے لے کر تادم واپسیں آپ نے ارشاد فرمائے اندریں صورت اگر قرآن کی طرح حدیث کو بھی مدوّن کر لیا جاتا تو تحفظِ قرآن کے پہلو بہ پہلو صحابہ کی توجہ تحفظِ حدیث کی جانب بھی مبذول و منعطف ہو جاتی۔ اور اس میں جو حرج تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ علاوہ ازیں تدوینِ حدیث میں یہ خطرہ بھی دامن گیر تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریعی حِکَم و نصائح پر مشتمل موجز و مختصر اقوال غیر شعوری طور پر قرآنی آیات کے ساتھ گڈ مڈ ہو جاتے

ظاہر ہے کہ اس سے دشمنان دین کو قرآن کریم پر شکوک و شبہات وارد کرنے کا موقع مل جاتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اعداء دین اس درّہ سے داخل ہو کر مسلمانوں کو یہ مشورہ دینے لگتے کہ جو کتاب ہی سرے سے مشکوک ہو اس پر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

علماء نے عہد رسالت میں عدم تدوین حدیث کے اور بھی بہت سے اسباب و وجوہ بیان کیے ہیں۔ اس سے یہ راز خود بخود منکشف ہو جاتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بروایت ابو سعیدؓ خدری کس بناء پر یہ حکم صادر کیا تھا کہ "قرآن کے سوا مجھ سے سن کر کچھ نہ لکھو اور جس نے لکھا ہو وہ مٹا دے" (صحیح مسلم)

عہد رسالت میں کتابتِ حدیث:

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ عہد رسالت میں کتابت حدیث کا کام سرے سے کیا ہی نہیں گیا تھا .. بلکہ صحیح سے ثابت ہے کہ کتابتِ حدیث کی داغ بیل عہد رسالت ہی میں پڑ گئی تھی اگرچہ یہ ایسی تدوین نہ تھی جس طرح قرآن مدوّن ہو چکا تھا۔ امام بخاری نے کتاب العلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قبیلہ خُزاعہ والوں نے فتح مکہ والے سال اپنے ایک مقتول کے عوض بنو لیث کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو اونٹنی پر سوار ہوئے اور خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

> "اللہ تعالیٰ نے مکہ سے اصحاب الفیل یا قتل کو روک دیا تھا۔ (امام بخاری کو اس امر میں شک ہے کہ آیا آپ نے فیل کا لفظ فرمایا یا قتل کا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو مکہ پر مسلط کیا۔ حرم کو نہ اس سے قبل کسی کے لیے حلال کیا گیا اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال کیا جائے گا۔ میرے لیے حرم کو دن کے چند گھنٹوں کے لیے حلال کیا تھا اور اب پھر وہ حسب سابق حرام ہو چکا ہے۔ حدودِ حرم میں نہ کانٹوں کو توڑا جائے نہ درختوں کو کاٹا جائے۔ نہ یہاں کی گری پڑی چیز اُٹھائی جائے۔ البتہ اس شخص کو اجازت ہے جو گری ہوئی چیز کو شہرت دینا چاہتا ہو جس

قوم کا کوئی شخص مارا جائے اس کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے۔ یا تو قاتلوں سے قصاص لے لیں یا دیت۔ ایک یمنی شخص نے حاضر ہو کر کہا: "حضور! مجھے لکھوا دیجیے"۔ آپ نے فرمایا "ابو شاہ کو (میرا یہ خطبہ) لکھ دو"۔ (صحیح بخاری)

اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین و امراء عصر کی جانب دعوت اسلام پر مشتمل خطوط تحریر کروائے تھے۔ (طبقات ابن سعد، ج ۲، ص ۲۲-۵۶)

آپ فوجی دستوں کو اطرافِ ملک میں بھیجا کرتے تھے۔ ان کو خط دیتے اور فرماتے کہ منزل مقصود پر پہنچ کر اسے پڑھیں۔ اسی طرح بعض صحابہؓ کے پاس صحیفے تھے جن میں آنحضورؐ سے حدیثیں سُن کر وہ لکھ لیا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس کو صادقہ کہا کرتے تھے۔ امام احمدؒ نے مسند میں اور بیہقی نے المدخل میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ "صحابہؓ میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ کے سوا مجھ سے بڑھ کر کوئی عالم حدیث نہ تھا۔ بات یہ تھی کہ عبداللہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا"۔

بعض صحابہ نے حضرت عبداللہؓ کی کتابت حدیث پر معترض ہو کر کہا تھا کہ "آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات لکھ لیتے ہیں۔ حالانکہ بعض اوقات آپ ناراض ہوتے ہیں اور وہ باتیں فرماتے ہیں جن کو شریعت کا درجہ حاصل نہیں۔ حضرت عبداللہؓ نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا:

"میری باتیں لکھتے جائیے! مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میرے منہ سے حق کے سوا کوئی بات نہیں نکلتی"۔ (جامع بیان العلم۔ ج ۱۔ ص ۷۶)

جواز و منع کتابتِ حدیث پر مشتمل روایات میں جمع و تطبیق

علماء کے مابین یہ امر مختلف فیہ رہا ہے کہ جن روایات میں کتابتِ حدیث سے روکا گیا ہے اور جن میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے دونوں کے مابین جمع و تطبیق کیونکر ممکن ہے؟

(۱) اکثر علماء کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ پہلے آپ نے کتابت حدیث سے منع کیا تھا پھر اجازت دے کر حکم سابق کو منسوخ کر دیا۔

(۲) بعض علماء کا قول ہے کہ جو لوگ قرآن و سنت کے مابین فرق و امتیاز کی اہلیت و صلاحیت سے محروم تھے اور یہ خطرہ دامن گیر تھا کہ یہ دونوں کو باہم گڈ مڈ کر دیں گے ان کو حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا۔ اور جن سے غلط و خلط کے وقوع پذیر ہونے کا خطرہ نہ تھا ان کو اجازت دے دی۔

مگر میری ذاتی رائے اس سے مختلف ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں قسم کی احادیث میں سرے سے کوئی تناقض و تضاد موجود ہی نہیں۔ میرے خیال میں ممانعت پر مشتمل احادیث میں قرآن کی طرح حدیث کو باقاعدہ رسمی طور پر مدوّن کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ بخلاف ازیں ان حدیثوں کو لکھنے کی اجازت دی گئی جو خاص معاملات و احوال سے متعلق تھیں۔ یا ان صحابہ کو کتابتِ حدیث کی اجازت سے بہرہ ور کیا گیا جو ذاتی طور پر اپنے لیے احادیث رقم کیا کرتے تھے۔ خطیب بغدادی تقیید العلم میں ضحاک کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ:

"حدیثیں لکھنے کے لیے رجسٹر نہ بناؤ، جس طرح قرآن مجید رقم کرنے کے لیے تم نے رجسٹر بنا رکھے ہیں" (تقیید العلم ص ۴۷)

جن روایات میں کتابتِ حدیث سے منع کیا گیا ہے ان میں غور و فکر کرنے سے بھی میرے نظریہ کی تائید ہوتی ہے کیونکہ یہ حکم عام تھا اور سب صحابہ کو دیا گیا تھا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب خاص حالات میں اور خاص اشخاص کو کتابتِ حدیث کی اجازت دی گئی تھی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حرمت کا حکم تاہنوز باقی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عبداللہ کو صحیفہ لکھنے کی اجازت دینا اور وفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کا اس کام کو جاری رکھنا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ آپ نے کتابتِ حدیث کی اجازت دے دی تھی بشرطیکہ اسے قرآن کریم کی طرح باقاعدہ

مدون نہ کیا جانے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے بھی اذنِ کتابت کا پتہ چلتا ہے کہ جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو فرمایا:

"لکھنے کا سامان لاؤ، تاکہ میں تمہیں وہ بات لکھوا دوں جس کی موجودگی میں تم گمراہ نہ ہوسکو گے"۔ (بخاری)

مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آپ سخت درد و کرب میں مبتلا ہیں آپ کو تکلیف دینا مناسب نہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا آخری حکم اذنِ کتابت ہی پر مشتمل تھا۔ سید رشید رضا مرحوم کی یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کہ آپ نے پہلے اجازت دی تھی۔ پھر منع کر کے اجازت کو منسوخ قرار دیا۔ (مجلہ المنار مجلد ۱۰)

وفاتِ رسولؐ کے بعد حدیث کے بارے میں صحابہ کا موقف:

ہم قبل ازیں ابوداؤد و ترمذی میں بروایت زید بن ثابت ذکر کردہ یہ حدیث بیان کر چکے ہیں کہ آپ نے فرمایا تھا:

نضّر اللہ امرأً سمع منّی مقالتی	اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب رکھے جس
فحفظها و وعاها فادّاها كما	نے میری بات سنی اسے خوب یاد رکھا اور
سمعها فربّ مبلّغ اوعیٰ من	جیسے سنا تھا جوں کا توں اسے آگے پہنچا دیا
سامع (ابوداؤد۔ ترمذی)	کیوں کہ جن لوگوں کو وہ بات پہنچائی جاتی ہے
	ان میں سے بہت سے براہ راست سننے والوں سے بھی زیادہ یاد رکھتے ہیں

ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا:۔

"الا لیبلّغ الشاهدُ منكم الغائبَ"	تم میں سے جو شخص موجود ہو وہ ان کو پہنچا دے
(جامع بیان العلم۔ ج ۱۔ ص ۱۴۱)	جو موجود نہ ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو مامور فرمایا تھا کہ جو کچھ آپ سے سنیں بکمال ذمہ داری اس کو دوسروں تک پہنچا دیں۔

ارشاد فرمایا :-

کفیٰ بالمرء إثماً ان یحدث بکل ماسمع — آدمی کے لیے یہی گناہ کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے آگے بیان کر دے۔ (مسلم از ابو ہریرہ)

بنابریں صحابہ کے لیے تعمیل ارشاد گرامی اور امانتِ رسولؐ کا لوگوں تک پہنچانا ایک لابدی فریضہ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حضرات صحابہ مختلف دیار و بلاد میں پھیل گئے۔ اور اس طرح تابعین کا مرکز و محور قرار پائے تھے۔ تابعین احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں دور دراز کا سفر طے کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس نعمتِ غیر مترقبہ سے بہرہ اندوز ہوتے۔

یہ تھے وہ عوامل جو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نشر و اشاعت اور جمہور اہل اسلام تک اس کے پہنچنے میں کارفرما تھے۔ مگر یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ حدیث کے سلسلہ میں سب صحابہ کا مبلغ علم یکساں نہ تھا۔ ان میں کثیر الحدیث اور قلیل الحدیث سبھی قسم کے لوگ موجود تھے قلیل الروایت صحابہ میں حضرت زبیر، زید بن ارقم اور عمران بن حُصَین رضی اللہ عنہم جیسے بزرگ شامل تھے۔

قلیل الروایت صحابہ :

امام بخاری کتاب العلم میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد حضرت زبیرؓ سے دریافت کیا، کیا بات ہے کہ آپ فلاں صحابی کی طرح حدیثیں روایت نہیں کرتے؟ فرمایا "مجھے آپ کی صحبت و رفاقت کی سعادت تو حاصل رہی لیکن میں نے آپ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:

"جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے"

امام ابن ماجہ سنن میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے کہا جاتا "ہمیں حدیث سنائیے" وہ اس کے جواب میں کہتے "ہم بوڑھے ہو کر حدیثیں بھول گئے۔

روایت حدیث کا معاملہ بہت کٹھن ہے"۔

حضرت سائبؓ بن یزید کہتے ہیں کہ میں مدینہ سے چل کر مکہ تک حضرت سعدؓ بن مالک کا رفیق سفر رہا۔ میں نے دوران سفر ان سے ایک حدیث بھی نہ سُنی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا یہ حال تھا کہ جب حدیث بیان کرتے تو آخر میں کہتے "او کما قال" (یا جیسے آپ نے فرمایا) مبادا وہ آپ کے ذمہ وہ الفاظ لگا دیں جو آپ نے نہیں فرمائے۔

حضرات صحابہ کے یہ بیانات اس امر کے آئینہ دار ہیں کہ وہ غلطی سرزد ہونے کے خوف سے کثرت روایت سے پرہیز کیا کرتے تھے۔ حضرت زبیرؓ اور زیدؓ بن ارقم کا طرز عمل اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ کچھ یوں دکھائی دیتا ہے کہ ایسے صحابہ کی قوتِ حافظہ ان کا ساتھ نہ دیتی تھی اور وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سُن کر بعینہٖ ان کو نقل و روایت کرنے پر قادر نہ تھے۔ اس لیے خدا کے دین میں حزم و احتیاط کا یہ تقاضا تھا کہ وہ کثیر الروایت نہ ہوتے۔

مزید براں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ذاتی خواہش یہ تھی کہ لوگ احادیث میں منہمک ہو کر قرآن سے غافل نہ ہو جائیں۔ قرآن ابھی تازہ تازہ نازل ہو رہا تھا۔ مصلحتِ وقت کا تقاضا تھا کہ مسلمان اسے یاد کریں اسے دوسروں تک پہنچائیں اس میں احتیاط سے کام لیں اور اس کے درس و مطالعہ میں دلچسپی لیں۔

شعبی حضرت قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم عازم عراق ہوئے تو حضرت عمرؓ مقام صرار تک ہمارے رفیق سفر رہے۔ وہاں پہنچ کر آپ نے وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کی، پھر فرمایا:

"کیا تمہیں معلوم ہے میں کس لیے یہاں تک تمہارے ساتھ آیا ہوں؟ لوگوں نے کہا "جی ہاں! اس لیے کہ ہم اصحاب رسولؐ ہیں آپ احتراماً ہمارے ساتھ تشریف لائے ہیں" آپ نے فرمایا "تمہارا گزر ایسی بستی پر ہو گا جہاں سے تلاوتِ قرآن کی آواز ایسے سنائی دے گی جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوتی ہیں۔ ان کو قرآن سے ہٹا کر

حدیث میں نہ لگادیں۔ قرآن کو اچھی طرح پڑھا کرو اور رسول اللہ سے حدیثیں کم روایت کیا کرو۔ جاؤ میں تمہارا رفیقِ سفر ہوں۔" جب حضرت قرظہؓ قریب پہنچے تو لوگوں نے حدیثیں سننے کا تقاضا کیا قرظہؓ نے کہا حضرت عمرؓ نے ہمیں حدیثیں روایت کرنے سے منع کیا ہے۔

(جامع بیان العلم ج ۲۔ ص ۱۲۰)

کثیر الروایت صحابہ :

صحابہ میں کثیر الروایت بھی تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حدیث نبوی کا چلتا پھرتا مجسمہ تھے۔ ان کی کثرت روایت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے آنحضورؐ کی اخبار و احادیث سے مسلمانوں کے سینوں اور ان کی مجالس و محافل کا بھرپور و معمور کر دیا تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص اپنے صحیفہ سے حدیثیں سنایا کرتے تھے اس کا نام انہوں نے "صادقہ" رکھا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ طلب حدیث کے سلسلہ میں کبار صحابہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اس ضمن میں طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہوتے۔

ابن شہاب زُہری حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں :۔

"ہمیں پتہ چلتا کہ فلاں صحابی کے پاس کوئی حدیث موجود ہے۔ اگر میں چاہتا تو بڑی آسانی سے پیغام بھجوا کر ان کو بلا لیتا اور ان سے حدیث سنتا مگر میں یوں نہیں کرتا تھا۔ میں خود ان کے دروازہ پر حاضری دیتا۔ اور اگر ان کے آنے میں دیر ہوتی تو دروازہ ہی پر سو جاتا اور وہ آکر مجھے حدیث سناتے۔" (جامع بیان العلم ج ۱۔ ص ۹۴)

اس طرح طلب حدیث کے سلسلہ میں حضرت ابن عباس لاتعداد صعوبات و تکالیف سے دوچار ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کے پاس جو احادیث تھیں وہ انہوں نے یاد کر لیں اور بڑی کشادہ دلی اور فراوانی سے انہیں پھیلانے لگ گئے۔ جس زمانہ میں وضع احادیث کا فتنہ اُٹھا حضرت ابن عباس نے اس دَور میں حدیث روایت کرنے میں کافی حد تک کمی کر دی تھی۔

امام مسلم نے مقدمہ صحیح مسلم میں روایت کیا ہے کہ بشیر بن کعب عبداللہ بن عباسؓ کے پاس

آکر حدیثیں سنانے لگے۔ ابن عباس نے کہا فلاں حدیث دہرائیے۔ بشیر نے تعمیل ارشاد کر دی اور کہا "میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آیا میری بیان کردہ سب حدیثوں کو آپ نے صحیح قرار دیا اور اس حدیث سے انکار کیا؟ یا سب احادیث کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور صرف ایک حدیث کو درست سمجھا"؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

"ہم اس زمانہ میں حدیثیں روایت کیا کرتے تھے جب آپ پر جھوٹ نہیں باندھا جاتا تھا۔ جب ہر کس و ناکس نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ہم نے حدیث روایت کرنا ترک کر دیا۔" (مقدمہ صحیح مسلم)

بعض صحابہ کس قدر بھی کثیر الروایت ہوں اس میں شبہ نہیں کہ خلافت صدیقی و فاروقی میں وہ زیادہ حدیثیں نقل و روایت نہیں کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ یہ دونوں بزرگ ایک طرف تو احادیث کی روایت میں مسلمانوں کو حزم و احتیاط پر آمادہ کرتے تھے۔ اور دوسری جانب قرآن کی طرف متوجہ ہونے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ خلافتِ فاروقی میں حدیثیں روایت کیا کرتے تھے؟ کہنے لگے "اگر میں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے اپنے دُرّہ سے پیٹتے۔" (جامع بیان العلم ج ۱۔ ص ۱۲۱)

حدیث نبوی سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ کے موقف کے بارے میں اب دو بحثوں پر خیال آرائی ازبس ناگزیر ہے۔

(۱) کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کثرتِ روایت کے جرم میں کسی صحابی کو قید کیا تھا؟

(۲) کیا صحابی کی روایت قبول کرنے کے لیے صحابہ کچھ شرائط عائد کرتے تھے؟

اب ہم ان دونوں مباحث کے بارے میں باری باری اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں

کیا کثرتِ روایت کے جرم میں حضرت عمرؓ نے کسی صحابی کو قید کیا تھا؟

یہ بات زبان زدِ عام ہے کہ حضرت عمرؓ نے تین کبار صحابہ کو کثرتِ روایت کے جرم میں قید

کیا تھا۔ وہ صحابہ حسب ذیل تھے :

حضرت عبداللہ بن مسعود ۔ حضرت ابوالدرداء ۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہم ۔

میں نے معتبر کتب میں اس روایت کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی ۔

اس روایت کے مَن گھڑت ہونے کے آثار و دلائل واضح ہیں :

۱ ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ :

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قدیم الاسلام اور کبار صحابہ میں شامل تھے ۔ حضرت عمرؓ ان کی بہت عزت کرتے تھے ۔ جب فاروق اعظمؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان کو عراق بھیجا تو یہ کہہ کر اہل عراق کو ممنون کیا :۔

"میں نے اپنی ذات پر تم کو ترجیح دے کر عبداللہ کو تمہارے پاس بھیجا ہے "

فاروقی خلافت کے زمانہ میں آپ عراق میں مقیم رہے ۔ حضرت عمرؓ نے آپ کو شرعی مسائل و احکام سکھانے کے لیے عراق بھیجا تھا ۔ ظاہر ہے کہ بعض احکام قرآن سے ماخوذ و منقول ہوتے ہیں اور زیادہ تر حدیث نبوی سے ۔ پھر حضرت عمرؓ کثرت روایت کے جرم میں آپ کو قید کیسے کر سکتے تھے ، خصوصاً جب کہ آپ نے ان کو عراق بھیجا ہی اس لیے تھا کہ ان کو شرعی مسائل سکھائیں ۔

۲ ۔ ۳ ۔ حضرت ابوالدرداءؓ و ابوذرؓ :

یہ دونوں صحابی سرے سے کثیر الروایت تھے ہی نہیں ! ابوالدرداء ملک شام میں اسی طرح معلّم تھے جس طرح عبداللہ بن مسعود عراق میں ۔ ابوالدرداءؓ کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب وہ شام کے معلّم و فقیہ تھے تو حضرت عمر ان کو قید و بند میں کیسے ڈال سکتے تھے ، کیا کوئی صاحب عقل و خرد اس بات کو باور کر سکتا ہے کہ حضرت عمر کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عبداللہ اور ابوالدرداء حدیثوں کو چھپا کر رکھیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ احکام دین کو چھپانے کے مرتکب ہوتے ۔ جہاں تک حضرت ابوذرؓ کا تعلق ہے ان کی مرویات حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ احادیث کے مقابلہ میں پاسنگ کی حیثیت بھی نہیں رکھتیں ۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ابوذرؓ کو تو قید و بند میں ڈالا

جاتا مگر ابو ہریرہ رضؓ محفوظ رہتے ؟ اگر یہ کہا جائے کہ ابو ھریرہؓ حضرت عمر رضؓ کے خوف سے زیادہ حدیثیں روایت نہیں کرتے تھے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ پھر ابو ذر رضؓ کے نہ ڈرنے کی وجہ کیا تھی؟

خلاصۂ کلام یہ کہ جو صحابہ کثرت روایت میں معروف تھے مثلاً ابن عباس ابوھُریرہ عائشہ اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم عبداللہ بن مسعودؓ بھی ان میں شامل تھے۔ ان میں سے کسی کے بارے میں منقول نہیں کہ حضرت عمر رضؓ نے اس سے کچھ تعرض کیا ہو۔ بخلافِ ازیں روایات میں مذکور ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے جب زیادہ حدیثیں روایت کرنا شروع کیں تو حضرت عمر رضؓ نے فرمایا "کیا آپ اس وقت ہمارے ساتھ تھے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فلاں جگہ میں تشریف فرما تھے ؟" ابوہریرہؓ نے کہا "جی ہاں! میں نے آنحضورؐ کو یہ فرماتے سنا جس نے دانستہ مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے" یہ سن کر حضرت عمر رضؓ نے فرمایا " جب آپ نے خود ہی یہ حدیث ذکر کردی ہے تو جائیے حدیثیں روایت کیجیے"۔

یہ بات کسی طرح قرین عقل وقیاس نہیں کہ حضرت عمر رضؓ ابوہریرہؓ جیسے شخص سے تو کچھ تعرض نہ کریں جو صحابہ میں علی الاطلاق سب سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے تھے اور عبداللہ بن مسعودؓ، ابوالدرداء اور ابوذر جیسے قلیل الروایت صحابہ کو قید وبند میں ڈال دیں حالانکہ یہ کثرت روایت میں ہرگز معروف نہ تھے۔

میں عرصۂ دراز تک صحابہ کو قید کرنے والی روایت کے بارے میں مبتلائے شک رہا اور اصحابِ علم سے اس کے بارے میں دریافت کرتا رہا۔ حتیٰ کہ میں نے امام ابن حزم رحمہ اللہ کی کتاب "الاحکام" میں مندرجہ ذیل روایت پڑھی:

"حضرت عمر رضؓ سے مروی ہے کہ آپ نے عبداللہ بن مسعود ابوالدرداءؓ اور ابوذرؓ کو حدیثیں روایت کرنے کی وجہ سے قید کردیا"۔

محدث ابن حزم نے اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے راوی ابراہیم بن عبدالرحمٰن کا سماع حضرت عمر سے ثابت نہیں۔ امام بیہقی نے بھی یہی لکھا ہے۔ مگر یعقوب ابن

شیبہ اور طبری نے حضرت عمرؓ سے اس کا سماع ثابت کیا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ ابراہیم کا سماع حضرت عمرؓ سے ثابت نہیں۔ اس لیے کہ ابراہیم بن عبدالرحمٰن ۹۵ھ یا ۹۹ھ میں بعمر ۵ سال فوت ہوا۔ بنابریں وہ ۲۰ھ میں خلافتِ فاروقی کے اواخر میں پیدا ہوا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے اس قدر چھوٹی عمر میں حضرت عمرؓ سے کیسے یہ روایت سنی ہوگی اس لیے یہ روایت قابل اخذ و استناد نہ ہوگی۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

"اس روایت پر کذب و وضع کے آثار نمایاں ہیں۔ اس لیے کہ یا تو حضرت عمرؓ نے ان صحابہ کو وضع حدیث سے متہم کیا جو بجائے خود غلط ہے۔ بصورت دیگر اگر وہ صحابہ احادیثِ صحیحہ روایت کرتے تھے اور آپ نے اس سے منع کیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت عمرؓ نے حدیث نبوی کی نشر و اشاعت سے روکا اور اس کے چھپانے پر مجبور کیا جو اسلام کے خلاف ایک عظیم بغاوت ہے۔ حالانکہ حضرتِ فاروقِ اعظمؓ کا دامن اس سے پاک ہے اور کوئی مسلم یہ بات کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ وہ صحابہ متہم بالکذب نہ تھے اور آپ نے بلاوجہ ان کو قید و بند میں ڈالا تو یہ ایک عظیم ظلم ہے۔ اب جو شخص اپنے مذہبِ فاسد پر ایسی ملعون روایات سے استناد کرتا ہے وہ جونسا خبیث راستہ چاہے اپنے لیے اختیار کرے۔"

(الاحکام لابن حزم ج ۲۔ ص ۱۹۳)

کیا صحابہ قبول حدیث کے لیے کچھ شرائط ٹھہراتے تھے؟

(۱) حافظ ذہبی رحمہ اللہ "تذکرۃ الحفاظ" میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے سیر و سوانح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جناب صدیق رضؓ اولین شخص تھے جنہوں نے قبول حدیث کے سلسلہ میں حزم و احتیاط سے کام لینے کی طرح ڈالی۔ ابن شہاب زہری قبیصہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دادی ورثہ طلب کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر کے پاس آئی۔ آپ نے فرمایا

میں تیرے لیے کتاب اللہ میں کچھ نہیں پاتا اور نہ ہی میرے علم کی حد تک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرے لیے کچھ مقرر کیا ہے۔" پھر اس ضمن میں لوگوں سے دریافت کیا۔ حضرت مغیرہؓ نے کھڑے ہو کر کہا "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو ایک تہائی دیا کرتے تھے" حضرت صدیقؓ نے فرمایا "کوئی اور شخص اس بات کی شہادت دے گا؟ چنانچہ محمدؓ بن مسلمہ نے اس کی تائید کی حضرت ابوبکرؓ نے دادی کو تہائی ورثہ دلا دیا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

۲ - ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو دروازہ کے پس پردہ تین دفعہ سلام کہا۔ جب آپ نے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دی تو ابوموسیٰ واپس چلے گئے حضرت عمر نے بلا کر واپسی کی وجہ پوچھی۔ ابوموسیٰ اشعری نے کہا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ "جب تم میں سے کوئی شخص کسی کو سلام کہے اور اندر سے کوئی جواب نہ ملے تو لوٹ جائے۔" حضرت فاروقؓ نے فرمایا "اس کی شہادت پیش کیجیے ورنہ میں آپ کو سزا دوں گا" حضرت ابوموسیٰ صحابہ کی مجلس میں آئے تو ان کا رنگ زرد تھا۔ ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ وجہ پوچھی تو ابوموسیٰ نے ماجرا بیان کیا اور کہا کیا تم میں سے کسی نے یہ حدیث سنی ہے؟ ہم نے کہا ہم سب نے سنی ہے۔ ہم نے ابوموسیٰ کے ساتھ ایک آدمی کو بھیجا جس نے حضرت عمر کو اس سے آگاہ کیا۔ (مسلم)

۳ - حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے صحابہ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کا حمل ساقط کر دے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ مغیرہ نے کہا "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں ایک غلام یا لونڈی کا فیصلہ کیا تھا" حضرت عمرؓ نے کہا "اگر آپ سچے ہیں تو کوئی گواہ پیش کیجیے" مغیرہ کہتے ہیں کہ محمد بن مسلمہ نے شہادت دی کہ آنحضورؐ نے یہ فیصلہ صادر کیا تھا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

۴ - اسماء بن حکم فزاری بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سُنا:

"میں جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنتا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے

جو فائدہ پہنچانا ہوتا وہ پہنچاتا۔ جب کوئی اور شخص مجھے حدیث سناتا تو میں اسے قسم دیتا۔ اگر وہ قسم کھاتا تو میں اس کی تصدیق کرتا۔ مجھے ابو بکرؓ نے حدیث سنائی ——— ابو بکرؓ نے سچ فرمایا ——— کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ "جو بندہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرتا اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دیتا ہے۔" (تذکرۃ الحفاظ)

حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ و علیؓ اور حدیث نبویؐ:

فنِ حدیث سے متعلق بعض لکھنے والوں نے اس سے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ صرف اس حدیث کو تسلیم کرتے تھے جس کو دو یا دو سے زیادہ رُواۃ و رجال بیان کریں۔ حضرت علیؓ راوی کو قسم دیا کرتے تھے۔ عصر حاضر میں تاریخ حدیث و فقہ کے موضوع پر لکھنے والے کثیر مصنّفین نے اس کو ایک طے شدہ ضابطہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے۔ ان مصنّفین کی فہرست میں ہمارے بعض جلیل القدر اساتذہ ——— جو تاریخ فقہ اسلامی کے موضوع پر نفیس ترین کتب کے مصنّف اور جامعہ ازہر کے شریعت کالج میں پروفیسر ہیں ——— بھی شامل ہیں انہوں نے جہاں عمل بالحدیث کے سلسلہ میں ائمہ دین کے شرائط کا ذکر کیا ہے وہاں لکھا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ و علیؓ رضی اللہ عنہم کے نزدیک عمل بالحدیث کی یہ اولین شرط تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

اصل بات یہ ہے کہ اس قاعدہ و نظریہ کو ان آثار پر مبنی قرار دینا ایک فاش علمی غلطی ہے جس کی وضاحت وہ آثار و دلائل کرتے ہیں جن سے مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے ایسی احادیث کو بھی قبول کیا جن کو صرف ایک راوی نے روایت کیا تھا۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے راوی کو قسم دیے بغیر بعض روایات کو قبول کر لیا۔ حضرت ابو بکرؓ سے بھی اسی طرح منقول و مروی ہے اب یہ آثار ملاحظہ فرمائیے:-

(۱) حضرت عمرؓ عازم شام ہوئے جب "سَرغ" کے مقام پر پہنچے تو پتہ چلا کہ شام میں وبا پھوٹ پڑی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "جب تمہیں پتہ چلے کہ جس علاقہ میں تم سکونت گزین ہو وہاں وبا پھوٹ پڑی ہے تو وہاں سے مت بھاگو" حضرت عمرؓ سرغ سے واپس آ گئے۔ ابن شہاب زُہری کہتے ہیں ہمیں سالم بن عبداللہ بن عمر نے بتایا کہ حضرت عمرؓ عبدالرحمٰن بن عوف کی حدیث کی وجہ سے لوگوں سمیت لوٹ آئے تھے۔ (بخاری و مسلم)

(۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"دیت (پاداش) وارثوں کو ملے گی اور عورت کو اپنے خاوند کی دِیَت سے کچھ نہ ملے گا۔"

ضحاک بن سفیانؓ نے حضرت عمرؓ کو بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ تحریری حکم بھیجا تھا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو اس کے خاوند کی دِیَت سے حصّہ دلائیں۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اس کو قبول کر لیا۔

(رسالہ شافعی ص ۴۲۶ نیز احمد۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ ابن ماجہ۔ موطا امام مالکؒ)

(۳) منقول ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا جس شخص نے جنین (وہ بچہ جو ابھی شکم مادر میں ہو) کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہو میں اس کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ وہ بیان کرے۔ حمل بن مالک بن نابغہ کہنے لگے میری دو لونڈیاں تھیں وہ آپس میں لڑنے لگیں۔ ایک نے کدال اٹھا کر دوسری کو دے مارا جس سے اس کا حمل ساقط ہو گیا۔ آپؐ نے اس میں ایک لونڈی یا غلام دینے کا حکم دیا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر کہا:

"اگر میں یہ بات نہ سنتا تو میرا فیصلہ اس سے مختلف ہوتا۔"

(الرسالۃ ص ۴۲۷)

(۴) حضرت عمرؓ نے مجوس کا ذکر کر کے فرمایا "مجھے نہیں معلوم کہ میں ان سے کیا سلوک کروں؟"

حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا "میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا تھا کہ مجوس سے اہل کتاب جیسا برتاؤ کرو۔ (الرسالہ ص ۴۳۰)

(۵) ہشام بن یحییٰ مخزومی بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ ثقیف کا ایک شخص حضرت عمر فاروقؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ایک عورت کے بارے میں دریافت کیا جو طوافِ زیارت انجام دینے کے بعد حیض میں مبتلا ہو گئی تھی کہ آیا وہ پاک ہونے سے قبل اپنے وطن کو لوٹ سکتی ہے؟ فرمایا "نہیں" ثقفی نے کہا "مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے مختلف فتویٰ دیا تھا۔" حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر اسے دُرّے سے پیٹنا شروع کیا۔ آپ کہتے جاتے تھے "جس امر میں حضورؐ فتویٰ دے چکے تھے آپ نے اس کے بارے میں مجھ سے کیوں دریافت کیا؟" (مفتاح الجنۃ للسیوطی ص ۳۱)

(۶) مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے انگوٹھے کی دیت پندرہ (۱۵) اونٹ انگشتِ شہادت کی دس (۱۰) درمیانہ انگلی کی نو (۹) اور سب سے چھوٹی انگلی کی چھ (۶) اونٹ مقرر کی۔ جب آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس تحریر سے آگاہ ہوئے جو آپ نے عمرو بن حزم کو لکھ کر دی تھی تو اپنا مسلک چھوڑ کر اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ رسول کریمؐ نے فیصلہ کیا تھا کہ ہر انگلی کی پاداش دس (۱۰) اونٹ ہے اصول کی بعض کتابوں میں اسی طرح مذکور ہے۔ فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی یہی لکھا ہے۔ مگر امام شافعی نے الرسالہ میں لکھا ہے کہ صحابہ نے حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد آلِ عمرو بن حزم کے پاس یہ تحریر دیکھی تھی۔ تب انہوں نے حضرت عمرؓ کا قول چھوڑ کر اس پر عمل کرنا شروع کیا۔

(الاحکام لابن حزم ج ۲۔ ص ۱۳ نیز فتح الملہم ص ۷)

(۷) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے موزوں کے مسح سے متعلق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت پر عمل کیا تھا۔ (فتح الملہم)

(۸) حضرت عمرؓ نے ایک پاگل عورت کو (زنا کے جرم میں) سنگسار کرنے کا ارادہ کیا جب آنحضورؐ

کے اس ارشاد سے آگاہ ہوئے کہ "تین شخص مرفوع القلم ہیں" تو آپ نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔

(الاحکام لابن حزم ج ۲ - ص ۱۳)۔

(۹) حضرت فاروق اعظمؓ نے حاطب کی آزاد کردہ لونڈی کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عثمانؓ نے انہیں یاد دلایا کہ جو کسی حکم سے نا واقف ہو اس پر شرعی حد نہیں لگائی جاتی یہ سن کر آپ نے ارادہ تبدیل کر لیا۔ (الاحکام - ج ۲ - ص ۱۳)

اس قسم کے بکثرت آثارِ صحیحہ ہیں جن کو قابل اعتماد آئمہ حدیث نے نقل و روایت کیا ہے۔

یہ آثار و دلائل بلا نزاع و جدال اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے صرف ایک ہی صحابی کی روایت کردہ حدیث بلا توقف و تامل قبول کر لی تھی۔ مذکورہ صدر روایات ان آثار کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہیں جن میں شہادت کے لیے دوسرے گواہ کو طلب کیا گیا تھا اور صحت و ثقاہت کے اعتبار سے بھی ان سے کسی طرح کم نہیں۔

چونکہ جمیع صحابہ بلا استثناء ایک ہی صحابی کی روایت پر عمل کیا کرتے تھے اس لیے حضرت عمر کے بارے میں جو ایسے آثار مروی ہیں، جو ان کے اپنے اور دیگر صحابہ کے عمل کے خلاف ہیں ان کی تاویل از بس ناگزیر ہے۔ جب ہم اُن روایات پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسقاطِ حمل سے متعلق مغیرہ بن شعبہ کی روایت بطریق حمل بن مالک بھی منقول ہے اور حضرت عمرؓ نے یہ روایت بلا تردّد قبول کر لی تھی۔

جہاں تک طلبِ اذن کے بارے میں ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت کا تعلق ہے اس کو اس امر پر محمول کرنا پڑے گا کہ جناب فاروقؓ قبولِ احادیث میں حزم و احتیاط کی راہ پر گامزن تھے اور صحابہ کو بھی اسی راہ پر لگانا چاہتے تھے۔ بنابریں حضرت مغیرہ اور ابوموسیٰ اشعری سے منقول روایات کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ حضرت عمر صحابہ کو روایت حدیث میں احتیاط برتنے کا مشورہ دینا چاہتے تھے۔ جب حضرت عمرؓ جناب مغیرہ و ابوموسیٰ جیسے جلیل القدر صحابہ سے دوسرے راوی کی شہادت طلب کرتے ہیں تو ان دونوں سے فروتر درجہ کے صحابہ و تابعین اس بات کے زیادہ لائق

ہوں گے کہ ان سے تائیدی شہادت طلب کی جائے۔

یہ ہے صحیح محمل حضرت عمرؓ کے طرز عمل کا! آپ نے ابوموسیٰ اشعری کے حق میں جو الفاظ کہے تھے ان سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:

"میں آپ کو متہم بالکذب نہیں کرتا۔ مگر بات یہ ہے کہ یہ حدیث رسول کا معاملہ ہے"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب حضرت اُبی بن کعب نے حضرت عمر کو ابوموسیٰ سے شہادت طلب کرنے کے سلسلہ میں معتوب کیا تو آپ نے فرمایا:

"میں نے تحقیق کرنا چاہی تھی اور بس"

امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی حضرت عمر کے طلب شہادت کے بارے میں اسی رائے کا اظہار فرمایا ہے امام موصوف لکھتے ہیں:

"ابوموسیٰ اشعری کے بارے میں حضرت عمرؓ کا طرز عمل حزم و احتیاط کا آئینہ دار تھا اور آپ جناب ابوموسیٰ کو ثقہ اور امین خیال کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص اس کی دلیل طلب کرے تو ہم کہیں گے کہ امام مالک بن انس نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے ابوموسیٰ سے کہا "میں آپ پر تہمت نہیں دھرتا مگر میں ڈرتا ہوں کہ لوگ رسول کریم ﷺ پر جھوٹ نہ باندھنے لگیں" (الرسالۃ، ص ۴۳۴)

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر پہلے تائیدی شہادت طلب کرنے کے حق میں تھے جب اُبی نے اس ضمن میں ان کو معتوب کیا تو اس نظریہ سے رجوع کر لیا اور ایک صحابی کی روایت کو قبول کرنے لگ گئے۔

(الاحکام لابن حزم ج ۲ - ص ۱۴۰)

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

یہ تھا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا طرز عمل حدیث نبوی سے متعلق! جہاں تک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے آپ سے صرف ایک واقعہ کے سلسلہ میں منقول ہے کہ آپ نے تائیدی

شہادت طلب کی تھی۔ امام ابن حزم نے اس روایت کو بھی منقطع قرار دیا ہے۔

(الاحکام لابن حزم، ج ۲۔ ص ۱۴)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ آپ اسی حدیث کو تسلیم کرتے تھے جو کم از کم دو راویوں سے منقول ہو۔ جناب صدیق کثیر واقعات وحوادث سے دوچار ہوئے جن میں آپ نے سنت رسول کی طرف رجوع کیا۔ مگر تائیدی شہادت طلب کرنے کا ذکر مذکورہ واقعہ کے سوا اور کہیں موجود نہیں۔ بلکہ امام رازی اپنی کتاب "المحصول" میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ نبی کریمؐ نے اسی قسم کے معاملہ میں آپ سے مختلف فیصلہ کیا تھا۔ یہ معلوم کر کے ابوبکرؓ نے اپنے فیصلہ کو واپس لے لیا۔ (المحصول امام رازی ج ۲)

بشرط صحت اس روایت سے ہمارے نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ مقدمات فیصل کرنے کے سلسلہ میں حضرت ابوبکر کے طرز عمل پر رائے زنی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"جب حضرت ابوبکرؓ کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہوتا تو کتاب اللہ میں دیکھتے اگر اس میں پیش آمدہ حادثہ کا حل مل جاتا تو اس کی روشنی میں فیصلہ صادر کرتے۔ اگر کتاب الٰہی میں اس کا حل نہ پاتے تو حدیث رسول میں دیکھتے۔ اگر کوئی ایسی حدیث مل جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اگر حدیث نبوی کی مدد سے اس کا فیصلہ نہ کیا جا سکتا تو لوگوں سے پوچھتے کہ آیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں کوئی فیصلہ فرمایا ہے؟ بسا اوقات لوگ کھڑے ہو کر ان کو آپ کے فیصلہ سے آگاہ کرتے اگر ایسی کوئی سنت نہ ملتی تو اکابر رجال کو جمع کر کے مشورہ کرتے۔ جب وہ کسی بات پر متفق ہو جاتے تو اس کے مطابق فیصلہ صادر کرتے۔"

(اعلام المُوقعین، ج ۱ ص ۵۱)

خلاصۂ کلام یہ کہ "حدیثِ جدّہ" (دادی کے ورثہ والی حدیث) کے سوا کوئی نص ایسی نہیں جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہو کہ کسی حدیث کے راوی سے حضرت ابوبکرؓ نے کبھی تائیدی شہادت طلب کی ہو۔ کچھ بعید نہیں کہ مذکورہ حدیث میں تائیدی شہادت مزید حزم واحتیاط کے تقاضا سے طلب کی گئی ہو۔ خصوصاً اس لیے کہ قرآن میں دادی کا حصہ مذکور نہیں اس لیے ایسے مسئلہ میں مزید احتیاط کی ضرورت تھی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرت ابوبکر نے اپنے لیے ایک ضابطہ معین کر رکھا تھا کہ حدیث کو اسی صورت میں قبول کرتے تھے جب دو راوی اسے روایت کریں ——— امام غزالی لکھتے ہیں:

"حضرت مُغیرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیثِ جَدّہ کے بارے میں حضرت ابوبکر کا توقف شاید کسی اہم سبب پر مبنی ہو اور کوئی شخص اس سبب سے آگاہ نہ ہو۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ توریثِ جَدّہ کا حکم آیا باقی ہے یا منسوخ ہو چکا ہے؟ یا آپ یہ بات معلوم کرنے کے درپے ہوں کہ آیا کسی اور کے پاس اس کے حق میں تائیدی شہادت موجود ہے تاکہ اس فیصلہ میں مزید استحکام پیدا ہو جائے۔ بصورتِ دیگر اس کے خلاف شہادت موجود ہو تو اس سے باز رہیں یا آپ نے مزید تقویت و استحکام کی خاطر توقف کیا ہو جس طرح حاکم بعض اوقات دو گواہوں کی موجودگی میں مزید توثیق کے نقطۂ خیال سے اور شہادتیں طلب کرتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ موجودہ شہادتیں رد کر دیتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے توقف کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ لوگ تغافل و تکاسل و تساہل کی بناء پر حدیثیں روایت کرنے نہ لگ جائیں۔ مندرجہ صدر احتمالات میں سے کسی ایک پر اس واقعہ کو محمول کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ ہمیں قطعی و حتمی طور پر معلوم ہے کہ حضرت ابوبکر ایک راوی کی روایت کو قبول کر لیا کرتے تھے اور جو لوگ اس نظریہ کے قائل تھے ان پر نقد و جرح نہیں کیا کرتے تھے۔" (المستصفیٰ للغزالی ج ۱۔ص ۱۵۴)

حضرت علی رضی اللہ عنہ :

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آپ راوی سے حلف لیا کرتے تھے ——
میرے نزدیک یہ بات بعید از قیاس ہے —— اگر یہ بات صحیح ہے تو ہمارے لیے اس میں کلام کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور اگر صحیح نہیں ہے تو پھر وہ بھی دیگر صحابہ کی طرح ٹھہرے اور یہ دوسری بات ہی قرین عقل و صواب ہے۔ امام رازی "المحصول" میں کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے مذی کے بارے میں حضرت مقداد کی روایت قسم دلائے بغیر تسلیم کر لی تھی۔

(المحصول جلد دوم مخطوطہ غیر مطبوعہ)

قبل ازیں وہ روایت ذکر کی جا چکی ہے جو حضرت علیؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے سنی تھی اور بلا حلف لیے بغیر فرما دیا تھا کہ "صَدَقَ اَبُوْبَکْرٍ" (ابو بکر نے سچ فرمایا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راوی سے حلف لینے کا حضرت علیؓ کے یہاں کوئی معین دستور نہ تھا۔

مندرجہ صدر بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر و عمر و علی رضی اللہ عنہم ایک راوی کی روایت کو تسلیم کر لیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں صحیح تر بات یہی ہے۔ اگر انہوں نے کسی موقع پر تائیدی شہادت طلب کی یا کسی راوی سے حلف لیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے یہاں یہ ایک طے شدہ دستور تھا۔ اس توجیہ و تطبیق کے پیش نظر ان اصحابِ کبار کا طرزِ فکر و نظر دیگر صحابہ کے ساتھ ہم آہنگ و یک رنگ ہو جائے گا اور ان کے مابین کوئی نزاع و خلاف سرے سے باقی ہی نہیں رہے گا کہ وہ سب ایک راوی کی حدیث پر اعتماد کرتے تھے۔ حجیتِ اخبارِ آحاد پر گفتگو کرتے ہوئے ہم اس ضمن میں امام شافعی کی رائے نقل کریں گے۔

طلب حدیث کے سلسلہ میں صحابہ کے اسفار بعیدہ

حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا زمانہ ختم ہوا تو حدیث ابھی سینوں میں محفوظ تھی۔ حدیث کو پھلنے پھولنے اور دیار و بلاد میں پھیلنے کے مواقع ابھی حاصل نہ ہوئے تھے۔ اس لیے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ صحابہ کو مدینہ سے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ آپ نے صرف چند صحابہ کو کسی

مصلحت کے پیشِ نظر باہر جانے کی اجازت دی تھی۔ حدیث رسولؐ مدینہ میں بھی بہت کم پھیلی۔ جناب فاروقؓ کی پالیسی یہ تھی کہ قرآن کریم کو وہم و خطا اور کمی بیشی سے محفوظ و مصئون رکھنے کے لیے حدیث کی نسبت قرآن کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ جب خلافتِ عثمانی کا زمانہ آیا تو صحابہ کو مدینہ سے باہر جانے کی اجازت مل گئی لوگ صحابہ سے دینی احکام و مسائل سیکھنے کے لیے ان کے محتاج تھے۔ صغار صحابہ کی جانب لوگوں کا خصوصی میلان تھا۔ کبار صحابہ دن بدن کم ہوتے جا رہے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صغار صحابہ نے عمر رسیدہ صحابہ سے حدیثیں جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ وہ طلب حدیث کے لیے دور دراز کا سفر طے کر کے کبار صحابہ کے یہاں پہنچتے اور حدیثیں سیکھتے حضرت جابرؓ بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے ایک صحابی کے بارے میں پتہ چلا کہ ان کو ایک حدیث یاد ہے جو میں نے آپ سے نہیں سُنی۔ چنانچہ میں نے ایک اونٹ خریدا اور اس پر سامان سفر باندھا۔ پورا مہینہ سفر کرنے کے بعد شام پہنچ کر حضرت عبداللہ بن اُنیس انصاریؓ سے ملا۔ میں نے کہا مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کو حقوق العباد کے بارے میں ایک حدیث یاد ہے جو میں نے آنحضورؐ سے نہیں سُنی۔ مجھے ڈر تھا کہ حدیث سننے سے پہلے میری یا آپ کی موت واقع ہو جائے۔ عبداللہ بن انیس انصاریؓ کہنے لگے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے:

"لوگ بروز قیامت غیر مختون خالی ہاتھ جمع ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کی کیا بات ہوگی؟ فرمایا ان کے پاس کوئی چیز نہ ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو پکاریں گے جس کو دُور و نزدیک والے سب سنیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں جزا و سزا دینے والا ہوں کوئی جہنمی اس وقت تک دوزخ میں نہیں جائے گا، جب تک اس سے قصاص کا مطالبہ کرنے والے جنتی کو اس جہنمی سے قصاص نہ دلوا دوں۔ اسی طرح کوئی جنتی جنت میں داخل نہ ہوگا جب تک اس سے قصاص طلب کرنے والے جہنمی کو اس جنتی سے بدلہ نہ دلوا دوں

حتیٰ کہ میں ایک بھیڑ کا بدلا بھی دلواؤں گا۔ صحابہ نے عرض کی ہم تو وہاں غیر مختون خالی ہاتھ ہوں گے پھر قصاص کیونکر دیں گے؟ فرمایا نیکیاں دے کر (اگر ہوں) ورنہ دوسرے کی برائیاں اٹھا کر۔"

(بخاری فی الادب المفرد۔ احمد۔ طبرانی۔ بیہقی، الفاظ بیہقی کے ہیں۔)

میزبان رسولؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ عقبہ بن عامرؓ سے ایک حدیث سننے کے لیے مدینہ سے عازم مصر ہوئے۔ اس حدیث کے سننے والوں میں سے صرف وہی بقید حیات تھے۔ امیر مصر مَسلمہ بن مخلد انصاری کے دولت کدہ پر جناب عقبہؓ سے ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت سے معانقہ کیا اور زحمتِ سفر کی وجہ پوچھی۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے کہا میں ستر مومن سے متعلق حدیث آپ سے سننے آیا ہوں۔ عقبہؓ نے کہا میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ:

"جس نے اس دنیا میں مومن کی کسی لغزش کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔"

یہ سن کر ابوایوب اپنی ناقہ کی طرف لوٹے اور سوار ہو کر جانبِ مدینہ چل دیے۔ جب امیر مصر مَسلمہ بن مخلد کا ہدیہ پہنچا تو اس وقت آپ "عریش مصر" تک پہنچ چکے تھے۔

(بیہقی و ابن عبدالبر از عطاء بن ابی رَباح)

اس طرح حدیث نبوی بلاد و امصار میں پھیلتی چلی گئی۔ صحابہ کو بیش از بیش مشتاقانہ نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ تابعین بے تابانہ نگاہوں سے صحابہ کی ملاقات اور ان سے اخذ و استفادہ کے منتظر رہتے کہ اس سے قبل کہ وہ دنیا سے رخصت ہوں ان کا علم اپنے سینوں میں جمع کر لیں۔ کوئی صحابی جب کسی اسلامی شہر میں پہنچتے تو مشتاقانِ زیارت شوقِ دید میں جوق در جوق حاضر خدمت ہو کر "هٰذَا صَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰهِ" کا نعرہ بلند کرتے۔ (جامع بیان العلم، ج ۱۔ ص ۹۳)

صحابہ میں چند خوش نصیب کثرتِ روایات میں مشہور چلے آتے ہیں۔ کثرتِ روایت کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

(۱) قدامتِ صحبت و رفاقت مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔

(۲) خادم رسولؐ ہونے کی بناء پر جیسے انس بن مالکؓ۔

(۳) خانگی امور سے آگاہ و آشنا ہونے کی وجہ سے مثلاً حضرت عائشہ صدیقہؓ۔

(۴) حدیث نبوی سے کثرتِ اہتمام کی بناء پر جیسے عبداللہ بن عمر و عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ابوہریرہ رضی اللہ عنہم۔

حالانکہ اوّل الذکر دونوں صحابی صغیر السن تھے۔ جب کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ متاخر الاسلام تھے۔ خلافت راشدہ کے عصر و عہد میں لوگ بلا شک و تردد صحابہ سے روایت کرتے تھے۔ اسی طرح صحابہ ایک دوسرے سے حدیثیں روایت کرتے۔ نہ کسی کی تکذیب کرتے اور نہ اخذ روایت میں کوئی حرج سمجھتے۔ فتنہ سامانی کے ظہور و شیوع سے پہلے نہ واضعین کا وجود تھا اور نہ وضع حدیث کا۔ جب اسلام میں فتنہ پروری نے بال و پر کھولے تو مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے پہلو بہ پہلو ان کی دینی زندگی بھی یکسر بدل گئی۔

فصل دوم

وضع حدیث کا ظہور و شیوع

وضع حدیث کا نقطۂ آغاز:

سنہ ۴۰ سنِ ہجری حدیث نبوی کے کذب و وضع کی آلودگی سے پاک رہنے کا آخری سال تھا۔ اس کے بعد وضع حدیث کی داغ بیل پڑ گئی اور سنت کو سیاسی اغراض اور داخلی انقسامات کے لیے آلۂ کار بنا لیا گیا۔ یہ اس وقت ہوا جب حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما میں ٹھن گئی اور ان کے باہمی اختلافات کو حرب و پیکار کی صورت دے دی گئی۔ ان دونوں کی لڑائی میں بے شمار جانیں تلف ہوئیں اور اہل اسلام چھوٹے چھوٹے فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے۔

جمہور اہل اسلام حضرت علی رض کے ہمنوا تھے۔ خوارج پہلے شیعانِ علی میں سے آپ کے سرگرم حامی تھے پھر حضرت علیؓ و معاویہؓ دونوں کے مخالف بن گئے۔ اہل بیت میں سے ایک گروہ نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد استحقاقِ خلافت کا شاخسانہ کھڑا کر دیا اور اس طرح اموی خلافت کے خلاف بغاوت کی طرح ڈال دی

اس طرح سیاسی اختلافات نے مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان نزاعات کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ تفرق و انقسام کو دینی رنگ دیا گیا۔ جس نے دین اسلام میں فرقہ سازی کی بڑی حد تک حوصلہ افزائی کی ہر فرقہ اپنے موقف کو قرآن و سنت سے مدلّل و مبرھن کرنے لگا۔ یہ ایک فطری بات تھی کہ ہر فرقہ اپنے مذہب و منہج کی تائید میں دلائل و براہین تلاش کرتا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ بعض فرقے قرآن کریم کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے لگے۔ احادیث کو غلط معانی و مطالب پہنائے جانے لگے۔ بعض فرقے اپنے افکار و آراء کی تائید میں حدیثیں گھڑنے لگے

چونکہ قرآن سینوں سفینوں میں محفوظ و مصئون تھا اور لوگ عام طور سے اس کی روایت و تلاوت میں لگے ہوئے تھے اس لیے قرآن کو گھڑنا ان کے لیے ممکن نہ ہوُا۔

یہ تھے وجوہ و اسباب جنہوں نے وضع حدیث کے فتنہ کو ہوا دی اور احادیث صحیحہ کو سقیمہ کے ساتھ گڈ مڈ کیا جانے لگا۔ اولین عنوان جس کو وضعِ حدیث کی آماجگاہ قرار دیا گیا "فضائل اشخاص و رجال" تھا۔ لوگوں نے اپنے آئمہ اور قائدین کے فضائل و مناقب کے سلسلہ میں حدیثیں وضع کرنا شروع کیں۔

اوّلین واضع شیعہ تھے:

مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید "شرح نہج البلاغہ" میں لکھتے ہیں:

"خوب جان لیجیے کہ فضائل و مناقب پر مشتمل احادیث میں اصل جھوٹ شیعہ کی جانب سے آیا ہے۔" (شرح نہج البلاغۃ ج ۲ - ص ۱۳۴)

بنابریں کہا جاتا ہے کہ اولین واضع شیعہ تھے۔ پھر اہل سنت میں سے جاہل لوگوں نے بھی شیعہ کے مقابلہ میں حدیثیں گھڑیں۔

وضعِ حدیث کا آغاز کب ہوُا:

ہمارے لیے یہ تصوّر کرنا بھی آسان نہیں کہ وہ اصحابِ رسولؐ جنہوں نے اپنے جان و مال کو آپؐ پر قربان کر دیا۔ اعزہ و اقارب کو چھوڑا وطنِ عزیز کو خیر باد کہا اور خدا کی محبت و خشیت ان کے گوشت و پوست میں پیوست ہو گئی تھی کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کذب و افتراء کی جسارت کر سکتے تھے خواہ کیسے بھی دواعی و محرکات کیوں نہ ہوں ؛ خصوصاً جب کہ ان کے رہنما و پیشوا اور نجات دہندہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ان کے یہاں مشہور ہو چکی تھی کہ:

"مجھ پر جھوٹ باندھنا دوسرں لوگوں پر افترا پردازی کی مانند نہیں، اور جس نے دانستہ مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنا لے۔"

یہ مشہور حدیث ہے بعض علماء نے اس کو متواتر قرار دیا ہے۔ بیشتر صحابہ نے اس کو رسول کریمؐ سے

روایت کیا ہے۔ بعض علماء نے اس سے زیادہ راویوں کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ روایت جملہ کتب حدیث میں موجود ہے۔

عہد رسالت اور اس کے بعد تاریخ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صحابہ میں اس حد تک تقویٰ اور خوف خداوندی پایا جاتا تھا جو انہیں اللہ و رسول پر جھوٹ باندھنے سے مانع تھا۔ مزید برآں صحابہ دینی احکام کے بے حد حریص اور شریعت کا دفاع کرنے اور اسے جوں کا توں لوگوں تک پہنچانے کے عاشق تھے۔ اس راہ میں انہیں ہر تکلیف اور قربانی گوارا تھی۔ جو شخص بھی دین سے برگشتہ ہوتا اس کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ امیر ہو یا خلیفہ نہ موت سے ڈرتے۔ نہ ملامت کی پرواہ کرتے اور نہ ظلم و جور سے ہراساں ہوتے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ برسر منبر فرمایا:

"لوگو! مہر میں مبالغہ سے کام نہ لو۔ اگر خدا کے نزدیک یہ عزت و وقار کا موجب ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ مہر مقرر کرتے۔"

یہ سن کر ایک عورت کھڑی ہو جاتی ہے اور صحابہ کے روبرو کہتی ہے کہ عمرؓ! ذرا ٹھہرو۔ یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دینا چاہتا ہے اور آپ ہمیں محروم رکھتے ہیں۔ کیا یہ فرمان باری تعالیٰ نہیں ہے کہ:-

وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا۔ اور تم نے ایک عورت کو خزانہ دے رکھا ہو۔

حضرت عمرؓ نے یہ سن کر کہا:-

"عورت نے ٹھیک کہا اور آدمی نے غلطی کھائی۔"

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جب مرتدین و منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا مصمم ارادہ کر لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے جھگڑنے لگے۔ وہ حضورؐ کی اس حدیث سے احتجاج کرتے تھے کہ آپ نے فرمایا:-

"مجھے اس وقت تک لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"

نہ کہیں۔ جب انہوں نے یہ کلمہ پڑھ لیا تو اپنا خون و مال مجھ سے بچا لیا۔ الا یہ کہ ان کے ذمہ خدا کا کوئی حق ہو۔ باقی رہا ان کا محاسبہ تو اس کی ذمہ داری خدا کی ذات پر ہے۔"

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "کیا اس حدیث میں "اِلَّا بِحَقِّهَا" کے الفاظ نہیں ہیں؟ اور زکوٰۃ بھی حقوق اللہ میں سے ایک ہے۔"

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اوّلین شخص تھے جس نے سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر رض کی فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی۔ مگر بایں ہمہ آپ کے دل میں جناب صدیق کا جو مرتبہ و مقام بھی ہو وہ آپ کو اس بات سے باز نہ رکھ سکا کہ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے اس کے بارے میں حضرت ابوبکر سے اظہارِ اختلاف کریں۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک زانیہ حاملہ عورت کو سنگسار کرنے کا حکم دیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ کہہ کر اس پر معترض ہوئے:

"بدکاری کے جرم میں آپ زانیہ کو سنگسار کر سکتے ہیں۔ مگر اس کے شکم میں جو بچہ ہے اس نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔"

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف سے رجوع کر لیا اور فرمایا:

لَوْلَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ۔ — اگر علی نہ ہوتے تو عمر برباد ہو جاتے۔

اسی طرح حضرت ابو سعید خدری رض نے والیٔ مدینہ مروان کی یہ بات پسند نہ کی کہ اس نے عید کی نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کر دیا۔ حضرت ابو سعید رض نے بتایا کہ یہ خلافِ سنت ہے۔

امام ذہبی نقل کرتے ہیں، حجاج ثقفی خطبہ دے رہا تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رض کھڑے ہو کر فرمانے لگے:۔

"دشمنِ خدا نے حرام کو حلال بنا لیا، خانۂ خدا کو برباد کیا اور اولیاء اللہ کو قتل کیا۔"

حجاج نے اپنے خطبہ میں یہ بھی کہا تھا کہ:۔

"عبداللہ بن زبیر رض نے کلام اللہ کو تبدیل کر دیا ہے۔"

حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا :۔

"تو جھوٹ بکتا ہے ۔ نہ ابن زبیر کلام اللہ کو بدل سکتا تھا اور نہ تو ۔"

حجاج نے کہا : "تو بوڑھا کھوسٹ ہے ۔"

جناب حضرت عبداللہ نے فرمایا :۔

"اگر تو لوٹ کر جوان بن جائے تو بھی میں اسی طرح کروں گا ۔"

اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں جن سے تاریخ کے اوراق معمور و بھرپور ہیں ۔ یہ واقعات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ صحابہ کرام اظہارِ حق کے سلسلہ میں بے حد بے باک اور جری واقع ہوئے تھے ۔ جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے اس کے لیے جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے ۔ حق و صدق ان کے نزدیک احباب و اعزّہ اور ہر عزیز و قریب سے بالاتر تھا ۔ اس لیے اس بات کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ صحابہ ذاتی خواہش یا دنیوی حرص و آز میں مبتلا ہو کر آنحضور ؐ پر جھوٹ بھی باندھ سکتے تھے ۔ جھوٹ بولنا بزدل آدمی کا کام ہے اور صحابہ بزدل نہ تھے ۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا پردازی کرتا ہو اور صحابہ خاموش تماشائی بنے رہیں ۔ ان کی تو یہ حالت تھی کہ اگر غور و فکر کے بعد کسی سے غلط اجتہاد کا صدور ہوتا تو وہ برملا اس کو ٹوک دیتے تھے ۔

عہدِ صحابہ :

اس ضمن میں صحابہ کے خیالات ملاحظہ فرمائیے !

(۱) ۔ حضرت براء بن عازب رضؓ فرماتے ہیں :۔

"سب صحابہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست حدیثیں نہیں سنا کرتے تھے ۔ ہماری زمینیں بھی تھیں اور دیگر مشاغل بھی ۔ مگر بات یہ تھی کہ لوگ آپؐ پر جھوٹ نہیں باندھا کرتے تھے ۔ جو شخص آپ پر براہِ راست کوئی حدیث سنتا وہ دوسروں کو بتا دیا کرتا تھا ۔" (بیہقی)

(۲)۔ حضرت قتادہؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس رضؓ نے حدیث بیان کی تو ایک شخص نے کہا "کیا آپ نے یہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے؟ حضرت انسؓ نے کہا "جی ہاں! مجھے اس شخص نے حدیث سنائی ہے جس نے جھوٹ نہیں بولا۔ بخدا ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے تھے۔ بلکہ ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ جھوٹ کسے کہتے ہیں؟

(بیہقی۔ مفتاح الجنتہ للسیوطی ص ۲۵)

مذکورہ صدر بیانات سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ صحابہ سے نہ عہدِ رسالت میں جھوٹ صادر ہؤا، اور نہ اس کے بعد۔ وہ ایک دوسرے پر اعتماد کرتے اور کسی کی تکذیب نہیں کرتے تھے۔ ان کے مابین جو فقہی و فروعی اختلاف پایا جاتا تھا وہ فکری و نظری حد تک محدود تھا۔ ان میں سے ہر شخص حق و صداقت کا خواہاں تھا۔

عصرِ تابعین:

جہاں تک تابعین کے عصر و عہد کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ تابعینِ کبار کے زمانہ میں پچھلے اَدوار کی نسبت بہت کم کذب و دروغ پایا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تابعینِ کبار کے دَور میں حضورؐ کے منصب و مقام کا اکرام و احترام اور تدین و تشرّع کے عوامل تابعین صغار کے زمانہ کی نسبت بہت زیادہ تھے۔ علاوہ ازیں سیاسی اختلافات کا ہنوز آغاز ہو رہا تھا۔ اس لیے اس عہد میں وضعِ حدیث کے محرکات پچھلے تاریخی ادوار کی نسبت بہت کم تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانہ میں ایسے صحابہ و تابعین کبار کا وجودِ مسعود جو علم و تقویٰ اور امانت و عدالت میں یگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ وضاعین حدیث کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنا ہؤا تھا۔

وضعِ حدیث کے عوامل و محرکات:

ہم قبل ازیں اس حقیقت پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ وہ سیاسی اختلافات جو عثمانی خلافت کے اواخر اور حضرت علی رضؓ کے عہدِ خلافت میں نمودار ہوئے وضعِ حدیث کا اولین و اساسی سبب تھے۔ ہم قائل کا یہ قول بھی ذکر کر چکے ہیں کہ:۔

"وضع حدیث کی طرح ڈالنے والے شیعہ فرقہ کے لوگ تھے۔" (ابن ابی الحدید)

اس اعتبار سے سرزمین عراق وضع حدیث کا اولین گہوارہ تھی۔ امام زُہری فرمایا کرتے تھے۔

"حدیث ہمارے یہاں سے ایک بالشت بھر نکلتی ہے اور عراق سے ایک گز بن کر ہمارے پاس لوٹتی ہے۔" (تاریخ ابن عساکر)

امام مالک رحمہ اللہ عراق کو ٹکسال کہا کرتے تھے جس میں حدیثیں گھڑی جاتی تھیں اور روپے پیسے کی طرح بن ٹھن کر لوگوں کے پاس پہنچتیں۔ سیاسی اختلافات کے پہلو بہ پہلو کچھ اور اسباب و وجوہ بھی تھے جن کی وجہ سے وضع حدیث کے دائرہ میں مزید وسعت آ گئی۔ اگرچہ اس کا اولین و اساسی سبب سیاسی اختلافات ہی تھے۔ اب ہم مختصراً ان تمام اسباب وضع پر روشنی ڈالتے ہیں جو اس کے پھلنے پھولنے کے موجب بنے۔

ا۔ سیاسی اختلافات :

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء پردازی کرنے کے سلسلہ میں یوں تو سبھی فرقوں نے تھوڑا بہت حصہ ضرور لیا مگر شیعہ اس میدان میں سب پر بازی لے گئے۔ امام مالکؒ سے جب روافض کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا :

"ان سے بات چیت نہ کرو اور نہ ان سے روایت کرو اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔" (منہاج السنتہ، ج ۱- ص ۱۳)

شریک بن عبداللہ قاضی جو بڑے معروف مگر معتدل شیعہ تھے کہا کرتے تھے :-

"جس سے بھی ملنے کا موقع ملے اس سے حدیث لے لو مگر روافض سے نہ لو کیونکہ وہ حدیثیں گھڑتے ہیں اور اس کو ایک دینی کام سمجھتے ہیں۔" (منہاج السنتہ)

حماد بن سلمہ فرماتے ہیں مجھے ایک رافضی شیخ نے بتایا کہ "جب ہم اکٹھے ہوتے اور کسی بات کو پسند کرتے تو اسے حدیث بنا دیتے۔" (منہاج السنتہ)

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :-

"گمراہ فرقوں میں مَیں نے شیعہ سے بڑھ کر جھوٹی شہادت دینے والا نہیں دیکھا۔"

(الباعث الحثیث۔ ص ۱۰۹)

غدیرِ خم :

اہل سنت شیعہ کی وضع کردہ احادیث میں "حدیث غدیر خم" کو پیش کرتے ہیں۔ اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب حجۃ الوداع سے لوٹے تو "غدیر خم" نامی مقام پر صحابہ کو جمع کیا اور حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کر سب کے رُوبرو فرمایا :

"یہ میرا بھائی میرا وصی اور میرے بعد میرا خلیفہ ہے۔ لہٰذا اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔"

اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ حدیث بلاشک و شبہ شیعہ کی ساختہ پرداختہ ہے۔ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

اب شیعہ کی من گھڑت چند احادیث ملاحظہ فرمایئے :۔

(۱)۔ "جو حضرت آدمؑ جیسا علم نوحؑ جیسا تقویٰ ابراہیمؑ جیسا حلم وتحمّل موسیٰؑ جیسا رعب داب اور عیسیٰؑ جیسی عبادت دیکھنا چاہے تو وہ حضرت علیؓ کو دیکھ لے۔"

(۲)۔ "میں علم کی ترازو ہوں۔ علیؓ اس کے دونوں پلڑے۔ حسنؓ وحسینؓ اس کی رسیاں اور فاطمہؓ اس کی درمیانی رسی ہے جس سے ترازو کو لٹکایا جاتا ہے۔ اور ہمارے امام ستون ہیں۔ اس ترازو میں ہمارے احباب و اعداء کے اعمال وزن کیے جاتے ہیں۔"

(۳)۔ "حُبّ علی ایک ایسی نیکی ہے جس کی موجودگی میں کوئی برائی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اور بغضِ علی ایک ایسی بُرائی ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی نیکی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔"

(۴)۔ شیعہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت میں یہ حدیث وضع کی :۔

"جب آنحضورؐ معراج کے لیے تشریف لے گئے تو جبریلؑ آپ کے لیے جنت سے ایک بہی (پھل کا نام) لائے اسے آپ نے کھا لیا۔ حضرت خدیجہؓ امید سے ہوئیں تو

حضرت فاطمہ پیدا ہوئیں۔ چنانچہ جب آپ جنت کی خوشبو سونگھنا چاہتے تو حضرت فاطمہؓ کو سونگھ لیتے۔

اس حدیث پر من گھڑت ہونے کے آثار نمایاں ہیں۔ حضرت فاطمہؓ واقعہ معراج سے قبل پیدا ہوئی تھیں اسی طرح حضرت خدیجہ نماز فرض ہونے سے پہلے فوت ہو گئی تھیں۔ اور نماز بالاجماع شب معراج میں فرض ہوئی۔

(اس سے معلوم ہوا کہ حضرت خدیجہ واقعہ معراج سے قبل فوت ہو گئی تھیں)

شیعہ نے جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ و اہل بیت کے فضائل و مناقب کے بارے میں حدیثیں وضع کی تھیں اسی طرح صحابہ خصوصاً صحابہ کبار و شیخین (جناب ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کے معائب و مثالب پر مشتمل حدیثیں بھی وضع کر ڈالیں۔

مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید رقم طراز ہے۔

"شیعہ جن ناپسندیدہ اور گھناؤنے امور کا ذکر کرتے ہیں ہمارے اصحاب (شیعہ) کے نزدیک ان کی کوئی اصل و اساس نہیں۔ محدثین نے اس کو روایت کیا ہے اور نہ اس کو پہچانتے ہیں یہ ایک ایسی بات ہے کہ شیعہ اس کی نقل و روایت میں منفرد ہیں

مندرجہ ذیل واقعات بالکل بے بنیاد ہیں

۱۔ صحابہؓ نے حضرت فاطمہؓ کے گھر میں ایک جنگلی چوہا چھوڑ دیا تھا۔

۲۔ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہؓ کو چابک سے مارا تھا اور آپ کے بازو پر اس طرح نشان پڑ گیا تھا جیسے بازو پر بازو بند باندھ رکھا ہو۔

۳۔ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہؓ کو دروازہ اور دیوار کے درمیان زور سے دبایا تھا اور آپ ابا ابا پکارنے لگیں۔

۴۔ حضرت عمرؓ نے جناب علیؓ کے گلے میں رسی ڈال کر انہیں کھینچا تھا حضرت فاطمہؓ پیچھے پیچھے چلا رہی تھیں اور حضرت حسن و حسین رو رہے تھے۔ (شرح نہج البلاغۃ، ج ۱۔ ص ۱۳۵)

حضرت معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ کی مذمت میں شیعہ نے مندرجہ ذیل حدیثیں وضع کیں :-

۱- جب معاویہ کو میرے منبر پر دیکھو تو اسے قتل کردو "

۲- آپ نے فرمایا اے اللہ! معاویہ اور عمرو بن العاص کو فتنہ میں سرنگوں کر اور دونوں کو جہنم میں دھکیل دے "

اس طرح شیعہ نے اپنے جذبات و احساسات کے پیش نظر حدیثیں گھڑنے میں حد درجہ مبالغہ سے کام لیا - علامہ خلیل اپنی کتاب " الارشاد " میں لکھتے ہیں :

" روافض نے حضرت علیؓ اور اہل بیت کے فضائل میں تین لاکھ حدیثیں وضع کیں "

اگرچہ مذکورہ صدر قول مبالغہ سے خالی نہیں تاہم یہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ شیعہ نے بکثرت حدیثیں وضع کیں - ایک مسلم جب شیعہ کی اس عظیم جسارت پر ایک نگاہ ڈالتا ہے تو درطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے - تاہم غور کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ شیعہ کی اس جسارت کی ایک معقول وجہ بھی تھی اور وہ یہ کہ وہ فارسی الاصل تھے - انہوں نے اسلام کے شیرازہ کو درہم برہم کرنے کے لیے تشیّع کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا - یا یہ کہ وہ بظاہر اسلام کے دائرہ میں آگئے تھے مگر اپنے وطنی و آبائی مذاہب کے اثرات کو قلب و ذہن سے نکال باہر کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا - وہ بدستور بُت پرستانہ ذہنیت میں گرفتار تھے اور رسول کریمؐ پر جھوٹ باندھنا ان کے نزدیک کوئی بڑی بات نہ تھی - اس سے ان کے دلوں میں پوشیدہ جذبات کو تسکین ملتی تھی - بچوں اور نادانوں کا بھی حال ہے کہ وہ خوشی و ناخوشی کا اظہار اسی طرز و انداز میں کرتے ہیں -

اہل سنت میں سے کچھ جُہلاء ایسے بھی تھے جنہوں نے شیعہ کی من گھڑت احادیث سے گھبرا کر ترکی بترکی جواب دینے کی کوشش کی اور شیعہ کی تقلید میں وضع حدیث کا بیڑا اٹھایا - اگرچہ ایسی احادیث کا دائرہ شیعہ کی نسبت محدود تر ہے - مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند احادیث ملاحظہ ہوں :

۱- " جنت کے ہر درخت کے پتوں پر کلمہ طیبہ اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے اسماء گرامی

مندرج ہیں"

۲ - "امانت دار تین ہیں، میں (نبی کریمؐ)، جبرئیلؑ اور معاویہؓ"

۳ - "اے معاویہؓ تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں"

۴ - "ایک دفعہ جنت میں معاویہؓ مجھے دکھائی نہ دیں گے اور بڑی دیر سے آئیں گے تو میں پوچھوں گا معاویہؓ کہاں سے آئے ہو؟ وہ کہیں گے میں اللہ تعالیٰ سے سرگوشی کرنے میں مشغول تھا" آپ فرمائیں گے "دنیا میں آپ کی جو توہین کی گئی تھی یہ اس کا صلہ ہے"

عباسی خلفاء کے حامیوں نے یوں کیا کہ وصیتِ علی کی مَن گھڑت حدیث کے مقابلہ میں حضرت عباس کی وصیت پر مشتمل مندرجہ ذیل حدیث وضع کر ڈالی کہ:

۱ - "عباسؓ میرے وصی اور وارث ہیں"

۲ - آپ نے حضرت عباسؓ کو مخاطب کر کے فرمایا "جب ۱۳۵ھ آئے گا تو یہ تیرے لیے اور تیری اولاد سفاح و منصور و مہدی کے لیے ہوگا"

خوارج اور حدیث نبوی:

علماء نے بیان کیا ہے کہ جملہ فرقہ ہائے اسلامی میں سے خوارج سب سے کم جھوٹ بولنے والے تھے یہ وہ فرقہ ہے جس نے حضرت علیؓ کے تحکیم کو قبول کرنے کے بعد ان کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ خوارج کے قلیل الکذب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کبائر کے مرتکب اور بقول کعبی گناہوں کا ارتکاب کرنے والے کو کافر قرار دیتے تھے۔ (الفرق بین الفرق ص ۴۵)

خوارج کذب و فسق کو کسی حالت میں بھی حلال نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بے حد متقی ہوا کرتے تھے تاہم ان کے بعض اکابر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دروغ گوئی کرنے سے محفوظ نہ رہ سکے ایک خارجی شیخ سے منقول ہے کہ اس نے کہا:

"حدیثیں دین کا اہم جزو ہیں ذرا غور کیجیے کہ تم کس سے دین اخذ کر رہے ہو۔ ہم جب کسی چیز کو پسند کرتے تو اس کے بارے میں حدیث وضع کر لیتے"

(مقدمہ کتاب الموضوعات ابن الجوزی نیز اللآلی المصنوعۃ للسیوطی ج ۲ - ص ۴۶۸)

عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں کہ مندرجہ ذیل حدیث خوارج اور زنادقہ نے وضع کی تھی:۔

"جب مجھ سے کوئی حدیث پہنچے اور وہ کتاب اللہ کے مطابق ہو تو وہ میری ہی بیان کردہ ہے۔"

قدیم و جدید مصنفین اسی طرح لکھتے آئے ہیں۔ مگر تلاش بسیار کے باوصف مجھے ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملی جس کو خوارج نے وضع کیا ہو۔ اسی طرح موضوعات پر مشتمل کتب میں مجھے ایک خارجی کا نام بھی نہیں ملا جسے کذاب اور وضاع قرار دیا گیا ہو۔ قبل ازیں جس خارجی شیخ کا ذکر کیا گیا مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھا۔ حماد بن سلمہ نے ایک رافضی شیخ سے اسی قسم کی جو روایت بیان کی ہے وہ قبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس لیے اس روایت کی نسبت خارجی شیخ کی جانب درست معلوم نہیں ہوتی۔ خصوصاً جب کہ ہمیں ایک حدیث بھی ایسی نہیں ملی جو خوارج کی ساختہ پرداختہ ہو۔

باقی رہا عبدالرحمٰن بن مہدی کا سابق الذکر قول کہ مندرجہ صدر حدیث زنادقہ و خوارج کی وضع کردہ ہے تو میں نہیں سمجھتا اس قول کی نسبت موصوف کی جانب کس حد تک درست ہے؟ میرے خیال میں یہ ایک بلا دلیل قول ہے۔ اس قول میں یہ مذکور نہیں کہ یہ حدیث کس نے اور کب وضع کی؟ اس امر سے ہمارے شک میں اور اضافہ ہوتا ہے کہ اس حدیث کو وضع کرنے کی نسبت خوارج اور زنادقہ دونوں کی طرف کی گئی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خوارج و زنادقہ دونوں اس کے وضع کرنے پر کیونکر متفق ہو گئے؟ نیز یہ کہ آیا دونوں فرقوں نے بیک وقت یہ حدیث وضع کی یا ایک نے پہلے اور دوسرے نے بعد ازاں؟ مزید برآں عبدالرحمٰن بن مہدی کے علاوہ دوسرے علماء نے صرف زنادقہ کو اس حدیث کا واضع قرار دیا ہے۔

عون المعبود میں لکھا ہے۔

"بعض رُواۃ حدیث نے جو یہ حدیث روایت کی ہے کہ:۔

"جب تمہارے پاس کوئی حدیث پہنچے تو اسے کتاب اللہ پر جانچ کر دیکھو۔ اگر اس کے

موافق ہو تو اسے لے لو۔"

تو یہ ایک بے بنیاد روایت ہے جس کی کوئی اصل نہیں۔ زکریا ساجی یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:۔

"یہ حدیث زنادقہ کی وضع کردہ ہے" (عون المعبود، ج ۴۔ ص ۳۲۹)

مشہور محدث محمد طاہر پٹنی امام خطابی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ حدیث زنادقہ کی ساختہ پرداختہ ہے۔" (تذکرۃ الموضوعات محمد طاہر پٹنی ص ۲۸)

مندرجہ صدر دونوں حوالوں میں خوارج کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ بعض علماء نے اس حدیث کو صرف ضعیف کہا ہے اور موضوع قرار نہیں دیا۔ وہاں ہم اس حدیث پر سیر حاصل تبصرہ کریں گے۔

سعی بسیار کے باوصف مجھے تا ہنوز کوئی ایسی دلیل نہ مل سکی جس سے خوارج کا واضع حدیث ہونا ثابت ہو۔ بخلاف ازیں علمی دلائل اس کی نفی کرتے ہیں۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ خوارج کبائر یا مطلق گناہوں کے مرتکب کو علیٰ اختلاف الروایات کافر قرار دیتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دروغ گوئی علی الاطلاق ایک کبیرہ گناہ ہے۔ جب دروغ بافی کرنے والا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو کذب کی آماجگاہ بنائے تو اس کے کفر میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔

مشہور نحوی المبرد لکھتے ہیں:

"خوارج کے تمام فرقے جھوٹوں اور گناہ کا ارتکاب کرنے والوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔" (الکامل، ج ۲۔ ص ۱۰۶)

جمہور خوارج خالص عربی الاصل تھے۔ ان میں درمیانہ درجہ کے لوگ بھی ایسے نہ تھے جو شیعہ کی طرح زنادقہ و شعوبیہ فرقہ کے لوگوں سے ساز باز رکھیں اور ان کی دسیسہ کاریوں کو قبول کریں وہ بڑے عابد شب زندہ دار نہایت بہادر بے باک صاف گو اور شیعہ کی طرح تقیہ سے کام لینے والے نہ تھے۔

ظاہر ہے کہ ان صفات کی خوگر قوم دروغ گو نہیں ہو سکتی۔ اگر خوارج رسولِ کریم پر جھوٹ باندھنے کو حلال سمجھتے ہوتے تو خلفاء و امراء پر افترا پردازی کرنے سے انہیں کیا چیز روک سکتی تھی ؟ مگر تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے زیاد اور حجاج جیسے سرکش لوگوں کے خلاف بھی کبھی دروغ گوئی سے کام نہیں لیا۔ بخلاف ازیں وہ خلفاء و حکام کے منہ پر ہمیشہ سچ کہتے اور کبھی اخفاءِ حق کے جرم کا ارتکاب نہ کرتے۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر انہیں دروغ گوئی کی کیا ضرورت تھی ؟

میں بارِ دیگر عرض پرداز ہوں کہ خوارج کو وضاعِ حدیث ثابت کرنے کے لیے کسی ٹھوس دلیل کی ضرورت ہے جو مجھے آج تک نہیں ملی۔ بخلاف ازیں امام ابوداؤد فرماتے ہیں :-

"گمراہ فرقوں میں خوارج سے زیادہ صحیح حدیثیں روایت کرنے والا کوئی فرقہ نہیں"

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں :-

"گمراہ فرقوں میں خوارج سے زیادہ سچا اور مبنی بر عدل و انصاف کوئی فرقہ نہیں"

نیز فرماتے ہیں :-

"خوارج دانستہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے ان کی راست گفتاری ضرب المثل کی حد تک معروف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خوارج کی روایت کردہ حدیث "اصح الحدیث" ہوتی ہے"

(منہاج السنۃ ج ۲ - ص ۲۱)

۲ - زندقہ :

وضعِ حدیث کے اسباب و وجوہ میں سے ایک زندقہ بھی ہے۔

زندقہ سے مراد یہ ہے کہ اسلام کو ایک دین و مذہب اور ریاست و حکومت کے اعتبار سے بنظرِ کراہت و حقارت دیکھا جائے۔

یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں کہ اسلامی حکومت نے بہت سی قوموں کے تخت و تاج ثروت و امارت اور بلند بانگ دعاوی کو خاک میں ملا دیا تھا۔ ان اقوام کی دولت و ثروت کا سنگِ بنیاد دوسری قوموں کی فکری تضلیل معاشرتی تذلیل اور ان کو جذبات و خواہشات کے آگے سرنگوں کر دینے پر

نصب کیا گیا تھا۔ یہ حرص دآز کی بجاری قومیں دوسروں کو اپنے دامِ تزدیر میں پھنسا تیں اور اپنی حکومت و سلطنت کے دائرہ کو آگے بڑھانے اور پھیلانے کے لیے ان کو لڑائی کی آگ میں جھونک دیا کرتی تھیں۔

لوگوں نے بچشم خود دیکھا کہ دین اسلام کے سایہ تلے آ کر فرد کو عزت ملتی ہے۔ اس کے مذہب و عقیدہ کو بنظر اکرام دیکھا جاتا ہے۔ عقل کو آزادی نصیب ہوتی ہے، ادھام و اباطیل اپنی موت مر جاتے ہیں اور دجل و فریب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ لوگ جوق در جوق مشرف باسلام ہونے لگے۔ اسلام کی بے پناہ سیاسی و عسکری قوت نے ان اقوام کے اُمراء و زُعماء کے قلب و دماغ میں اس امید کی کوئی کرن باقی نہ رہنے دی کہ ان کی عظمت و شوکتِ رفتہ پھر بھی کسی وقت سنبھالا لے سکتی ہے۔

جب اسلام سے انتقام لینے کے سب راستے مسدود ہو گئے تو انہوں نے سوچا کہ اب ہمارے لیے اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں کہ اسلام کے عقائد کو بگاڑیں۔ اس کے محاسن کو نقائص و معائب کی صورت میں پیش کریں اور اس کے اتباع و احباب کی صفوں میں انتشار پیدا کریں چنانچہ انہوں نے اس میدان میں اپنی مساعی تیز تر کر دیں کبھی تشیع کے پردہ میں اسلام پر حملہ آور ہوئے اور کبھی زہد و تصوف اور فلسفہ و حکمت کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کی بیخ کنی کرنا چاہی۔ یہ سب جدّ و جہد اور تمام حربے اس لیے استعمال کیے جا رہے تھے کہ اسلام کا جو قصرِ عالی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں استوار ہوا تھا اس کو منہدم کر دیں۔ مگر ان مساعیِ باطلہ کے علی الرغم خدا کے علم میں مقدر تھا کہ یہ قصرِ رفیع تا ابد تاباں و درخشاں رہے گا۔ حوادثِ روزگار اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے رہیں گے مگر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے۔ جو بد نہاد لوگ اس کی تخریب کے درپے ہیں وہ اپنے کیے پر نادم ہوں گے اور ان کی سب کاوشیں انہی کے حق میں ضرر رساں ثابت ہوں گی۔

زنادقہ نے دینِ حنیف میں بگاڑ پیدا کرنے، عقلاء اور مہذب طبقہ کی نگاہ میں اس کی

وقعت کو گرانے اور عوام کے عقائد کو انتہائی پست اور مضحکہ خیز سطح پر لانے کے لیے جو حدیثیں وضع کی تھیں ان میں سے چند ایک مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ملاحظہ فرمائیں:

۱ - "ہمارا رب عرفہ کی شب ایک خاکستری رنگ کے اُونٹ پر سوار ہو کر اترتا ہے سواروں سے مصافحہ کرتا ہے اور پیدل چلنے والوں سے معانقہ کرتا ہے۔"

۲ - "اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنے سینہ اور بازوؤں کے بالوں سے پیدا کیا۔"

۳ - "میں نے اپنے رب کو بے حجاب دیکھا اس کے سر پر موتیوں کا ایک تاج تھا۔"

۴ - "اللہ تعالیٰ کی آنکھیں دکھنے لگیں اور فرشتوں نے اس کی بیمار پرسی کی۔"

۵ - "اللہ تعالیٰ نے جب اپنے آپ کو پیدا کرنا چاہا تو گھوڑے کو پیدا کیا اور اسے بھگایا جب اسے پسینہ آگیا تو اس سے اپنے آپ کو پیدا کیا۔"

۶ - "جب اللہ تعالیٰ نے حروف کو پیدا کیا تو "ب" سجدہ ریز ہوگئی اور "ا" کھڑا رہا۔"

۷ - "خوبصورت چہرے کی جانب دیکھنا عبادت ہے۔"

۸ - "بینگن ہر مرض کی دوا ہے۔"

علیٰ ہذا القیاس زنادقہ نے عقائد و اخلاق حلال و حرام اور طب سے متعلق ہزاروں حدیثیں وضع کر ڈالیں۔ خلیفہ مہدی عباسی کے روبرو ایک زندیق نے اعتراف کیا تھا کہ اس نے ایک سو حدیثیں وضع کی ہیں جو لوگوں میں گردش کر رہی ہیں۔ جب مشہور زندیق عبدالکریم بن ابی العوجاء کو قتل کے لیے پیش کیا گیا تو اُس نے اقرار کیا کہ اس نے چار صد حدیثیں وضع کی ہیں جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا گیا ہے۔

بعض عباسی خلفاء نے جب اپنے دَور خلافت میں زنادقہ سے سیاسی خطرہ محسوس کیا تو ان کو قتل کرنے اور ان کا شیرازہ منتشر کرنے لگے خلیفہ مہدی نے زنادقہ کی تادیب و تعذیب کے سلسلہ میں سرگرم حصہ لیا اور اس ضمن میں ایک خاص محکمہ قائم کیا تھا مہدی نے زنادقہ کی کمین گاہوں کا پتہ چلایا اور ان کے علماء شعراء اور اُدباء کو گرفتار کر لیا۔ حسب ذیل زنادقہ اس دَور کے

مشہور وضاع تھے۔

(۱)۔ عبدالکریم بن ابی العوجاء ۔ اس کو محمد بن سلیمان بن علی امیر بصرہ نے قتل کیا تھا۔

(۲) بیان بن سمعان مہدی ۔ اس کو خالد بن عبداللہ قسری نے قتل کیا تھا۔

(۳) محمد بن سعید مصلوب ۔ اس کو ابوجعفر منصور نے قتل کیا تھا۔

۳۔ مختلف قسم کے تعصبات :

وضعِ حدیث کی ایک وجہ قوم و قبیلہ زبان و وطن اور کسی ایک امام کی جانب رُجحان و میلان اور جنبہ داری بھی تھی۔ مثلاً فرقہ شعوبیہ (جو عربوں کا مخالف تھا) نے یہ حدیث وضع کی تھی۔

"جب اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے تو عربی میں وحی بھیجتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے تو فارسی میں"

عربوں نے اس کے خلاف جوابی کاروائی یوں کی :

"جب اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے تو فارسی میں وحی بھیجتا ہے اور جب خوش ہوتا ہے تو عربی میں"

اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے حامیوں نے ان کی مدح و ستائش میں مندرجہ ذیل حدیث گھڑلی :

"میری امت میں ایک شخص ابوحنیفہؒ نامی پیدا ہوگا وہ میری امت کا چراغ ہوگا"

امام شافعیؒ کے مخالفین نے یہ حدیث وضع کی :

"میری امت میں ایک شخص پیدا ہوگا جسے محمد بن ادریس کہا جائے گا۔ وہ میری امت کے حق میں ابلیس سے بھی زیادہ ضرر رساں ہوگا"

اسی طرح بعض لوگوں نے دیار و بلاد اقوام و قبائل اور اَزمنہ و اَمکنہ کی فضیلت کے بارے میں حدیثیں وضع کیں۔ علماء نے اس قسم کی موضوعات کو بیان کرکے ان کی قلعی کھول دی اور احادیثِ صحیحہ و سقیمہ کو ممیز و ممتاز کر دیا ہے۔

۴۔ قصص و وعظ | وعظ گوئی کا پیشہ افسانہ گو قسم کے لوگوں نے سنبھال رکھا تھا۔ جن میں نام کو

بھی خوفِ خداوندی موجود نہ تھا۔ ان کا مطمحِ نظر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگ مجلسِ وعظ میں ڈھاڑیں مار مار کر روئیں۔ ان کا وعظ سن کر جھومنے لگیں اور واہ واہ کے ڈونگرے برسانے لگیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ جھوٹے قصے گھڑتے اور ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیتے۔

مشہور محدث ابن قُتَیبہ نے جہاں حدیث نبوی میں فساد پیدا ہونے کے وجوہ واسباب بیان کیے ہیں وہاں لکھا ہے۔ وضع حدیث کا دوسرا سبب افسانہ گو قسم کے لوگ تھے۔ وہ عوام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے جو جھوٹی اور منکر حدیثیں ان کو یاد ہوتی تھیں لوگوں میں خوب پھیلاتے تھے۔ عوام الناس کی یہ عادت ہے کہ جب تک ان کو عجیب و غریب خارج از عقل اور دل میں سوزوگداز پیدا کرنے والی حدیثیں سنائی جاتی رہیں وہ جم کر بیٹھے رہتے ہیں۔ جب جنت کا ذکر کرتے تو یوں کہتے :

"اہل جنت کو رہنے کے لیے سفید موتی کا ایک محل ملے گا جس میں ستر ہزار کمرے ہوں گے۔ ہر کمرہ میں ستر ہزار گنبد ہوں گے۔ جنتی شخص ان تمام کمروں پر ہمیشہ قابض رہے گا اور کبھی ان سے نکالا نہ جائے گا۔"

(تاویل مختلف الحدیث۔ ص ۳۵۷)

اسی قسم کی ایک حدیث یہ بھی ہے :

"جو شخص "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" کہتا ہے اللہ تعالیٰ ہر لفظ سے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی چونچ سونے کی اور پَر مرجان کے ہوتے ہیں۔"

یہ عجیب بات ہے کہ یہ واعظ اور افسانہ گو قسم کے لوگ دروغ گوئی میں نہایت بےباک ہوا کرتے تھے اور شرم وحیا سے انہیں کوئی علاقہ نہ تھا۔ ایک دفعہ امام احمد بن حنبلؒ اور یحییٰ بن مَعینؒ نے جامع رصافہ میں نماز ادا کی۔ ایک واعظ ان کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا "مجھے احمد بن حنبل اور یحییٰ بن مَعین نے حدیث سنائی ان دونوں نے عبدالرزاق سے اس نے قتادہ سے

اور اس نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" پھر اس نے سابق الذکر حدیث اس طوالت سے بیان کی کہ بیس[2] صفحات اس سے پُر ہو سکتے ہیں۔

یہ سن کر امام احمد اور یحییٰ بن مَعین ایک دوسرے کی طرف دیکھنے اور پوچھنے لگے کہ کیا آپ نے یہ حدیث بیان کی ہے؟ دونوں نے کہا کہ یہ حدیث تو میں نے ابھی سنی ہے۔ جب واعظ فارغ ہوا تو یحییٰ بن معین نے اشارہ کیا۔ واعظ سمجھا کہ ہدیہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ فوراً حاضر ہوا۔ یحییٰ نے کہا" یہ حدیث آپ کو کس نے سنائی ہے؟" واعظ نے کہا" احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے"۔ یحییٰ نے کہا" میرا نام یحییٰ ہے اور یہ احمد بن حنبل ہیں ہم نے تو یہ حدیث آج تک نہیں سنی۔ اگر تم نے جھوٹ ہی باندھنا ہو تو کسی اور پر باندھا کرو"۔

واعظ نے کہا" میں آج تک سنتا رہا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے۔ اب دیکھنے کا اتفاق ہوا" یحییٰ نے کہا" یہ کیسے معلوم ہوا؟" واعظ نے کہا" کیا تمہارے سوا دنیا میں دوسرا کوئی احمد اور یحییٰ نہیں ہے؟ میں نے تو سترہ[1] ایسے آدمیوں سے روایت کی ہے جن کا نام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین تھا"۔

یہ امر بے حد افسوسناک ہے کہ یہ واعظ جہالت اور بے باکانہ دروغ گوئی کے باوصف عوام کے یہاں نہایت مقبول تھے۔ علماء کو ان کی مخالفت کے نتیجہ میں لاتعداد صعوبات و مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ امام سیوطی اپنی کتاب "تحذیر الخواص من اکاذیب القصاص" میں رقمطراز ہیں:۔

"بغداد میں ایک واعظ آیت "عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہنے لگا کہ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے ساتھ عرش پر بیٹھیں گے"۔

مشہور مفسر امام ابن جریر طبری نے جب یہ بات سُنی تو بہت ناراض ہوئے اور اپنے گھر کے دروازہ پر یہ الفاظ لکھ دیے کہ:۔

سُبْحَانَ مَنْ لَيْسَ لَهُ اَنِيْسٌ — خدا کی ذات پاک ہے جس کا کوئی محب نہیں

وَلَا لَهُ عَلٰی عَرْشِهٖ جَلِيْسٌ — اور نہ ہی عرش پر اس کا کوئی ہم نشین ہے۔

عوام نے آپ کے گھر پر دھاوا بول دیا اور اتنے پتھر برسائے کہ گھر کا دروازہ پتھروں کے ڈھیر سے بند ہو گیا۔

۵۔ فقہی و کلامی اختلافات :

فقہی و کلامی مذاہب کے بعض جاہل اور فاسق اتباع نے اپنے مذاہب کی حمایت میں جھوٹی حدیثیں وضع کرنا شروع کیں۔ اس ضمن میں چند احادیث موضوعہ ملاحظہ ہوں :

(۱) "جو نماز میں رفع یدین کرے تو اس کی نماز نہیں ہوتی"

(۲) "تین تین دفعہ کلی کرنا اور ناک میں پانی چڑھانا جنبی کے لیے فرض ہے"

(۳) "جبریل نے کعبہ کے نزدیک مجھے نماز پڑھائی تو اونچی آواز سے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھی"

(۴) "جس نے کہا کہ قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہو گیا"

(۵) "آسمان و زمین کے درمیان جو کچھ بھی ہے قرآن مجید اور اللہ تعالیٰ کے سوا وہ خدا کی مخلوق ہے میری امت میں ایسی قومیں بھی پیدا ہوں گی جو قرآن کو مخلوق کہیں گی جس نے یہ بات کہی اس نے خدا کے ساتھ کفر کیا، اور اس کی بیوی مطلقہ ہو گئی۔

۶۔ جہالت کے باوجود نیکی کی رغبت :

بہت سے عابد و زاہد اور صلحاء اجر و ثواب کی امید میں ترغیب و ترہیب سے متعلق احادیث وضع کیا کرتے تھے۔ وہ اس کو موجب تقرب ربانی اور ایک عظیم دینی خدمت تصور کرتے تھے۔ جس سے انسان میں طاعات و عبادات کا جذبہ کروٹ لیتا ہے۔ جب علماء ان کے اس رویہ پر تنقید کرتے اور ان کو حضورؐ کی یہ حدیث سناتے کہ :

"جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے"

تو وہ کہتے کہ "ہم آپ پر جھوٹ نہیں باندھتے بلکہ آپ کے لیے جھوٹ بولتے ہیں"۔

یہ سب جہالت خواہش پرستی اور غفلت کی کرشمہ سازی تھی۔ اس سلسلہ میں جو حدیثیں انہوں نے وضع کیں اس کی مثال وہ احادیث ہیں جو انہوں نے قرآن کریم کی جداگانہ سورتوں کے بارے میں گھڑیں۔ مشہور وضاع نوح بن ابی مریم نے خود اس بات کا اعتراف کیا تھا وہ اس کی وجہ یہ بیان کیا کرتا تھا کہ چونکہ لوگوں نے امام ابو حنیفہ کی فقہ اور ابن اسحاق کی مغازی میں منہمک ہو کر قرآن کو چھوڑ دیا تھا اس لیے قرآن کا ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے میں نے سورتوں کے فضائل میں حدیثیں وضع کیں۔

اس قسم کے وضاعین میں سے غلیل کا غلام بھی تھا۔ یہ بڑا عابد و زاہد اور تارک الدنیا تھا۔ لوگ اسے قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب اس نے وفات پائی تو بغداد کے لوگوں نے اس کے سوگ میں دوکانیں بند رکھیں۔ اس کے باوصف اس نے اذکار و اوراد کے فضائل میں بکثرت احادیث وضع کی تھیں۔ جب اس کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے کہا "ہم نے عوام کے دلوں میں رقت پیدا کرنے کے لیے یہ حدیثیں وضع کی ہیں"۔

۷۔ سلاطین و امراء کی خوشنودی :

اس ضمن میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ خلیفہ مہدی عباسی کبوتر سے کھیل رہا تھا کہ غیاث بن ابراہیم داخل ہوا۔ یہ دیکھ کر اس نے خلیفہ کو خوش کرنے کے لیے معروف حدیث :

لَا سَبَقَ اِلَّا فِیْ نَصْلٍ اَوْ حَافِرٍ — مقابلہ صرف تیر چلانے یا گھوڑا دوڑانے میں جائز ہے"

میں "اَوْ جَنَاحٍ" (یا اور یا پرندوں کا مقابلہ) کا لفظ بڑھا دیا۔ خلیفہ مہدی نے غیاث کو دس ہزار درہم انعام دیا۔ جب وہ چلا گیا تو خلیفہ نے کہا :

"میں شہادت دیتا ہوں کہ تیری گدی ایک مفتری علی الرسول کی گدی ہے۔ اس نے کبوتر کو ذبح کرنے کا حکم دیا"

مذکورہ صدر وجوہ کے علاوہ وضعِ حدیث کے کچھ اور بھی اسباب و محرکات تھے چند اسباب

ملاحظہ ہوں :

(۱) لوگوں کے سامنے متن و سند کے اعتبار سے نادر اور انوکھی حدیث پیش کرنے کے لیے حدیثیں وضع کی جاتی تھیں۔

(۲) کسی فتویٰ کی تائید کے لیے حدیث وضع کر لیا کرتے تھے۔

(۳) کسی خاص گروہ سے انتقام لینے کے لیے حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔

(۴) کسی خاص قسم کے کھانے خوشبو یا لباس کو ترویج دینے کے لیے حدیثیں وضع کی جاتی تھیں۔

علماء نے مذکورہ صدر موضوعات کی مثالیں بیان کرنے کے سلسلہ میں بڑی طوالت و تفصیل سے کام لیا ہے۔

مشہور وضاعین کے اصناف و اقسام :

سابقاً ذکر کردہ اسبابِ وضع کے پیش نظر اب ہم مشہور واضعین کے اصناف و اقسام بیان کرتے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں :

۱ ۔ زنادقہ

۲ ۔ اربابِ بدعت

۳ ۔ فرقہ شعوبیہ

۴ ۔ کسی قوم و وطن یا امام کے حامی

۵ ۔ کسی فقہی مسلک کے جاہل مؤیدین

۶ ۔ کسی گروہ کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے کے لیے۔

۷ ۔ پیشہ ور واعظ

۸ ۔ تغافل شعار اور جاہل عُبّاد و زُہّاد

۹ ۔ امراء و خلفاء کی چاپلوسی کرنے والے

۱۰ ۔ علوّ اسناد و غریب الحدیث پر فخر کرنے والے محدثین نما قسم کے لوگ۔

خلفاء و اُمراء کی وضاعین سے مداہنت :

بحث ہذا کے اختتام پر ایک بات عرض کرنا میرے لیے از بس ناگزیر ہے۔ جو ہمیشہ میرے ذہن میں چکر کاٹتی رہی ہے اور یہ فصل تحریر کرتے وقت وہ اور زیادہ پختہ ہو گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وضع حدیث کی صورت میں اُمت جس عظیم فتنہ سے دوچار ہوئی اس کی بڑی وجہ خلفاء و امراء کا نرم سلوک ہے جو ہمیشہ وہ حدیثیں وضع کرنے والوں سے روا رکھتے ہیں اور اگر وہ ایسے حالات میں حکم خداوندی کے مطابق ان لوگوں کو سزا دیتے تو فتنہ کی یہ آگ بھڑکنے نہ پاتی یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ خلیفہ مہدی نے یہ جاننے کے باوجود کہ غیاث نے اس کو خوش کرنے کے لیے حدیث گھڑی ہے اس کو دس ہزار درہم بطور انعام دیے۔ خلیفہ مہدی کے کبوتر کو ذبح کرنے والی بات بھی بڑی عجیب ہے۔ مہدی کو چاہیے تھا کہ اس کاذب و فاجر کو حدیث وضع کرنے کی سزا دیتا اور کبوتر کو ذبح نہ کرتا۔ یہ امر عاری از حکمت و مصلحت ہے کہ اس نے ایک واجب القتل شخص کو بلا سزا دیے چھوڑ دیا اور بلا وجہ کبوتر کو ذبح کر دیا۔

اسی طرح خلیفہ مہدی نے ایک اور وضاعِ حدیث سے بھی سہل انگاری برتی تھی۔ مشہور وضاع مقاتل بن سلیمان بلخی نے مہدی سے کہا "اگر آپ چاہیں تو میں بنی عباس کی فضیلت میں حدیثیں وضع کر دوں؟ مہدی نے کہا "مجھے اس کی ضرورت نہیں" صرف یہ کہا اور اس کو مطلقاً سزا نہ دی۔

ہارون الرشید کے بارے میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ ابوالبختری کذاب نے جو اس کا قاضی تھا ہارون کو مندرجہ ذیل جھوٹی حدیث سنائی کہ:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبوتر اُڑایا کرتے تھے۔"

ہارون نے اسے صرف یہ کہا کہ:

"اگر تو قریش کے قبیلہ سے نہ ہوتا تو میں تجھے معزول کر دیتا۔"

اگر یہ واقعات درست ہیں تو اللہ تعالیٰ خلفاء سے ان کا محاسبہ ضرور کرے گا۔ خلفاء نے دین اسلام کو بگاڑنے کے سلسلہ میں زنادقہ کو جو سزائیں دی تھیں اگرچہ ہم اس کے مداح ہیں تاہم

یہ حقیقت ہے کہ زنادقہ کے خلاف جو چیز ان کو ابھار رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ خلفاء کے باغی تھے اس کی دلیل یہ ہے کہ جو وضاعین وکذابین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر جھوٹ باندھ کر خلفاء کا تقرب حاصل کرتے تھے ان کے خلاف انہوں نے اس کا عشر عشیر بھی نہیں کیا جو وہ باغیوں کے خلاف کرتے تھے۔

واعظ اور افسانہ گو قسم کے لوگ امراء وسلاطین کی موجودگی میں بے محابا جھوٹی حدیثیں بیان کرتے تھے۔ جھوٹے زاہد ہر طرف دندناتے اور من مانی کاروائیاں کرتے پھرتے تھے۔ کوئی انہیں روکنے والا نہ تھا۔ اگر خدا فند رحیم وکریم نے اپنے دین کی خدمت کے لیے ہر عصر وعہد میں ایسے ثقہ علماء وحفاظ نہ پیدا کیے ہوتے جو خدا کی شریعت سے محرفین کی تحریفات کو دُور کرتے اور سنتِ رسول کو ہر قسم کے اختلاط وآمیزش سے بچاتے ہیں تو یہ مصیبت پُوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی، حق کے آثار ومعالم مٹ جاتے اور اس تک رسائی حاصل کرنا ہمارے لیے دشوار ہو جاتا۔ اگر باہمت علماء سلف حدیث رسول کو کذب ووضع سے تاقیامِ قیامت بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی نہ لگاتے تو خالص حق تک پہنچنا ہمارے لیے کسی طرح ممکن نہ ہوتا۔

فصل سوم

وضعِ حدیث کے مقابلہ کے لیے علماء کی مساعی

جو شخص عصر صحابہ سے لے کر جمع و تدوینِ حدیث کی تکمیل تک علماء کے موقف اور احادیث صحیحہ وسقیمہ کو باہم ممیز و ممتاز کرنے کے سلسلہ میں ان کی مساعی جمیلہ کا مطالعہ کرتا ہے وہ اس بات کا اعتراف کرنے کے لیے مجبور ہے کہ اس ضمن میں اس سے زیادہ سعی و جہد ممکن نہیں۔ یہ ایک درخشاں حقیقت ہے کہ علماء سلف نے حدیث کی نقد وتحیص کے لیے جو طریقے اختیار کیے وہ صحیح ترین علمی طریقے تھے۔ ہم وثوقِ کامل کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے علماء جملہ اقوامِ عالم میں اوّلین لوگ تھے جنہوں نے اخبار و احادیث کی جانچ پرکھ کے لیے نہایت دقیق علمی اصول وضع کیے۔ انہوں نے ایسی بلند پایہ مساعی انجام دیں کہ ان کے بل بوتے پر اہلِ اسلام جملہ اقوامِ عالم پر بجا طور پر اظہار فخر و مباہات کر سکتے ہیں۔ وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔

اب ہم علماء کی ان جہود و مساعی کی تفصیلات بیان کرتے ہیں جن کی راہ پر گامزن ہو کر ہمارے علماء نے حدیث نبوی کو وضاعین کے دجل و فریب سے بچایا اور اعداء دین نے اس پر جو کیچڑ اچھالا تھا اس کا دامن اس سے پاک کیا۔

۱۔ اسناد:

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اسی طرح تابعین بلاتوقف صحابہ کی روایت کردہ احادیث کو قبول کر لیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ نامراد یہودی عبداللہ بن سبا غالی شیعہ کے نقطۂ نظر پر مبنی دعوت لے کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ الوہیت علی کا قائل تھا۔ احادیث میں اختلاط و آمیزش کا آغاز ہُوا۔

اندریں حالات علماء صحابہ و تابعین نے حدیث کی نقل و روایت میں حزم و احتیاط سے کام لینا شروع کیا۔ وہ صرف اسی حدیث کو قبول کرتے تھے جس کے رُواۃ و رجال اور ان کی ثقاہت و عدالت سے آگاہ و آشنا ہوں۔ امام ابن سیرین فرماتے ہیں:

"پہلے زمانہ میں اسناد کے متعلق نہیں پوچھا جاتا تھا۔ جب فتنہ سامانی کا ظہور ہوا تو راویوں کے بارے میں سوال کیا جانے لگا۔ اہل سنت کی روایت کردہ حدیث قبول کی جاتی اور اہل بدعت کی ترک کی جاتی تھی۔" (مقدمہ صحیح مسلم)

حدیث نبوی کی روایت میں احتیاط کا آغاز ان صغارِ صحابہ کے عہد سے ہوا جو فتنہ سامانی کے ظہور کے بعد فوت ہوئے۔ امام مسلم مقدمہ صحیح مسلم میں مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ بشیر عدوی حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیثیں بیان کرنے لگا۔ جب ابن عباسؓ نے نہ توجہ دی نہ ان کی طرف نظر بھر کر دیکھا تو وہ متعجبانہ انداز میں کہنے لگا "ابن عباس! کیا بات ہے کہ میں آپ کو آنحضورؐ کی حدیثیں سنا رہا ہوں اور آپ سن نہیں رہے"؟

ابن عباسؓ کہنے لگے "ایک زمانہ وہ تھا کہ جب کوئی شخص "قال رسول اللہ" کہتا تو ہم ہمہ تن گوش ہو کر اس کی بات سنتے۔ جب ہر کس و ناکس حدیثیں بیان کرنے لگا تو ہم وہی روایات قبول کرنے لگے جس سے آشنا ہیں۔" (مقدمہ صحیح مسلم)

جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دروغ بافی کا عام رواج ہو گیا تو تابعین نے اسناد کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں:

"ہم صحابہ سے روایت کردہ احادیث سنتے تو ہمیں اطمینان نہ ہوتا۔ پھر ہم سوار ہو کر ان کی خدمت میں پہنچتے اور براہ راست ان سے سنتے۔" (مقدمہ صحیح مسلم)

امام زہری کا قول ہے:

"اسناد دین کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسناد نہ ہو تو جو شخص جو چاہے کہے۔"

عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں:

"ہمارے اور قوم کے درمیان اسناد حائل ہے"۔ (مقدمہ صحیح مسلم)

(یعنی اسناد دروغ گوئی سے مانع ہے)۔

۲۔ طلب حدیث کے لیے سفر و سیاحت :

اس دور میں حدیث کے طلبہ صحابہ و تابعین اور ائمۂ فن کی جانب رجوع کر کے حدیثوں کی تحقیق کرنے لگے۔ خداوند کریم نے سنتِ رسول کے تحفظ و بقاء کے لیے یہ اہتمام کیا کہ چند اکابر صحابہ کو عمر دراز عطا کی تاکہ وہ حدیث نبوی کا مرکز و محور قرار پائیں اور لوگ ان سے مستفیض ہو سکیں۔ جب اس دور میں دروغ کو فروغ حاصل ہوا تو لوگ ان صحابہ کا رُخ کر کے احادیث کو جانچنے پرکھنے لگے۔ جو احادیث و آثار وہ لوگوں سے سنتے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی حقیقت و کیفیت دریافت کرتے۔

امام مسلم نے مقدمہ صحیح مسلم میں ابن ابی مُلیکہ سے روایت کیا ہے کہ "میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خط لکھ کر عرض کیا کہ مجھے چند احادیث لکھ بھیجیں"۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: ابن ابی ملیکہ میرا خیر خواہ بیٹا ہے۔ میں اسے چند باتیں لکھ بھیجوں گا۔ چنانچہ آپ نے حضرت علیؓ کے فیصلہ جات طلب کیے۔ ان میں سے چند چیزیں لکھیں اور بعض کے بارے میں فرمایا کہ یہ فیصلہ حضرت علیؓ نے اسی صورت میں کیا ہوگا جب آپ گمراہ ہو گئے ہوں۔ (یعنی آپ نے یہ فیصلہ صادر نہیں کیا بلکہ جھوٹ موٹ اسے آپ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے)۔

اسی مقصد کی خاطر تابعین بلکہ بعض صحابہ نے بھی دور دراز کے سفر طے کر کے معتبر راویوں سے حدیثیں روایت کیں۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت جابر بن عبداللہ طلب حدیث کے لیے ملک شام اور حضرت ابوایوب انصاری مصر گئے تھے۔ حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں :

"میں صرف ایک حدیث کے لیے کئی کئی شب و روز چلتا رہتا تھا"۔

(جامع بیان العلم، ج ۱، ص ۹۴)

ایک مرتبہ امام شعبی نے ایک حدیث روایت کی۔ پھر اپنے شاگرد سے کہا:

"یہ بلا معاوضہ لے لو۔ ایک زمانہ تھا کہ اس سے کم درجہ حدیث کی تلاش میں ایک شخص کو مدینہ جانا پڑتا تھا۔" (جامع بیان العلم ج ا۔ ص ۹۲)

حضرت بسر بن عبداللہ حضرمی کا قول ہے:

"میں صرف ایک حدیث سننے کے لیے کئی شہروں کا سفر طے کیا کرتا تھا۔"

(حوالہ مذکور)

۳۔ نقد رواۃ و رجال:

راویان حدیث پر نقد و جرح فن حدیث کا ایک عظیم باب ہے۔ اس کے ذریعہ علماء نے احادیث صحیحہ و سقیمہ کو باہم ممیز و ممتاز کیا۔ محدثین نے اس ضمن میں جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ فن حدیث کے ماہرین نے راویانِ حدیث کو ٹٹولا۔ ان کی حیات، ان کی سیرت اور تاریخ کا مطالعہ کیا۔ ان کے ظاہری و باطنی امور کا بخوبی جائزہ لیا۔ اس راہ میں نہ کسی کی ملامت کا خوف دامنگیر ہوا، نہ راویوں پر نقد و جرح کرنے سے ورع و تقویٰ مانع ہوا۔ مشہور محدث یحییٰ بن سعید القطان سے کہا گیا تھا:

"جن لوگوں سے آپ حدیث روایت نہیں کرتے کیا وہ خدا کی بارگاہ میں آپ سے مزاحم نہ ہوں گے"؟

موصوف نے جواب دیا:

"بارگاہِ ربانی میں ان لوگوں کا مزاحم ہونا میرے لیے اس امر سے بہتر ہے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے مدمقابل ہوں اور مجھ سے دریافت فرمائیں کہ تم نے میری احادیث کو جھوٹ کی آمیزش سے کیوں نہ بچایا"؟

محدثین نے قواعد و ضوابط وضع کیے تھے کہ کن راویوں کی حدیثیں اس قابل ہیں کہ ان کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے اور کن کی نہیں۔

متروک الحدیث رواۃ و رجال کی قابلِ ذکر اقسام حسب ذیل ہیں:

۱۔ رسولُ اللہ پر جھوٹ باندھنے والے:

اس بات پر اہلِ علم کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دروغ بافی کرنے والے کی حدیث قبول نہ کی جائے۔ نیز یہ کہ آپ پر افترا پردازی اکبر الکبائر میں سے ہے ایسے شخص کے کفر میں علماء مختلف الخیال ہیں۔ علماء کی ایک جماعت مفتری علی الرسول کو کافر قرار دیتی ہے۔ جب کہ دوسری جماعت کے نزدیک ایسا شخص واجب القتل ہے۔ قبولیتِ توبہ کے بارے میں بھی علماء کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ اور امام بخاریؒ کے استاد ابوبکر حمیدیؒ کا کہنا ہے کہ ایسے شخص کی روایت ہرگز قبول نہ کی جائے۔

امام نووی شارح مسلم کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ ایسا شخص مقبول التوبہ ہے اور اس کی شہادت کی طرح اس کی روایت بھی قبول کی جائے گی۔ جس طرح کافر جب مشرف باسلام ہو جائے تو اس کی روایت و شہادت مقبول ہے اسی طرح مفتری علی الرسول کی بھی۔

امام سمعانی کا قول ہے کہ "جو شخص کسی ایک حدیث کی روایت میں دروغ گوئی کا مرتکب ہو اس کی باقی احادیث بھی مردود ٹھیریں گی"۔

۲۔ دروغ پیشہ لوگ:

جو شخص حدیثِ رسول کے علاوہ دیگر باتوں میں جھوٹ بولنے کا عادی ہو اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی۔ اگرچہ رسول کریم پر دروغ بافی کا جرم اس سے سرزد نہ ہوا ہو۔ علماء حدیث اس بات میں متحد الرائے ہیں کہ جس شخص نے ایک مرتبہ بھی دروغ گوئی کا ارتکاب کیا ہو اس کی حدیث قبول نہیں کی جائے گی۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"چار آدمیوں سے حدیث اخذ نہیں کی جائے گی:

(۱) جو آدمی علانیہ حماقت کا ارتکاب کرتا ہو وہ بہت بڑا راوی ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) جو شخص عام باتوں میں جھوٹ بولنے کا عادی ہو۔ اگرچہ حدیث نبوی میں دروغ گوئی کا مرتکب نہ ہوا ہو۔

(۳) وہ بدعتی شخص جو اپنے مسلک کی دعوت دیتا ہو۔

(۴) ایک عابد شب زندہ دار جو حدیث نبوی سے یکسر بیگانہ ہو۔

جب ایک جھوٹا آدمی دروغ گوئی سے تائب ہو جائے تو بقول جمہور اس کی توبہ و روایت دونوں مقبول ہیں۔ مگر ابو بکر صیرفی اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا قول ہے کہ:

"راویوں میں سے ہم جس کی روایت اس کی دروغ گوئی کی وجہ سے ایک مرتبہ مسترد کر دیں گے وہ تائب بھی ہو جائے تو ہم اس کی روایت قبول نہیں کریں گے"۔

۳۔ مبتدعین :

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بدعت جب کفر کی موجب ہو تو اس کے حامل کی روایت مقبول نہیں ہو گی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص جھوٹ کو حلال سمجھتا ہو تو اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی اگرچہ وہ بدعت کے باعث کافر نہ بھی ہو۔ جب راوی حلتِ کذب کا قائل نہ ہو تو اب سوال یہ ہے کہ اس کی روایت مقبول ہو گی یا نہیں؟ نیز یہ کہ آیا بدعت کے داعی و غیر داعی کے مابین قبولِ روایت کے ضمن میں فرق و امتیاز روا رکھا جائے گا یا نہیں؟

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ متنازع فیہا چلا آ رہا ہے۔ اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ داعی بدعت و غیر داعی کے درمیان فرق کرنا چاہیے۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے بتصریح منقول ہے اور ابن حبان نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے کہ "جمیع ائمہ حدیث کے نزدیک ایسی روایت مردود ہے"۔

مگر ابن حبان کا یہ دعویٰ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امام بخاری نے مشہور خارجی عمران بن حطان سے روایت کی ہے۔ حالانکہ یہ شخص حضرت علی کے قاتل عبدالرحمٰن بن

ملجم کی مدح وستائش کیا کرتا تھا اور مسلکِ خوارج کا بہت بڑا داعی تھا۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے :

"میں روافض کے فرقہ خطابیہ کے سوا سب بدعتی راویوں کی روایت قبول کرتا ہوں۔ خطابیہ کی روایت اس لیے قبول نہیں کرتا کہ یہ اپنے مذہب کی تائید کے لیے جھوٹ بولنے کو جائز قرار دیتے ہیں"۔ (اختصار علوم الحدیث ص ۱۰۷)

امام عبدالقاہر بغدادیؒ نے اپنی کتاب "الفَرق بَیْنَ الفِرَق" میں لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے ارباب بدعت کی روایت کو قبول کرنے کے مسلک سے رجوع کر لیا تھا۔ البتہ وہ معتزلہ کو مستثنیٰ قرار دیتے تھے۔ (الفرق بین الفرق۔ ص ۱۰۳)

میرے نزدیک اس ضمن میں صحیح تر بات یہ ہے کہ محدثین بدعتی کی روایت اس صورت میں قبول نہیں کرتے جب وہ اپنے مخصوص مسلک کی تائید وحمایت میں کوئی حدیث روایت کرے۔ یا جب وہ ایسے گروہ سے وابستہ ہو جو جھوٹ کو حلال سمجھتا ہو اور بدعت کی تائید وحمایت کے لیے حدیثیں گھڑتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین روافض کی روایات قبول نہیں کرتے۔ زید بن ہارون فرمایا کرتے تھے :

"بدعتی شخص جب اپنے مسلک کا داعی نہ ہو تو ہم اس کی روایت قبول کرتے ہیں۔ مگر شیعہ کی روایت کردہ حدیث قبول نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں"۔

(منہاج السنۃ ج ۱۔ص ۱۳)

تاہم علماء نے بعض ایسے شیعہ کی روایات قبول کی ہیں جو صدق وامانت میں معروف تھے۔ اسی طرح جو ارباب بدعت جھوٹ کو حلال نہ سمجھتے ہوں جیسے عِمران بن حِطّان خارجی، تو محدثین ان کی روایت کردہ احادیث کو بھی قبول کرتے ہیں۔

۴۔ گروہِ زنادقہ وفُسّاق :

زنادقہ، فُسّاق اور ان غفلت پیشہ راویوں کی نقل کردہ حدیث قابلِ تسلیم نہیں جو

اس حدیث کا فہم و ادراک نہ رکھتے ہوں ۔ اسی طرح جو راوی بھی ضبط و عدالت اور فہم و ادراک کی صفات سے عاری ہوں ان کی روایت سے استناد نہیں کیا جا سکتا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

مقبول وہ حدیث ہے جس کا راوی ثقہ اور حفظ و ضبط سے بہرہ ور ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلم عاقل بالغ، اسباب فسق سے عاری اور اخلاق عالیہ سے متصف ہو مزید براں وہ بیدار مغز ہو، غفلت شعار نہ ہو۔ اگر اپنے حافظہ سے روایت بیان کرے تو اسے قوی الحافظہ ہونا چاہیے ۔ اور اگر روایت بالمعنی کرتا ہو تو اس کے لیے سمجھ دار ہونا ضروری ہے ۔ اگر مذکورہ شرائط میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو تو اس کی روایت قبول نہیں کی جائے گی"۔ (اختصار علوم الحدیث ۔ ص ۹۸)

جن رُواۃ و رجال کی روایت اخذ کرنے سے گریز کیا جاتا ہے ان کی بڑی بڑی اصناف و اقسام حسب ذیل ہیں :

۱ ۔ وہ راوی جس کی جرح و تعدیل کے بارے میں علماء مختلف الخیال ہوں ۔
۲ ۔ جس سے اکثر غلطی سرزد ہوتی ہو اور وہ اپنی مرویات میں ائمہ ثقات کی مخالفت کرتا ہو۔
۳ ۔ جو کثیر النسیان ہو۔
۴ ۔ عمر کے آخری حصہ میں جس کا دماغ خراب ہو گیا ہو۔
۵ ۔ جس کا حافظہ خراب ہو۔
۶ ۔ جو بلا امتیاز قوی و ضعیف ہر قسم کے راویوں سے حدیث روایت کرتا ہو۔

۴ ۔ حدیث کی تمیز و تقسیم کے لیے وضع قواعد عامہ :

محدثین نے حدیث کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے :

(۱) صحیح ۔ (۲) حسن ۔ (۳) ضعیف ۔

صحیح :

صحیح وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو اور اس کو ایک عادل ضابط راوی انہی صفات کے حامل دوسرے راوی سے نقل کرتا جائے یہاں تک کہ یہ سلسلہ نبی کریمؐ، صحابی یا تابعی تک پہنچ جائے۔ یہ حدیث شاذ و مردود نہ ہو اور اس میں کوئی علتِ قادحہ بھی نہ پائی جاتی ہو۔ (اختصار علوم الحدیث ص ۹)

مذکورہ صدر تعریف میں اِتصالِ سند کی قید لگا کر انقطاع سند سے احتراز کیا ہے۔ اگر سند میں صحابی کا نام مذکور نہ ہو تو اس کو مرسل کہتے ہیں۔ جمہور محدثین کے نزدیک مرسل روایت ناقابلِ اخذ و استناد اور صحیح کے مقام سے فروتر ہے۔ البتہ فقہاء اس کے بارے میں مختلف الخیال ہیں۔

حَسَن :

حدیث حَسَن کی تعریف میں علماء کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بقول محدث ابن الصلاح چونکہ حدیث حسن بظاہر حدیث صحیح و ضعیف کے بین بین ہوتی ہے۔ مگر دراصل یوں نہیں ہوتی اس لیے اکثر اصحابِ فن کے لیے اس کا ضبط و تعبیر مشکل ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک اضافی امر ہے۔ ایک چیز محدث کے نزدیک موجباتِ جرح و قدح میں سے ہوتی ہے مگر وہ اس کے اظہار و بیان سے قاصر ہوتا ہے۔ آگے چل کر ابن الصلاح فرماتے ہیں:

حدیث حسن کی دو قسمیں ہیں:

(۱) حسن کی ایک قسم وہ ہے جس کی سند میں ایسا مستور الحال راوی ہو جس کی اہلیت ثابت نہ ہو۔ تاہم وہ تغافل شعار، کثیر الخطاء اور متہم بالکذب نہ ہو اور وہ حدیث کسی دوسری سند سے بھی مروی و منقول ہو۔

(۲) حسن کی دوسری قسم وہ ہے جس کا راوی گو صدق و امانت میں معروف ہو۔ مگر حفظ و اتقان میں حدیث صحیح کے راویوں سے فروتر ہو۔ جس حدیث کی روایت

کرنے میں وہ منفرد ہو اس کو منکر نہ قرار دیا جائے اور اس حدیث کا متن شاذ اور معلل بھی نہ ہو۔ (اختصار علوم الحدیث ص ۲۸)

پہلی اور دوسری صدی کے محدثین کسی حدیث کو حسن نہیں کہا کرتے تھے۔ یہ اصطلاح امام احمد اور بخاری کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور آگے چل کر شہرت پذیر ہوئی۔

ضعیف :

محدثین کے نزدیک یہ حدیث کی تیسری قسم ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس میں حدیث صحیح اور حسن کے اوصاف نہ پائے جاتے ہوں۔ ضعف کا سبب کبھی متن حدیث میں پایا جاتا ہے اور کبھی سند میں۔

اقسام ضعیف :

مُرسَل : مرسل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند سے صحابی کا نام ساقط ہو گیا ہو حدیث مرسل کے قابلِ احتجاج ہونے میں فقہاء کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ محدثین اس ضمن میں متفق الرائے ہیں کہ حدیث مرسل پر عمل نہ کیا جائے۔ امام مسلم صحیح مسلم کے مقدمہ میں فرماتے ہیں :

"مرسل ہمارے اور محدثین کے قول کے مطابق حجت نہیں ہے"۔

حافظ ابن الصلاح رقم طراز ہیں :

"ہم نے حدیث مرسل کے ضعیف اور ناقابلِ احتجاج ہونے کے بارے میں جو کچھ کہا ہے حُفّاظ و نُقّادِ حدیث اسی پر متفق ہیں اور اپنی تصانیف میں انہوں نے یہی بات تحریر کی ہے"۔

اس میں شبہ نہیں کہ خدا کے دین اور حدیث نبوی میں حزم و احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ حدیث مرسل کو ضعیف قرار دیا جائے۔ عدالتِ صحابہ کے بارے میں یک زبان ہونے کے باوصف محدثین حدیث مرسل کو ضعیف تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ مرسل کی سند میں صرف

صحابی کا نام مذکور نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ احتمال کہ صحابی نے تابعی سے روایت کیا ہو یہ نہایت کمزور احتمال ہے اور کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا۔ اگر صحابی نے تابعی سے روایت کی ہوتی تو انہوں نے اسے بیان کر دیا ہوتا۔ جب ثقہ تابعی صحابی کا نام ساقط کر دے ــــ اور سب صحابہ اجماعًا عدول ہیں ــــ تو اگرچہ اس سے حدیث کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ مگر ضبط و احتیاط کے پیش نظر جو علماء امت کی عظیم خصوصیت ہے حدیث مرسل سے احتجاج نہیں کیا جاتا۔

حدیث مرسل میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ایک تابعی نے دوسرے تابعی سے روایت کر کے حدیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا ہو۔ تو یہ احتمال قلیل الوقوع ہونے کے ساتھ ساتھ غیر مؤثر بھی ہے۔ اس لیے کہ ثقہ تابعی رسول کریم ؐ سے اسی صورت میں کوئی حدیث روایت کرتا ہے جب اس نے کسی صحابی سے بذاتِ خود سنی ہو۔

مُنقَطِع: منقطع اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند سے صحابی کے سوا کوئی اور راوی ساقط ہو گیا ہو۔ یا اس میں کوئی مبہم راوی مذکور ہو۔

مُعضَل: اگر سند سے دو یا دو سے زیادہ راوی ساقط ہو گئے ہوں تو اس کو معضل کہتے ہیں۔ اگر اتباعِ تابعین میں سے کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتا ہو تو اس کو بھی مُعضَل کہتے ہیں۔

شاذ: بقول امام شافعیؒ جب ایک ثقہ راوی ایسی روایت بیان کرے جو باقی لوگوں کی روایت کے خلاف ہو تو اس کی بیان کردہ حدیث کو "شاذ" کہتے ہیں۔ اس کے قبول کرنے میں توقف سے کام لیا جاتا ہے۔

دیگر حفاظِ حدیث نے شاذ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"شاذ اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی ایک ہی اسناد ہو اور جس کے روایت کرنے میں ایک ثقہ یا غیر ثقہ راوی منفرد ہو۔"

جب حدیث شاذ کا راوی ثقہ ہو تو اس کے قبول کرنے میں توقف سے

کام لیا جائے گا اور اس سے اخذ و احتجاج نہیں کریں گے۔ بخلاف ازیں جب اس کا راوی غیر ثقہ ہو تو اس حدیث کو ردّ کر دیا جائے گا۔"

امام شافعی کی اوّل الذکر تعریف اولیٰ و افضل ہے۔ اس لیے کہ اگر دوسری تعریف کو درست تسلیم کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بکثرت ایسی احادیث کے قبول کرنے میں توقف سے کام لینا پڑے گا جن کو ایک ہی راوی ثقہ راویوں سے نقل کرتا ہے۔ حالانکہ امام مسلم فرماتے ہیں کہ:

"امام زہری نے نوّے ایسی احادیث روایت کی ہیں جن کو کسی دوسرے راوی نے ذکر نہیں کیا۔"

منکر: منکر اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے روایت کرنے میں ایک غیر عادل و ضابط راوی منفرد ہو۔ ایسی روایت کو رد کر دیا جائے گا اور اسے قبول نہیں کریں گے۔

مضطرب: جس حدیث کے متن و سند میں اختلاف ہو اور صحت میں برابر ہونے کی بنا پر ایک روایت کو دوسری پر ترجیح دینے کا کوئی امکان نہ ہو تو اس کو مضطرب کہتے ہیں۔ حدیث مضطرب ضعیف ہوتی ہے۔ مگر جب راوی کے نام یا اس کے باپ کے نام یا اس کی نسبت میں اختلاف ہو اور وہ راوی ثقہ ہو تو اندریں صورت حدیث کو صحیح قرار دیا جائے گا۔

حدیث موضوع اور اس کے آثار و علامات:

جس طرح علماء نے حدیث صحیح و حسن و ضعیف کے مابین فرق و امتیاز کرنے کے لیے قواعد مقرر کیے ہیں اسی طرح احادیث موضوعہ کی جانچ پرکھ کے لیے بھی انہوں نے اصول و ضوابط مقرر کیے اور ایسی علامات کی نشان دہی کی ہے جس سے ایک موضوع حدیث جانی پہچانی جا سکتی ہے۔ ہم قبل ازیں وضاعین کے اصناف و اقسام اور وضع حدیث کے اسباب و وجوہ بیان کر چکے ہیں۔ اب ہم ایسی علامات کی نشان دہی کریں گے جن سے موضوع حدیث کا

پتہ چل جاتا ہے۔

یہ علامتیں دو قسم کی ہیں:

(۱) علامات فی السند۔ (۲) علامات فی المتن۔

سند میں وضع کی علامات:

یوں تو ایسی علامات بہت ہیں مگر ان میں سے اہم حسب ذیل ہیں:

(۱) راوی کذّاب اور معروف بالکذب ہو۔ اور اس کے سوا کوئی دوسرا راوی اس حدیث کو بیان نہ کرتا ہو۔ علماء حدیث نے جھوٹے راویوں کی جان پہچان اور تاریخ بیان کرنے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ انہوں نے جھوٹے راویوں کی ایک ایک روایت کا کھوج لگایا ہے۔ کوئی کذاب راوی ان کی گرفت سے بچ نہیں سکا۔

(۲) موضوع حدیث کی ایک علامت یہ ہے کہ واضع خود اپنے جرم کا معترف ہو۔ جس طرح ابوعصمہ نوح بن ابی مریم نے قرآنی سورتوں کے فضائل سے متعلق حدیثیں وضع کرنے کا خود اعتراف کیا تھا۔ اور جیسے عبدالکریم بن ابی العوجاء نے خود اقرار کیا تھا کہ اس نے تحریم حلال اور تحلیل حرام کے ضمن میں چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں۔

(۳) وضع حدیث کی ایک نشانی یہ ہے کہ راوی ایسے شیخ سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات ہی ثابت نہیں۔ یا وہ اس کے بعد پیدا ہوا ہو۔ یا جس جگہ سماع کا دعویٰ کیا وہاں سرے سے گیا ہی نہیں۔ اس ضمن میں چند امثلہ ملاحظہ ہوں:

الف: جب مامون بن احمد ھروی نے دعویٰ کیا کہ اس نے ہشام بن عمار سے حدیثیں سنی ہیں تو محدث ابن حبان نے دریافت کیا "آپ ملکِ شام کب گئے تھے"؟ مامون نے کہا "۲۵۰ھ ہجری میں"۔ ابن حبان نے کہا "جس ہشام سے آپ روایت کا دعویٰ کرتے ہیں وہ تو ۲۴۵ھ میں فوت ہو گیا تھا"۔

ب: عبداللہ بن اسحاق کرمانی نے جب محمد بن ابی یعقوب سے حدیثیں روایت کرنے

کا دعویٰ کیا تو اس سے کہا گیا کہ "محمد بن ابی یعقوب تو تمہاری پیدائش سے نو سال پہلے فوت ہو گیا تھا!"

ج : جب محمد بن حاتم نے عبد بن حمید سے حدیث روایت کی تو مشہور محدث حاکم ابو عبداللہ نے کہا: "محمد بن حاتم نے عَبد بن حُمَید کی وفات کے تیرہ سال بعد اس سے حدیث سنی"؟

د : مقدمہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ معلی بن عرفان نے کہا ہمیں ابو وائل نے بتایا کہ کہ جنگ صفین میں عبداللہ بن مسعود ہمارے سامنے آئے"۔ یہ سُن کر مُعلی کے شاگرد فضل بن دُکَین نے کہا "تو پھر ابن مسعود دوبارہ زندہ ہو کر آئے ہوں گے"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود باختلاف روایات ۳۲ھ یا ۳۳ھ میں حضرت عثمان کا عہدِ خلافت ختم ہونے سے تین سال پہلے فوت ہو گئے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ایسے امور کا مدار وانحصار راویوں کی تاریخ ولادت ووفات' ان کی رحلت واقامت اور ان کے شیوخ کے کوائف واحوال پر ہے۔ بنا بریں نُقّادِ حدیث کے لیے علم الطبقات از بس ناگزیر ہے

قاضی حفص بن غیاث فرماتے ہیں:

"جب تم حدیث کے کسی راوی پر دروغ گوئی کا الزام عائد کرو تو اس کی اور اس کے شیخ کی عمر کا محاسبہ کر لو"۔

سفیان ثوری کا قول ہے:

"جب راویوں نے جھوٹ بولنا شروع کیا تو ہم نے تاریخ سے فائدہ اُٹھایا"۔

(۴) بعض اوقات راوی کے حالات اور اس کے نفسانی محرکات سے بھی وضع حدیث کا پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً امام حاکم نے سیف بن عمر تمیمی سے روایت کیا ہے کہ ہم سعد بن طریف کے پاس بیٹھے تھے۔ اس کا لڑکا سکول سے روتا ہوا آیا۔ سعد نے رونے کی وجہ پوچھی۔

لڑکے نے کہا "مجھے استاد نے پیٹا ہے"۔ سعد نے کہا "آج میں ان کو ذلیل کر کے رکھ دوں گا۔
اسی وقت یہ حدیث بیان کرنے لگا:

"مجھے عکرمہ نے ابن عباس سے سن کر بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تمہارے بچوں کے استاد تم میں سب سے زیادہ شریر ہیں۔ وہ یتیموں پر بہت کم رحم کرنے والے اور مسکینوں پر بہت زیادہ سختی کرنے والے ہیں"۔

اسی طرح محمد بن حجاج نخعی دلیا فروش نے ایک حدیث وضع کی تھی:

"الھریسۃ تشد الظھر" دلیا کمر کو طاقت بخشتا ہے۔

متن میں وضع کی علامات:

یوں تو وضع فی المتن کے آثار و معالم بہت ہیں۔ مگر ان میں سے اہم مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ لفظی رکاکت:

بعض اوقات موضوع حدیث ایسے رکیک اور گھٹیا الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے کہ عربی زبان و ادب کا دقیقہ شناس فوراً بھانپ جاتا ہے کہ ایسے الفاظ ایک فصیح و بلیغ شخص سے صادر نہیں ہو سکتے۔ چہ جائیکہ سید الفصحاء صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے کلمات کا صدور ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

"یہ وہاں ہوتا ہے جہاں اس امر کی صراحت کی گئی ہو کہ یہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں"۔

امام ابن دقیق العید فرماتے ہیں:

"بعض اوقات حدیث کے الفاظ کے پیش نظر بھی اس کے موضوع ہونے کا فیصلہ صادر کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کثرت مزاولت و ممارست کی بنا پر محدثین کو ایک ایسا قوی ملکہ حاصل ہو جاتا ہے جس کی اساس پر وہ فوراً پہچان جاتے ہیں کہ آیا حدیث میں وارد شدہ الفاظ آنحضور کے ہو سکتے ہیں یا نہیں"۔

امام بلقینی کا قول ہے :

"اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر عرصۂ دراز تک ایک شخص کسی کی خدمت کرتا رہے اور اس کی پسند ونا پسند سے آگاہ ہو اور ایک شخص دعوٰی کرے کہ وہ فلاں چیز کو ناپسند کرتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ چیز اس کو پسند تھی تو وہ فوراً اس کی تردید کرے گا۔"

۲۔ فسادِ معنی :

۱۔ فسادِ معنی سے مراد یہ ہے کہ حدیث عقلی بدیہیات کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کا کوئی امکان نہ ہو۔ مثلاً مندرجہ ذیل حدیث :

"حضرت نوح کی کشتی نے سات دفعہ خانہ کعبہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیمؑ کے نزدیک دو رکعتیں ادا کیں۔"

۲۔ حِکَم و اخلاق کے قواعدِ عامہ کے منافی ہو۔ مثلاً یہ موضوع حدیث :

"ترکوں کا ظلم اچھا اور عربوں کا عدل بُرا ہے۔"

۳۔ جو حدیث شہوت و فساد کی موجب ہو۔ مثلاً :

"خوبصورت چہرے کی طرف دیکھنے سے نظر تیز ہوتی ہے۔"

۴۔ جو حدیث حِس و مشاہدہ کے برعکس ہو۔ جیسے یہ حدیث :

"سنہ ۱۰۰ ہجری کے بعد کوئی بچہ ایسا پیدا نہ ہوگا جو خدا کو مطلوب ہو۔"

۵۔ جو طب کے متفق علیہ قواعد کے خلاف ہو۔ مثلاً

"بینگن ہر مرض کی شفا ہے۔"

۶۔ جو حدیث خداوند تعالیٰ کی تقدیس و تنزیہہ کے خلاف ہو۔ جیسے مندرجہ ذیل حدیث :

"اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کو پیدا کرکے بھگایا تو اسے پسینہ آگیا۔ پھر اپنی ذات کو اس سے پیدا کیا۔"

(۷) جو حدیث تاریخی حقائق یا سنت اللہ کے منافی ہو۔ مثلاً:

"عوج بن عُنق تین ہزار گز لبا تھا۔ جب نوح علیہ السلام نے اسے طوفان سے ڈرایا تو اس نے کہا مجھے اپنے اس پیالہ (کشتی نوح) میں سوار کرلو۔ طوفان نوح اس کے ٹخنوں تک پہنچا تھا۔ وہ سمندر میں ہاتھ ڈال کر مچھلیاں پکڑ لیتا اور سورج کی تپش میں بھون لیا کرتا تھا۔"

یہ حدیث بھی اسی قبیل سے ہے کہ "رتن ہندی" نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا اور وہ چھ سو سال تک بقیدِ حیات رہا۔"

(۸) جو حدیث ایسی لغو باتوں پر مشتمل ہو جن سے عقلاء کا دامن پاک ہوتا ہے۔ مثلاً:

"سفید مرغ میرا دوست اور میرے محب جبریلؑ کا دوست ہے۔"

نیز یہ خود ساختہ حدیث:

"دم بریدہ کبوتر پالا کرو۔ یہ تمہارے بچوں سے جنات کو دور کرتے ہیں۔"

(۹) عقل جس بات کو بداہتہً رد کرتی ہو وہ باطل اور مردود ہے۔ امام ابن الجوزی فرماتے ہیں "قائل کا یہ قول کس قدر پسندیدہ ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ وہ خلاف عقل ہے یا اصول و نقول سے ٹکراتی ہے تو جان لو کہ وہ موضوع ہے۔"

"المحصول" میں لکھا ہے:

"جس حدیث سے باطل کا وہم پڑتا ہو اور اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو تو وہ جھوٹی ہے۔ یا اس حدیث سے وہم کو زائل کرنے والا حصہ ساقط ہوگیا ہے۔"

۳۔ صریح قرآن کے مخالف:

(۱) جو حدیث نص قرآنی کے خلاف ہو اور قابلِ تاویل نہ ہو وہ موضوع ہے۔ مثلاً یہ حدیث:

"ولد الحرام سات پشتوں تک جنت میں نہیں جائے گا۔"

یہ حدیث آیتِ قرآنی "لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" (کوئی اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا) کے خلاف اور تورات سے ماخوذ ہے۔

۲- اسی طرح جو حدیث صریح سنت متواترہ کے خلاف ہو۔ مثلاً:

"جب میری طرف سے تمہیں کوئی حدیث سنائی جائے تو اسے لے لو خواہ میں نے وہ بیان کی ہو یا نہ کی ہو۔"

یہ موضوع حدیث مندرجہ ذیل حدیثِ متواتر سے ٹکراتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

"جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے۔"

۳- وہ حدیث جو قرآن و سنت سے ماخوذ قواعدِ عامہ کے خلاف ہو۔ جیسے یہ حدیث:

"جس کے یہاں بچہ تولد ہوا۔ اور اس نے اس کا نام محمد رکھا تو والد و مولود دونوں جنت میں جائیں گے۔"

نیز یہ من گھڑت حدیث:

"میں نے قسم کھائی ہے کہ جس کا نام محمد یا احمد ہوگا اس کو دوزخ میں داخل نہیں ہونے دوں گا۔"

مذکورہ صدر دونوں حدیثیں کتاب و سنت کے اس قطعی و حتمی قاعدہ کے خلاف ہیں کہ فلاح و نجات کا مدار و انحصار اعمالِ صالحہ پہ ہے، اسماء و القاب پر نہیں۔

۴- جو حدیث اجماع کے خلاف ہو وہ بھی موضوع ہے۔ مثلاً قضاء عمری سے متعلق مندرجہ ذیل حدیث:

"جس نے رمضان کے آخری جمعہ میں چند فرضی نمازیں قضاء پڑھیں تو اس سے اس کی ستر سالوں کی فوت شدہ نمازوں کی تلافی ہو جائے گی۔"

یہ موضوع حدیث اس اجماعی مسئلہ کے خلاف ہے کہ کوئی عبادت فوت شدہ فرائض کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

۴۔ جو حدیث عہدِ رسالت کے معروف تاریخی حقائق کے خلاف ہو۔

جو حدیث عہدِ رسالت کے معروف تاریخی حقائق سے متصادم ہو وہ موضوع ہے مثلاً یہ حدیث کہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان اور حضرت سعد بن معاذؓ کی شہادت کی بناء پر اہل خیبر پر جزیہ عائد کیا اور ان سے ٹیکس معاف کر دیا۔"

حالانکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ غزوۂ خیبر کے سال (۷ھ) جزیہ کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ جزیہ کے حکم پر مشتمل آیت غزوۂ تبوک والے سال (۹ھ) نازل ہوئی۔ مزید برآں حضرت سعد بن معاذؓ غزوہ خیبر سے قبل ۵ھ غزوۂ خندق میں فوت ہو گئے تھے۔ اور حضرت معاویہؓ فتح مکہ کے موقع پر (۸ھ میں) مشرف باسلام ہوئے تھے۔ بنا بریں تاریخی حقائق ببانگِ دہل اس حدیث کی تردید کرتے اور اس کے موضوع ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔

حضرت انسؓ سے مروی و منقول حدیث کو بھی اس کی مثال میں پیش کر سکتے ہیں:

"حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں حمام میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چادر اوڑھے وہاں بیٹھے ہیں۔ میں نے آپ سے بات چیت کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا "اے انس! میں نے چادر کے بغیر حمام میں داخل ہونے سے اسی لیے منع کیا ہے"۔

حالانکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سرے سے حمام میں داخل ہی نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ عہدِ رسالت میں حجاز میں حمام میں نہانے کا رواج نہ تھا۔

۵۔ حدیث کی مسلک راوی سے مماثلت و مطابقت:

جب راوی کی بیان کردہ حدیث اس کے مسلک و مذہب سے ہم آہنگ ہو اور وہ راوی

اپنے مسلک میں غلو کی حد تک تعصب رکھتا ہو تو اس کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ مثلاً کوئی رافضی راوی اہل بیت کے فضائل میں حدیث روایت کرے۔ یا راوی جب مرجئہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہو اور اپنے مسلک کی تائید و حمایت میں حدیث روایت کرے تو اسے تسلیم نہیں کریں گے۔

مثلاً حبّہ بن جُوَین روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا فرماتے تھے "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں باقی لوگوں سے پانچ یا سات سال پہلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی"۔

محدث ابن حبان فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا راوی حبّہ ناقابلِ اعتماد اور بڑا غالی شیعہ تھا

۶۔ کسی مشہور واقعہ کو صرف ایک راوی کا روایت کرنا:

جب حدیث کسی ایسے واقعہ پر مشتمل ہو جو بہت سے لوگوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا جس کا تقاضا تھا کہ بکثرت لوگ اسے نقل و روایت کرتے۔ مگر بایں ہمہ صرف ایک ہی راوی اسے روایت کرے تو ایسی حدیث ناقابلِ اعتماد ہوگی۔

نظر بریں اہل سنت علماء نے حدیثِ "غدیر خُم" کو جھوٹی اور موضوع قرار دیا ہے۔

علماء کی رائے میں اس حدیث کے موضوع ہونے کی علامت یہ ہے کہ بقول شیعہ "غدیر خُم" کا واقعہ صحابہ کی ایک کثیر جماعت کی موجودگی میں پیش آیا۔ پھر ہوا یہ کہ حضرت ابو بکرؓ کے انتخاب کے وقت سب صحابہ اس کے چھپانے پر متفق ہو گئے۔ اور کسی نے بھی اس کا اظہار نہ کیا۔ حالانکہ یہ بات عادۃً بعید و مستحیل ہے۔

روافض کا جمہور اہل اسلام کے خلاف اس حدیث کی نقل و روایت میں منفرد ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ روایت شیعہ کی ساختہ پرداختہ ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

"حضرت علیؓ کی خلافت سے متعلق شیعہ جو نص بیان کرتے ہیں وہ بھی اسی قبیل

سے ہے۔ ہم مختلف طریقوں سے جانتے ہیں کہ یہ جھوٹی روایت ہے۔ اس نص کو کسی ایک راوی نے بھی بسند صحیح نقل نہیں کیا۔ اس کا متواتر ہونا تو بڑی بات ہے، یہ بھی منقول نہیں کہ کسی راوی نے رازداری کے طور پر ہی اس کو نقل و روایت کیا ہو۔ حالانکہ خلافت کے بارے میں بڑے بڑے جھگڑے اُٹھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کا مسئلہ متنازع فیہ رہا۔ حضرت عمر فاروقؓ کی وفات کے وقت یہ مسئلہ چھ اشخاص پر مشتمل ایک مجلس شوریٰ کے سپرد کیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد لوگ حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کرنے کے سلسلہ میں بھی اختلافات کا اظہار کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ بقول شیعہ اگر حضرت علی کی خلافت سے متعلق کوئی جلی اور قاطع نص موجود ہوتی۔ اور اہل اسلام کو اس کا علم بھی ہوتا تو یہ ایک لازمی بات ہے کہ لوگ اس کو نقل و روایت کرتے۔ خصوصاً ایسے متنازعہ مواقع پر جب کہ لوگ ایسی روایات کو بڑے ذوق وشوق سے بیان کیا کرتے ہیں۔ جب صحابہ نے ایسے آڑے وقت پر یہ روایت بیان نہیں کی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ روایت سرے سے درست ہی نہیں بلکہ شیعہ کی من گھڑت ہے۔ (منہاج السنۃ۔ ج ۴۔ ص ۱۱۸)

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"شیعہ خلافت علیؓ سے متعلق جس نص کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ہمیں کہیں نہیں ملی۔ البتہ ایک ضعیف روایت ہے جس کو ایک مجہول راوی دوسرے مجہول راوی ابوالحمراء نامی سے روایت کرتا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم ابوالحمراء کس مخلوق سے تعلق رکھتا ہے"

مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید رقم طراز ہے:

معلوم ہونا چاہیے کہ خلافتِ علیؓ کے بارے میں بکثرت اخبار و آثار پائے جاتے ہیں۔ جو شخص عدل وانصاف کے تقاضوں کے مطابق ان میں غور و فکر کرتا ہے وہ

اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس ضمن میں ایسی ایک بھی صریح اور قطعی نص موجود نہیں جو شک و شبہ سے بالا ہو اور جس میں کسی دوسرے احتمال کی گنجائش نہ ہو جیسا کہ شیعہ کا دعویٰ ہے۔ شیعہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطریق عموم نہیں بلکہ واشگاف جلی اور صریح الفاظ میں حضرت علیؓ کی خلافت و امارت کی اطلاع دی اور مسلمانوں کو مامور فرمایا تھا کہ آپ کو سلام خلافت کریں۔ چنانچہ سب صحابہ نے تعمیل ارشاد کر دی۔ سرورِ کائناتؐ نے متعدد دفعہ صریح الفاظ میں فرمایا تھا کہ علیؓ میرے بعد خلیفہ ہوں گے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کی فرمانبرداری کا حکم دیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک منصف مزاج شخص جب ان واقعات پر غور کرتا ہے جو آنحضورؐ کی وفات کے بعد پیش آئے تو اسے قطعی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ ایسی کوئی نص سرے سے موجود ہی نہیں۔" (نہج البلاغۃ۔ ج ۱، ص ۱۳۵)

۷۔ جو حدیث مبالغہ آمیز اجر و ثواب پر مشتمل ہو:

جب حدیث کسی معمولی کام کے صلہ میں مبالغہ آمیز اجر و ثواب پر مشتمل ہو، یا اس میں معمولی کام کا مرتکب ہونے پر شدید وعید کی دھمکی دی گئی ہو تو ایسی حدیث موضوع ہوتی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں رقت پیدا کرنے اور ان کو حیرت و استعجاب سے ہمکنار کرنے کے لیے پیشہ ور واعظ اکثر ایسی حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً یہ حدیث:

"جس نے نماز چاشت کی اتنی اتنی رکعتیں پڑھیں تو اسے ستر نبیوں جتنا ثواب ملے گا۔"

نیز یہ حدیث:

"جو شخص "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک پرندہ پیدا کرتا ہے جس کی ستر ہزار زبانیں ہوتی ہیں۔ ہر زبان سے ستر ہزار بولیاں بولتا ہے۔ جن سے وہ اس کے لیے بخشش طلب کرتا ہے۔"

یہ ہیں وہ اساسی و اصولی قواعد و ضوابط جو محدثین نے حدیث کی چھان پھٹک کے لیے وضع کیے۔ اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ انہوں نے صرف متن ہی کو ہدف نقد و جرح نہیں بنایا بلکہ سند کی جانچ پرکھ کی جانب بھی توجہ مبذول کی۔ نظر بریں مستشرقین اور ان کے کاسہ لیس نام نہاد محققین کا یہ الزام قطعاً بے بنیاد ہے کہ محدثین نے متن حدیث کی جانچ پرکھ کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ محدثین نے متن حدیث میں سات علاماتِ وضع کی نشان دہی کی ہے اور سند میں چار کی۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ذوقِ فنی کو بھی حدیث کی جانچ پرکھ اور رد و قبول میں بڑا دخل ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی حدیث کو سنتے ہی اس لیے رد کر دیتے ہیں کہ ان کی فنی مہارت و بصیرت اس کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہے۔ محدثین کے یہاں ایسے الفاظ کی بہتات ہے کہ:

(۱) "اس حدیث پر تاریکی چھائی ہوئی ہے"۔ (۲) "اس حدیث کو دل تسلیم نہیں کرتا"۔

(۳) "اس کا متن تاریک ہے"۔ (۴) "اس سے جی مطمئن نہیں"۔

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ ربیع بن خثیم فرماتے ہیں:

"بعض حدیثیں ایسی ہوتی ہیں جو نصف النہار کی طرح تاباں و درخشاں ہوتی ہیں اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن پر ظلمتِ شب چھائی ہوتی ہے اور تم اس کو پہچان لیتے ہو"۔ (معرفۃ علوم الحدیث للحاکم، ص ۶۲)

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں:

"موضوع حدیث کو سن کر طالب حدیث کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس کا دل اس سے نفرت کرنے لگتا ہے"۔

آگے چل کر جہاں ہم مستشرقین اور ان کے دام تزویر میں مبتلا لوگوں کے شکوک و شبہات کا ذکر کریں گے وہاں وضع حدیث پر مزید تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

فصل چہارم

علماء کی مساعی کے ثمرات و نتائج

علماء کی ان پُر زور مساعی کے نتیجہ میں جن کا ذکر ہم نے مختصراً کیا ہے شریعت کو استقامت حاصل ہوئی اور حدیث نبوی ــــــ جس کو شریعت کے تشریعی مصادر میں دوسری حیثیت حاصل ہے ــــــ کے ستون مضبوط ہو گئے۔ اہل اسلام رسول کریم کی سنت کے لازوال خزانہ کو پاکر سکون آشنا ہوئے۔ حدیث نبوی کے دامن کو اختلاط و آمیزش سے پاک و صاف کیا گیا۔ حدیث صحیح و حسن و ضعیف کے مابین فرق و امتیاز قائم ہوا۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کو بازیچۂ مفسدین اور سازشیوں کی آماجگاہ بننے سے بچا لیا۔ زنادقہ اور شعوبیہ اپنے عزائم قبیحہ میں خائب و خاسر ہوئے اور اہل اسلام ان مبارک و مسعود جہود و مساعی کے ثمرات و نتائج سے بہرہ اندوز ہوئے۔

ان مساعی کے اہم نتائج حسب ذیل تھے:

۱۔ تدوینِ حدیث:

ہم قبل ازیں اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ عہد رسالت میں حدیث نبوی باقاعدہ طور پر مدون نہیں ہوئی تھی۔ البتہ سینوں میں محفوظ تھی اور صحابہ نے یہ لازوال سرمایہ براہِ راست تابعین سے مل کر ان کی تحویل میں دے دیا تاہم جیسا کہ بیان کر چکے ہیں یہ عہد سعادت مہد حدیث کی تدوین سے بالکل ہی عاری نہیں رہا۔

جب عصر صحابہ ختم ہوا تو ہنوز حدیثِ نبوی کا بہت کم سرمایہ ضبط کتابت میں آیا تھا۔ البتہ حدیثیں عام طور سے صحابہ کرام کی زبانوں پر جاری و ساری تھیں حضرت فاروق اعظم

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تدوینِ سنت کا خیال تو آیا تھا مگر اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ محدث بیہقی المدخل میں عروہ بن زبیرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حدیثیں لکھوانے کا ارادہ کیا اور اس ضمن میں حضرات صحابہؓ سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے اس کے حق میں رائے دی آپ اس سلسلہ میں مہینہ بھر استخارہ کرتے رہے اور ایک صبح بڑے پختہ عزم کے ساتھ فرمایا:

"میں نے حدیثیں لکھوانے کا ارادہ تو کیا تھا مگر مجھے اقوام سابقہ یاد آگئیں۔ انہوں نے از خود کچھ کتابیں ترتیب دیں اور پھر ان میں منہمک ہو کر کتاب خدا وندی کو چھوڑ دیا۔ بخدا میں کتاب اللہ کے ساتھ ہرگز کسی چیز کی آمیزش نہ ہونے دوں گا۔"

(جامع بیان العلم، ج ۱ ص ۷۶)

جناب فاروقؓ نے عدم کتابتِ حدیث کا جو عذر بیان کیا تھا وہ مسلمانوں کے ظروف واحوال سے بالکل ہم آہنگ تھا۔ قرآن ابھی تازہ تازہ اتر رہا تھا۔ لوگ جوق در جوق مشرف باسلام ہو رہے تھے۔ اس لیے یہ ان کے لیے بے حد ناگزیر تھا کہ وہ قرآن کریم کو یاد کرتے اور اس کے درس و مطالعہ میں منہمک رہتے تاکہ وہ ان کے عقائد کی اصل و اساس قرار پا سکے اور ہر تبدیلی و انحراف سے ان کو بچائے۔ معاملہ یونہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ فتنہ سامانی کا ظہور ہوا اور حدیثِ رسولؐ کو کذب و دروغ کی آماج گاہ بنایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلیل القدر تابعین اور ان کے اتباع وضع حدیث کی تحریک کے سامنے سینہ سپر ہونے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ شاندار مساعی انجام دیں جن کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ ان جہود و مساعی کا اوّلیں ثمرہ یہ برآمد ہوا کہ سنت کو ضیاع سے بچانے اور اس کو کمی بیشی سے محفوظ و مصئون رکھنے کے لیے انہوں نے اسے مدوّن و مرتّب کر دیا۔

سب روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ تابعین میں سے اوّلیں شخص جس کو حدیثِ نبوی کی جمع و تدوین کی فکر دامنگیر ہوئی وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تھے۔ صاحب

ممدوح نے مدینہ منورہ کے گورنر ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ:

"دیکھیے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث بھی آپ کو ملے اسے لکھ لیجیے۔ میں علم کے مٹ جانے اور علماء کے رختِ سفر باندھنے سے ڈرتا ہوں"۔

ابوبکر بن حزم نے چاہا کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ (وفات ۹۸ھ) اور قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ (وفات ۱۲۰ھ) کے پاس جو حدیثیں ہیں وہ عمر بن عبدالعزیز کو لکھ بھیجے۔ پھر یوں دکھائی دیتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ حکم تنہا ابوبکر بن حزم ہی کو نہیں بھیجا تھا بلکہ جمیع وُلاۃِ بلاد و اَمصار اور جملہ علماءِ کبار سے بھی اسی قسم کا مطالبہ کیا تھا۔

چنانچہ ابونُعیم نے تاریخ اصبہان میں لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اطراف ملک میں یہ حکم جاری کیا تھا کہ:

"احادیث نبویہ کو تلاش کر کے جمع کر لو"۔

خطیب بغدادی "تقیید العلم" میں لکھتے ہیں کہ:

"عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ حکم اہل مدینہ کو دیا تھا۔ اس طرح آپ نے اپنے بزرگ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل کی جو عرصۂ دراز تک آپ کے جی میں موجزن رہی مگر قرآن میں اختلاط کے خوف سے اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تھے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر بن حزم نے کتابتِ حدیث کے سلسلہ میں کچھ خدمت انجام دی تھی اور جو حدیثیں عمرہ اور قاسم بن محمد کے پاس موجود تھیں وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو لکھ بھیجی تھیں۔ البتہ ابن حزم نے مدینہ کے تمام اخبار و آثار جمع نہیں کیے تھے بلکہ اس کی تکمیل کا سہرا محمد بن مسلم ابن شہاب زہری (وفات ۱۲۴ھ) کے سر ہے۔ جو اپنے عصر و عہد میں سنت کے علم بردار تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اپنے رفقاء و احباب کو کہا کرتے تھے کہ "زہری کی خدمت میں حاضر ہوا کریں اس لیے کہ خطۂ ارضی پر ان سے بڑا عالم حدیث

موجود نہیں"۔

امام مسلم نے ذکر کیا ہے کہ امام زہری کو نوّے حدیثیں ایسی یاد تھیں جن کے روایت کرنے میں وہ منفرد و یگانہ تھے۔ امام زہری کے معاصر اہل علم کہا کرتے تھے کہ:

"اگر زُہری نہ ہوتے تو بہت سی حدیثیں ضائع ہوجاتیں"۔

حالانکہ امام زُہری کے عصر و عہد میں حسن بصری اور ان جیسے جلیل القدر تابعین موجود تھے۔ امام زُہری نے جمع و تالیف حدیث کے سلسلہ میں جو خدمت انجام دی وہ اس طرز و انداز کی تدوین نہ تھی جو امام بخاری، مسلم، احمد بن حنبل اور دیگر جامعین کتب حدیث کے مبارک ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ امام زُہری نے صرف یہ کارنامہ انجام دیا کہ صحابہ سے منقول انہیں جو روایات ملیں ان کو بلا ترتیب و تہذیب جمع کر لیا۔ ان روایات میں صحابہ و تابعین کے اقوال و فتاویٰ بھی شامل تھے۔ اور ہر کام کے آغاز میں ایسا ہوتا بھی ہے۔

روایات میں منقول ہے کہ امام زُہری اپنے تلامذہ کو حدیث و آثار پر مشتمل کاغذات اخذ و استفادہ کے لیے دیا کرتے تھے۔

مندرجہ صدر بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ امام زہری اولیں شخص تھے جس نے مخصوص کتب میں احادیث جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ حالانکہ علماء تابعین کی ایک خاصی تعداد اس بناء پر حدیثیں لکھنے سے روکتی تھی کہ اس طرح حافظہ کمزور پڑ جائے گا۔ بلکہ امام زُہری بذاتِ خود اپنی علمی شہرت کے ابتدائی زمانہ میں کتابتِ حدیث کے حق میں نہ تھے اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تھی۔

آگے چل کر جہاں ہم امام زُہری کی سیرت و سوانح کا ذکر کریں اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

امام زُہری کے قریبی عصر و عہد میں حدیثِ نبوی کو بہت فروغ حاصل ہوا اور اس ضمن میں سبقت و اوّلیت کا شرف مندرجہ ذیل اکابر کے حصہ میں آیا۔

نمبر شمار	اسمائے گرامی	نام شہر	سن وفات
۱	ابن جریج رحمہ اللہ تعالیٰ	مکہ	۱۵۰ھ ہجری
۲	ابن اسحاق رح	"	۱۵۱ھ "
۳	سعید بن ابی عروبہؒ	مدینہ	۱۵۶ھ "
۴	ربیع بن صبیح رح	"	۱۶۰ھ "
۵	امام مالک رح	"	۱۷۹ھ "
۶	حماد بن سلمہ رح	بصرہ	۱۷۶ھ "
۷	سفیان ثوری رح	کوفہ	۱۶۱ھ "
۸	ابو عمرو اوزاعی رح	شام	۱۵۶ھ "
۹	ہشیم رح	واسط	۱۸۸ھ "
۱۰	عبداللہ بن مبارک رح	خراسان	۱۸۱ھ "
۱۱	معمر رح	یمن	۱۵۳ھ "
۱۲	جریر بن عبد الحمید رح	رَے	۱۸۸ھ "

اسی طرح سُفیان بن عُیَینَہ (۱۹۸ھ) لیث بن سعد (۱۷۵ھ) اور شعبہ بن حجاج (۱۶۰ھ) نے بھی تدوین حدیث میں سرگرم حصہ لیا۔ یہ سب ایک ہی زمانہ میں بقیدِ حیات تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے سبقت و اوّلیت کی سعادت کس کے حصہ میں آئی۔

ان کا اسلوب و انداز یہ تھا کہ احادیث و اقوالِ صحابہ کو یکجا بیان کیا کرتے اور ایک کتاب میں مختلف ابواب کو باہم ملا جُلا کر تحریر کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ اس دَور کے جامعین حدیث مختلف ابواب کو یکجا کر دیا کرتے تھے۔ جہاں تک ایک ہی باب میں باہم مشابہ و مماثل احادیث

ذکر کرنے کا تعلق ہے تو اس میں سبقت کرنے والے شعبی تھے۔ امام شعبیؒ سے یہ فقرہ منقول ہے کہ "یہ طلاق کے مسائل پر مشتمل بہت بڑا باب ہے"۔

(توجیہ النظر۔ ص ۸)

مسند نویسی کا آغاز:

تیسری صدی ہجری از منۂ ماضیہ کی نسبت حدیث نبوی کے لیے بہت ہی مبارک و مسعود ثابت ہوئی۔ اس میں بڑے بڑے محدثین پیدا ہوئے اور انہوں نے زندہ جاوید کتب حدیث مرتب کیں۔ اسی قرن میں مسند نویسی کی داغ بیل پڑی۔

مسند حدیث کی اس کتاب کو کہا جاتا ہے جس کے ایک ہی باب میں ایک صحابی کی جملہ مرویات کو اختلافِ موضوع کے باوصف جمع کر دیا جائے۔

مسند نویسی کی طرح ڈالنے والے یہ اکابر تھے:

(۱) عبداللہ بن موسیٰ عَبَسی کوفی (۲) مسدد بصری

(۳) اَسَد بن موسیٰ (۴) نُعَیم بن حماد خزاعی

پھر مندرجہ ذیل حُفّاظ حدیث ان کی ہموار کردہ راہ پر گامزن ہوئے:

(۱) امام احمد بن حنبل صاحب مسند۔

(۲) اسحاق بن راہَوَیہ

(۳) عثمان بن ابی شَیبہ و دیگر محدثین۔

ان کا اسلوبِ تالیف یہ تھا کہ احادیث کو اقوالِ صحابہ و تابعین سے الگ ذکر کرتے البتہ وہ احادیث صحیحہ و سقیمہ کو بلا امتیاز یکجا ذکر کرتے تھے جس سے طالب حدیث کو بڑی دقت کا سامنا ہوتا تھا۔ اس لیے کہ صحیح و ضعیف کے مابین فرق و امتیاز جلیل القدر نقادِ حدیث کا کام ہے اور ہر کس و ناکس اس کا اہل نہیں ہو سکتا۔ وہ ایسی احادیث کی جانچ پرکھ کے لیے کبار محدثین کا دست نگر ہے۔ اور اگر اسے کوئی ایسا محدث نہ مل سکے

تو وہ حدیث اس کے یہاں مجہول الحال رہے گی اور اس کی صحت وضعف کا پتہ نہ چل سکے گا۔

صحاح ستہ:

یہی ظروف و احوال تھے جو امام المحدثین اور حدیث نبوی کے دُرشہوار امام محمد بن اسمٰعیل بخاری (۲۵۶ھ) کے سبب اس امر کے باعث و محرک ہوئے کہ وہ حدیث کی جمع و تالیف کے سلسلہ میں ایک نئی شاہراہ ایجاد کریں اور صرف احادیث صحیحہ پر مشتمل ایک کتاب ترتیب دیں۔ چنانچہ آپ نے "الجامع الصحیح" مرتب کی۔ پھر آپ کے تلمیذ رشید امام مسلم بن حجاج قشیری (۲۶۱ھ) نے بھی آپ کی ہموار کردہ راہ پر گامزن ہو کر "صحیح مسلم" ترتیب دی۔

یہ تھے دو اکابر محدثین جنہوں نے عشاق حدیث نبوی کے سامنے ایک نئی شاہراہ کھول دی جس پر چل کر وہ کسی سے پوچھے بغیر صحیح حدیثیں تلاش کر سکتے تھے۔ پھر اس کے بعد کثیر محدثین نے اسی روش پر چل کر بہت سی کتب حدیث لکھیں جن میں سے اہم حسب ذیل تھیں:

(۱) سنن ابی داود ۲۷۵ھ (۲) سنن نسائی ۳۰۳ھ

(۳) جامع ترمذی ۲۷۹ھ (۴) سنن ابن ماجہ ۲۷۳ھ

مذکورہ صدر محدثین نے اپنی تالیفات میں ان تمام چھوٹی بڑی کتب حدیث کو سمو لیا جو سابقہ ادوار میں محدثین نے تالیف کی تھیں۔ اصحاب صحاح ستہ حسب عادت محدثین سابقین ہی سے روایات اخذ کرتے تھے۔

چوتھی صدی کے محدثین اپنی تالیف میں قرن ثالث کے اصحاب حدیث کی کتب پر کسی نئی چیز کا اضافہ تو نہ کر سکے۔ البتہ جو حدیثیں ان سے رہ گئی تھیں انہوں نے ان کو اپنی کتب میں جگہ دی۔ چوتھی صدی کے رجال حدیث نے سابقاً جمع کردہ احادیث کو اپنی تالیفات میں از سر نو جمع کیا اور پچھلے محدثین پر پورا پورا اعتماد کیا۔ البتہ اس دور کے محدثین کو طرق و اسانید

کے کچھ اور سلسلے بھی مل گئے اور اس طرح طرقِ حدیث میں وسعت پیدا ہوئی۔ قرن رابع کے محدثین شہیر حسب ذیل تھے:

۱۔ امام سلیمان بن احمد طبرانی (م ۳۶۰ھ)۔ آپ نے یہ کتب مرتب کیں۔

(۱) معجم کبیر۔ (۲) معجم اوسط۔ (۳) معجم اصغر۔

یہ کتاب پچیس ہزار احادیث پر مشتمل تھی۔ طبرانی نے ان تینوں کتابوں میں حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق اپنے شیوخ و اساتذہ کا ذکر کیا۔

۲۔ امام دارقطنی (م ۳۸۵ھ) صاحب سنن

۳۔ ابن حبان البستی (م ۳۵۴ھ)

۴۔ ابن خزیمہ (م ۳۱۱ھ)

۵۔ طحاوی (م ۳۲۱ھ)

مذکورہ صدر محدثین کی مساعی جمیلہ سے اس صدی میں حدیث کی جمع و تدوین اور احادیث صحیحہ و سقیمہ میں فرق و امتیاز کا کام تکمیل پذیر ہو گیا۔ اگلے ادوار کے محدثین نے کتب صحاح پر استدراک کے سوا کوئی اہم خدمت انجام نہیں دی۔ مثلاً امام ابو عبداللہ حاکم نیسابوری نے مستدرک مرتب کی۔ جن احادیث کے بارے میں ان کو معلوم ہوا کہ وہ بخاری و مسلم کے شرائط کے مطابق ہیں مگر دونوں اماموں نے ان کو اپنی کتب میں جگہ نہیں دی۔ امام حاکم نے ان کو مستدرک میں جمع کر دیا۔ علماء نے امام حاکم کی جمع کردہ احادیث کی ایک قسم کو تسلیم کیا مگر دوسری کو ماننے سے انکار کر دیا۔

۲۔ علم مصطلح الحدیث:

وضع حدیث کے خلاف علماء نے جس مبارک تحریک کا آغاز کیا تھا اس کے نتیجہ میں ایسے قواعد و ضوابط تیار کیے گئے جن کے مطابق حدیث کے اقسام و متعلقات بیان کیے گئے اور اس طرح مصطلحاتِ حدیث کا فن عالم وجود میں آیا جس کے ذریعہ احادیث و اخبار کی صحت

معلوم کرنے کے لیے علمی قواعد کی بنا پڑی۔ روایت و اخبار کے سلسلہ میں یہ صحیح ترین علمی قواعد تھے جن سے تاریخ آشنا ہے۔ ہمارے علماء نے علمی اساس پر قواعد وضع کرنے کے سلسلہ میں سبقت و اوّلیت کا شرف حاصل کیا۔

علماء حدیث نے تمیز صحیح و سقیم کے سلسلہ میں جن علمی قواعد کی طرح ڈالی تھی۔ دیگر علماء بھی اسی راہ پر گامزن ہو گئے۔ مثلاً تاریخ و فقہ تفسیر لغت و ادب اور دیگر علوم میں بھی انہی قواعد کی پیروی کی جانے لگی۔ چنانچہ قرون اولیٰ میں جو علمی تصانیف مرتب کی گئیں، ان میں ہر مسئلہ اور ہر بحث کو بسند متصل اس کے قائل کی جانب منسوب کیا جاتا تھا حتیٰ کہ تلامذہ اپنے شیوخ و اساتذہ کی تصانیف نسلاً بعد نسلٍ ان سے بسند متصل نقل و روایت کیا کرتے تھے۔

نظر بریں ہم کمال وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج صحیح بخاری کا جو نسخہ ہمارے یہاں متداول ہے یہ امام محمد بن اسماعیل بخاری ہی کا ساختہ پرداختہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ کتاب قوماً بعد قوم بسند متصل آپ سے منقول ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ ایک ایسی عظیم خصوصیت ہے جو دیگر اقوام کے علماء کی کسی تصنیف میں نہیں پائی جاتی۔ اس کی حد یہ ہے کہ ان کی کتب مقدسہ تک اس وصف سے عاری ہیں۔ چنانچہ بیروت یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے پروفیسر اسد رستم نے تاریخی روایات کے اصول و قواعد پر ایک کتاب مرتب کی ہے جس میں مصطلحات حدیث سے متعلق قواعد پر اعتماد کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اخبارات و روایات کی چھان بین کے لیے یہ صحیح ترین اور جدید علمی طریقہ ہے۔

مصطلح الحدیث کے فن میں حدیث کے مدارج مثلاً صحیح و حسن و ضعیف اور ان کے اقسام و شروط سے بحث کی جاتی ہے جن کا راوی و مروی میں پایا جانا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں اس فن میں بتایا جاتا ہے کہ کسی حدیث میں علت، اضطراب اور شذوذ کیونکر پیدا ہو جاتا ہے؟ حدیث کو رد کس لیے کیا جاتا ہے اور دوسری روایات سے تائید و تقویت حاصل کرنے کی

ضرورت کن احادیث میں ہوتی ہے؟ نیز حدیث کے سماع اور اس کے ضبط و تحمل کی کیفیت کیا ہے؟ محدث اور طالب حدیث کے لیے کون سے آداب ضروری ہیں؟ اور اس قسم کے دیگر آداب و شرائط۔

یہ آداب و شروط پہلی تین صدیوں تک غیر منضبط حالت میں رہے۔ جب آگے چل کر دیگر علوم اسلامیہ مدون ہوئے تو ان کو بھی جداگانہ تصانیف میں جگہ دی گئی۔

اصولِ حدیث کا ارتقاء:

اولین شخص جس نے مصطلحاتِ حدیث کو موضوعِ سخن بنایا، امام بخاری کے استاد محترم علی بن مدینی تھے۔ اسی طرح امام بخاری، مسلم اور ترمذی نے بھی بعض مباحث سے متعلق جداگانہ رسائل ترتیب دیے مگر ان کو یکجا کرنے کی نوبت نہ آسکی۔ پہلا شخص جس نے اس موضوع پر ایک جامع اور بھرپور کتاب تصنیف کی، قاضی ابو محمود رامہرمزی متوفی ۳۶۰ھ صاحب "المحدث الفاصل بین الراوی والسامع" تھے، مگر یہ کتاب تشنہ اور جملہ مباحث متعلقہ کو شامل نہ تھی۔

پھر امام حاکم ابو عبداللہ نیسابوری متوفی ۴۰۵ھ کا زمانہ آیا اور آپ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" تالیف کی۔ مگر یہ کتاب تہذیب و ترتیب سے عاری تھی۔ ابو نعیم اصفہانی متوفی ۴۳۰ھ نے امام حاکم کی کتاب پر ایک مستخرج تحریر کی مگر وہ بھی جملہ مباحث کی جامع نہ تھی۔

بعد ازاں خطیب ابو بکر بغدادی متوفی ۴۶۳ھ نے قوانین روایت سے متعلق اپنی کتاب "الکفایہ" اور آدابِ حدیث کے سلسلہ میں "الجامع لآداب الشیخ والسامع" لکھی۔ خطیب موصوف نے فنونِ حدیث سے متعلق ہر فن کے بارے میں ایک مستقل کتاب تحریر کی۔ پھر قاضی عیاض متوفی ۵۴۴ھ کا دور آیا تو آپ نے "الالماع" نامی کتاب لکھی۔ یہ کتاب تمام تر خطیب بغدادی کی تصانیف سے ماخوذ و مستفاد تھی۔ اس کے بعد محدث ابن الصلاح دمشقی

متوفی ۶۴۲ھ نے اپنی مشہور کتاب "مقدمہ ابن الصلاح" مرتب کی۔ محدث موصوف نے یہ کتاب دمشق کے مدرسہ اشرفیہ میں اپنے تلامذہ کو املاء کرائی تھی۔ یہ بھی ترتیب و تہذیب سے عاری تھی۔ متقدمین کی کتب میں جو مباحث منتشر پڑے تھے ابن الصلاح نے ان کو یکجا کر دیا۔

مندرجہ صدر وجوہ و اسباب کی بنا پر مقدمہ ابن الصلاح کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کسی نے اس کو نظم کے قالب میں ڈالا اور کسی نے نثر میں اس کی شرح و توضیح کی مثلاً محدث عراقی نے "الفیہ" کے نام سے ہزار اشعار میں اس کو منظوم کیا اور امام سخاوی نے "فتح المغیث" کے نام سے اس کی شرح لکھی۔ اسی طرح امام نووی نے "تقریب" نامی کتاب میں اس کے مطالب کو سمویا اور سیوطی نے "التدریب" لکھ کر اس کے مطالب کی تشریح کی۔ علاوہ ازیں اس ضمن میں بہت سی کتب تصنیف کی گئیں۔

مقدمہ ابن الصلاح کے اختصار نویسوں میں امام حافظ ابن کثیر دمشقی متوفی ۷۷۴ھ کا نام معروف ہے۔ آپ نے "اختصار علوم الحدیث" کے نام سے اس کا خلاصہ لکھا جس کی شرح احمد محمد شاکر نے "الباعث الحثیث" نامی شائع کی۔ اس کے بعد اس فن میں مسلسل کتب تحریر کرنے کا آغاز ہوا۔ اس ضمن میں حافظ عراقی متوفی ۸۰۶ھ کی کتاب "الفیہ عراقی" اور ابن حجر عسقلانی کی "نخبۃ الفکر" کا نام خاصا مشہور ہے۔ حال ہی میں جمال الدین القاسمی دمشقی نے "قواعد التحدیث" کے نام سے ایک بہترین کتاب تصنیف کی ہے۔

۳۔ علم الجرح والتعدیل:

علماء کی بابرکت مساعی کے نتیجہ میں "جرح و تعدیل" یا "میزان الرجال" کا فن عالم وجود میں آیا۔ یہ وہ علم ہے جس میں راویوں کے سیر و سوانح، ان کی امانت و عدالت، ضبط و ثقاہت اور یا ان کے کذب و غفلت اور سہو و نسیان سے بحث کی جاتی ہے۔ اس مبارک تحریک کے زیر اثر جن شاندار علوم نے جنم لیا یہ علم ان میں سب سے بہتر ہے۔ دیگر اقوام کے

علوم و فنون میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ۔ احادیث میں فرق و امتیاز کرنے کے لیے علماء میں راویوں کے حالات سے باخبر ہونے کی جو خواہش پائی جاتی تھی وہ اس علم کی محرک بنی ۔ علماء کی یہ حالت تھی کہ اپنے معاصر راویوں کے حالات کی ٹوہ میں رہتے ۔ جو معاصر نہ تھے ان کے بارے میں دوسروں سے دریافت کرتے ۔ وہ خوفِ گناہ اور احساسِ حرج و ضرر سے بالا ہو کر رُواۃ و رجال کے بارے میں دینِ اسلام اور سنّتِ رسول کے دفاع کے نقطۂ نظر سے علانیہ اظہار خیال کرتے تھے ۔ امام بخاری سے جب کہا گیا کہ :

"آپ نے جو تاریخ لکھی ہے لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں کہ اس میں لوگوں کی غیبت کی گئی ہے"۔

تو آپ نے برملا فرمایا :

"راویوں کے بارے میں یہ باتیں ہم نے اپنی طرف سے نہیں کہیں بلکہ دوسروں سے نقل و روایت کی ہیں ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "بِئْسَ اَخُو الْعَشِيْرَةِ" (قبیلے کا بدترین فرد)

(امام بخاری کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ آنحضورؐ سے بھی منقول ہیں) ۔

رُواۃِ حدیث کے بارے میں جرح و تعدیل کا آغاز صغار صحابہ کے عصر و عہد ہی سے ہو گیا تھا ۔ اس ضمن میں تفصیل حسب ذیل ہے :

صغار صحابہ میں حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں :

۱ ۔ ابن عباس رضؓ (سنہ ۶۸ھ)

۲ ۔ عبادہ بن صامت رضؓ (سنہ ۳۴ھ)

۳ ۔ انس بن مالک رضؓ (سنہ ۹۳ھ)

تابعین میں سے مندرجہ ذیل نے اس میں نمایاں حصہ لیا :

۱ ۔ سعید بن المسیبؒ (سنہ ۹۳ھ)

۲۔ شعبی (سنہ ۱۰۴ھ)

۳۔ ابن سیرین (سنہ ۱۱۰ھ)

پھر اس کے بعد جرح و تعدیل میں حصّہ لینے والے علماء پیدا ہوتے گئے۔ مشہور فضلاء کے اسماء حسب ذیل ہیں:

۱۔ شعبہؒ (سنہ ۱۶۰ھ) یہ بڑے بیدار مغز تھے اور صرف ثقہ راویوں سے حدیث روایت کرتے تھے۔

۲۔ امام مالکؒ (سنہ ۱۷۹ھ)

دوسری صدی ہجری کے علماء جرح و تعدیل میں مشہور ترین حسب ذیل تھے:

۱۔ معمرؒ (سنہ ۱۵۳ھ)

۲۔ ہشام دستوائیؒ (سنہ ۱۵۴ھ)

۳۔ اوزاعیؒ (سنہ ۱۵۶ھ)

۴۔ سفیان ثوریؒ (سنہ ۱۶۱ھ)

۵۔ حماد بن سلمہؒ (سنہ ۱۶۷ھ)

۶۔ لیث بن سعدؒ (سنہ ۱۷۵ھ)

۷۔ عبداللہ بن مبارکؒ (سنہ ۱۸۱ھ)

۸۔ فزاریؒ (سنہ ۱۸۵ھ)

۹۔ سفیان بن عُیَیْنَہؒ (سنہ ۱۹۷ھ)

۱۰۔ وکیع بن جراحؒ (سنہ ۱۹۷ھ)

اس طبقہ کے علماء میں مندرجہ ذیل نے بیحد شہرت و قبولیت حاصل کی:

۱۔ یحییٰ بن سعید قطانؒ (سنہ ۱۸۹ھ)

۲۔ عبدالرحمٰن بن مہدیؒ (سنہ ۱۹۸ھ)

جمہور علماء ان دونوں کو جرح و تعدیل کے بارے میں سند کا درجہ دیتے تھے جس کی روایت کو یہ تسلیم کرتے اس کو قبول کر لیا جاتا اور جس کو مجروح قرار دیتے اس کو رد کر دیا جاتا۔ جس راوی کے بارے میں یہ دونوں مختلف الرائے ہوتے' لوگ حسبِ مرضی جس کو چاہتے ترجیح دیتے۔ (توجیہ النظر۔ ص ۱۱۴)

ان کے بعد کچھ اور ماہرین جرح و تعدیل پیدا ہوئے جن میں نمایاں ترین حسب ذیل تھے:

۱ - یزید بن ہارون رح (سنہ ۲۰۶ھ)

۲ - ابو داؤد طیالسی رح (سنہ ۲۰۴ھ)

۳ - عبدالرزاق بن ہمامؒ (سنہ ۲۱۱ھ)

۴ - ابو عاصم نَبیل رح (سنہ ۲۱۲ھ)

اب فنِ جرح و تعدیل پر مستقل کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اس ضمن میں سبقت کا شرف مندرجہ ذیل اکابر کے حصہ میں آیا:

۱ - یحییٰ بن مَعین رح (سنہ ۲۳۳ھ)

۲ - احمد بن حنبل رح (سنہ ۲۴۱ھ)

۳ - محمد بن سعد صاحبِ طبقات کاتبِ واقدی (سنہ ۲۳۰ھ)

۴ - علی بن مدینی رح (سنہ ۲۳۴ھ)

ان کے بعد امام بخاریؒ۔ مسلمؒ۔ ابو زرعہؒ رازی۔ ابو حاتمؒ رازی اور ابو داؤدؒ کا دور آیا۔ پھر اس کے بعد مسلسل و بہیم نویں صدی ہجری تک جرح و تعدیل کے علماء اور مصنفین پیدا ہوتے رہے۔ جو اس فن سے متعلق کتابیں لکھتے اور رُواۃِ حدیث کی چھان بین کرتے رہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ کتبِ حدیث میں آپ ایک راوی بھی ایسا نہیں پائیں گے جس کے بارے میں مکمل تفصیلات ان کی تصانیف میں موجود نہ ہوں۔

کتب جرح و تعدیل کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ کتب جو صرف ثقہ راویوں کے ذکر و بیان پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ابن حبان بستی کی کتاب "الثقات" و ابن قطلوبغا (۸۷۹ھ) کی کتاب "الثقات" جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ نیز خلیل بن شاہین کی کتاب الثقات۔

(۲) دوسری قسم کی وہ تصانیف ہیں جو ضعیف راویوں کے سیر و سوانح کی جامع ہیں۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل محدثین نے کتابیں تصنیف کیں:

بخاریؒ۔ نسائیؒ۔ ابنؒ حبان۔ دارقطنیؒ۔ عقیلیؒ۔ ابنؒ الجوزی۔ ابنؒ عدی۔

ابن عدی کی کتاب اس حد تک جامع ہے کہ جس راوی پر معمولی جرح قدح بھی کی گئی ہے اس کتاب میں اس کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں بخاری و مسلم کے متکلم فیہ راویان حدیث اور بعض ایسے ائمہ متبوعین کا تذکرہ ملتا ہے جن کے مخالفین نے ان پر نقد و جرح کی تھی۔

(۳) تیسری قسم کی وہ کتابیں ہیں جن میں ثقہ اور ضعیف دونوں قسم کے رواۃ حدیث کا ذکر کیا گیا ہے۔ یوں تو ایسی کتب بہت ہیں مگر مندرجہ ذیل بہت مشہور ہیں:

۱۔ تاریخ کبیر امام بخاری۔ اس کو حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق مرتب کیا گیا ہے۔

۲۔ تاریخ اوسط امام بخاری۔

۳۔ تاریخ صغیر امام بخاری۔

ان دونوں کتب کو سنین کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔

۴۔ کتاب الجرح والتعدیل لابن حبان۔

۵۔ کتاب الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم الرازی۔

۶۔ طبقات الکبریٰ ابن سعد۔

۷۔ التکمیل فی معرفۃ الثقات والضعفاء والمجاہیل لابن کثیر۔

مؤخرالذکر کتاب اس موضوع پر سب سے بہتر ہے ۔ حافظ ابن کثیر نے اس کتاب میں مشہور محدث المزی کی "تہذیب" اور محدث ذہبی کی میزان کو یکجا کر کے ان پر مزید اضافے کیے ہیں ۔ یہ کتاب محدثین و فقہاء کے لیے نہایت مفید ہے ۔

(توجیہ النظر ۔ ص ۱۱۸)

جرح و تعدیل میں اختلاف کے اسباب :

رواۃ حدیث کی جرح و تعدیل کے بارے میں سب محدثین کے سانچے اور پیمانے یکساں نوعیت کے نہ تھے ۔ ان میں متشدد و متوسط بھی تھے اور متساہل بھی ۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

۱ ۔ متشددین : ابن معین ۔ قطان ۔ ابن حبان ۔ ابو حاتم رازی ۔

۲ ۔ متساہلین : ترمذی ۔ حاکم ۔ ابن مہدی ۔

۳ ۔ اعتدال پسند : احمد ۔ بخاری ۔ مسلم ۔

نظر بریں بعض راویان حدیث کی جرح و تعدیل کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے ۔ اگر ایک محدث اس کو ضعیف قرار دیتا ہے تو دوسرا اس کی توثیق کرتا ہے ۔ اس تخالف و تناقض کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہر امام کے نزدیک نقد و جرح کا معیار و مدار مختلف ہوتا ہے ۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک امام سے ایک ہی راوی کے بارے میں دو مختلف خیالات منقول ہوتے ہیں ۔ ایک محدث آج ایک راوی کو ثقہ قرار دیتا ہے تو آگے چل کر اس رائے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ بعض اوقات اس کے برعکس ہوتا ہے ۔

امام ابو حنیفہؒ پر جرح کی حقیقت :

جرح و تعدیل میں اختلاف کی ایک وجہ فقہاء کے اجتہادی و فروعی اختلافات بھی ہیں ۔ مثال کے طور پر اہل الحدیث و اہل الرائے کے مابین جو نزاع پایا جاتا ہے اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اہل الحدیث نے اہل الرائے کے بعض ائمہ پر جرح وقدح کی اور انہیں ضعیف راویوں میں شمار کیا۔ اس کی وجہ نظر باقی نزاع واختلاف کے سوا کچھ نہ تھی۔ اس کے اثبات کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ محدثین کی ایک جماعت نے تاریخ اسلام کے عظیم فقیہ امام ابوحنیفہؒ پر حملے کیے اور بعض علماء جرح وتعدیل نے جناب امام کے زہد وتقویٰ اور جلالتِ شان کے علی الرغم ان کو ضعیف قرار دیا۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں امام موصوف کے بارے میں اسی طرح لکھا ہے۔ اس کی بڑی وجہ فقہِ حنفی کی باریکی اور گہرائی تھی جو بہت سے محدثین بلکہ ان کے ائمہ پر بھی پوشیدہ رہی۔ عام محدثین نے امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں جو تعصب روا رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے امام موصوف پر ایسے ایسے الزامات عائد کیے تاریخ جن کو جھٹلاتی ہے۔

نقادِ حدیث کے رجحانات ومیلانات اور حدیث کی جانچ پرکھ کے اصول وضوابط میں سختی ونرمی کا جو فرق وامتیاز پایا جاتا تھا اس نے علماء کو مجبور کیا کہ کسی راوی پر جرح کو اسی صورت میں قبول کیا جائے جبکہ اس کی وجہ بھی ساتھ ہی بیان کر دی گئی ہو۔ مبادا جرح درست نہ ہو اور صرف تعصب کی بنا پر راوی کو متہم کیا گیا ہو۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

"جرح کو اسی صورت میں قبول کیا جائے گا جب کہ واضح ہو مبہم نہ ہو بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جرح کرنے والا ایک چیز کو موجباتِ فسق میں سے قرار دے کر راوی کی تضعیف کر دیتا ہے۔ حالانکہ وہ چیز درحقیقت یا دوسرے علماء کے نزدیک فسق کی موجب نہیں ہوتی۔ بنا بریں جرح کرتے وقت سبب کا اظہار وبیان ناگزیر ہے۔" (اختصار علوم الحدیث، ص ۱۰۱)

جرح وتعدیل سے متعلق جو عجیب وغریب باتیں منقول ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ "کسی ناقدِ حدیث سے دریافت کیا گیا آپ نے فلاں راوی کی روایت کیوں ترک کی"؟ اس نے کہا "میں نے اسے ترکی گھوڑے کو بھگاتے دیکھا تو اس سے حدیث روایت کرنا چھوڑ دی"۔

ایک محدث سے صالح مُرّی سے حدیث روایت کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اس نے کہا:

"ہم صالح کو کیا کریں، اس کی تو یہ حالت ہے کہ ایک روز حماد بن سلمہ کی مجلس میں اس کا ذکر آیا تو حماد نے تھوک دیا۔" (الباعث الحثیث۔ ص ۱۰۱)

مندرجہ صدر بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ بعض محدثین معمولی واقعات کی بناء پر جن کا عدالت وثقاہت اور حفظ وضبط کے ساتھ کچھ بھی علاقہ نہ تھا بعض راویوں کو ہدفِ نقد وجرح بنا دیا کرتے تھے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کا طریق کار تھا جو اس علم سے یکسر کورے تھے۔ جو محدثین درحقیقت اس منصب رفیع کے اہل تھے اور علم حدیث جن کے رگ وپے میں رچا بسا ہوا تھا وہ ایسا ناروا اور مضحکہ خیز فیصلہ صادر نہیں کر سکتے تھے۔

۴۔ عُلومُ الحدیث:

حدیث نبوی کے درس ومطالعہ، روایت ودفاع اور اس کے اصول ومصادر کی تحقیق نے بہت سے علوم کو جنم دیا۔ مشہور محدث ابو عبداللہ حاکم نے اپنی کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں علم حدیث سے متعلق باون[۵۲] علوم کی نشان دہی کی ہے۔ امام نووی نے "التقریب" میں پینسٹھ[۶۵] علوم گنائے ہیں۔ ہم ذیل میں اہم علوم الحدیث کا ذکر کرتے ہیں، جس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ علماء نے حدیثِ نبوی کی حفاظت وصیانت میں کس بالغ نظری، دقیقہ رسی اور محنت وکاوش سے کام لیا ہے۔

علوم الحدیث کی اہم اقسام حسب ذیل ہیں:

۱۔ راوی کی صداقت وامانت کی پہچان۔

امام حاکم اس ضمن میں فرماتے ہیں:

"دورِ حاضر کے محدثین پر لازم ہے کہ پہلے راوی کے حالات سے بحث کریں کہ آیا وہ توحید پرست ہے یا نہیں؟ وہ انبیاء ورُسل کی تعلیمات کا کس حد تک

پابند ہے؟ کیا وہ بدعات پر عامل یا ان کا داعی تو نہیں؟ اس لیے کہ بدعتی شخص کی نہ روایت قبول کی جاتی ہے اور نہ وہ لائقِ اکرام واحترام ہے۔ علماء نے مبتدعین کی روایت کے ترک کرنے پر اجماع منعقد کیا ہے۔

جب یہ باتیں معلوم ہو جائیں تو اس کی عمر کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ جن شیوخ واساتذہ سے وہ روایت کرتا ہے آیا اس کی عمر اس کی متحمل ہو سکتی ہے؟ ہمیں ایسے رُواۃِ حدیث کا علم ہے جو ان اساتذہ سے روایت کرتے ہیں جن کا زمانہ سرے سے انھوں نے پایا ہی نہیں۔ پھر دیکھا جائے کہ اس کے اُصُولِ روایت قدیم ہیں یا جدید؟ ہمارے زمانہ میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی بھی اُٹھی ہے جو حدیث کی کتابیں خریدتے ہیں اور حدیثیں پڑھ کر ان کو روایت کرنے لگتے ہیں۔

فنِ حدیث سے نابلد شخص جب ایسی حدیثیں سنتا ہے تو اپنی جہالت کی بناء پر فوراً ان کو تسلیم کر لیتا ہے۔ بخلاف ازیں جب اصحاب بصیرت ان کی اس حرکت سے آگاہ ہو کر یہ مرویات سنتے ہیں تو ان کو مجروح قرار دیتے ہیں اور جب تک وہ اپنے رویّہ سے تائب نہ ہوں ان سے حدیث روایت نہیں کرتے۔ مزید براں فنِ حدیث سے کورے شخص کو معذور قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ایک جاہل شخص پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ جو بات اسے معلوم نہیں وہ دوسروں سے دریافت کرے۔ علماء سلف کا طریق کار یہی تھا۔

۲۔ مسند احادیث کی جان پہچان:

امام حاکم فرماتے ہیں:

"علوم الحدیث کے انواع میں سے اس نوع کا علم بہت بڑی چیز ہے۔ اس لیے کہ غیر مسند حدیث سے احتجاج واستدلال کے بارے میں علماء کے یہاں اختلاف

پایا جاتا ہے۔ مسند اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو محدث ایک ایسے شیخ سے روایت کرے جس سے اس کا سماع ممکن ہو۔ یہ سلسلہ اوپر تک اسی طرح چلا جائے یہاں تک کہ ایک مشہور صحابی اور اس کے آگے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے"۔

۳۔ موقوف آثار کی پہچان:

مثلاً وہ حدیث جو حاکم نے مغیرہ بن شعبہ سے روایت کی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ آپ کا دروازہ ناخنوں سے کھٹکھٹایا کرتے تھے"۔

امام حاکم رقمطراز ہیں:

"بے خبر لوگ اس کو حدیث مسند قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اس میں آنحضورؐ کا ذکر آیا ہے۔ حالانکہ یہ مسند نہیں بلکہ ایک صحابی کا قول ہے جو اس نے دیگر صحابہ سے نقل و روایت کیا ہے۔ ایک صحابی بھی اس کو مسند حدیث کی حیثیت سے روایت نہیں کرتا"۔

۴۔ طبقاتِ صحابہ سے آگاہی:

بقول امام حاکم صحابہ کے بارہ طبقات ہیں۔ پہلے طبقہ میں وہ صحابہ شامل ہیں جو مکہ میں مشرف باسلام ہوئے۔ آخری طبقہ میں ان بچوں کو شمار کیا جاتا ہے جنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر بچشم خود دیکھا۔ ان کو صحابہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

۵۔ حدیث مرسل کی پہچان:

یہ حدیث کی ایک مشکل قسم ہے جس کو ماہر فی الفن ہی پہچان سکتا ہے۔

۶۔ منقطع:

حدیث مرسل و منقطع دو جداگانہ قسمیں ہیں۔ ان میں بہت کم حفاظ حدیث فرق و

امتیاز کر سکتے ہیں۔

امام حاکم فرماتے ہیں کہ منقطع کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ حدیث کی سند میں دو ایسے راوی موجود ہوں جن کے نام و مقام کا کچھ پتہ نہ ہو۔

۲۔ سند میں ایک غیر معلوم الاسم راوی ہو مگر کسی دوسری سند سے اس کا نام معلوم ہو جائے۔

۳۔ سند میں ایک ایسا راوی ہو جس کا پتہ تابعی تک پہنچنے سے پہلے نہ چلے وہ تابعی ہی موضع ارسال ہو۔ ایسی حدیث کو مرسل نہیں بلکہ منقطع کہتے ہیں۔

۷۔ سند مسلسل:

یہ سند کی ایک ایسی قسم ہے جس میں سماع بلا شک و ریب ثابت ہوتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ اس کی ایک قسم یہ ہے کہ سند کے جملہ رُواۃ و رجال حدیث بیان کرتے وقت ایک ہی قسم کے الفاظ استعمال کریں۔ مثلاً سب راوی "حَدَّثَنَا" یا "سَمِعْتُهُ" یا "شَهِدْتُ عَلَىٰ فُلَانٍ اَنَّهُ قَالَ" کے الفاظ کہیں۔

بعض اوقات سند میں تسلسل یوں پیدا ہوتا ہے کہ ہر شیخ اپنے شاگرد کے ساتھ ایک خاص کام کرتا ہے۔ مثلاً کسی سند میں ہر شیخ حدیث بیان کرتے وقت اپنے تلمیذ سے مصافحہ کرتا ہے۔ ایسی سند کو "المسلسل بالمصافحۃ" کہتے ہیں۔

۸۔ حدیث مُعَنْعَنْ:

جو حدیث عَنْ فُلَانٍ کے الفاظ کے ساتھ روایت کی جائے اس کو معنعن کہتے ہیں۔ اگر ایسی سند تدلیس کے عیب سے پاک ہو تو جملہ محدثین کے نزدیک حدیث متصل کے حکم میں ہے۔

امام حاکم اس کی مثال میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کر کے کہتے ہیں کہ اس حدیث کو پہلے مصری راویوں نے اور پھر کئی مدنی راویوں نے ذکر کیا ہے اور وہ تدلیس

کے عادی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کا سماع کی تصریح کرنا اور نہ کرنا مساوی ہے۔

۹۔ مُعضَل :

جس حدیث کی سند سے ایک سے زیادہ راوی ساقط ہو گئے ہوں اس کو مُعضَل کہتے ہیں۔ مُعضَل اور مُرسَل میں فرق ہے۔ مُرسَل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کو تابعی رسول کریم سے روایت کرے اور صحابی کا نام ذکر نہ کرے۔

۱۰۔ مُدرَج :

جس حدیث میں کوئی جملہ بڑھا دیا گیا ہو اس کو مدرج کہتے ہیں۔ امام حاکم نے اس کی مثال میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت پیش کی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں نماز میں تشہد پڑھنا سکھایا۔ آپ نے فرمایا پڑھیے "اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّیِّبَاتُ"۔ آپ نے آخر تک تشہد پڑھا۔ کہا "جب تو نے یہ کلمات پڑھ لیے تو تمہاری نماز مکمل ہو گئی۔ اگر جانا چاہو تو چلے جاؤ ورنہ بیٹھے رہو"۔

امام حاکم کہتے ہیں "اِذَا قُلْتَ ھٰذَا" کے الفاظ حدیث میں عبداللہ بن مسعودؓ نے شامل کیے ہیں۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جس میں مذکور ہے کہ آنحضورؐ کے یہ کلمات سکھانے کا ذکر کر کے عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے شاگرد سے کہا کہ "جب تو نے یہ کلمات پڑھ لیے تو تمہاری نماز مکمل ہو گئی"۔

۱۱۔ تابعین کی پہچان :

یہ نوع بہت سے علومِ حدیث کی جامع ہے۔ تابعین مختلف طبقات میں منقسم ہیں۔ جو شخص علمِ حدیث کی اس نوع سے بہرہ ور نہ ہو وہ صحابہ و تابعین نیز تابعین و اتباعِ تابعین میں فرق و امتیاز نہیں کر سکتا۔ بقول حاکم تابعین کے پندرہ طبقات ہیں۔ پہلے طبقہ میں وہ تابعین شامل ہیں جو عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم سے ملے تھے۔ مثلاً سعید بن المسیب، قیس بن ابی حازم

وعلاوہ ازیں ۔

آخری طبقہ میں وہ تابعین شمار ہیں جو بصرہ میں انس بن مالک، کوفہ میں عبداللہ بن ابی اوفیٰ مدینہ میں سائب بن یزید، اہل مصر میں سے حارث بن جزء اور اہل شام میں سے ابو اسامہ باہلی سے ملے تھے۔

۱۲- اولاد صحابہ کی جان پہچان :

جو شخص اس نوع سے آشنا نہ ہو بہت سی روایات اس پہ مشتبہ رہیں گی۔ محدث پر سب سے پہلے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے آگاہ ہونا اور یہ معلوم کرنا لازم ہے کہ اولاد رسولؐ میں سے کس کس نے آپ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ پھر کبار صحابہ کی اولاد کا جاننا ضروری ہے۔ پھر تابعین اور اتباع تابعین اور دیگر ائمہ حدیث کے اولاد و اطفال سے آگاہی و آشنائی ناگزیر ہے۔ یہ بے حد مفید علم اور علوم الحدیث کی ایک مستقل قسم ہے۔

۱۳- علم الجرح والتعدیل :

دراصل یہ دو جداگانہ قسم کے علوم ہیں۔ علم الجرح ایک مستقل علم ہے اور علم التعدیل اس سے مختلف ہے۔ یہ دونوں علوم فن حدیث کی بہت بڑی سیڑھی ہیں۔ ان دونوں علوم کے سلسلہ میں اسی طرح گفتگو کی جاتی ہے جس طرح صحیح ترین اور ضعیف ترین سند کے بارے میں۔

۱۴- احادیث صحیحہ وسقیمہ میں فرق وامتیاز :

یہ جرح و تعدیل سے ایک مختلف علم ہے۔ بسا اوقات ایک سند میں کوئی مجروح راوی نہیں ہوتا اس کے باوصف اس کو صحیح حدیث شمار نہیں کیا جاتا۔ امام حاکم اس کی مثال میں بسند متصل ایک حدیث بروایت ابن عمرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

"رات دن کی نماز دو دو رکعت اور وتر رات کے آخری حصہ میں ایک رکعت ہے"

امام حاکم فرماتے ہیں اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں مگر اس میں "دن" کے لفظ کا اضافہ

وہم پر مبنی ہے۔

امام حاکم اس کی دوسری مثال میں امام مالک کی وہ روایت بھی ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے ابن شہابؒ سے، اس نے عروہ سے اور اس نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کی ہے کہ:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کھانے میں کبھی عیب نہیں نکالا تھا۔ اگر پسند ہوتا تو کھا لیتے، ورنہ چھوڑ دیتے"۔

امام حاکم کہتے ہیں اگرچہ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں مگر امام مالک کی روایت سے یہ حدیث بے کار ہے۔ دراصل اس سند سے جو حدیث روایت کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ:

حضور اکرمؐ نے اپنے ہاتھ سے کبھی کسی عورت کو نہیں پیٹا اور نہ کسی سے اپنی ذات کے لیے انتقام لیا۔ البتہ اگر کوئی شخص دینی شعائر کی توہین کا مرتکب ہوتا تو آپ اس سے انتقام لیتے"۔

امام حاکم کہتے ہیں "میں نے یہ دریافت کرنے کی مقدور بھر کوشش کی کہ اس حدیث میں کس راوی سے وہم صادر ہوا مگر اس کا ٹھیک پتہ نہ چل سکا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ یہ وہم ابن حبان بصری سے صادر ہوا ہے۔ باوجودیکہ وہ صدوق و مقبول راوی ہے"۔

حاکم مزید فرماتے ہیں:

"صحیح حدیث کا پتہ صرف روایت ہی سے نہیں لگتا بلکہ اس کی پہچان راوی کے فہم و حفظ اور کثرتِ سماع سے حاصل ہوتی ہے۔ علم کی اس خاص نوع کے لیے اہل علم کا باہمی مذاکرہ نہایت مفید ہے۔ اس طرح حدیث میں جو خفیہ علت ہوتی ہے وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ جب اس قسم کی احادیث اسانید صحیحہ کے ساتھ پائی جائیں اور بخاری و مسلم نے ان کو روایت نہ کیا ہو تو اہل علم کو باہم بحث و تمحیص کر کے ان کی علت معلوم کرنا چاہیے"۔

۱۵۔ فقہ الحدیث:

علوم الحدیث کا مغز و خلاصہ فقہ الحدیث ہی ہے۔ شریعت کا مدار و انحصار بھی اسی پر ہے۔ امام حاکم نے بکثرت ائمہؒ حدیث کے نام گنائے ہیں جو روایت حدیث کے ساتھ ساتھ اس کے رمز آشنا اور فقہ الحدیث میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مثلاً ابن شہابؒ زہری، عبدالرحمٰنؒ بن عمر الاوزاعی، عبداللہؒ بن مبارک، سفیانؒ بن عُیَیْنہ، احمدؒ بن حنبل وغیرہم۔

۱۶۔ ناسخ و منسوخ:

امام حاکم نے ناسخ و منسوخ احادیث کی متعدد مثالیں ذکر کی ہیں۔

۱۷۔ حدیث مشہور:

بقول حاکم حدیث مشہور و صحیح میں فرق ہے۔ بہت سی مشہور احادیث کو احادیث صحیحہ میں شمار نہیں کیا جاتا۔

۱۸۔ حدیث غریب:

حدیث غریب کی کئی قسمیں ہیں۔ حدیث غریب کی ایک قسم "صحیح غریب" ہے۔ یہ وہ حدیث ہے جس کے روایت کرنے میں ثقہ راوی منفرد ہو۔

حدیث غریب کی ایک قسم "غرائب الشیوخ" ہے۔ امام حاکم نے اس کی مثال میں حدیث "لَا یَبِیْعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ" ذکر کی ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ حدیث بروایت امام مالک از نافع غریب ہے۔ امام شافعی اس کے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ امام شافعی بہت ثقہ راوی ہیں مگر ان سے یہ حدیث صرف ربیع بن سلیمان نے روایت کی ہے جو ثقہ اور قابل اعتماد راوی ہے۔

۱۹۔ حدیث فرد:

حدیث فرد کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ حدیث جس کو کسی صحابی سے روایت کرنے میں ایک شہر کے رہنے والے منفرد

ہوں ۔ مثلاً آغاز سند سے آخر تک صرف کوفی یا مدنی راوی روایت کریں ۔

(۲) وہ حدیث جس کو کسی امام سے روایت کرنے میں ایک شخص متفرد ہو ۔

(۳) اہل مدینہ کی احادیث جن کے روایت کرنے میں مکہ کا کوئی راوی متفرد ہو ۔ (مکہ و مدینہ کا نام مثال کے طور پر لیا گیا ہے ۔ مراد یہ ہے کہ ایک شہر کا راوی دوسرے شہر کے باشندوں سے روایت کرنے میں متفرد ہو) ۔

۲۰ ۔ مُدلِّسین کی پہچان :

محدث حاکم کہتے ہیں کہ تابعین اور اتباع تابعین میں ہمارے زمانہ تک بہت سے راوی مُدلِّس ہوئے ہیں ۔

حاکم نے تدلیس کے چھ اقسام اور پھر ان کی مثالیں ذکر کی ہیں ۔

۲۱ ۔ علل الحدیث :

یہ ایک مستقل علم ہے ۔ امام حاکم رقمطراز ہیں :

"کسی حدیث کے معلل ہونے کے کئی وجوہ ہیں جن میں جرح کا کوئی دخل نہیں ہوتا ۔ اس لیے کہ جس حدیث پر جرح و قدح کی گئی ہو وہ ساقط الاعتبار ہوتی ہے بعض اوقات ثقہ راویوں کی روایت کردہ حدیث میں بھی علت موجود ہوتی ہے جس کا انہیں علم نہیں ہوتا ۔ اس علت کی بناء پر وہ حدیث معلول ہو جاتی ہے ۔ علت کی پہچان کا مدار و انحصار ہمارے نزدیک فہم و حفظ پر ہے کسی اور چیز پر نہیں ۔

حاکم نے علت کی دس قسمیں بیان کر کے ہر ایک کی مثال بیان کی ہے ۔ حاکم نے اس کے قواعد کا تذکرہ نہیں کیا ۔ وہ ہر نوع کی مثال ذکر کر کے پھر اس کی علت پر روشنی ڈالتا ہے ۔ حدیث میں علت پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یا تو ایک حدیث دوسری میں داخل و مدغم ہو جاتی ہے ۔ یا راوی وہم کا شکار ہو جاتا ہے ۔ یا کسی مرسل حدیث کو موصولا بیان کرتا ہے ۔

۲۲- احادیث متعارضہ:

کچھ حدیثیں بظاہر متعارض ہوتی ہیں۔ ایک مذہب و مسلک کے حامل ایک حدیث سے اخذ و احتجاج کرتے ہیں تو دوسرے فرقہ والے دوسری حدیث سے۔ حاکم نے احادیث صحیحہ سے اس کی مثالیں ذکر کی ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپ مفرد بالحج یعنی صرف فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ دوسری احادیث میں ہے کہ آپ نے تمتع کیا تھا یعنی عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد حج کے لیے نیا احرام باندھا تھا۔ جبکہ دیگر احادیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ آپ قارن تھے یعنی آپ نے ایک ہی احرام کے ساتھ عمرہ اور حج دونوں ادا کیے۔ امام احمدؒ و ابن خزیمہ کا قول ہے کہ آپ نے تمتع کیا۔ امام شافعی آپ کو مفرد قرار دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ قران کے حق میں ہیں۔

۲۳- احادیث غیر متعارضہ:

حاکم نے ایسی احادیث کی مثالیں ذکر کی ہیں جن میں کوئی تناقض و تضاد نہیں پایا جاتا۔

۲۴- زیادت راوی:

بعض احادیث ایسے اضافہ پر مشتمل ہوتی ہیں جن کی نقل و روایت میں ایک ہی راوی متفرد ہوتا ہے۔ ایسی حدیثیں قلیل الوجود ہیں اور محدثین میں بہت کم لوگوں کو یاد ہوتی ہیں۔ امام حاکم نے اس ضمن میں چند امثلہ ذکر کی ہیں جن میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ حدیث بھی ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا سب سے افضل عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا "اوّل وقت پر نماز ادا کرنا"۔ میں نے عرض کیا "اس کے بعد کون سا؟" فرمایا "خدا کی راہ میں جہاد"۔ میں نے عرض کیا "پھر کون سا؟" فرمایا "والدین کی اطاعت شعاری"۔

حاکم کہتے ہیں یہ ایک صحیح اور محفوظ حدیث ہے جس کو ائمہ حدیث کی ایک جماعت نے مالک بن مغول اور عثمان بن عمر سے روایت کیا ہے۔ مگر بندار بن بشار اور حسن بن مکرم کے

سوا کسی راوی نے بھی اول وقت کا ذکر نہیں کیا۔ یہ دونوں راوی ثقہ ہیں۔

۲۵۔ محدثین کا مذہب و مسلک :

حاکم نے ائمہ حدیث کی تصریحات کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے بعض راویوں کا مذہب و مسلک ذکر کر کے لوگوں کو ان سے احادیث روایت کرنے سے باز رکھا ہے۔

۲۶۔ تصحیف المتون :

تصحیف المتن کا مطلب یہ ہے کہ متن حدیث جن الفاظ پر مشتمل ہے ان کی شکل تبدیل ہو جائے۔ ائمہ حدیث کی ایک جماعت نے اس میں لغزش کھائی ہے۔ حاکم نے اس کی مثالیں ذکر کی ہیں۔

۲۷۔ تصحیف الاسانید :

اگر سند میں ایسا بگاڑ پیدا ہو تو اس کو تصحیف الاسناد کہتے ہیں۔

آگے چل کر محدِث حاکم نے علوم الحدیث کے بہت سے انواع ذکر کیے ہیں جن کا تعلق راویانِ حدیث کے اسماء و انساب قبائل و اقران ان کی عمروں کنیتوں اور ان کے پیشوں کے ساتھ ہے۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ محدثین نے حدیث نبوی کی حفاظت و صیانت میں کس بالغ نظری، دقیقہ رسی اور ضبط و اتقان سے کام لیا تھا۔

حدیث نبوی کے تحفظ کے سلسلہ میں ہم علماء کی مساعی کے ثمرات کا ذکر کر رہے تھے۔ اجمالاً وسط کلام میں علوم الحدیث کا تذکرہ آگیا۔ اب ہم پھر اپنے موضوع کی جانب لوٹتے ہیں۔

۵۔ احادیث موضوعہ پر مشتمل کتب :

جب حدیث نبوی میں دروغ گوئی کا ظہور و شیوع ہوا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر افترا پردازی کرنے والوں کی چھان پھٹک کی جانے لگی تو علماء سلف نے علانیہ مجالس میں ان کا تذکرہ شروع کیا۔ وہ واشگاف الفاظ میں کہتے کہ فلاں شخص کذاب ہے۔

اس سے روایت نہ کرو۔ فلاں زندیق اور فلاں منکر تقدیر (قدریہ) ہے۔

محدثین کے یہاں جو لوگ دروغ گوئی میں رسوائے زمانہ تھے ان میں سے معدودے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

(۱) ابان بن جعفر نمیری: اس نے تین سو[۳۰۰] حدیثیں وضع کرکے امام ابوحنیفہؒ کی جانب منسوب کردی تھیں۔ امام موصوف نے ان میں سے ایک حدیث بھی روایت نہیں کی تھی۔

(۲) ابراہیم بن زید اسلمی: اس نے امام مالکؒ سے ایسی حدیثیں روایت کیں جن کی کوئی اصل نہیں۔

(۳) احمد بن عبداللہ جویباری: فرقہ کرامیہ کے لیے اس نے کئی ہزار حدیثیں وضع کیں۔

(۴) جابر بن یزید جعفی: اس کے بارے میں سفیان کہتے ہیں کہ میں نے جابر جعفی سے تیس ہزار[۳۰۰۰۰] حدیثیں سنی ہیں۔ مجھے جتنی بھی دولت دی جائے میں ان کا ذکر کرنے کو حلال نہیں سمجھتا۔

(۵) محمد بن شجاع لیثی: اس نے ذات خداوندی کے جسم انسانی کے مماثل ہونے سے متعلق حدیثیں گھڑ کر محدثین کی جانب منسوب کردیں۔

(۶) نوح بن ابی مریم: اس نے قرآنی سورتوں کے فضائل میں حدیثیں وضع کیں۔

چند مشہور وضاعین کے نام یہ ہیں:

حارث[۱] بن عبداللہ اعور۔ مقاتل[۲] بن سلیمان۔ محمد[۳] بن سعید مصلوب۔ واقدی[۴]۔ ابن ابی یحیٰی[۵]۔ وہب[۶] بن وہب قاضی۔ محمد[۷] بن سائب کلبی۔ ابوداؤد[۸] نخعی۔ اسحاق[۹] بن نجیح ملطی۔ عباس[۱۰] بن ابراہیم نخعی۔ مامون[۱۱] بن ابی احمد ہروی۔ محمد[۱۲] بن عکاشہ کرمانی۔ محمد[۱۳] بن قاسم طائکانی۔ محمد[۱۴] بن زیاد یشکری۔ محمد[۱۵] بن تمیم داری۔

اس کے بعد محدثین نے احادیث موضوعہ پر مشتمل جداگانہ کتب تصنیف کیں تاکہ عوام ان کے

دام فریب میں نہ آسکیں - اس ضمن میں مشہور ترین تصانیف حسب ذیل ہیں :

۱ - موضوعات حافظ ابوالفرج ابن الجوزی متوفی ۵۹۷ھ -

جن احادیث کو موضوع قرار دیا گیا ہے وہ تمام ابن الجوزی نے اس کتاب میں جمع کر دیں خواہ وہ کتب صحاح میں ہی مندرج کیوں نہ ہوں - اس کی تفصیل یہ ہے -

(۱) بقول ابن الجوزی صحیح مسلم میں دو۲ حدیثیں موضوع ہیں -

(۲) بخاری میں ایک موضوع حدیث موجود ہے -

(۳) مسند احمد میں اڑتیس۳۸ موضوع احادیث ہیں -

(۴) سنن ابی داؤد میں نو۹ -

(۵) جامع ترمذی میں تیس۳۰ -

(۶) سنن نسائی میں دس۱۰ -

(۷) سنن ابن ماجہ میں تیس۳۰ -

(۸) مستدرک حاکم میں ساٹھ۶۰

اور اسی طرح دیگر کتب حدیث میں -

علماء نے ابن الجوزی کی ذکر کردہ اکثر موضوعات کو برقرار رکھا اور بہت کم احادیث میں ان کی مخالفت کی - خصوصاً انہوں نے بخاری مسلم اور مسند احمد میں مندرج احادیث کے موضوع ہونے کی تردید کی -

۲ - "المغنی عن الحفظ والکتاب" یہ کتاب ابوعمر بن بدر موصلی متوفی ۶۲۳ھ کی تصنیف ہے -

اس کتاب میں صرف ان ابواب کا ذکر کیا گیا ہے - جن سے متعلق کوئی صحیح حدیث روایت نہیں کی گئی - مثلاً اس میں مذکور ہے"

اس کے آگے لکھتے ہیں "کہ اس باب میں کوئی صحیح حدیث روایت نہیں کی گئی" اس کتاب پر علماء نے کڑی تنقید کی ہے -

۳۔ الدر الملتقط فی تبیین الغلط :۔ یہ کتاب علامہ رضی الدین ابو الفضل حسن ابن محمد بن حسین متوفیٰ ۶۵۰ھ کی تصنیف ہے۔ علماء نے اس کتاب کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

۴۔ تذکرۃ الموضوعات :۔ یہ ابن طاہر مقدسی کی تصنیف ہے۔ مصنف نے اس میں وہ تمام حدیثیں جمع کر دی ہیں جن کو کذاب مجروح ضعیف اور متروک راویوں نے روایت کیا ہے۔

۵۔ اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ :۔ یہ حافظ سیوطی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ابن الجوزی کی کتاب کی تلخیص پر مشتمل ہے۔ ابن الجوزی نے جن احادیث کو موضوع قرار دیا تھا سیوطی نے ان میں سے بعض پر شدید تنقید کی ہے۔

۶۔ سیوطی نے اس کتاب کا ضمیمہ بھی مرتب کیا تھا۔ ابن الجوزی جن موضوع احادیث کو اپنی کتاب میں شامل نہ کر سکے سیوطی نے اس ضمیمہ میں ان کو جمع کر دیا ہے۔

۷۔ تذکرۃ الموضوعات از محمد بن طاہر بن علی الفتنی (پٹنی یعنی پٹنہ (بھارت) کے رہنے والے) متوفیٰ ۹۸۶ھ :۔
اس کتاب کے ساتھ ایک رسالہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ جس میں وضّاع اور ضعیف راویوں کا ذکر حروفِ تہجی کی ترتیب سے کیا گیا ہے۔

۸۔ موضوعات از ملّا علی قاری حنفی متوفیٰ ۱۰۱۴ھ۔

۹۔ الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ از امام شوکانی متوفیٰ ۱۲۵۰ھ۔

۱۰۔ رسالہ از امام صنعانی :۔ اس رسالہ میں موصوف نے وہ تمام احادیث جمع کر دی ہیں جو ان کے عصر و عہد میں واعظ اور قصہ گو عام طور سے بیان کیا کرتے تھے۔ اس کے آخر میں مشہور ترین ضعیف اور متروک راویوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔

۱۱۔ اللؤلؤ المرصوع فی مالا اصل لہٗ او باصلہ موضوع :۔ یہ کتاب شیخ محمد بن ابی محاسن ازھری کی تصنیف ہے۔ آپ طرابلس میں پیدا ہوئے اور مصر میں ۱۳۰۵ھ وفات پائی کتاب مذکور اور امام صنعانی کا سابق الذکر رسالہ مصر میں دونوں یکجا طبع ہوئے ہیں۔

۶ ۔ زبان زدِ عام احادیث پر مشتمل تصانیف :

(۱) "تمییز الطیب من الخبیث فی ما یدور علی السنة الناس من الحدیث"

یہ کتاب ابن الربیع شیبانی الاثری متوفی ۹۴۴ھ نے مرتب کی ۔

(۲) "حسن الاثر فی ما فیہ ضعف واختلاف من حدیث وخبرٍ واثرٍ"

یہ کتاب شیخ محمد الحوت بیروتی مرحوم کی ساختہ پرداختہ ہے ۔

فنِ حدیث جن تاریخی ادوار و مراحل سے گزرا اور جس زد و ردِ تحریف سے دوچار ہوا اس کا مختصر بیان اب یہاں تکمیل پذیر ہوتا ہے ۔ علماءِ حدیث نے حدیثِ نبوی کو جھاڑ جھنکار سے پاک و صاف کرنے کے سلسلہ میں جو مساعی جمیلہ انجام دی تھیں ان کا ذکر و بیان بھی ہو چکا ۔ بلا ریب یہ مساعی ایسی تھیں کہ ہر منصف مزاج شخص کا سر اجلالاً و اکراماً ان کے آگے جھک جاتا ہے اور وہ اس امر کا اعتراف کرنے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ یہ جہود و مساعی بشری استطاعت سے بالا تھیں ۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا

باب دوم

حدیث نبوی پر اعتراضات

اس میں سات فصلیں ہیں

★ فصل اوّل : حدیث نبوی شیعہ و خوارج کے مابین۔

★ فصل دوم : قدیم منکرینِ حدیث۔

★ فصل سوم : جدید منکرینِ حدیث

★ فصل چہارم : منکرینِ حجیتِ اخبارِ آحاد

★ فصل پنجم : معتزلہ و متکلّمین اور حدیث نبوی

★ فصل ششم : بعض مصنّفین عصرِ حاضر اور حدیث نبوی

★ فصل ہفتم : مستشرقین اور حدیثِ نبوی۔

حدیث نبوی شکوک وشبہات کے جس ورطہ میں ڈوب کر کامیاب وکامران حالت میں نکلی تھی اس کا فطری نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اس پر زخم خوردہ ہونے کے کچھ آثار ومعالم بالضرور باقی رہتے۔ چنانچہ یہی ہُوا، مگر حدیث کی قوت وحیات میں فرق نہ آیا۔ یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں کہ سنت مختلف عصور وازمنہ میں مسلم فرقوں کے شکوک وظنون کی آماج گاہ رہی اور اس کے ماخذِ قانون ہونے پر اعتراضات وارد کیے جاتے رہے ہیں۔ ہم اگلی فصلوں میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

فصل اوّل

حدیث نبوی شیعہ و خوارج کے مابین

صحابہ کرام کے فضائل و مناقب:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اس امر میں ذرہ بھر شک نہیں رکھتے تھے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب ہے۔ وہ جانتے تھے کہ آپ سب لوگوں کی جانب مبعوث ہو کر تشریف لائے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ کائنات ارضی پر بسنے والے تمام بنی آدم اور آیندہ ادوار میں پیدا ہونے والے لوگوں تک آپ کا پیغام پہنچانا صحابہ پر فرض ہے۔ تاریخ اسلام اس بات کی شاہد عدل ہے کہ صحابہ ایک دوسرے کو شک و شبہ اور عداوت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ وہ باہم بھائی بھائی اور گہرے دوست تھے۔ ان کا عقیدہ ایک تھا۔ نصب العین ایک تھا۔ ایک نبی ایک کتاب اور ایک شریعت کی محبت نے ان کو ایک شیرازہ میں پرو دیا تھا۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ وہ باہم کس قدر اخوت و محبت رکھتے تھے۔ قرآن کریم میں فرمایا:-

> "محمد تو اللہ کے رسول ہیں جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور باہم نہایت رحیم و کریم ہیں۔ تو اُن کو رکوع کرتے اور سجدہ کرتے ہوئے دیکھتا ہے وہ خدا کے فضل اور رضامندی کے خواہاں ہیں۔ ان کے چہروں پر سجدہ کے نشان پڑے ہوئے ہیں۔"

صحابہ کا جذبۂ الفت و محبت و ایثار و تعاون ضرب المثل کی حد تک معروف تھے۔ ان میں جب کبھی اختلاف رُونما ہوتا تو حق کی بناء پر ہوتا۔ جب حق کھل کر سامنے آجاتا تو وہ اختلافات کو خیرباد کہہ دیتے۔ باہمی نزاع و اختلاف کے علی الرغم وہ اخلاق و آداب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑتے

دوسروں کی ناموس و آبرو کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے نہ کسی پر دروغ گوئی کا الزام عائد کرتے نہ کسی کو متہم کرتے اسلام میں سبقت کرنے والوں کے قدرداں تھے۔ دعوتِ اسلام کی نشر و اشاعت میں جن لوگوں نے مال صرف کیا تھا ان کے مرہونِ منت تھے۔ خدا کے عطا کردہ مال و متاع کی بنا پر وہ کسی سے حسد نہیں کرتے تھے۔ ان کے لیے یہی عزت و عظمت کافی ہے کہ وہ اصحابِ رسول اور دینِ اسلام کے داعی و مبلغ تھے۔ خداوندِ کریم نے ان کو قعرِ ضلالت سے نکال کر اوجِ ہدایت پر متمکن فرمایا تھا۔ اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟

جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو پہلا اختلاف جو صحابہ میں رونما ہوا وہ آپ کی جانشینی سے متعلق تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت خطرناک اختلاف تھا اور اس امر پر مبنی تھا کہ اسلامی ریاست کا حاکمِ اعلیٰ کون ہو؟ مگر اس نزاع کے دوران صحابہ نے جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تبادلۂ افکار کا جو طرز و انداز اختیار کیا اور آخر کار جس طرح ایک رائے پر متفق ہو گئے وہ تاریخ کا ایک اعجوبہ ہے۔ اس آڑے وقت پر صحابہ نے ضبطِ نفس، خوش معاملگی، طلبِ حق اور محبتِ رسول کے اکرام و احترام کا جو ثبوت دیا دورِ حاضر کی اسمبلیوں میں بھی اس کی مثال تلاش نہیں کی جا سکتی۔ چہ جائیکہ اس قدیم عصر و عہد میں اس کی نظیر تلاش کی جائے جب لوگ نہ شوریٰ سے آگاہ تھے نہ کسی قوم کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنا امیر خود منتخب کرے۔

تاریخِ اسلام میں آپ نے یہ واقعات پڑھے ہوں گے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کس طرح انصارِ مدینہ آپ کا جانشین منتخب کرنے کے لیے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے۔ اور کس طرح سرکردہ مہاجرین حضرت ابوبکر و عمر و ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم کی قیادت میں وہاں پہنچے۔ بکمالِ ادب و احترام انصار کے دلائل سنے اور پھر جناب صدیق نے اپنی اور مہاجرین کی رائے پیش کی۔ سب سے پہلے آپ نے انصار کے فضائل و مناقب پر روشنی ڈالی۔ آپ نے بتایا انصار نے آڑے وقت پر اسلام اور اہلِ اسلام کا ساتھ دیا۔ رسول کریم کا دفاع کیا۔ مہاجرین کو خوش آمدید کہا اور ان کی اعانت کا حق ادا کیا۔ پھر فخر و غرور کے کسی شائبہ کے بغیر مہاجرین

کی فضیلت بیان کی۔ فرمایا عرب کے باشندے خاندان قریش کے سوا کسی کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ مزید براں انصار کے دو متخالف گروہوں میں سے اگر اوس میں سے امیر منتخب ہوا تو خزرج حسد کی آگ میں جل اٹھیں گے۔ اور اگر خزرج میں سے ہوا تو اوس کے قبیلہ پر ناگوار گزرے گا۔

انصار نے کہا تھا کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک مہاجرین میں سے ہو۔ مہاجرین نے اس کے جواب میں کہا کہ اسلام میں یہ پہلی کمزوری ہے۔ پھر جناب صدیق رضؓ نے حاضرین سے کہا کہ عمرؓ و ابو عبیدہؓ میں سے کسی ایک کی بیعت کر لو۔ فاروق اعظم کہنے لگے "آپ مجھ سے افضل ہیں" حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا "مگر آپ مجھ سے زیادہ طاقتور ہیں" حضرت عمرؓ نے کہا "میری طاقت تو آپ کی نصرت و تائید کے لیے ہے" پھر آگے بڑھے اور حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا۔ مہاجرین نے بھی بیعت کر لی۔ انصار اس تیزی سے بیعت کے لیے آگے بڑھے کہ حضرت سعد رئیس انصار کے کچلے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حضرت سعد انصار کی طرف سے خلافت کے امیدوار تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں موجود سب لوگوں نے حضرت صدیق کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد جمہور اہل اسلام نے آپ کو خلیفہ تسلیم کر لیا۔ البتہ حضرت علیؓ اور ان کے چند رفقاء کو قدرے تامل ہوا مگر جلد ہی انہوں نے بھی آپ کی بیعت کر لی۔

اس طرح انتخابِ خلیفہ کی خطرناک مہم انجام کو پہنچی۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کی تکمیل میں نہ خون کا کوئی قطرہ بہایا گیا۔ نہ اقوام و قبائل آپس میں گتھم گتھا ہوئے۔ نہ دوسروں پر کیچڑ اچھالا گیا یہ واقعہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ صحابہ کس قدر بلند عزائم کے حامل تھے۔ وہ کس حد تک ایک دوسرے کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کے معاشرہ میں استحکام کہاں تک تھا اور ان میں تعاون و اخوت کا جذبہ اپنے اندر کتنی بے پناہ طاقت رکھتا تھا۔

جنابِ شیخین (حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کے عصر و عہد اور حضرت عثمانؓ کے

کے اوائل خلافت تک حالات کا دھارا اس طرح بہتا رہا۔ وہ ہر نیک کام کے سلسلہ میں پورا پورا تعاون کرتے اور امر بالمعروف میں اعانت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ جزوی و فروعی مسائل میں ان کے یہاں اختلاف بھی پایا جاتا تھا۔ جب حق کھل کر ان کے سامنے آجاتا تو کسی کی درستی کسی کی خوش حالگی یا کسی کی عظمت و رفعت انہیں اس کے اظہار و اعلان سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ ان میں خالص عربوں جیسی وضاحت و صراحت پائی جاتی تھی۔ وہ مکر و فریب اور نفاق کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ وہ اس مہذب شہری کی طرح باادب تھے جو درشتی و سنگ دلی سے واقف ہی نہ ہو۔ وہ بھائیوں کی طرح ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ فخر و غرور ان کے پاس بھی نہ پھٹکا تھا۔ وہ ایک سپاہی کی طرح اطاعت شعار اور بغاوت ناآشنا تھے۔ وہ ایک جدید مملکت ایک جدید شریعت اور ایک جدید ملت کے بانی اور معمار تھے۔ ان میں اس معمار کی سی بالغ نظری علمی وسعت سعی و جہد کی فراوانی اور وسائل و ذرائع کی کثرت پائی جاتی تھی جو اپنے فن میں ماہرانہ بصیرت رکھتا ہو۔

جب عثمانی خلافت کے اواخر میں فتنہ نمودار ہوا تو پوشیدہ طور سے صحابہ میں ایسے لوگ داخل ہو گئے جو دراصل دشمن اسلام یہودی و عجمی تھے۔ مگر انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس فتنہ بازی کے نتیجہ میں خلیفہ سوم و چہارم نے شہادت پائی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تنہا مسندِ خلافت پر متمکن ہو گئے۔ ہم نے اس دور میں دیکھا کہ اصحابِ رسولؐ پر زبان طعن دراز کی جانے لگی۔ حبِ علی کی آڑ میں حضرات صحابہ کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا تھا۔ حالانکہ یہ وہی صحابہ تھے جنہوں نے دین اسلام کی بنیادوں کو اپنی قوتِ بازو اپنی روح اور اپنے خون کے ساتھ استوار کیا تھا۔ جس طرح شیعانِ علی نے اصحابِ رسول پر زبان لعن و طعن دراز کی تھی اسی طرح واقعہ تحکیم کے بعد خوارج نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ اس عصر و عہد میں جو صحابہ بقید حیات تھے خوارج نے سب کی اس اساس پر تکفیر کی کہ انہوں نے بزعم خویش حکم خداوندی کی مخالفت کی ہے۔ اور جو شخص اس کا مرتکب ہو وہ کافر ہو جاتا ہے۔

بخلاف ازیں جمہور اہل اسلام نے اختلافاتِ صحابہ کے بارے میں مبنی بر اعتدال موقف اختیار کیا۔ ان کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ خلفاءِ ثلاثہؓ حضرت علیؓ کی نسبت خلافت کے زیادہ حق دار تھے اور حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ سے احق بالخلافۃ تھے۔ مگر خلفاءِ ثلاثہ کی تائید و حمایت اور حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کو قابلِ ترجیح تصور کرنے کے علی الرغم وہ ان جملہ صحابہ کبار کو بنظر اکرام و احترام دیکھتے تھے۔ وہ خطاکار کو اس بناء پر معذور قرار دیتے تھے کہ ان کی خطا مبنی بر اجتہاد تھی۔ اور مجتہد سے غلطی بھی سرزد ہو تو وہ گنہگار نہیں ہوتا۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے دین اسلام کی نشر و اشاعت اور اعلاء کلمۃ الحق کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت والفت اور صحبت و رفاقت کا جو حق ادا کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ ان سب کے ساتھ حسنِ ظن رکھا جائے۔ مزید برآں فتنہ کے ظہور و شیوع سے قبل کی تاریخ مطالعہ کرنے سے صحابہ کے آداب و اخلاق اور عالی ظرفی کے جو مظاہر و مناظر سامنے آتے ہیں وہ بھی ہمیں ان کے بارے میں نیک گمان کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ صحابہ طالبِ حق مجتہد تھے۔ ان میں سے جس کا اجتہاد درست ہے اس کو دو اجر ملیں گے۔ اور جس کا اجتہاد درست نہیں اسے ایک اجر۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہادِ حاکم سے متعلق ایک مشہور حدیث میں یونہی ارشاد فرمایا ہے۔ (کتاب الام للشافعی، ج ۷، ص ۲۵۲)

اگر یہ اختلاف صحابہ کبار اور ان کے ہمنوا جمہور صحابہ و تابعین کے دائرہ میں محدود رہتا تو اس میں صحابہ کی امتیازی خصوصیت یعنی حسنِ ادب احترام صحبت اور اس کے ساتھ ساتھ علانیہ حق گوئی و بے باکی باقی رہتی۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ بلکہ ہوا یہ کہ اعداءِ دین کی دسیسہ کاریوں اور مختلف گروہوں کے ان اختلافی معرکوں میں حصہ لینے کی وجہ سے تاریخِ صحابہ میں ایسے الفاظ کا اضافہ ہو گیا جو انہوں نے ایک دوسرے کے حق میں سرے سے کہے ہی نہ تھے۔ بلکہ یہ بات ہرگز نہیں سنی گئی کہ صحابہ ایسی پست سطح تک اتر آئے ہوں۔ افسوس بالائے

افسوس یہ ہے کہ ان من گھڑت اقوال نے جمہور شیعہ کے یہاں بار پایا، اور وہ ان میں دلچسپی لینے لگے۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ شیعہ اوّلین لوگ تھے جنہوں نے صحابہ پر زبانِ طعن دراز کی۔ صحابہ کے بارے میں من گھڑت اقوال سے اپنی مجالس کو آباد کیا اور حضرت علیؓ کی فضیلت میں حدیثیں وضع کیں۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید کی زبانی نقل کر چکے ہیں۔

خوارج :

بہرکیف صحابہ کے باہمی اختلافات کا نتیجہ یہ ہوا کہ خوارج و شیعہ نے جمہور اہلِ اسلام کے خلاف ان کے بارے میں الگ الگ موقف اختیار کیا۔ چنانچہ خوارج کے تمام فرقے فتنہ بازی کے ظہور سے قبل جمیع صحابہ کو عادل قرار دیتے ہیں۔ ظہور فتنہ کے بعد خوارج حضرت علیؓ و عثمان اصحابِ جمل حضرت ابوموسیٰ اشعری و عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم اور تحکیم پر اظہارِ خوشنودی کرنے والے یا دونوں میں سے کسی ایک حکم کی تصویب کرنے والے تمام لوگوں کی تکفیر کرتے ہیں۔ (الفَرقُ بَینَ الفِرَق، ص ۴۵)

نظر بریں خوارج ظہورِ فتنہ کے بعد جمہور صحابہ کی روایات کو اس لیے تسلیم نہیں کرتے کہ بزعمِ خویش انہوں نے تحکیم کو تسلیم کر کے آئمہ جور کا اتباع کیا اور اس لیے قابلِ اعتماد نہیں رہے۔

شیعہ :

شیعہ کے تمام گروہ ——— اور ہماری مراد ان شیعہ سے ہے جو اسلام کے دائرہ میں محدود رہے ——— حضرت ابوبکر و عمر و عثمان اور ان کے ہمنوا صحابہ نیز حضرت عائشہ طلحہ زبیر معاویہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کو موردِ جرح و قدح ٹھہراتے ہیں۔ بالفاظ صحیح تر یوں کہنا چاہیے کہ جمیع صحابہ شیعہ کے یہاں مطعون ہیں سوا ان چند صحابہ کے جو بقول شیعہ حضرت علی کے خصوصی احباب میں شامل تھے۔ بعض شیعہ کے نزدیک ایسے صحابہ کی تعداد کل پندرہ[۱۵] ہے۔ شیعہ کے عقیدہ کی اصل و اساس یہ ہے کہ جمہور صحابہ کی مرویات کو قبول نہ کیا جائے۔ سوا ان روایات کے جن کے راوی حضرت علی کے ہمنوا صحابہ ہیں

شیعہ صرف ان احادیث کو تسلیم کرتے ہیں جو ان کے ائمہ یا ان کے اتباع و اشیاع سے منقول ہوں۔ اس لیے کہ وہ اپنے ائمہ کو معصوم قرار دیتے ہیں۔

شیعہ کے یہاں عام قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص حضرت علی سے موالات کا رشتہ نہ رکھتا ہو وہ وصیت رسول میں خیانت کا ارتکاب کرتا، اور ائمہ حق کے خلاف معرکہ آرا ہے۔ اس لیے وہ اعتماد کے قابل نہیں۔ مگر شیعہ کا زیدیہ نامی فرقہ اس ضمن میں جمہور شیعہ کے خلاف ہے۔ زیدیہ اگرچہ تفضیلِ علیؓ کا عقیدہ رکھتے ہیں مگر وہ شیخین کی خلافت کو درست قرار دیتے اور ان کی عظمت و فضیلت کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ شیعہ کا معتدل فرقہ ہے اور ان کی فقہ اہل سنت کی فقہ سے قریب تر ہے۔

جمہور کا نقطۂ نظر :

جمہور اہل اسلام صحابہ کو عدول سمجھتے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ ظہور فتنہ سے قبل کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہوں یا اس کے بعد والے عصر و عہد سے۔ نیز یہ کہ انھوں نے فتنہ میں کچھ عملی حصہ لیا ہو یا نہ لیا ہو۔ جمہور بالاتفاق عدول و ثقات صحابہ کی مرویات پر اعتماد کرتے ہیں البتہ اصحاب علیؓ سے روایت کردہ احادیث میں سے وہ صرف انہی احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں جو عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب و تلامذہ سے منقول ہوں۔ کیونکہ وہ ثقہ اور مامون عن الکذب ہیں اور روافض کی طرح حضرت علی کی فضیلت میں حدیثیں وضع کرنے کو جائز قرار نہیں دیتے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے بارے میں جو اختلافات رُونما ہوئے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو احادیث جمہور اہل اسلام نے جمع کی تھیں اور ائمہ و نُقّاد حدیث نے عصر صحابہ سے لے کر جمع و تدوینِ حدیث کے دَور تک ان کو جانچا پرکھا تھا شیعہ نے ان پر دھاوا بول دیا اور ان کو کذب و وضع سے متہم کیا۔ شیعہ نے ان احادیث کو خصوصی جرح و نقد کی آماجگاہ بنایا جو ان کے اعداء یعنی صحابہ کے فضائل و مناقب سے متعلق تھیں۔ انھوں نے اہل سنت کی مرویات میں سے صرف ان کو قبول کیا جو ان کے ائمہ معصومین سے روایت کردہ احادیث

سے ہم آہنگ تھیں۔

اس معرکہ آرائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو احادیث اہل سنت کے نزدیک حدیث صحیح کے بلند ترین مرتبہ پر فائز تھیں شیعہ نے ان کو موضوع قرار دے دیا۔ ہم اس کی مثال میں صحیح بخاری کی یہ روایت پیش کر سکتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ مسجد نبوی سے متصل ہر کھڑکی کو حضرت ابوبکر کی کھڑکی کے سوا بند کر دیا جائے۔ یہ حدیث عند الجمہور جملہ شروطِ صحت کی حامل ہے اور اس کے ضعیف یا مشکوک ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس حدیث کے بارے میں یہ صحیح علمی تنقید ہے۔ مگر شیعہ اپنے یہاں کی ایک مزعومہ صحیح حدیث کی حریف ہونے کی وجہ سے اس حدیث کو جھوٹی اور موضوع قرار دیتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ آنحضور صلعم نے حضرت علیؓ کی کھڑکی کھلی رہنے کا حکم صادر کیا تھا۔

ایک اور مثال لیجیے جو اس کے برعکس ہے اور وہ حدیث "غدیرِ خُم" ہے۔ یہ حدیث شیعہ کے تمام فرقوں کی اصل و اساس اور ایک عظیم ستون کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس پر شیعہ نے خلفاء ثلاثہ اور جمہور صحابہ کے خلاف حقد و عناد کے قصر رفیع کو استوار کیا ہے۔ حالانکہ اہل سنت کے نزدیک یہ ایک جھوٹی اور بے اصل روایت ہے جس کو غالی شیعہ نے سبِ صحابہ کا جواز پیدا کرنے کے لیے گھڑ لیا تھا۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ جمہور محدثین نے حدیث نبوی کی چھان پھٹک کے لیے جو اصول وضع کیے تھے وہ اس حدیث کی تکذیب کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک باانصاف شخص اپنے آپ کو اس ضمن میں جمہور کے نظریہ کی تائید و حمایت کے لیے مجبور پاتا ہے۔

عقل انسانی اس بات کو باور نہیں کرتی کہ جو وصیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بزعم شیعہ صحابہ کے ایک جم غفیر کے سامنے کی تھی جمہور صحابہ نے اسے چھپائے رکھا۔ اسی طرح عقلاً یہ بھی ممکن نہیں کہ سب صحابہ حضرت علیؓ کی تنقیصِ شان اور آنحضورؐ کے حکم کو چھپانے پر متفق ہو گئے تھے۔ حالانکہ صحابہ دینی احکام کی نشر و اشاعت اور ان کو بتمام و کمال دوسروں تک پہنچانے کے

اس حد تک حریص تھے کہ وہ اس ضمن میں کسی کے عقاب و عتاب کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ مہر کی ادائگی یا خطبہ جمعہ میں بیٹھنے جیسے چھوٹے مسائل کو بھی علانیہ بیان کر دیا کرتے تھے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ جو وصیت آپ نے جملہ صحابہ کو کی اور اپنا جانشین نامزد کیا تھا صحابہؓ نے اسے چھپائے رکھا۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ دانستہ حکم رسولؐ کی خلاف ورزی فسق و عصیان ہے اور اگر کوئی اسے جائز قرار دیتا ہو تو کفر ہے۔ بزعم شیعہ جب تمام صحابہ نے آپ پر جھوٹ باندھا اور حضرت علیؓ کے حق میں وصیت کو چھپایا تو تمام صحابہ کافر و فاسق ٹھہرے۔ پھر اس شریعت پر کیوں کر بھروسہ کیا جا سکتا ہے جو تمام تر انہی سے مروی و منقول ہے؟ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ بات کہاں تک موزوں ہے کہ آپ کے صحابہ ایسے جھوٹے اور فریب کار تھے کہ سب کے سب کتمانِ حق اور عداوتِ علی پر متفق ہو گئے؟

شیعہ نے جمہور اہل اسلام کی مرویات کے بارے میں جو موقف اختیار کیا خوارج کا طرزِ عمل بھی اس کے قریب قریب تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ خوارج نے شیعہ کی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خوارج بڑے صاف گو سادہ طبع متقی اور تقیہ کے مسلک سے دور تھے جس پر شیعہ ایمان رکھتے ہیں۔ مگر وہ بہت سے شرعی مسائل میں باقی امت سے اختلاف رکھتے تھے۔ چنانچہ ان سے بکثرت عجیب و غریب مسائل منقول ہیں۔ مثلاً وہ بیوی کی پھوپھی یا خالہ سے بہ یک وقت نکاح کرنے کو جائز قرار دیتے تھے۔ وہ رجم کے منکر تھے۔

خوارج کے ان عجیب و غریب مسائل کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ دینی احکام سے بے بہرہ تھے یا دین میں جسارت سے کام لیتے اور اللہ و رسول کی حرام کردہ اشیاء کو حلال قرار دیتے تھے جیسا کہ بعض مصنفین کا خیال ہے۔ بخلاف ازیں اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ وہ ان احادیث کو تسلیم نہیں کرتے تھے جو ظہور فتنہ کے بعد روایت کی گئیں یا جن کے راویوں نے فتنہ میں

عملی حصہ لیا۔ یہ ایک عظیم ابتلاء ہے کہ ہم ان جمہور صحابہ کو ساقط العدالت قرار دیں جو حضرت علیؓ و معاویہؓ کے باہمی تنازعات میں شریک ہوئے۔ یا ان کی احادیث کو رد کر دیں اور ان پر کفر و فسق کا الزام عائد کریں۔ خوارج کا یہ نقطۂ نظر فسادِ رائے اور سُوءِ نتیجہ کے اعتبار سے مسلکِ شیعہ سے کچھ کم خطرناک نہیں۔

جب قبولِ روایت کا مدار و انحصار صحابی کی صداقت و امانت پر ہے ——— اور صحابہ کے یہاں اس کی کمی نہ تھی ——— صحابہ کی تربیت ہی اس انداز پر ہوئی تھی کہ وہ طبعاً و دیانتہً دروغ گوئی سے نفور تھے۔ تو ان کے سیاسی آراء و افکار اور غلطیوں کا ان کی مرویات پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟ یہ تو بعینہٖ اس طرح ہے جیسے کسی شخص نے بے پناہ قومی و ملی خدمات انجام دیں اور اپنی جان و مال اور قلم سے استعماری طاقتوں کے سامنے سینہ سپر ہوا ہو۔ اور کوئی شخص صرف اس لیے اس کو قومی لیڈر شمار نہ کرے اور اس کے جملہ فضائل و مناقب پر پانی پھیر دے کہ اس سے ایک سیاسی غلطی صادر ہوئی۔ یا اس لیے کہ وہ کسی دوسرے لیڈر کے خلاف نبرد آزما ہوا، اور اس سے بغض و عداوت رکھنے لگا۔

جب تاریخی واقعات میں یہ بات درست نہیں اور یہ حق و انصاف سے بھی بعید ہے۔ تو بعینہٖ اسی طرح خوارج و شیعہ کا فیصلہ صحابہ کے بارے میں بھی درست نہیں۔ شیعہ یہ فیصلہ صحابہ کے بارے میں اس لیے صادر کرتے ہیں کہ انہوں نے بعض سیاسی مواقع پر حضرت علیؓ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ شیعہ اس جرم میں اصحابِ رسولؐ کو غیر ثقہ اور ساقط العدالت قرار دیتے ہیں۔ وہ صحابہ کو ایسے عیوب و نقائص سے ملوث کرنے کی سعی کرتے ہیں جو عام لوگوں میں بھی نہیں پائے جاتے۔ چہ جائیکہ وہ صحابہ ان سے آلودہ ہوں جنہوں نے دین اسلام اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جان نثاری و فداکاری کا حق ادا کر دیا۔ اگر صحابہ نہ ہوتے تو ہم ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھرتے اور صراطِ مستقیم پر گامزن نہ ہو سکتے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شیعہ و خوارج کے تعصب و عناد کی وجہ سے سنتِ صحیحہ کو بڑا نقصان

پہنچا۔ ان دونوں گروہوں نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو باغیانہ موقف اختیار کیا، اس نے فقہ اسلامی کے اختلافات پر بہت نمایاں اثر ڈالا۔ اسی بنیاد پر حدیث نبویؐ کو شکوک و شبہات کی آماجگاہ ٹھہرایا گیا۔ آگے چل کر جہاں ہم مستشرقین کے شبہات کا ذکر کریں گے اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

فصلِ دوم

قدیم منکرینِ حدیث

ہنوز دوسری صدی ہجری ختم نہ ہونے پائی تھی کہ حدیثِ نبوی منکرین کے زغہ میں گھر گئی۔ منکرین سنت مندرجہ ذیل گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔

(۱) وہ لوگ جو حدیث نبوی کو اسلامی قانون کے مصادر میں سے ایک مصدر کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتے تھے۔

(۲) بعض لوگ غیر متواتر احادیث کو جو بطریق آحاد مروی ہوں۔ حجت نہیں تصور کرتے تھے۔

(۳) جس حدیث میں کوئی ایسا مستقل حکم بیان کیا گیا ہو جو نہ تو قرآن کی تفسیر پر مشتمل ہو اور نہ اس کا مؤکد ہو۔ بعض لوگ اس کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

ہمارے علم کی حد تک ان مذاہب کا ذکر سب سے پہلے امام شافعی رحمہ اللہ نے کیا۔ امام موصوف نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "کتاب الام" جلد ۷ میں اپنے ایک مناظرہ کا ذکر کیا ہے۔ جو ایک منکر حدیث کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اسی طرح آپ نے اپنی کتاب "الرسالۃ" میں اخبارِ آحاد کی حجیت کے اثبات میں ایک طویل فصل منعقد کی ہے۔ کتاب الام کے مندرجات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

امام شافعی اور ایک منکر حدیث کا مناظرہ:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :-

"مجھے ایک شخص نے جسے اپنے اصحاب کے مذہب کا عالم سمجھا جاتا تھا کہا کہ "آپ عربی الاصل ہیں قرآن آپ کی زبان میں نازل ہوا۔ آپ اس کے حافظ بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ

نے قرآن کریم میں ایسے فرائض نازل کیے ہیں کہ اگر ان کے کسی حرف میں بھی کسی کو شک پڑ جائے تو آپ اس سے توبہ کا مطالبہ کریں گے۔ اگر وہ تائب نہ ہوگا تو آپ اس جرم میں اُسے قتل کر ڈالیں گے۔ جب قرآن بزعم خود "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" ہے تو آپ کے لیے یہ بات کہنا کیوں کر درست ہے کہ بعض فرض عام ہوتے ہیں اور بعض خاص۔ بعض احکام کی تعمیل ضروری ہوتی ہے جب کہ بعض مباح ہوتے ہیں قرآنی احکام کے مابین فرق و امتیاز کے سلسلہ میں آپ ایک یا دو یا تین احادیث پیش کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ اور آپ کے ہمنوا جس راوی کو صدق اور ثقہ مانتے ہیں اس کو بھی معاف نہیں کرتے۔ بلکہ یوں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں حدیث میں غلطی کھائی۔ وہ بھول گیا اس سے خطا سرزد ہوئی۔ ان سے آگے روایت کرنے والوں کا بھی یہی حال ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن احادیث کو آپ نے حلال و حرام کا مبنیٰ قرار دیا ہے جب کوئی شخص ان کو روایت کرتا ہے اور وہ روایت آپ کے یہاں ثابت نہیں تو آپ اسے کہتے ہیں "تم نے جھوٹ بولا۔ نبی کریمؐ نے ایسا فرمایا ہی نہیں"۔ آپ نہ اس سے توبہ کا مطالبہ کرتے ہیں نہ کوئی اور سزا دیتے ہیں۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ "آپ نے بُری بات کہی"۔ جس حدیث کی یہ حالت ہو اس کے بل بوتے پر قرآنی احکام میں تقسیم و تفریق کیوں کر روا ہے؟ حالانکہ جملہ احکام قرآن مساوی ہیں۔ تم احادیث کو کتاب اللہ کی ہم پلہ قرار دیتے ہو اور تمہارے یہاں شرعی احکام کا مدار و انحصار انہی احادیث پر ہے۔"

امام شافعی:۔

میں نے کہا ہم انہی احادیث کو معمول بہا قرار دیتے ہیں جو یقینی طریق سے ہمیں معلوم ہیں اور جن کی صداقت شک و شبہ سے پاک ہے۔ ہم قیاس پر بھی عمل کرتے ہیں ساس کے اسباب مختلف ہوتے ہیں، بعض قوی اور بعض ضعیف۔ مثلاً جو شخص قرض وغیرہ کا اقرار کر لیتا ہے یا مدعی

شہادت پیش کرتا ہے۔ یا مدعی علیہ حلف اٹھانے سے منکر ہوتا ہے اور مدعی حلف اٹھالیتا ہے۔ تو ہم صاحب حق کو اس کا حق دلوا دیتے ہیں۔ اقرار شہادت سے قوی تر ہوتا ہے اور شہادت مدعی اور مدعی علیہ دونوں کی قسم کی نسبت اولیٰ و افضل ہے۔ اگرچہ ہم فیصلہ ایک ہی قسم کا صادر کرتے ہیں مگر اس کے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔

امام شافعی :- امام شافعی نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں یہ آیت پیش کی :-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	اللہ کی وہ ذات ہے جس نے ناخواندہ لوگوں
رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ	میں اپنا رسول بھیجا جو ان کو خدا کی آیات پڑھ کر
آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	سناتا ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب و حکمت
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (سورۃ الجمعہ)	کی تعلیم دیتا ہے۔

منکر حدیث :- اس آیت میں کتاب سے قرآن مراد ہے پھر حکمت کس چیز کا نام ہے ؟

امام شافعی :- حکمت سے حدیث رسولؐ مراد ہے۔

منکر حدیث :- کیا یہ درست نہیں کہ کتاب سے قرآن کریم بحیثیت عموم مقصود ہو اور حکمت سے اس میں بیان کردہ احکام مراد لیے جائیں ؟

امام شافعی :- یہ درست ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن کریم میں احکام مجملاً بیان کیے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نوعیت و کیفیت واضح فرما دی۔

منکر حدیث :- یہ درست ہے۔

امام شافعی :- تو مقصد یہ ہے کہ قرآن و حدیث ایک ہی چیز ہیں اور قرآن کا مطلب و معنی حدیث رسولؐ کے بغیر معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

منکر حدیث :- مگر اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ حدیث نبوی قرآن ہی کو دہرا رہی ہے۔ اس طرح تکرار کلام کا نقص پیدا ہو جاتا ہے۔

امام شافعی :- پھر آپ ہی بتائیے کہ جب کتاب اور حکمت دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے تو آیا

یہ دو چیزیں ٹھہریں گی یا ایک؟

منکرِ حدیث :۔ ممکن ہے کہ آپ کے حسب ارشاد "کتاب وسنت" دو جُداگانہ چیزیں مراد ہوں۔ اور اس بات کا بھی امکان ہے کہ دونوں مل کر ایک ہوں۔

امام شافعی :۔ میرے خیال میں پہلی بات صحیح تر ہے اور کتاب و حکمت دو الگ الگ چیزیں ہیں (یعنی قرآن و حدیث) اور یہ بات قرآن سے بھی مؤید ہے۔ مگر آپ اس کو تسلیم نہیں کرتے۔

منکرِ حدیث :۔ قرآن میں یہ کہاں مذکور ہے کہ کتاب اور ہے اور حکمت چیزے دیگر؟

امام شافعی :۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے :۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ	اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیات اور حکمت
مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ	تلاوت کی جاتی ہے اُسے یاد کیجیے بیشک اللہ
اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝	تعالیٰ بڑا مہربان اور خبر رکھنے والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج مطہرات کے گھروں میں دو چیزوں کی تلاوت کی جاتی ہے

(۱) قرآن کریم۔ (۲) حکمت۔

منکرِ حدیث :۔ قرآن کی تلاوت تو ہوئی مگر حکمت کی تلاوت کے کیا معنی؟

امام شافعی :۔ تلاوت کے معنی نطق کے ہیں۔ لہٰذا اس سے کتاب و سنت کا نطق مراد ہے۔

منکرِ حدیث :۔ اس آیت سے تو کھل کر یہ بات سامنے آگئی کہ قرآن اور چیز ہے اور حکمت چیزے دیگر۔

امام شافعی :۔ اللہ تعالیٰ نے اتباعِ رسول کو ہم پر فرض قرار دیا ہے۔

منکرِ حدیث :۔ قرآن میں یہ حکم کس جگہ دیا گیا ہے؟

امام شافعی :۔ قرآن کریم میں فرمایا :۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى	تیرے رب کی قسم لوگ اس وقت تک مومن نہیں
يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ	ہوں گے جب تک آپ کو اپنے تنازعات میں

ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔	حکم نہ بنائیں پھر جو فیصلہ آپ صادر کردیں اس کے بارے میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور سر تسلیم خم کردیں۔

نیز فرمایا :-

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ۔	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا :-

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔	جو لوگ رسول کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیے کہ وہ کہیں آزمائش میں مبتلا نہ ہو جائیں یا دردناک عذاب میں گرفتار ہوں۔

نیز فرمایا :-

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔	جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے روکے اس سے رک جاؤ۔

منکر حدیث :- قرآن کریم سے مستفاد ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام و نواہی کی تعمیل ضروری ہے۔

امام شافعی :- جی ہاں! رسول کی اطاعت ہمارے لیے ہم سے پہلے لوگوں اور بعد میں آنے والوں کے لیے از بس ناگزیر ہے۔

منکر حدیث :- یہ درست ہے۔

امام شافعی :- کیا اطاعتِ رسول کے بغیر احکامِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کا کوئی امکان ہے؟ پھر آپ نے تفصیلاً بتایا کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے کو منسوخ کر سکتا ہے۔ مگر منسوخاتِ قرآن کا پتہ صرف حدیث رسول ہی سے چلتا ہے۔

منکرِ حدیث :- آپ نے اپنے دعویٰ کو بدلائل ثابت کر دیا ہے کہ اہل اسلام پر حدیث رسول کو تسلیم کرنا فرض ہے۔ میں نے آپ کے موقف کو تسلیم کر لیا ہے۔ میں انکار حدیث کے نظریہ کو ترک کر کے حق و صداقت کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ آپ ذرا اس امر پر روشنی ڈالیے کہ قرآن میں خاص احکام کون سے ہوتے ہیں اور عام کون سے؟

امام شافعی :- دراصل بات یہ ہے کہ عربی زبان نہایت وسیع ہے۔ بسا اوقات ایک عام لفظ بول کر اس سے خاص مفہوم مراد لیا جاتا ہے۔ مگر کسی عام لفظ سے خاص مفہوم اسی وقت مراد لیا جاتا ہے جب کتاب و سنت کی کوئی دلیل موجود ہو۔ پھر آپ نے قرآن کریم کی چند آیات پیش کیں جن کے الفاظ عام ہیں اور حدیث سے ان کی تخصیص کی گئی ہے۔ حسب ذیل امثلہ ملاحظہ ہوں:-

۱ - قرآن کریم میں نماز کا حکم سب اہل اسلام کو بلا استثناء شخصے دیا گیا ہے۔ مگر حدیث نبوی سے ذوات الحیض کو مستثنیٰ قرار دیا۔

۲ - قرآن کریم میں زکوٰۃ کا حکم جو دیا گیا ہے وہ عام ہے۔ مگر حدیث نبوی نے بعض اموال کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔

۳ - والدین کے لیے وصیت کا جو حکم دیا گیا تھا وراثت کے احکام سے اسے منسوخ قرار دیا۔

۴ - ترکہ میں آباء و اُمہات اور اولاد کے حصص مقرر کیے مگر حدیث نبوی کی رُو سے کافر (باپ یا بیٹا) مسلم کا وارث قرار نہیں پا سکتا۔ اسی طرح غلام اپنے آقا اور قاتل مقتول کا ورثہ حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ احکام حدیث سے ثابت ہیں۔

منکرِ حدیث :- بے شک یہ احکام حدیث نبوی ہی سے ماخوذ ہیں۔ میں ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کرتا رہا۔ اب مجھ پر حق واضح ہوا ہے۔ اس ضمن میں لوگوں نے دو مسلک اختیار کیے ہیں۔ ایک فریق احادیث کو تسلیم نہیں کرتا اور بزعم خویش اس بات کا قائل ہے کہ قرآن میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے۔

امام شافعی :- پھر اس کا نتیجہ کیا ہوا ؟

منکر حدیث :- اس سے بڑے دُور رس نتائج برآمد ہوئے - ایک فریق یہ کہنے لگا کہ جو شخص نماز کی قسم کا کوئی ایسا کام انجام دے جس پر نماز کے لفظ کا اطلاق کیا جا سکے تو اس نے نماز ادا کرلی - اس میں وقت کی پابندی نہیں - زکوٰۃ کا بھی یہی معاملہ ہے - اگر کوئی شخص ہر روز دو رکعتیں پڑھے یا کئی دنوں میں تو اُس نے نماز کا فریضہ ادا کر دیا - جو چیز کتاب اللہ میں مذکور نہ ہو وہ فرض نہیں ہو سکتی - دوسرے فریق نے کہا قرآن میں جو حکم وارد ہو گا اس کو قبول کیا جائے گا - یہ فریق ناسخ و منسوخ اور خاص و عام کو تسلیم نہیں کرتا اس لیے خطا کار ہے یہ دونوں نظریات مبنی بر ضلالت ہیں - میں ان میں سے کسی کا بھی قائل نہیں - مگر اس امر کی کیا دلیل ہے کہ ایک حرام چیز کو ظنی دلیل سے مباح ٹھہرایا جا سکے ؟

امام شافعی :- جی ہاں ! اس کی دلیل موجود ہے -

منکر حدیث :- ذرا اس پر روشنی ڈالیے -

امام شافعی :- آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، جو میرے پاس بیٹھا ہے ؟ کیا اس کا خون و مال حرام ہے ؟

منکر حدیث :- یہ صحیح ہے کہ اس کا خون اور مال حرام ہے -

امام شافعی :- اگر دو آدمی اس امر کی شہادت دیں کہ اس شخص نے ایک آدمی کو قتل کر کے اس کے مال پر قبضہ کر لیا اور وہ مال اس کے پاس موجود ہے تو پھر آپ کی رائے اس کے بارے میں کیا ہو گی

منکر حدیث :- میں قصاص میں اسے قتل کر دوں گا اور جو مال اس کے پاس موجود ہے، وہ مقتول کے ورثاء کو دے دوں گا -

امام شافعی :- کیا شاہد جھوٹی شہادت بھی دے سکتے ہیں ؟

منکر حدیث :- جی ہاں !

امام شافعی :- پھر آپ نے ایک ظنی دلیل (شہادت) کی بنا پر خون اور مال کو جن کی حرمت یقینی ہے

کیسے مباح قرار دیا؟

منکرِ حدیث :- شہادت کا قبول کرنا ضروری ہے۔

امام شافعی :- کیا خدا کی کتاب میں کوئی ایسی نص موجود ہے کہ قتل سے متعلق شہادت کو قبول کیا جائے؟

منکرِ حدیث :- واضح آیت تو کوئی نہیں البتہ بعض آیات سے اس پر استدلال کر سکتے ہیں۔

امام شافعی :- جب آپ گواہ کی گواہی کو بالضرور قبول کرتے ہیں حالانکہ وہ صرف بظاہر سچا ہوتا ہے اور اس کے باطن کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ تو ہم راوی میں شاہد سے بھی زیادہ صفات تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم ایسے لوگوں کی شہادت بھی قبول کرتے ہیں جن کی روایت ہمارے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہم متعلقہ راوی کے بارے میں دیگر حفاظ ورواۃ سے پوچھ کر بھی صداقت وامانت وبرعکس کا حال معلوم کر سکتے ہیں اور کتاب وسنت کی مدد سے بھی۔ حالانکہ شہادت میں اس امر کا امکان نہیں ہے۔

اختتام مناظرہ پر منکرِ حدیث نے علانیہ اعتراف کیا کہ حدیث رسول کو قبول کرنا احکام خداوندی کی قبولیت کے مترادف ہے۔ مذکورہ صدر مناظرہ پر حسب ذیل نقد وتبصرہ ازبس ناگزیر ہے۔

(۱) - امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ راز منکشف نہیں کیا کہ مسلمانوں کا کون سا فرقہ جملہ احادیث نبویہ کا منکر تھا؟ نیز یہ کہ مناظرہ میں آپ کا حریف کون شخص تھا؟ شیخ خضری رحمہ اللہ اپنی کتاب "تاریخ التشریع الاسلامی" میں لکھتے ہیں :-

"امام شافعیؒ نے یہ نہیں فرمایا کہ مسلمانوں کا کون سا فرقہ منکرِ حدیث تھا۔ تاریخ سے بھی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ امام شافعیؒ نے جو مناظرہ احادیث مخصوصہ کے منکرین سے کیا تھا اس میں بتایا تھا کہ جملہ احادیث کے انکار کا نظریہ اہل بصرہ کی ایجاد ہے بصرہ ان دنوں معتزلہ کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ اسی سے معتزلہ کے فرق ومذاہب پھوٹے ان کے اہل علم وقلم وہیں پلے بڑھے۔ یہ اہل الحدیث کے جانی دشمن تھے۔ کچھ بعید

نہیں کہ جناب امام کا حریف ان کا ہی ایک فردِ ہو۔ محدث ابن قتیبہ کی "تاویل مختلف الحدیث" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ابن قتیبہ نے کتاب مذکور کے صفحہ ۲۷۶ پر حدیث نبوی کے بارے میں شیوخ معتزلہ کا موقف بیان کیا اور بتایا ہے کہ وہ کس طرح کبار صحابہ پر زبان طنز و طعن دراز کرتے تھے۔ شیخ خضری آخر اس نتیجہ تک پہنچے کہ اہل الحدیث پر نکتہ زنی اور مسلسل یورشوں کا آغاز متکلمین نے عصر شافعی میں یا اس سے تھوڑا عرصہ پہلے کیا۔ بصرہ متکلمین کا ملجا و مامن تھا۔ اس لیے پختہ بات یہی ہے کہ امام شافعی کا مدمقابل معتزلی ہوگا" (تاریخ التشریع الاسلامی ص ۱۹۷)

شیخ خضری کی بات قرائن سے درست معلوم دیتی ہے۔

(۲) اس امر میں ذرہ بھر شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو لوگ حدیث نبوی کی حجیت سے انکار کرتے تھے وہ اس کے طریق وصول پر معترض تھے۔ اور رُواۃ حدیث کو خطاء و وہم کا مرتکب قرار دیتے تھے اس کا دوسرا سبب وہ کذاب و وضاع لوگ تھے جنہوں نے محدثین کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ اسی کے زیر اثر کچھ لوگ کہنے لگے کہ صرف قرآن پر بھروسہ کیا جائے اور احادیث کو قابل اعتناء خیال نہ کیا جائے۔ یہ معنی نہیں کہ وہ لوگ احادیث کو رسول کے اقوال و افعال تصور کرنے کے باوصف ان کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے ایسا تو کوئی مسلم نہیں کر سکتا۔ کسی ایک مسلم فرقے سے بھی یہ بات منقول نہیں کہ حکم رسول کا اتباع واجب نہیں اور آپ کے اقوال و افعال مصدرِ قانون کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ یہ احکام قرآنی اور جمیع صحابہ و اہل اسلام کے اجماع کی صریح خلاف ورزی ہے۔ البتہ غالی رافضیوں کے ایک فرقہ کی جانب یہ قول منسوب ہے۔ اس فرقہ کے لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے منکر ہیں۔ اس سے ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ ہم اسلامی فرقوں کی بات کر رہے ہیں مرتدین و ملاحدہ کی نہیں۔ چنانچہ ہم اس کی تائید میں علماء کے اقوال پیش کرتے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں۔

"میں نے کسی ایسے شخص کے بارے میں نہیں سنا جو علم و فضل کا مدعی ہو یا لوگ اس کو عالم تصور کرتے ہوں کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واجب الاتباع ہونے سے انکار کرتا ہو اور اس بات کا قائل نہ ہو کہ کتاب الٰہی اور سنتِ رسول ہر حال میں واجب الاطاعت ہے۔ ان دونوں کے سوا جو کچھ بھی ہے ان کے زیر اثر اور تابع ہے البتہ صرف ایک فرقہ ایسا ہے۔ میں اس کی تفصیلات آگے چل کر بیان کروں گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ وہ حدیث کو ظنی الثبوت سمجھتے ہیں۔ جب کہ قرآن کریم قطعی الثبوت ہے اور اس کی نسبت پہلے نبی کریمؐ کی طرف اور پھر اللہ تعالیٰ کی جانب کسی شک و شبہ سے بالا ہے۔"

(کتاب الام جلد ۷۔ ص ۲۵۰)

امام ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

"ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کریم دینی احکام کی اصل و اساس ہے۔ شرعی اوامر کے اثبات میں اس کی جانب رجوع کیا جاتا ہے۔ قرآن میں اطاعت رسول کو واجب قرار دیا گیا ہے" قرآن میں فرمایا:۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔ (النجم ۳،۴)

(وہ ہمارا رسول) اپنی مرضی سے نہیں بولتا وہ تو صرف وحی ہے جو کی جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) وَحیِ مَتلُوّ:۔ یہ وحی ایک معجزانہ ترتیب سے مرتب کی گئی ہے اور یہ قرآن کریم ہے۔

(۲) وَحیِ غیر مَتلُوّ:۔ وحی کی یہ دوسری قسم مروی و منقول تو ہے مگر نہ معجزانہ نظام و ترتیب کی حامل ہے۔ اور نہ اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ البتہ یہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ حدیث نبوی ہے جو قرآنی احکام کی تبیین و تفسیر کرتی ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:۔

لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ　　تاکہ آپ لوگوں پر اس چیز کو واضح کردیں جو ان کی
(النحل۔۴۴)　　طرف اتاری گئی تھی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں وحی بہر دو صنف کی اطاعت کو بلافرق و امتیاز واجب قرار دیا ہے ———— ارشاد فرمایا:۔

اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ　　اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول
(المائدہ۔۹۲)　　کی۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کی جامع آیت میں جن اصولِ ثلاثہ کی اطاعت کو ضروری قرار دیا گیا ہے ان میں سے ایک حدیث بھی ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) "اَطِیۡعُوا اللّٰهَ" سے قرآن کریم مراد ہے۔

(۲) "اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ" یہ احادیث نبوی کی اطاعت پر مشتمل ہے۔

(۳) "اُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ" اس سے اجماع مراد ہے۔ (النساء۔ ۵۹)

(الاحکام لابن حزم۔ ج ۱۔ ص ۹۶)

امام ابن حزم مزید فرماتے ہیں:۔

"جو شخص خدا کی وحدانیت کا قائل ہے اس کے لیے اس امر کی گنجائش نہیں کہ وہ جدال و نزاع کے وقت کتاب و سنت کے سوا کسی اور چیز کی جانب رجوع کرے اور ان کے مندرجات سے سرتابی کرے۔ اگر قیام حجت کے بعد بھی وہ اس جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ فاسق ہے اور اگر کتاب و سنت کے سوا کسی اور چیز کی اطاعت کو مباح سمجھ کر ایسا کرتا ہے تو بلاشک و ریب وہ کافر ہے۔"

محدث مذکور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"اگر کوئی شخص یہ کہے کہ "میں تو اسی چیز پر عمل کروں گا جو قرآن میں مذکور ہو" تو یہ شخص باجماعِ امت کافر ٹھہرے گا۔ بزعم خویش اگر یہ شخص زوال آفتاب سے تا ظلمت شب

صرف ایک رکعت ادا کرے اور دوسری رکعت طلوعِ فجر کے وقت پڑھ لے تو کافی ہے اس لیے کہ یہ کم از کم چیز ہے جس پر نماز کا اطلاق کیا جا سکتا اور زیادہ سے زیادہ کے لیے تو کوئی حد ہی مقرر نہیں۔ اس قول کا قائل کافر مشرک مباح الدم والمال ہے۔ اس کی قائل غالی روافض کی ایک جماعت ہے جس کے کفر پر پوری امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے" (الاحکام۔ ج ۲۔ ص ۸۰)

امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں:۔

"غالی شیعہ کا ایک گروہ صرف قرآن کے ساتھ اخذ و احتجاج کرتا اور حدیث نبوی کو حجت قرار نہیں دیتا۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ دراصل حضرت علیؓ نبی و رسول تھے۔ جبریل غلطی سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوتے رہے"

(مفتاح الجنۃ للسیوطی، ص ۳)

(۳) ۔ بقول امام شافعی جو لوگ تمام احادیث کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں ہر بات کی تفصیل موجود ہے۔ اگر حدیث سے ایسے جدید احکام کا اثبات کیا جائے جو قرآن میں مذکور نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ احادیث جو ظنی الثبوت ہیں قطعی الثبوت یعنی قرآن کی معارض و متقابل ہوں حالانکہ دلیلِ ظنی قطعی کی حریف نہیں ہو سکتی۔ اور اگر حدیث کسی قرآنی حکم کی مؤید و مؤکد ہو تو اندریں صورت اتباع قرآن کا ہوگا حدیث کا نہیں۔ اور اگر حدیث مجملاتِ قرآن کی تفصیل پیش کرے تو یہ ایک ایسے قطعی حکم کی ——— جو کہ قطعی الثبوت ہے اور جس کے ایک حرف کا انکار بھی کفر ہے ——— توضیح و تفسیر ایک ظنی دلیل سے ہو گی جس کے ثبوت کے منکر کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں۔

بسا اوقات یہ بات لوحِ ذہن پر ابھرتی ہے کہ منکرین قطعی الثبوت ہونے کی وجہ سے احادیثِ متواترہ کو تسلیم کرتے ہوں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ امام شافعی کا یہ قول کہاں تک درست ہے کہ منکرین جملہ احادیث کو رد کر دیتے ہیں۔ مگر غور کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ وہ اخبار متواترہ

کو بھی قطعی نہیں بلکہ ظنی تصور کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اخبار آحاد اور احادیث متواترہ دونوں کی نقل و روایت کا انداز و اسلوب یکساں ہے۔ جب اخبارِ آحاد ظنی ہیں تو احادیث متواترہ کیوں کر قطعی ہوسکتی ہیں؟ اخبارِ متواترہ کے راوی اگرچہ کثیر العدد ہوتے ہیں مگر اس کے باوصف کذب کا احتمال ان میں موجود ہوتا ہے۔ جب علامہ خضری کی بیان کردہ یہ بات درست ہے کہ انکارِ حدیث کے قائلین معتزلہ تھے اور نظام معتزلی کا یہ قول بھی ٹھیک ہے کہ احادیث متواترہ سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا۔ تو ہمارا یہ قول ——— جس کا اعتراف سابق الذکر منکرِ حدیث نے بھی کیا ہے ——— صحیح ہوگا کہ منکر حدیث کو اس امر کا اعتراف کرنا چاہیے کہ جو شخص ایک رکعت زوال اور غروب آفتاب کے درمیان اور ایک طلوع فجر کے بعد پڑھ لے تو اس کی نماز ادا ہوگئی۔ کیونکہ ایک رکعت پر نماز کے لفظ کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ گویا نماز کے دوران رکعات کی پابندی ان کے لیے ضروری نہیں۔ حالانکہ عددِ رکعات پر اُمت کا اجماع منعقد ہوچکا ہے۔

(۴) امام شافعی کے جواب کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(الف) اللہ تعالیٰ نے اطاعتِ رسول کو ہمارے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ یہ حکم ان لوگوں کے لیے بھی کافی ہے جو عہد رسالت میں تھے اور ان کے لیے بھی جو تا قیام قیامت پیدا ہوں گے۔ جس شخص نے رسول کریمؐ کو بچشم خود نہیں دیکھا اس کے لیے اطاعتِ رسول کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ آپ کی احادیث کو معمول بہا ٹھہرائے۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا ہمیں حدیثوں کی پیروی کا حکم دیا۔ اس لیے کہ جس چیز کے بغیر کسی واجب کی پیروی ممکن نہ ہو وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے۔ نظر بریں جب احادیث کے بغیر اطاعتِ رسول کا کوئی امکان نہیں تو احادیث کا اتباع لازم ٹھہرے گا۔

(ب) احکام قرآن معلوم کرنے کے لیے احادیث سے چارہ نہیں۔ اس لیے کہ ناسخ و منسوخ کا علم حدیث کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

(ج) کچھ احکام ایسے بھی ہیں جن کو منکرین حدیث تک مانتے ہیں۔ وہ صرف حدیث سے ثابت ہیں۔ قرآن میں ان کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔

(د) قرآن کے بعد قطعی احکام کی ظنی الثبوت احادیث سے تخصیص کی گئی ہے۔ مثلاً دو آدمی کسی کے خلاف شہادت دیں کہ اُس نے کسی کو قتل کیا اور اس کے مال پر قبضہ کر لیا ہے اندریں صورت خون اور مال کی حرمت ایک قطعی چیز ہے۔ اس ضمن میں جو دو آدمیوں کی شہادت قبول کی گئی ہے وہ بلا نزاع ظنی ہے

(س) بے شک احادیث میں خطا، کذب اور وہم کا احتمال پایا جاتا ہے۔ لیکن جب راوی کی ثقاہت و عدالت ثابت ہو جائے۔ اور اس کے اقران و امثال اس کی روایت کی تصدیق کریں تو ایسی روایت میں کذب و وہم کا اس قدر احتمال باقی نہیں رہتا۔ جتنا شہادت میں پایا جاتا ہے۔ خصوصاً جب کتاب و سنت سے اس روایت کی تصدیق ہو رہی ہو تو کذب کا احتمال معدوم ہو جائے گا۔

(۵) امام شافعی نے منکر حدیث کے اس اعتراض کا جواب نہیں دیا کہ قرآن "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" ہے۔

ہم آگے چل کر تیسرے باب میں اس استدلال کا شافی و کافی جواب دیں گے۔

فَصْل سوم

جدید منکرین حدیث

جدید منکرین حدیث کے دلائل:

دورِ حاضر میں فنِ حدیث سے نابلد بعض لوگوں نے حدیث نبوی کے دین میں حجت ہونے سے انکار کردیا ہے چنانچہ علامہ سید رشید رضا مرحوم کے مشہور ماہنامہ "المنار" سالِ نہم کے عدد ۷ و ۱۲ میں ڈاکٹر توفیق صدقی کے دو مقالے شائع کیے گئے ہیں۔ ہر دو مقالات میں علانیہ حدیث نبوی کے حجت ہونے سے انکار کیا گیا ہے۔ مقالات کا عنوان ہے "اسلام صرف قرآن کا نام ہے" حدیث کے بارے میں بیان کردہ شبہات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

پہلی دلیل:

قرآن کریم میں فرمایا:-

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام-۳۸) — ہم نے کتاب میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

نیز فرمایا:-

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ۔ (النحل ۸۹) — اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ہر چیز کو تفصیلاً بیان کرتی ہے۔

یہ آیات اس امر کی آئینہ داری کرتی ہیں کہ کتاب خداوندی جملہ امور و احکام کی جامع ہے۔ اس میں اس قدر تفصیل و توضیح کی گئی ہے کہ اس کی موجودگی میں حدیث و سنت یا اور کسی چیز کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اگر حدیث کی ضرورت سمجھی جائے تو کتاب کو ناقص ماننا پڑے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا کی بتائی ہوئی خبر (کتاب کا جامع الاشیاء ہونا) غلط ثابت ہوگی۔

دوسری دلیل:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (الحجر-۹)

بے شک ہم نے ہی قرآن کو اُتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی ہے حدیث کی نہیں۔ اگر حدیث نبوی بھی دین میں حجت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کی بھی ذمہ داری قبول کرتے۔

تیسری دلیل:

اگر حدیث دین میں حجت ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی کتابت کا حکم صادر فرماتے نیز صحابہ وتابعین آپ کی وفات کے بعد اس کی جمع وتدوین میں لگ جاتے۔ تاکہ حدیث نبوی خطاء ونسیان سے محفوظ رہے اور بازیچۂ طفلاں نہ بن جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو حدیثِ رسول قطعی وحتمی صورت میں اہل اسلام تک پہنچ جاتی۔ اس لیے کہ ظنیّ الثبوت دلیل سے اخذ واحتجاج صحیح نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ۔ (الاسراء-۳۶)

جس بات کا تجھے یقینی علم نہیں وہ بیان نہ کر

نیز فرمایا:-

إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ۔ (الانعام-۱۴۸)

تم تو صرف ظنّ کی پیروی کرتے ہو۔

حدیث اسی صورت میں قطعی الثبوت ہو سکتی تھی جب قرآن کی طرح اسے ضبطِ تحریر میں لایا جاتا۔

بخلاف ازیں یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے روک دیا تھا اور جو حدیثیں لکھی جا چکی تھیں انہیں مٹانے کا حکم صادر فرمایا۔ صحابہ و تابعین بھی اسی ڈگر پر گامزن رہے۔

امام حاکم حضرت عائشہ رض سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبر رض نے پانچ صد احادیث تحریر کر کے نذر آتش کر دی تھیں۔ جناب صدیق رض نے فرمایا:۔

"مجھے یہ خطرہ دامنگیر ہے کہ میں مر جاؤں اور ان احادیث میں سے بعض ایسے شخص سے مروی ہوں جسے میں نے امین و ثقہ خیال کیا ہو اور درحقیقت وہ ایسا نہ ہو۔ اندریں صورت اس جرم کا مرتکب میں خود ہوا۔"

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے یہاں آئے تو آپ نے جناب زید رض سے ایک حدیث کے بارے میں دریافت کیا جو انہوں نے تبلادی۔ حضرت معاویہ رض نے ایک شخص کو اس حدیث کے لکھنے کا حکم دیا۔ یہ سن کر حضرت زید رض نے کہا "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثیں لکھنے سے منع فرمایا تھا" یہ سن کر انہوں نے وہ حدیث مٹا دی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حدیثیں لکھنے کی ٹھانی۔ پھر اس ارادہ سے باز رہے اور فرمایا:۔

"میں نے حدیثیں لکھنے کا ارادہ کیا تھا پھر مجھے تم سے پہلی قومیں یاد آگئیں۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے کچھ کتابیں مرتب کیں اور پھر ان پر اس طرح پل پڑے کہ خدا کی کتاب کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا دیا۔ بخدا میں خدا کی کتاب کو ہرگز کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط نہیں ہونے دوں گا۔"

اسی طرح جناب علی رضی اللہ عنہ نے حدیثیں لکھنے والوں سے فرمائش کی تھی کہ ان کو محو کر دیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رض سے سن کر جو حدیثیں ایک صحیفہ میں جمع کی گئیں تھیں وہ آپ نے مٹا دی تھیں۔

مندرجہ ذیل تابعین کتابتِ حدیث کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کے اقوال علمی کتب میں جابجا

بکھرے پڑے ہیں:۔

علقمہؒ۔ عبیدہؒ۔ قاسمؒ بن محمد۔ شعبیؒ۔ نخعیؒ۔ منصورؒ۔ مغیرہؒ۔ اعمشؒ۔

بعض تابعین حدیثیں روایت کرنے سے روکتے یا قلتِ تحدیث کا حکم صادر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تدوین حدیث پچھلے ادوار میں ہوئی جب کہ اس میں عام طور سے خطاؤ نسیان کی آمیزش ہو چکی تھی۔ نظر بریں حدیث نبوی شکوک و شبہات کی آماجگاہ بن گئی اور اس قابل نہ رہی کہ اس سے شرعی احکام اخذ کیے جائیں۔

چوتھی دلیل:

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے اقوال و آثار منقول ہیں جن سے مستفاد ہوتا ہے کہ حدیث نبوی دین میں حجت نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"حدیثیں مجھ سے بہت پھیلیں گی۔ جو قرآن کے موافق ہو وہ میری حدیث ہے اور جو قرآن کے مخالف ہو وہ میری حدیث نہیں۔"

نظر بریں جس حدیث سے کسی نئے حکم کا اثبات ہوتا ہے اور وہ قرآن میں مذکور نہ ہو تو وہ قرآن کے موافق نہیں۔ اور اگر حدیث کسی جدید حکم کی مثبت نہ ہو تو وہ قرآن کی مؤید و موکد ہے۔ حجت صرف قرآن ہی ہے دوسری کوئی چیز حجت نہیں ہے۔

آپ نے فرمایا:۔

"جب تمہیں کوئی حدیث سنائی جائے جو تمہاری جانی پہچانی ہو تو اس کی تصدیق کیجیے اور جب تمہیں کوئی ایسی حدیث سنائی جائے جسے تم پہچانتے نہ ہو تو اس کی تصدیق مت کیجیے۔ اس لیے کہ میں وہی بات کہتا ہوں جو تمہاری جانی پہچانی ہو اور انوکھی یا نرالی نہ ہو۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو اس کو اہل اسلام کے یہاں معروف احکامِ قرآن کے معیار پر رکھ کر جانچ لینا چاہیے۔ بنا بریں حدیث

دین میں حجت نہیں ہو سکتی۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا:۔

"میں اس چیز کو حلال قرار دیتا ہوں جس کو خدا نے اپنی کتاب میں حلال ٹھہرایا اور اسی چیز کو حرام قرار دیتا ہوں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام فرمایا۔"

یہ ہے ڈاکٹر توفیق صدقی کے حدیث نبوی کے خلاف وارد کردہ شکوک و شبہات کا خلاصہ! حدیث کا ہر طالب علم نگاہِ اولین ہی میں ان کو بے کار بے بنیاد اور تارِ عنکبوت سے بھی کمزور تر قرار دے گا۔ تاہم اتمام حجت کے طور پر ہم اس پر خیال آرائی کرتے ہیں۔

دلائلِ منکرینِ حدیث کے جوابات

پہلی دلیل کا جواب:

اس میں شک و ریب کی کوئی گنجائش نہیں کہ قرآن حکیم اصولِ دین اور قواعدِ احکام کا جامع ہے اس میں بعض احکام بصراحت بیان کیے گئے ہیں اور بعض کی توضیح و تشریح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تفویض کی گئی ہے۔ جب آپ کی بعثت ہی احکامِ دین کی تشریح و توضیح کے لیے کی گئی اور آپ کی پیروی لوگوں پر واجب قرار دی گئی ہے۔ تو اس سے ظاہر ہے کہ آپ جن احکام کی وضاحت کریں گے وہ قرآن ہی کی توضیح ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ شرعی احکام خواہ کتاب و سنت سے ثابت ہوں یا اجماع و قیاس سے وہ سب کتاب اللہ ہی کے احکام ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ احکام نصاً ثابت ہوں یا دلالۃً۔ نظر بریں حدیث کے حجت ہونے اور قرآن کریم کے "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" ہونے کے مابین سرے سے کوئی منافات ہی نہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

"جب کوئی شخص کسی حادثہ سے دو چار ہوتا ہے تو قرآن کریم میں اس کا حل موجود

قرآن کریم میں فرمایا :۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔ (ابراہیم -۱)	یہ وہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر اس لیے اُتارا کہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر خدا کے حکم سے روشنی اور خداوند غالب و ستودہ صفات کی راہ کی طرف لائیں ۔

ارشاد فرمایا :۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۞ (النحل -۴۴)	اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی تاکہ آپ اس چیز کی وضاحت کر دیں جو ان کی جانب اتاری گئی اور تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۔

نیز فرمایا :۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل -۸۹)	اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جس میں ہر چیز کی وضاحت ہے ۔

مذکورہ صدر آیات میں "بیان" کا لفظ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے ۔ اس میں اصول و فروع سب شامل ہیں ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قرآنی احکام کی تشریح کی ہے اس کی چند قسمیں ہیں :۔

(۱) خداوند تبارک و تعالیٰ نے قرآن کریم میں حکم دیا کہ اہل اسلام پر نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج فرض ہیں اسی طرح ظاہری و باطنی فواحش و منکرات کو حرام قرار دیا ۔ زنا اور شراب سے باز رکھا ۔ مردار خون اور خنزیر کو حرام ٹھہرایا ۔ وضو کو فرض قرار دیا ۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احکام پر تفصیلی روشنی ڈالی ۔

(۲) بعض فرائض کی نوعیت و کیفیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ۔ مثلاً نمازوں کی تعداد، زکوٰۃ کا نرخ و نصاب اور وقت وغیرہ ۔

(۳) بعض سنتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیں ۔ قرآن کریم میں اصلاً ان کا ذکر نہیں کیا گیا ۔

قرآن کریم میں اطاعتِ رسول کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ بنابریں جس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ احکام کو قبول کیا تو اس نے خدا کے حکم سے ایسا کیا۔

(۴) بعض مسائل کی طلب و تلاش میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اجتہاد کو فرض قرار دیا اور دیگر احکام شرعیہ کی طرح اجتہادی احکام میں بھی ان کی اطاعت کو آزمایا۔" (الرسالۃ للشافعی ص ۲۰-۲۲)

(امام شافعی کا بیان ختم ہوا)۔

دوسری دلیل کا جواب:

خداوند کریم نے جو حفاظت کا وعدہ کیا ہے وہ قرآن حمید ہی تک محدود و مقصور نہیں بلکہ اس سے وہ دین و شریعت مراد ہے جس کو لے کر نبی کریم تشریف لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس میں قرآن و حدیث دونوں شامل ہیں۔

مندرجہ ذیل آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے:۔

فَاسْئَلُوٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (النحل-۴۳) — اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو۔ (النحل-۴۳)

اس آیت میں "اہل الذکر" سے دین و شریعت کے عالم مراد ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ اس طرح حدیث نبوی کو بھی محفوظ و مصون رکھا خداوند کریم نے حدیثِ رسول کی حفاظت کے لیے ان محدثین کو پیدا کیا جنہوں نے ہر طرح اس کی حفاظت کی۔ اس کی نقل و روایت اور درس و مطالعہ میں حصہ لیا۔ احادیث صحیحہ و سقیمہ کو باہم ممیز و ممتاز کیا۔ خدمتِ حدیث میں اپنی جانیں تک قربان کر دیں۔ ہم بابِ اوّل کی تیسری فصل میں ان کی مساعی کا تفصیلی تذکرہ کر چکے ہیں۔ آئمہ حدیث کی جہود و مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ حدیث نبوی پڑھی جانے لگی۔ وہ محفوظ و مدون ہو گئی اور اس کا کچھ حصہ بھی ضائع نہ ہونے پایا۔

علماء حدیث نے جن کے سرخیل امام شافعی ہیں، اس بات کی تصریح کی ہے کہ احادیث عام اہل علم کے یہاں موجود ہیں۔ بعض علماء کے یہاں حدیث کا سرمایہ کم ہوتا ہے اور بعض کے پاس زیادہ

جب سارے علماء کے علمی ذخیرہ کو جمع کر لیا جائے تو سب حدیثیں یکجا ہو جاتی ہیں۔ اور اگر ان کے حدیثی سرمایہ کو انفرادی طور سے ملاحظہ کیا جائے تو وہ ناقص ہوتا ہے۔ مگر جو حدیث ایک کے پاس موجود نہیں ہوتی وہ دوسرے کے یہاں پائی جاتی ہے۔ (الرسالۃ ص ۴۳)

بلاشبہ یہ ایک قطعی و حتمی بات ہے، کہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور دیگر معاملات و فرائض سے متعلق حدیث نبوی کا ایک ادنیٰ حصہ بھی ضائع نہیں ہو پایا۔ آپ نے جو کچھ کیا یا کہا باختلاف طرق و مراتب محفوظ و مدون ہو چکا ہے۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ رقم طراز ہیں :-

"لغت و شریعت کے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ جو وحی بھی آسمان سے نازل ہوئی ہے وہ ذکرِ منزّل ہے۔ جملہ اقسام وحی کو خداوند تعالیٰ نے محفوظ و مصئون رکھا ہے جس چیز کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے قبول کی ہو نہ وہ ضائع ہو سکتی ہے نہ کسی وقت اس میں تبدیلی کا کوئی امکان ہے۔ یہ دعویٰ جھوٹا اور دلیل و برھان سے عاری ہے کہ آیت "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ" میں ذکر سے صرف قرآن کریم مقصود ہے۔ ذکر ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو آنحضورؐ پر نازل ہوئی وہ قرآن ہو یا حدیث

مزید برآں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ۔ (النحل۔ ۴۴)	اور ہم نے آپ پر "ذکر" نازل کیا ہے تاکہ آپ اس چیز کی وضاحت کر دیں جو ان کی طرف اُتاری گئی۔

اس آیت سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ آپ کو قرآن کریم کی توضیح و تشریح کا حکم دیا گیا تھا۔ قرآن کریم میں بہت سے احکام مجمل دیے گئے ہیں۔ مثلاً نماز، زکوٰۃ اور حج وغیرہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توضیح کے بغیر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرض کیا ہے۔ اگر نبی کریم کی تشریحات کو غیر محفوظ قرار دے دیا جائے تو

نصِ قرآنی سے فائدہ اُٹھانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بکثرت احکام جو ہم پر فرض قرار دیے گئے ہیں اس لیے ضائع ہو جائیں گے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے مفہوم و مقصود کو سمجھ نہیں سکے ۔" (الاحکام، ج ۱ - ص ۱۲۱)

تیسری دلیل کا جواب :

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کتابتِ حدیث کا حکم نہ دینے یا اس کو ضبطِ تحریر میں لانے سے روکنے کا یہ مطلب نہیں کہ حدیث نبوی دین میں حجت نہیں ہے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ اس دور میں کاتب بے حد قلیل العدد تھے۔ مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ قرآن کریم کی کتابت و تدوین کی جانب پوری توجہ مبذول کی جائے۔ اہل اسلام قرآن کریم کو یاد کریں تاکہ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔ اور اس میں اختلاط و امتزاج کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ ہم تحریر کر چکے ہیں کہ کتابتِ حدیث سے روکنے کا مطلب یہ تھا کہ حدیث کو رسمی طور پر مدوّن نہ کیا جائے تاکہ وہ قرآن کریم کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائے۔ جہاں تک ذاتی طور پر حدیثیں لکھنے کا تعلق ہے۔ عہدِ رسالت میں اس پر عمل ہو چکا تھا۔

اس کے دوش بدوش یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ حدیث کے حجت ہونے کا مدار و انحصار صرف کتابت ہی پر نہیں ہے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ اگر حدیث دین میں حجت ہوتی تو آپ ان کے لکھنے کا حکم صادر فرماتے۔ اس لیے کہ حجیّت کا اثبات بہت سی چیزوں سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً، حدیث کا متواتر ہونا۔ عدول اور ثقہ راویوں سے منقول ہونا۔ کتابت کی صورت میں۔ اس لیے کہ خلافتِ صدیقی تک تو قرآن بھی یکجا مدوّن نہیں ہوا تھا بلکہ الگ الگ ٹکڑوں پر مرقوم تھا صحابہ نے قرآن کو صرف لکھا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی ایک ایک آیت کو سینہ میں جگہ دی تھی۔ یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ کسی چیز کو حفظ کرنا صحت و ضبط کے لحاظ سے کسی طرح بھی کتابت سے کم نہیں خصوصاً عرب قوم کے پیشِ نظر جن کی قوتِ حافظہ ضرب المثل کی حد تک مشہور تھی۔ اور جن کے بارے میں اس ضمن میں عجیب و غریب باتیں منقول ہیں۔

عربوں کی قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ پورا قصیدہ صرف ایک دفعہ سن کر یاد کر لیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بارے میں منقول ہے کہ مشہور شاعر عمر بن ابی ربیعہ کا قصیدہ صرف ایک ہی نشست میں یاد کر لیا تھا۔ بعض رواۃ حدیث ایک ہی مجلس میں حدیثیں سن کر یاد کر لیتے اور ایک حرف بھی ضائع نہ ہوتا۔ چنانچہ محدث ابن عساکر زُھری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ عبدالملک نے اہل مدینہ کے نام ایک خط لکھا۔ اہل مدینہ نے ابن زبیرؓ کے بارے میں جو موقف اختیار کیا تھا اس خط میں اس پر ملامت کی۔ یہ خط جو دو صحیفوں پر مشتمل تھا مسجد میں پڑھ کر لوگوں کو سنایا گیا۔ سعید نے اس کے مندرجات سے آگاہ ہونے کے لیے اپنے تلامذہ سے دریافت کیا مگر وہ اُسے مطمئن نہ کر سکے۔ یہ سن کر زُھری نے کہا "ابو محمد! کیا آپ خط کے مضمون سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا" جی ہاں! یہ کہہ کر زُھری نے بلاکم و کاست پورا خط سنایا۔ امام شافعی کے بارے میں بھی اسی طرح منقول ہے۔ (جامع بیان العلم، ج ا۔ ص ۶۹ و تاریخ ابن عساکر)۔

صحابہ و تابعین جن احادیث کو پڑھتے پڑھاتے یا نقل و روایت کرتے اس کا مدار و انحصار ان کی قوتِ حافظہ پر تھا۔ ہم اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہیں کہ حافظہ پر اعتماد کرنا ایک طالب علم کے لیے کتاب پر بھروسہ کرنے سے زیادہ مفید ہے۔ اسی لیے بہت سے لوگ جن کے نام منکر حدیث نے ذکر کیے ہیں علمی باتیں لکھنے کو معیوب قرار دیتے تھے تاکہ قوتِ حافظہ کمزور نہ پڑ جائے اور وہ کتابوں کا سہارا نہ لینے لگیں۔ حافظ ابن عبدالبر کتابتِ علم کی کراہت سے متعلق اقوالِ صحابہ و تابعین ذکر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:۔

"اس ضمن میں ہم نے جن لوگوں کے اقوال ذکر کیے ہیں وہ عربوں کے مزاج کے مطابق ہیں۔ قوتِ حافظہ عربوں کی فطرت اور عظیم خصوصیت تھی۔ جو لوگ کتابت کو ناپسند کرتے تھے۔ مثلاً ابن عباس۔ شعبی۔ ابن شہاب۔ نخعی۔ قتادہ اور ان کے ہمنوا یہ حفظ کے خوگر تھے۔ یہ صرف سن کر یاد کر لیتے تھے۔ اس ضمن میں ابن شہاب زھری کا قول خاصا

مشہور ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے :۔

"میں بازار سے گزرتا ہوں تو اپنے کان بند کر لیتا ہوں۔ مبادا کان میں کوئی فحش بات پڑ جائے۔ خدا کی قسم جو بات میرے کان میں ایک دفعہ پڑ گئی میں اسے کبھی بھول نہ سکا۔"

امام شعبی سے بھی اسی قسم کے الفاظ منقول ہیں۔ یہ سب عربی الاصل لوگ تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :۔

"ہم ان پڑھ قوم ہیں اور حساب کتاب سے آشنا نہیں۔"

یہ بات مشہور ہے کہ قوتِ حافظہ عربوں کی خصوصیت ہے جس میں کوئی دوسری قوم ان کی سہیم و شریک نہیں۔ (جامع بیان العلم، ج ۱ ص ۶۵)

اس کے ساتھ ساتھ صحابہ کے وَرَع و تقویٰ کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ وہ صرف وہم و خطاء کے احتمال کی بناء پر تحریر کردہ احادیث کو مٹا دیا کرتے تھے۔ ہم قبل ازیں منکر حدیث کا ذکر کردہ واقعہ بیان کر چکے ہیں کہ حضرت صدیقؓ نے اپنے صحیفۂ احادیث کو جلا ڈالا تھا۔ بشرطیکہ یہ واقعہ صحیح ہو۔ ورنہ بقول امام ذہبی یہ واقعہ صحیح نہیں۔ اطمینان قلب بھی اسی بات سے نصیب ہوتا ہے۔

جہاں تک بعض صحابہ کی روایتِ حدیث سے احتراز کا تعلق ہے تو اس کی بڑی وجہ احتیاط فی الدین کی شدت تھی۔ مبادا وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ایسے قول کو منسوب کر دیں۔ جس میں خطاء کا احتمال ہو۔ جیسا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے بذاتِ خود اس کی تصریح کی تھی جو صحابہ قوت حافظہ سے بہرہ ور تھے وہ بے خوف و خطر حدیثیں روایت کرتے تھے۔ مثلاً ابن عباس ابن مسعود اور ابی ہریرہ رضی اللہ عنہم صحابہ میں کثیر الروایت مشہور تھے۔ حضرت زید بن ثابت جو کتابت حدیث کو ناپسند کرتے تھے اس کی وجہ خود بیان فرماتے ہیں :۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جو حدیثیں میں نے تمہیں سنائی ہیں وہ ویسی نہیں ہیں جیسے میں نے بیان کیں؟" (جامع بیان العلم)

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ حدیث کی روایت و کتابت سے صحابہ کا احتراز مبنی بر احتیاط فی الدین تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ صحابہ و تابعین سے جو روایات کتابت حدیث کے بارے میں منقول ہیں تواتر معنوی کی حامل ہیں، اور کوئی طالب حق نہ ان سے انکار کر سکتا ہے اور نہ ان کو شک و شبہ سے نگاہ دیکھ سکتا ہے)۔ اور اگر آپ اس سلسلہ میں وارد شدہ آثار کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو امام ابن عبدالبر کی جامع بیان العلم (ج ۱۔ ص ۶۰۔ ۷۷) اور خطیب بغدادی کی "تدوین العلم" ملاحظہ فرمائیں

باقی رہی یہ بات کہ حدیث نبوی کی تالیف و تدوین بتاخیر ہوئی۔ بنا بریں اس کے حفظ و ضبط پر اعتماد نہیں رہا اور وہ شکوک و شبہات کی آماجگاہ بن گئی۔ اس لیے خدا کے دین میں اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ تو یہ وہی شخص کہہ سکتا ہے جو علماء کی ان جہود و مساعی سے بے بہرہ ہو جو انھوں نے حدیث نبوی سے تحریف و وضع کے ازالہ کے سلسلہ میں انجام دی تھیں۔ جب حدیث نبوی کے ضبط و حفظ اور گاہے کتابت کی داغ بیل عہد صحابہ سے تا اختتام قرنِ اوّل پڑ چکی تھی اور زھری نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ایماء پر حدیثیں مدوّن کیں، تو اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ حفاظتِ حدیث کا سلسلہ پیہم و مسلسل جاری رہا اور کہیں ٹوٹنے نہیں پایا۔ اس لیے یہ شک و شبہ سے بالا ہے۔

جہاں تک اس کذب و دروغ کا تعلق ہے جس کو احادیث میں داخل کر دیا گیا تھا علماء نے اس کی قلعی کھول کر رکھ دی تھی اور اس میں شک و شبہ کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑی تھی۔ اس کی حد یہ ہے کہ ان مساعی کو دیکھ کر انسان مطمئن ہو جاتا ہے اور حدیث نبوی پر اسے کامل یقین آ جاتا ہے۔ بایں ہمہ ہم یہ نہیں کہتے کہ اخبار آحاد جو نہایت کثیر العدد ہیں یقینی علم کی موجب ہیں ــــــ جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے ــــــ بخلافِ ازیں ہماری رائے میں ان سے ظنّی علم حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مفیدِ ظنّ ہونے میں ایک جھگڑالو شخص ہی اختلاف کی گنجائش پاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مفید ظنّ ہونے کے باوصف احادیث نبویّہ

قابلِ اعتماد حجت ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ دینی احکام میں ظن کی اجازت نہیں ہے۔ تو یہ بات دین کے ان اصول و قواعد سے متعلق ہے جن کے بارے میں شک یا انکار کرنے والے کو کافر قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً خدا کی وحدانیت و صداقت رسول نزولِ قرآن یا ارکانِ دین یعنی نماز، زکوٰۃ وغیرہ جو ضروریات دین میں شامل ہیں۔ فروعاتِ دین کا معاملہ ان سے مختلف ہے۔ جزوی احکام کو ظنی طریق سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ مخالف بھی اس امر کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ دین کے جملہ احکام قطعیات کے ساتھ ثابت کیے جاتے ہیں۔ قرآن کریم سے جو قطعی احکام ماخوذ ہیں وہ ان اجتہادی احکام کی نسبت بہت کم ہیں جو نصوص قرآن سے مستفاد ہیں۔

ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں عام خاص مطلق مقید اور مجمل مبین سب ہی قسم کے احکام ہیں۔ ان اقسام میں قطعیت کا باقی رہنا ممکن نہیں۔ یہ بات علم الاصول میں مسلّم ہے۔ ہم یہاں آپ کو یہ بات یاد دلاتے ہیں کہ امام شافعی نے منکر حدیث کو عمل بالشہادت کی مثال دے کر اس پر الزام قائم کیا تھا۔ اثباتِ حکم کے سلسلہ میں شہادت بھی ایک ظنی طریق ہے۔ اس لیے کہ شاہد سے کذب و خطاء کا صدور ممکن ہے۔ کیا اب اس کے بعد بھی یہ بات کہنے کی گنجائش ہے کہ ظنی طریق سے احکام کا اثبات نہیں کیا جاسکتا؟

چوتھی دلیل کا جواب :

منکر حدیث نے اس ضمن میں جو احادیث ذکر کی تھیں اب ان کا تفصیلی جواب سنیئے!

(۱) منکر حدیث نے پہلی حدیث یہ پیش کی تھی کہ "إِنَّ الْحَدِيثَ سَيَفْشُو عَنِّي" محدث بیہقی اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کو خالد بن ابی کریمہ نے ابو جعفر سے روایت کیا ہے۔ اس کا راوی خالد مجہول ہے اور ابو جعفر صحابی نہیں۔ اس لیے یہ حدیث منقطع ہے۔

(مفتاح الجنۃ ص ۱۵)

امام شافعی فرماتے ہیں:۔

"اس حدیث کو ثقہ راوی نے روایت نہیں کیا۔ یہ منقطع روایت ایک مجہول راوی سے منقول ہے۔ ہم ایسی روایت کو قبول نہیں کرتے۔" (الرسالۃ ص ۲۲۵)

امام ابن حزم فرماتے ہیں :۔

"اس حدیث کا راوی حسین بن عبداللہ ساقط الاحتجاج اور زندیق ہے۔"

(الاحکام ج ۲ - ص ۷۶)

(۲) امام بیہقی فرماتے ہیں :۔

"جس حدیث میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حدیث کو قرآن کے معیار پر پرکھ کر دیکھ لو باطل و ضعیف ہے۔ بلکہ اس حدیث کا مضمون ہی اس کے بطلان کی شہادت دے رہا ہے قرآن میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ حدیث کو قران کے معیار پر پرکھ کر جانچو۔"

(مفتاح الجنۃ، ص ۶)

یہ ہیں مذکورہ صدر حدیث کے بارے میں علماء کے اقوال!

مجھے اس کے تسلیم کرنے میں قدرے تامل ہے۔ اگر اس حدیث کو ضعفِ سند کی بناء پر ردّ کیا گیا ہے جیسا کہ محدثین کا قول ہے تو اس میں کلام نہیں۔ اور ان کا قول ہر حال میں تسلیم کرنا پڑے گا مگر یہ بات بھی پیش نظر رکھی جائے کہ سب محدثین اس کو موضوع قرار نہیں دیتے۔ بلکہ بعض صرف اس کے ضعیف ہونے کے قائل ہیں۔ جیسا کہ آپ امام شافعی و بیہقی کے اقوال ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اور اگر اس حدیث کو متن کی بناء پر رد کیا گیا ہے تو یہ حدیث مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کی گئی ہے اکثر روایات کے الفاظ یوں ہیں :۔

"جو قرآن کے موافق ہو اسے قبول کر لو۔ اور جو اس کے مخالف ہو یا موافق نہ ہو اُسے ردّ کر دو۔"

اور یہ الفاظ ایسے نہیں ہیں کہ ان کی بناء پر اس حدیث کو ضعیف قرار دیا جائے چہ جائیکہ عبدالرحمٰن بن مہدی کی طرح اس کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کیا جائے کہ "یہ حدیث خوارج اور زنادقہ کی

ساختہ پرداختہ ہے۔"

اس کی وجہ علماء کا وہ متفقہ فیصلہ ہے جو قبل ازیں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ جو حدیث قرآن کریم اور سنتِ صحیحہ کے خلاف ہو وہ موضوع ہوتی ہے۔ جب کوئی حدیث ایسے حکم پر مشتمل ہو جو خلافِ قرآن ہو یا اس کے موافق نہ ہو اور اس میں تاویل کی گنجائش نہ ہو تو ہم بالاتفاق اس کو موضوع قرار دیں گے۔ ظاہر ہے کہ حدیث زیرِ قلم میں اس سے زیادہ کچھ مذکور نہیں۔ البتہ اگر حدیث کے الفاظ یوں ہوتے کہ :-

"جو کچھ تم خدا کی کتاب میں پاؤ اسے قبول کر لو اور جو نہ پاؤ اسے رد کر دو۔"

تو یہ حدیث لازماً باطل ٹھہرتی۔ اس لیے کہ احادیث سے ایسے احکام بھی ثابت ہوتے ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہوتے۔ ایسی احادیث باتفاق اہل علم صحیح، مقبول اور معمول بہا ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اس بات پر علماء کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ سنتِ صحیحہ کتاب اللہ کے خلاف نہیں ہو سکتی جو احادیث خلافِ قرآن احکام پر مشتمل ہیں وہ بالاتفاق مردود ہیں۔

امام ابن حزم فرماتے ہیں :-

"احادیث صحیحہ میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جو قرآن کے خلاف ہو۔"

محمد بن عبداللہ ابن میسرہ فرماتے ہیں :-

"حدیث کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) وہ حدیث جو مندرجاتِ قرآن کے موافق ہو۔ ایسی حدیث سے اخذ و احتجاج فرض ہے۔

(۲) وہ حدیث جس میں کوئی ایسا حکم یا مضمون بیان کیا گیا ہو جو قرآن میں مذکور نہ ہو۔ اس پر بھی عمل ضروری ہے۔ اس سے قرآن کے مندرجات میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۳) جو حدیث مخالف قرآن ہو اسے نظر انداز کر دیا جائے گا۔"

امام ابن حزمؒ ہی کا قول ہے کہ :-

"ایسی کوئی صحیح حدیث موجود نہیں جو مخالفِ قرآن ہو۔ حدیث تین حال سے خالی نہیں۔

(۱) وہ ایسے مضمون پر مشتمل ہو گی جو قرآن میں مذکور نہیں اور اس طرح مندرجاتِ قرآن میں اضافہ کی موجب ہو گی۔

(۲) وہ قرآنی احکام و مطالب کی توضیح و تفسیر پر مشتمل ہو گی۔

(۳) وہ قرآن کے عام حکم میں استثنائی صورت کو واضح کرے گی۔

اس سے زائد چوتھی قسم کی کوئی حدیث نہیں ہو سکتی" (الاحکام لابن حزم، ج ۲۔ ص ۸۰۔ ۸۲)

اندریں صورت میری رائے میں جب حدیث کے الفاظ یہ ہوں کہ:۔

"جو حدیث قرآن کے موافق نہ ہو یا مخالف ہو وہ مردود ہے"

تو اس کے متن کو موضوع قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔

امام شاطبی کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ شاطبی اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"حدیث اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی کی جاتی ہے اس لیے وہ کتاب خداوندی سے ہرگز متناقض و متصادم نہیں ہو سکتی البتہ یہ ممکن ہے کہ حدیث میں کوئی ایسی بات بیان کی گئی ہو جو نہ تو قرآن کے مخالف ہو اور نہ موافق۔ بلکہ قرآن اس کے بارے میں خاموش ہو مگر جب کوئی دلیل اس کے خلاف قائم ہو جائے تو اس صورت میں ہر حدیث کا موافق قرآن ہونا ضروری ہے۔ حدیث زیر تبصرہ میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ نظر بریں اس حدیث کا مطلب و مفہوم درست ہے اس کی سند صحیح ہو یا نہ ہو"

(الموافقات، ج ۴۔ ص ۲۱)

مندرجہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ یہ روایت منکر حدیث کے لیے حجت نہیں بن سکتی۔ اگرچہ اس کی سند بھی صحیح ہو۔

(۳) منکر حدیث نے ایک روایت یہ پیش کی تھی کہ:۔

"جب میری طرف سے تمہیں کوئی حدیث پہنچائی جائے اور تم اسے پہچانتے بھی ہو تو اس کی تصدیق کیجئے خواہ میں نے وہ بیان کی ہو یا نہ کی ہو"

یہ روایت ضعیف اور منقطع ہے۔ امام ابن حزم اس کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

"یہ حدیث مُرسل ہے۔ اس کی سند میں اصبغ نامی راوی مجہول ہے۔ اس حدیث کے الفاظ ہی اس کے ضعف اور کذب پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کے یہ الفاظ کہ: اُس کی تصدیق کیجیے وہ میں نے بیان کی ہو یا نہ کی ہو" محلّ نظر ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات پر جھوٹ باندھنے کی اجازت کیونکر دے سکتے ہیں۔ حالانکہ آپ نے حدیث متواتر میں فرمایا:

"جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنا لے"

محدّث ابن حزم مزید فرماتے ہیں :۔

"اس حدیث کا ایک راوی عبیداللہ بن سعید مشہور کذاب ہے۔ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا پردازی کی جو اجازت دی گئی ہے اس کو ایک کذاب زندیق کافر اور احمق شخص ہی تسلیم کر سکتا ہے" (الاحکام، ج ۲ - ص ۷۸)

امام بیہقی کا قول ہے :۔

"محدث ابن خزیمہ فرماتے ہیں اس حدیث کی صحت میں نظر ہے۔ ہم نے مشرق و مغرب میں کوئی شخص نہیں دیکھا جو ابن ابی ذئب سے آشنا ہو ماسوا یحییٰ بن آدم کے۔ میں نے کسی محدث کو نہیں دیکھا جو ابو ھریرہؓ سے اس حدیث کی روایت کو درست خیال کرتا ہو۔ یحیی بن آدم سے روایت کرنے والوں نے مختلف قسم کی باتیں کہی ہیں۔ اس حدیث کے سند و متن میں ایسا اختلاف پایا جاتا ہے جو اضطراب کا موجب ہے بعض راوی ابو ھریرہؓ کا نام ذکر کرتے ہیں۔ اور بعض ان کا نام لیے بغیر حدیث کو مرسلاً بیان کرتے ہیں" (مفتاح الجنۃ، ص ۱۹)

البتہ مذکورہ صدر حدیث سندِ صحیح کے ساتھ بھی روایت کی گئی ہے۔ مگر اس میں یہ الفاظ موجود نہیں کہ "میں نے وہ حدیث بیان کی ہو یا نہ کی ہو" نظر بریں اس سے منکر حدیث کے نظریہ کی تائید وحمایت نہیں ہوتی۔ اس سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث صحیح کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ شریعت کے بیان کردہ محاسن سے ہم آہنگ ہو۔ ورنہ اس کے کذب میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس روایت میں حدیث کے حجت نہ ہونے کا ذکر کہاں کیا گیا ہے؟

(۴) منکر حدیث نے ایک حدیث یہ پیش کی تھی کہ آپ نے فرمایا:۔

"میں اسی چیز کو حلال ٹھہراتا ہوں جس کو خدا نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا۔ اور اسی چیز کو حرام ٹھہراتا ہوں جس کو خدا نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا"

امام سیوطیؒ کہتے ہیں اس حدیث کو شافعی و بیہقی نے بطریق طاؤس روایت کیا ہے۔ امام شافعیؒ اس کو منقطع قرار دیتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے حکم دیا گیا تھا آپ نے اسی طرح کیا۔ آپ کو وحی کی پیروی کا حکم دیا گیا تھا۔ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے وحی کی پیروی میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں "اس حدیث کے الفاظ" فی کتابہ" اگر صحیح ہوں تو ان سے وحی بطریق عموم مراد ہے۔ وحی کی دو قسمیں ہیں:۔

(۱) وحی مَتلُوّ۔ (۲) وحی غیر مَتلُوّ۔ (مفتاح الجنۃ، ص ۱۹)

آپ دیکھتے ہیں کہ امام بیہقیؒ نے "کتاب" کی تفسیر اعم طریق سے کی ہے جو قرآن وحدیث دونوں کو شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ایک حدیث میں بھی اسی طرح فرمایا گیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے کسی آدمی کی بیوی کے ساتھ زنا کیا۔ زانی کے والد نے اس شخص کو چند بکریاں اور غلام دے کر اس سے صلح کرلی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ سے آگاہ ہوئے تو آپ نے فرمایا:۔

"اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں تمہارے درمیان خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ بکریاں اور غلام تجھے واپس کر دیے جائیں اور اس کی بیوی اگر اعترافِ جرم کرے تو اس کو سنگسار کیا جائے"

کتاب سے اس کا متبادر مفہوم یعنی قرآن مجید مراد لینے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کو حلال یا حرام ٹھہراتے ہیں وہ خدا کی اس کتاب میں بھی حلال یا حرام ہے جس کی اطاعت کا اس نے حکم دیا اور جس کی مخالفت سے اس نے باز رکھا ہے۔

باقی رہی منکر حدیث کی پیش کردہ روایت "لَا يُمْسِكَنَّ النَّاسَ عَلَيَّ بِشَيْءٍ" تو امام شافعی نے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ حدیث بروایت طاؤس منقطع ہے۔ بشرطِ صحت اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ یوں کہیں کہ نبی کریمؐ اس چیز کو حلال یا حرام کیوں کر ٹھہراتے ہیں جس کی حلّت یا حرمت قرآن میں مذکور نہیں؛ اس لیے کہ سرور کائنات شارع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ اسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہراتے ہیں جو خدا کی شریعت میں حلال یا حرام ہوتی ہے۔

مندرجہ صدر بیانات سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ منکر حدیث نے جن احادیث کا سہارا لیا ہے ان میں سے کچھ تو محدثین کے نزدیک سرے سے ثابت ہی نہیں۔ اور بعض ثابت تو ہیں مگر اس کے دعویٰ پر دلالت نہیں کرتیں۔ اس کے دعویٰ کے بے بنیاد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بکثرت احادیث صحیحہ اس کی تغلیط و تردید کرتی ہیں۔ مثلاً امام شافعی کی روایت کردہ یہ حدیث کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"ایسا نہ ہو کہ تم میں سے ایک شخص مسند سے ٹیک لگائے بیٹھا ہو اور اس کے پاس میرا کوئی امر یا نہی پہنچے اور وہ کہنے لگے مجھے نہیں معلوم! ہم تو صرف اسی چیز کی پیروی کریں گے جو خدا کی کتاب میں پائیں گے" (الرسالۃ للشافعی، ص ۴۰۳۔ بحوالہ ابو داؤد۔ ابن ماجہ۔ ترمذی و احمد)

امام حاکم نے بسند خود مقدام بن معدیکرب سے روایت کی ہے کہ غزوہ خیبر کے روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان میں پالتو گدھا بھی شامل تھا۔ آپ نے فرمایا :۔

"وہ دن دُور نہیں جب ایک شخص پلنگ پر براجمان ہوگا۔ اسے میری حدیث سنائی جائے گی اور وہ کہے گا میرے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب کافی ہے۔ جس چیز کو خدا کا رسول حرام ٹھہرائے وہ خدا کی حرام کردہ اشیاء کی طرح ہوتی ہے"

امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ سرور کائناتؐ نے لوگوں کو اپنے احکام کے رد کرنے سے منع کیا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر آپ کی پیروی کو فرض قرار دیا ہے۔

بیاناتِ سابقہ کا لبِ لباب یہ ہے کہ کوئی مسلم جو خدا کے دین کو جانتا اور شرعی احکام کو پہچانتا ہو نہ تو حدیث نبوی کے حجت ہونے سے انکار کر سکتا ہے اور نہ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ اسلام صرف قرآن کا نام ہے۔ یہ بات یوں بھی خلافِ واقعہ ہے۔ اس لیے کہ اکثر احکام شرعیہ حدیث سے ثابت ہوئے ہیں۔ قرآن میں جو احکام موجود ہیں وہ یا تو مجمل ہیں اور یا قواعدِ کلیہ ہیں ورنہ قرآن میں مندرجہ ذیل مسائل کہاں مذکور ہیں ؟

(۱) نمازوں کی تعداد۔ (۳) احکام حج۔

(۲) نصاب زکوٰۃ اور اس کی شرح۔ (۴) دیگر عبادات و معاملات۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :۔

"ہم منکر حدیث سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل مسائل کس قرآن میں مذکور ہیں :۔

۱۔ ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور مغرب کی تین۔

۲۔ رکوع و سجدہ کی کیفیت اور تسبیحات۔

۳۔ مفسداتِ صوم۔

۴۔ چاندی سونا بکری، اُونٹ اور گائے کی زکوٰۃ کا نصاب و شرح۔

۵۔ احکام و ارکانِ حج مثلاً وقوف عرفہ مزدلفہ میں نماز پڑھنے کا طریق۔ رمی جمار احرام۔

۶۔ قطع سارق۔

۷۔ کس رضاعت سے حرمت ثابت ہوتی ہے

۸ - حلال و حرام غذائیں -
۹ - ذبائح قربانی کے جانور -
۱۰ - حدود شرعیہ -
۱۱ - اقسامِ طلاق - احکامِ بیوع - ربا - فیصلہ جات - قسم کے احکام - عمریٰ، عمر بھر کے لیے کسی کو کوئی چیز دینا، صدقات و دیگر فقہی احکام -

قرآن کریم میں احکام اجمالاً ذکر کیے گئے ہیں - اگر ان احکام کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے (ان کو حدیث نبوی کی تصریحات کی روشنی میں نہ دیکھا جائے) تو ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ ان پر کیسے عمل کیا جائے - مجملاتِ قرآنی کی توضیح و تصریح کے سلسلہ میں حدیث نبوی کی جانب مراجعت ازبس ناگزیر ہے -

اجماع کا بھی یہی حال ہے - صرف چند مسائل کے بارے میں علماء کا اجماع منعقد ہوا ہے اس لیے شرعی احکام معلوم کرنے کے لیے حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑے گا اور اگر کوئی شخص یوں کہے کہ :-

"ہم تو اسی بات پر عمل کریں گے جو قرآن میں پائیں گے"

تو یہ شخص اجماعاً کافر ٹھہرے گا - ایسے شخص کو چاہیے کہ ایک رکعت زوال آفتاب و ظلمتِ شب کے مابین اور ایک رکعت فجر کے وقت پڑھ لیا کرے - اس سے زیادہ کی اسے ضرورت نہیں - اس لیے کہ ایک رکعت کم از کم مقدار ہے جس پر لفظ "صلوٰۃ" کا اطلاق کیا جا سکتا ہے - زیادہ سے زیادہ کے لیے تو کوئی حد ہی مقرر نہیں - ایسا شخص یقیناً کافر مشرک مباح الدم والمال ہے - یہ غالی روافض کا عقیدہ ہے جن کے کافر ہونے پر پوری امت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے اور اگر کوئی شخص صرف اسی بات پر عمل کرتا ہو جس پر پوری ملت مجتمع ہو چکی ہو اور مختلف فیہ امور کو ترک کر دیتا ہو - حالانکہ نص سے ان کا اثبات ہوتا ہے تو ایسا شخص باجماعِ امت فاسق ٹھہرے گا مذکورہ بالا دلائل و براہین سے واضح ہوتا ہے کہ حدیث نبوی سے اخذ و احتجاج ناگزیر ہے :-

(الاحکام، ج ۲ - ص ۷۹ - ۸۰)

فصل چہارم

منکرینِ حجیتِ اخبارِ آحاد

محدثین کے نزدیک حدیث کی دو قسمیں ہیں :-

(۱) **متواتر :**

متواتر وہ حدیث ہے جس کو عدول اور ثقہ راویوں کا ایک گروہ ثقہ و عدول راویوں کے دوسرے گروہ سے نقل کرتا ہو حتیٰ کہ وہ حدیث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔

(۲) **خبر واحد :**

خبر واحد اس حدیث کو کہتے ہیں، جس کو ایک یا دو راوی دوسرے ایک یا دو راویوں سے روایت کریں یہاں تک کہ یہ سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔ یا یوں کہیے کہ جس حدیث کے راوی متواتر کی حد تک نہ پہنچ سکیں وہ خبرِ واحد ہے۔

حنفیہ کے یہاں حدیث کی ایک تیسری قسم بھی، جس کو "حدیث مشہور" کہتے ہیں :-

(۳) **حدیث مشہور :**

یہ وہ حدیث ہے جو ابتداءً خبر واحد ہوتی ہے مگر دوسری و تیسری صدی میں شہرت پذیر ہو جاتی ہے۔ مثلاً حدیث

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (التحریر و شرحہ، ج ۲ - ص ۲۳۵)

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حدیث متواتر سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے اور اس کی تعمیل واجب ہوتی ہے۔ حدیث متواتر بلا نزاع حجت ہے۔ البتہ منکرین حدیث نظام معتزلی اور اس کے ہمنوا اس کو حجت قرار نہیں دیتے۔

اَخبارِ آحاد کی حجیّت:

جمہور کے نزدیک اَخبارِ آحاد حجت ہیں اور ان پر عمل واجب ہے۔ اگر چہ ان سے ظنّی علم حاصل ہوتا ہے۔ امام رازیؒ نے اپنی کتاب "المحصول" میں دعویٰ کیا ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ (المحصول، ج ۲)

امام احمد حارث محاسبی حسین بن علی کرابیسی ابو سلیمان اور امام مالکؒ سے منقول ہے کہ خبرِ واحد یقینی علم کی موجب ہوتی ہے۔ اس سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے اور اس کی تعمیل ضروری ہوتی ہے۔ (الاحکام از آمدی، ج ۱- ص ۱۰۸)

فریقین کے دلائل کتب اصول میں مذکور ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر چہ اس ضمن میں دونوں فریق مختلف الخیال ہیں کہ آیا خبرِ واحد سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے یا ظنّی، تاہم دونوں فریق اس کو حجت سمجھتے اور اس پر عمل کرنے کو ضروری ٹھہراتے ہیں۔ روافض قاسانی اور ابن داؤد کے بارے میں منقول ہے کہ وہ خبرِ واحد کو حجت قرار نہیں دیتے۔

(احکام از آمدی، ج ۱- ص ۱۶۹)

التحریر اور اس کی شرح میں اس قول کو روافض اور ابو داؤد کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔

(التحریر ج ۲- ص ۲۷۲)

محدث ابن حزم نے الاحکام ج ۱- ص ۱۳۳ پر جو کچھ لکھا ہے اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ معتزلہ کا قول ہے۔

امام شافعیؒ نے اپنی تصانیف "الرسالۃ" و "کتاب الاُمّ" میں یہ نہیں لکھا کہ حدیث نبوی کی حجیت سے کس فرقہ کے لوگ انکار کرتے تھے۔ اگر چہ "الاُمّ" کے مطالعہ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ بصرہ میں بود و باش رکھتے تھے۔ یہاں دونوں احتمال ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ رافضی ہوں۔ اسی طرح یہ بھی احتمال ہے کہ معتزلہ ہوں۔ عصرِ شافعی میں بصرہ علمی و فکری تحریکات کا مرکز تھا۔ یہاں تمام فِرَق و مذاہب کے لوگ اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ شرح مسلم الثبوت. ج ۲ ص ۱۳۱ اد

شرح المختصر، ج ۲ ص ۵۹ پر لکھا ہے کہ یہ روافض اور اہل الظاہر کا قول ہے۔ مگر اہل الظاہر کی جانب اس قول کی نسبت بہت عجیب معلوم ہوتی ہے۔ امام ابن حزم کی تصانیف اور علماء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر یہ اس ضمن میں جمہور کے ہمنوا ہیں۔

منکرینِ حجیّتِ اخبارِ آحاد کے دلائل:

خبرِ واحد کی حجیت کے منکرین نے حسبِ ذیل دلائل پیش کیے ہیں:۔

پہلی دلیل:۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (سورۃ الاسراء۔ ۳۶)

جس چیز کا تجھے یقینی علم نہیں وہ بیان نہ کر۔

نیز فرمایا:۔

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ (النجم، آیت ۲۸)

بے شک ظن حق کا کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا

اخبارِ آحاد جس طریق سے مروی و منقول ہوتی ہیں وہ ظنّی ہے۔ کیونکہ راوی سے خطاء و نسیان سرزد ہونے کا احتمال ہر وقت باقی رہتا ہے۔ اور جو چیز ایسی ہو وہ قطعی و حتمی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس سے استدلال کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔

دوسری دلیل:۔ اگر فروعات میں خبرِ واحد پر عمل کرنا جائز ہو تو اصول و عقائد میں بھی جائز ہونا چاہیے۔ حالانکہ اس بات پر فریقین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ عقائد میں اخبارِ آحاد پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ نظر بریں جب عقائد کے ضمن میں ان پر عمل درست نہیں تو فروعات میں بھی جائز نہیں۔

تیسری دلیل:۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر نماز عصر کے چار فرضوں کے بجائے دو فرض ادا کیے۔ ذوالیدین نامی صحابی نے جب آپ کو اس سے آگاہ کیا تو اس کی بات تسلیم کرنے میں آپ کو تامّل ہُوا۔ ذوالیدین نے کہا تھا "یارسول اللہ! کیا نماز

کم ہوگئی یا آپ بھول گئے"؟ جب حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور دیگر شرکاءِ نماز نے اس کی تائید کی تو آپ نے باقی ماندہ دو رکعتیں ادا کیں اور دو سجدہ ہائے سہو کیے۔ اگر خبرِ واحد حجت ہوتی تو آپ ؐ ذوالیدین کے کہنے پر نماز مکمل کر لیتے اور اس میں توقف نہ فرماتے۔

چوتھی دلیل :- متعدد صحابہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ خبرِ واحد پر عمل نہیں کرتے تھے مثلاً حضرت ابوبکر نے دادی کی میراث سے متعلق مُغیرہ بن شعبہ کی روایت کو رد کر دیا تھا جب محمد بن مُسلمہ نے اس کی تائید کی تو آپ نے تسلیم کیا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے طلبِ اذن کے بارے میں ابوموسیٰ اشعری کی روایت کو قبول نہ کیا۔ اور جب ابوسعید نے اس کے حق میں شہادت دی تو آپ نے اسے قبول کیا۔ علیٰ ھٰذا القیاس حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے حکم بن العاص کو واپس مدینہ بلانے کے بارے میں حضرت عثمان کی روایت کردہ حدیث کو تسلیم نہ کیا۔ حضرت علی نے ابوسنان اشجعی کی روایت منکوحہ بلا مہر کے بارے میں مسترد کر دی تھی۔ حضرت علی حلف لیے بغیر کسی کی روایت قبول نہیں کیا کرتے تھے۔ البتہ حضرت ابوبکر اس کلیہ سے مستثنیٰ تھے۔ حضرت عائشہؓ نے ابن عمرؓ کی اس روایت کو قبول نہیں کیا تھا کہ گھر والوں کے رونے سے میّت کو سزا دی جاتی ہے۔ (الاحکام آمدی ج ۱۔ ص ۹۴ نیز التحریر۔ ج ۲ ص ۲۷۲-۲۷۳)

دلائل منکرین کے جوابات :

علماء نے منکرینِ حجیّتِ اخبارِ آحاد کے پیش کردہ دلائل کے حسبِ ذیل جوابات دیے ہیں:-

(۱) پہلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ دین کے اصول و قواعد کے ضمن میں یقینی دلائل پر عمل کیا جاتا ہے جہاں تک فروع و جزئیات کا تعلق ہے ان کے سلسلہ میں عمل بالظن واجب ہے۔ جزئیات کو صرف ظنی دلائل کے ذریعہ ہی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا ان کے معلوم کرنے کا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ مثال کے طور پر کہہ سکتے ہیں۔ قرآنی نصوص کے فہم و ادراک میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک مجتہد ایک آیت کو ایک طرح سے سمجھتا ہے تو دوسرا

دوسرے انداز سے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ میرا اجتہاد حتمی وقطعی ہے۔ بایں ہمہ اس بات پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ حاصلِ اجتہاد پر عمل واجب ہے

مزید برآں اخبارِ آحاد کی حجیت ظنی نہیں بلکہ قطعی ہے۔ اس لیے کہ عصرِ صحابہ سے لے کر آج تک اس پر علماء کا اجماع منعقد ہوتا چلا آیا ہے۔ ان لوگوں کی مخالفت اجماع پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ بنابریں اس کی تعمیل ایک ظنی دلیل کی پیروی نہیں بلکہ ایک قطعی دلیل کا اتباع ہے جس سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ اجماع ہے۔ (الاحکام آمدی، ج ا ص ۷۱-۷۲، الاحکام لابن حزم، ج ا- ص ۱۱۴)

(۲) دوسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ اجماعادین کے اصول وعقائد کو ظنی طریق سے قطعاً حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ فروعِ دین کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ علامہ آمدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :۔

"منکر حدیث کا یہ اعتراض فتویٰ اور شہادت کے بارے میں خبرِ واحد کو قبول کرنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ فروع واصول کے مابین حقیقی فرق پایا جاتا ہے۔ اسی فرق و امتیاز کا نتیجہ ہے کہ اثباتِ رسالت اور اصول وعقائد کے سلسلہ میں قطعی دلیل کی ضرورت ہے۔ ظنی دلیل اس ضمن میں معتبر نہیں ہے۔ فروع کا معاملہ جداگانہ نوعیت کا ہے۔" (الاحکام آمدی، ج ا-ص ۹۸)

حق بات یہ ہے کہ قطعی دلائل کے وجوب کے سلسلہ میں فروع کو اصول وعقائد پر قیاس کرنا تحکم اور محال ہے۔ اس لیے کہ فروعی احکام میں قطعی دلائل موجود نہیں۔ جب کہ اصول وعقائد کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی بات ہے کہ اس کے بارے میں ایک مناظرہ باز شخص ہی جدال ونزاع پر آمادہ ہوتا ہے۔

(۳) تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ذوالیدین کی بات تسلیم کرنے میں اس لیے تامل ہوا کہ مبادا وہ صحیح نہ ہو۔ جب باقی حاضرین نے یہ بات نہیں کہی تھی تو

ایک شخص کی بات پر اظہار حیرت بجا اور درست ہے۔ اور جب خبر واحد میں وہم کی کوئی علامت پائی جاتی ہو تو اس میں توقف واجب ہے۔ جب دیگر حاضرین نے تائید کر دی تو ذوالیدین کی بات میں وہم کا احتمال باقی نہ رہا اور آپ نے اس کی تعمیل فرما دی۔ مزید برآں جب آپ نے ذوالیدین اور دیگر حاضرین کی بات پر عمل کیا جن میں حضرت ابوبکر و عمر بھی شامل تھے تو وہ اس وقت بھی خبر متواتر کے درجہ کی حامل نہ تھی۔ نقطہ نزاع و اختلاف بھی یہی ہے اور اس کے تسلیم کرنے سے مقصود کا تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔

(۴) یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جس میں شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ صحابہ اخبار آحاد پر عمل کرتے تھے۔ یہ بات ان سے بتواتر ثابت ہے۔ ہم آگے چل کر وہ دلائل و واقعات بیان کریں گے جن میں صحابہ نے خبر واحد پر عمل کیا تھا۔ جب کسی خبر واحد کے ضمن میں منقول ہو کہ صحابہ نے اس کے قبول کرنے میں تامل سے کام لیا۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خبر واحد پر عمل نہیں کرتے۔ بخلاف ازیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ میں کوئی شک یا وہم پایا جاتا ہے۔

منکرِ حدیث نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے میراث جدّہ کو ردّ کرنے سے متعلق جو واقعہ بیان کیا ہے اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ اخبار آحاد کو قبول نہ کرتے تھے۔ بلکہ آپ کسی تائیدی شہادت کی تلاش میں تھے جس سے یہ ثابت ہو جاتے کہ اسلام میں دادی کے لیے ترکہ کا ۱/۶ حصہ مقرر ہے۔ چونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر قرآن نے صراحتہً روشنی نہیں ڈالی اس لیے اس کی تعمیل کرنے میں زیادہ حزم و احتیاط کی ضرورت تھی۔ جب محمد بن مسلمہ نے اس امر کی شہادت دے دی کہ انہوں نے آپ سے یہ حدیث سنی ہے تو آپ نے بلا تردد حضرت مغیرہ کی حدیث پر عمل کر لیا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ابوموسیٰ کی روایت کو مسترد کرنے کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ ہم قبل ازیں تحریر کر چکے ہیں کہ یہ حدیث صحابہ اور ان کے بعد اسلام میں داخل ہونے والوں کے لیے ایک عبرت انگیز درس کی حیثیت رکھتی ہے کہ حدیث نبوی کے

بارے میں تحزم و احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ سے کہا تھا:

"میں آپ پر الزام نہیں دھرتا مگر یہ حدیث رسولؐ کا معاملہ ہے۔"

اس قبیل کی جس قدر روایات منقول ہیں ان سب کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ وہ اخبار آحاد سے عدمِ احتجاج کے سلسلہ میں وارد نہیں ہوئیں۔ ورنہ ایک صحابی کے ساتھ دوسرے صحابی کے منضم ہو جانے سے وہ روایت واجب العمل نہیں ہو جاتی اس لیے کہ وہ اس حالت میں بھی خبر واحد ہی رہتی ہے۔ جب کہ روایت کرنے والے صحابی کے ساتھ دو یا تین صحابی اور شامل ہو جائیں۔ ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ صحابہ احادیث کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر ردّ بھی کرتے اور بناء بر اجتہاد ایک دوسرے کو خطاء کار بھی ٹھہراتے۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ احادیث نبویہ کو ہر قسم کی غلطی اور وہم سے پاک رکھا جائے۔

علامہ آمدی لکھتے ہیں:-

"صحابہؓ نے جن احادیث کو مسترد کیا یا ان کے قبول کرنے میں توقف سے کام لیا تھا وہ چند امور کی وجہ سے تھا جو اس کے مقتضی ہوئے۔ مثلاً کوئی معارض موجود ہو۔ یا کوئی شرط نہ پائی جاتی ہو۔ اس لیے نہیں کہ وہ ان سے احتجاج کرنے کے قائل نہ تھے۔ اسی لیے ہم نے اس پر اجماع قائم کیا ہے کہ ظواہر کتاب و سنت حجت ہیں۔ اگرچہ خارجی امور کی بناء پر ان کا ترک کرنا یا ان پر عمل کرنے میں توقف سے کام لینا درست ہے" (الاحکام، ج ۱۔ ص ۹۷)

بہرکیف یہ ہیں منکرینِ حجیتِ اخبارِ آحاد کے دلائل و جوابات! باقی رہے وہ براہین و دلائل جن سے اخبارِ آحاد کا حجت ہونا واضح ہوتا ہے اور کسی مسلم کے لیے بشرط صحت ان سے مجالِ انکار نہیں۔ تو علماءِ اصول نے اس ضمن میں بکثرت دلائل ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے بعض میں نقد و تبصرہ اور ردّ کی گنجائش ہے۔ (الاحکام آمدی، ج ۲۔ ص ۵، نیز التقریر شرح التحریر

ج ۲ - ص ۲۷۲ و بر حاشیہ شرح الاسنوی علی المنہاج - ج ۲ ص ۲۹۴)

میں نے مصلحت اس میں دیکھی کہ امام شافعیؒ نے اپنی کتاب "الرسالۃ" میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے طوالت کے باوصف اس کو آپ کے سامنے پیش کر دوں - کیونکہ میرے علم کی حد تک ائمہ کبار میں سے وہ اولین شخص تھے جس نے مکمل کر اس موضوع پر لکھا - متاخرین نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا ہے وہ جناب امام ہی کی خوشہ چینی پر مبنی ہے - میرا جی چاہا کہ صاف اور شیریں پانی کے اس چشمہ سے سیر ہو کر پیوں - خصوصاً جب کہ امام شافعی نے جو کچھ لکھا ہے بڑے دل نشین اسلوب، انداز اور فصیح و بلیغ عربی میں لکھا ہے -

حجیتِ اخبارِ آحاد کے دلائل :

امام شافعی رحمہ اللہ اپنی تصنیف "الرسالۃ" صفحہ ۴۰۱ پر زیر عنوان "حجیت خبر واحد کے دلائل رقم طراز ہیں :-

"اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حدیث و اجماع کی رُو سے خبر واحد کی حجت کی دلیل پیش کیجیے تو میں اسے کہوں گا کہ مندرجہ ذیل نصوص و براہین سے خبر واحد کا حجت ہونا واضح ہوتا ہے"

پہلی دلیل :

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

"اللہ تعالیٰ اس شخص کو مسرور و شادمان رکھے جس نے میری بات سن کر اسے یاد رکھا اور اسے آگے پہنچا دیا - علم دین کے بہت سے حامل فقیہ نہیں ہوتے - اور فقہ کے بہت سے حامل ایسے لوگوں کو علم دین پڑھاتے ہیں جو ان سے زیادہ باشعور ہوتے ہیں"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اپنے اقوال کے سننے اور ان کو یاد رکھنے کی تاکید کی - ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جو بات سنی جائے اسے آگے لوگوں تک پہنچایا جائے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اسی بات کو لوگوں کی طرف پہنچانے کا حکم دیا ہے جو سامعین پر حجت ہو - کیونکہ جو بات پہنچائی جائے گی - وہ حلال و حرام سے متعلق ہو گی - یا شرعی حد ہو گی جو کسی پر

قائم کی جائے گی۔ مال ہوگا جو دیا یا لیا جائے گا۔ وہ بابت دین و دنیا کی بھلائی سے وابستہ ہوگی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات علم دین حاصل کرنے والے فقیہ نہیں ہوتے وہ احکام کے حافظ تو ہوتے ہیں مگر فقیہ نہیں ہوتے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل اسلام کی جماعت سے وابستہ رہنے کا حکم دیا۔ اس سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔

دوسری دلیل:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

" ایسا نہ ہو کہ تم میں سے ایک شخص مسند سے ٹیک لگائے براجمان ہو۔ اسے میرا کوئی حکم امر و نہی سے متعلق سنایا جائے اور وہ کہے" مجھے نہیں معلوم! ہم جو چیز خدا کی کتاب میں پائیں گے اس کی پیروی کریں گے۔"

محدث ابن عیینہ اس حدیث کو مرسلاً روایت کرتے ہیں۔ مذکورہ صدر روایت سے حدیث کا حجت اور لازم الاتباع ہونا مستفاد ہوتا ہے۔ اگر چہ قرآن کریم کی کسی آیت سے حدیث کی تائید نہ ہوتی ہو۔

تیسری دلیل:

عطاء بن یسار روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لیا۔ اسے شدید ندامت کا احساس ہوا اور اپنی بیوی کو مسئلہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ اس نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہو کر حقیقت حال بیان کی۔ فرمایا آنحضور بھی روزہ کی حالت میں یوں کر لیا کرتے ہیں۔ عورت نے واپس جا کر اپنے خاوند کو بتایا۔ اس نے ناراض ہو کر کہا" ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے لیے جو چاہے حلال کر دے۔" وہ عورت پھر ام سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو رسول کریمؐ کو وہاں پایا۔ حضور نے فرمایا یہ عورت کس لیے آئی ہے؟ حضرت ام سلمہؓ نے ماجرا کہہ سنایا۔ آپ نے فرمایا "کیا آپ نے اُسے بتایا نہیں ہے کہ روزہ کی حالت میں میں بھی اس طرح کر لیا کرتا ہوں؟ ام سلمہؓ

نے جواب دیا" میں نے اسے بتایا تھا۔ اس نے جب اپنے خاوند کو اس بات سے آگاہ کیا تو وہ ناراض ہو گیا اور اس نے کہا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے لیے جس چیز کو چاہے حلال ٹھہرائے" آپؐ یہ سن کر ناراض ہو گئے اور فرمایا:-

"میں تم میں سب سے زیادہ متقی اور خدا کی حدود کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا ہوں"

میں نے سنا ہے کہ بعض محدثین اس حدیث کو موصولاً بھی بیان کرتے ہیں مگر میں ان کے نام سے آگاہ نہیں ہوں[1]۔

امام شافعی نے نبی کریمؐ کے اس قول کے بارے میں "کیا تو نے اسے بتایا نہیں کہ میں بھی ایسے کرتا ہوں،، فرمایا کہ اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ آپؐ سے متعلق حضرت اُم سلمہؓ کا قول قابل قبول ہے۔ اگر ام سلمہ کا بیان حجت نہ ہوتا تو آپؐ ان کو یہ بیان دینے کے لیے مامور نہ فرماتے۔ اسی طرح اس شخص کی بیوی کی خبر اس کے حق میں قابل قبول ہے۔

چوتھی دلیل:

امام مالک عبداللہ بن دینار سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابن عمرؓ سے کہا لوگ مقام قباء میں نماز فجر ادا کر رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نیا حکم یہ نازل ہوا ہے کہ بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کریں۔ صحابہ اس وقت بیت المقدس کی طرف رُخ کیے نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ یہ سنتے ہی کعبہ کی جانب مڑ گئے۔ اہل قباء انصار میں سے سابق الاسلام اور بڑے سمجھ دار تھے۔ وہ بیت المقدس کی جانب رخ کیے نماز ادا کر رہے تھے جو ان پر فرض تھا۔ وہ ایک فریضہ کو اسی صورت میں ترک کر سکتے تھے جب ان پر کوئی شرعی حجت قائم ہو

---

[1] امام شافعی کی تصنیف "الرسالہ،، کے مصحح استاذ احمد شاکر نے زرقانی شرح مؤطا ج ۲ ص ۹۲ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ عبدالرزاق نے اس حدیث کو بسند صحیح عطاء سے موصولاً روایت کیا ہے اور اُس نے ایک انصاری سے سنا۔

جاتی - بذاتِ خود نہ وہ آنحضور سے ملے اور نہ تحویل قبلہ سے متعلق خداوندی حکم سنا - نہ عام لوگوں نے انہیں یہ خبر سنائی - بخلاف ازیں صرف ایک شخص سے یہ بات سن کر وہ کعبہ کی جانب پھر گئے -

اس سے معلوم ہوا کہ خبر واحد کا قبول کرنا نہ صرف جائز بلکہ فرض ہے - اگر خبر واحد کو قبول کرنا صرف جائز ہوتا تو وہ ایک یقینی فریضہ (بیت المقدس) کو حالتِ نماز میں ترک کر کے ایک غیر یقینی خبر کی بناء پر دوسرے قبلہ کی جانب متوجہ نہ ہوتے - اس لیے کہ ایک یقینی امر کو دوسرے یقینی امر ہی کی بناء پر ترک کیا جا سکتا ہے -

پانچویں دلیل :

حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ میں ابو طلحہؓ ابو عبیدہؓ بن الجراح اور ابی بن کعب کو کچی اور پکی کھجوروں کی شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر بتایا کہ شراب حرام ہو چکی ہے - ابو طلحہ نے انس سے کہا "شراب کے مٹکوں کو توڑ دیجیے" میں نے ایک بڑا سا پتھر اُٹھا کر ان پر دے مارا جس سے وہ ٹوٹ گئے - ان صحابہ کا جو علمی مقام تھا اور تقدمِ صحبت کے لحاظ سے یہ جس مرتبہ پر فائز تھے اس سے کوئی صاحب علم انکار نہیں کر سکتا - یہ بھی معلوم ہے کہ شراب اس وقت حلال تھی اور عام لوگ ان دنوں شراب پیتے تھے - اچانک ایک شخص آکر حُرمتِ شراب کی خبر دیتا ہے اور شراب کے مٹکوں کے مالک ابو طلحہ فوری طور پر ان کو توڑنے کا حکم دیتے ہیں - ان میں سے کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ آئیے نبی کریمؐ سے دریافت کریں - یا عام لوگوں سے پوچھیں - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک شخص کی خبر پر پورا پورا اعتماد کرتے تھے -

چھٹی دلیل :

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُنیسؓ کو حکم دیا کہ فلاں شخص کی بیوی نے بدکاری کا ارتکاب کیا ہے - صبح اس کے یہاں جاؤ اور اگر وہ اعتراف جرم کر لے تو اُسے سنگسار کر دو - اس واقعہ سے بھی خبر واحد کا حجت ہونا واضح ہوتا ہے -

ساتویں دلیل:

عمرو بن سُلیم الزُرقی اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں ہم مقام منیٰ میں تھے کہ جو منی ہم نے دیکھا حضرت علیؓ ایک اونٹ پر سوار یہ کہہ رہے ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کھانے پینے کے دن ہیں۔ اس لیے کوئی شخص روزہ نہ رکھے۔ حضرت علیؓ چلا چلا کر یہ کہہ رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی صورت میں ایک شخص کو یہ پیغام پہنچانے کے لیے بھیج سکتے تھے۔ جب اس کا قول واجب التسلیم حجت ہو۔ ورنہ آپ بسہولت چند آدمیوں کو بھی مامور فرما سکتے تھے۔ اس سے بھی خبر واحد کا حجت ہونا واضح ہوتا ہے۔

آٹھویں دلیل:

یزید بن شیبان روایت کرتے ہیں کہ ہم عرفات میں ایک ایسی جگہ مقیم تھے جو امام سے بہت ہی دور تھی۔ ہمارے پاس ہریع انصاری آئے اور کہا میں آپ کی طرف رسول کریمؐ کا قاصد بن کر آیا ہوں آپ نے حکم دیا ہے کہ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو۔ تم اپنے دادا ابراہیم کی میراث پر قابض ہو۔

نویں دلیل:

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ میں حضرت علی کو مکہ بھیجا۔ آپ نے عیدالاضحیٰ کے روز حاجیوں کے اجتماع میں سورۃ التوبہ کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ آپ نے ایک قوم کا عہد واپس کر دیا اور ان کے لیے ایک مدت مقرر کر دی۔ چند باتوں سے انہیں منع کیا۔ حضرت ابوبکرؓ و علیؓ اہل مکہ کے یہاں صداقت و امانت میں معروف تھے۔ اگر حاجیوں میں سے کوئی شخص ان دونوں کو یا ان میں سے ایک کو نہ جانتا ہوتا تو دوسرا اس کو بتا دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ ایک شخص کو اسی صورت میں یہ پیغام دینے کے لیے بھیج سکتے تھے جب اس کا قول حجت ہوتا

دسویں دلیل:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ میں حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر بھیجا۔ مختلف دیار و امصار

کے حاجی جمع تھے۔ آپ نے ان کو احکام حج بتلائے اور آنحضورؐ کے ارشادات گرامی سے مطلع کیا۔

گیارھویں دلیل :

سالار رسل صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف و اکناف میں عمال بھیجے۔ ہم ان عمال سے بھی آگاہ ہیں اور ان مقامات سے بھی جن کی طرف انہیں بھیجا گیا۔ چنانچہ آپ نے قیس بن عاصم زبرقان بن بدر اور ابن نویرہ کو ان کے اپنے اپنے قبیلہ کی جانب عامل بنا کر بھیجا۔ اس لیے کہ وہ ان کی صداقت و امانت سے آشنا تھے۔ جب بحرین کا وفد مدینہ آیا اور وہ آنحضور کے صحابہ سے آشنا ہو گئے تو آپ نے ان کے ہمراہ سعید بن العاص کو بھیجا۔ آنحضورؐ نے حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا اور فرمایا کہ جو لوگ تمہارے اطاعت کیش ہوں وہ نافرمانوں کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ لوگوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کریں۔ اور ان سے شرعی واجبات وصول کریں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اہل یمن حضرت معاذ کے مرتبہ و مقام اور راست گوئی سے آگاہ تھے۔ آپ نے جس شخص کو بھی کسی علاقہ کا والی بنا کر بھیجا اسے حکم دیا کہ وہاں کے رہنے والوں سے واجبات وصول کرے۔ مگر ان میں سے کسی نے بھی یہ نہ کہا تھا کہ تو ایک آدمی ہے۔ ہم آپ کو مالی واجبات ادا نہیں کر سکتے جب تک نبی کریمؐ ہمیں مامور نہ فرمائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف انہی اشخاص کو اطراف ملک میں عامل بنا کر بھیجا تھا جن کی بات قابل تسلیم حجت کی حیثیت رکھتی تھی۔

بارھویں دلیل :

اسی طرح جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھر اُدھر فوجی دستے روانہ کیے تو ایک ایک صحابی کو دستے کا امیر مقرر کیا۔ چنانچہ جب مقام مُوتہ کی جانب فوج روانہ کی تو زیدؓ بن حارثہ کو سالار لشکر مقرر کیا۔ آپ نے فرمایا اگر یہ شہید ہو جائیں تو پھر جعفرؓ امیر ہوں گے۔ اگر وہ بھی شہادت سے سرفراز ہوں تو پھر ابن رواحہؓ۔ اسی طرح ہر علاقے کی طرف ایک فوجی دستہ بھیجا اور ایک ایک صحابی کو اس کا امیر مقرر کیا۔ جن لوگوں کو دعوت اسلام نہیں پہنچی تھی وہ ان کو دعوت

دیتے۔ اور جن سے لڑنا جائز ہوتا تھا ان سے لڑتے۔ ہر والی اور امیر کو یہی حکم تھا۔ آپ نے کسی علاقہ کی طرف دو یا تین یا چار یا اس سے زیادہ صحابہ کو والی بنا کر نہیں بھیجا تھا۔

تیرھویں دلیل:

آپ نے ایک ہی زمانہ میں بارہ سلاطین کی طرف بارہ صحابہ کو قاصد بنا کر بھیجا۔ مقصد یہ تھا کہ ان پر اتمامِ حجت کیا جائے۔ یہاں بھی آپ نے اسی امر کو ملحوظ رکھا کہ اسی صحابی کو قاصد بنا کر بھیجا جو اس علاقہ میں جانا پہچانا ہو۔ چنانچہ حضرت دحیہ کو اس علاقہ کی طرف ایلچی بنا کر بھیجا جہاں وہ معروف تھے۔

چودھویں دلیل:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اطرافِ ملک میں خطوط بھیج کر عمال کو ہدایات صادر فرماتے رہتے تھے کوئی والی آپ کے احکام سے سرتابی نہ کر سکتا تھا۔ آپ اسی شخص کو سفیر بنا کر بھیجتے تھے جو مرسل الیہ کے یہاں قابل اعتماد ہوتا تھا۔ اور اگر مکتوب الیہ کو قاصد پر اعتماد نہ ہوتا یا وہ اس شبہ میں مبتلا ہوتا کہ قاصد نے نبی کریمؐ کے خط میں کچھ کمی بیشی کر دی ہو گی تو وہ بذاتِ خود آنحضورؐ سے دریافت کرنے کی ضرورت محسوس کرتا۔

پندرھویں دلیل:

آپ کی وفات کے بعد خلفاء و عمال بھی اطرافِ ملک میں خطوط کے ذریعہ ہدایات بھیجتے رہے۔ ہر زمانہ میں اس امر پر اہل اسلام کا اجماع قائم رہا ہے کہ خلیفہ ایک ہو قاضی اور امیر ایک ہو۔ چنانچہ آنحضورؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ چنا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے عمر فاروقؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔ حضرت عمرؓ نے اہل شوریٰ کو منتخب کرنے کے لیے کہا۔ اس کے نتیجہ میں حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے حضرت عثمانؓ کو خلیفہ منتخب کیا۔

سولھویں دلیل:

اسی طرح قضاۃ فیصلہ جات صادر کرتے ہیں تو ان کے احکام نافذ ہو جاتے ہیں

وہ شرعی حدود بھی قائم کرتے ہیں۔ ان کے احکام ان کے بعد بھی نافذ ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے احکام ایک خبر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حدیثِ رسول اور اہل اسلام کے اجماع سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت خبر اور حکم کے مابین فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ جب قاضی ایک شخص کے حق میں اور دوسرے کے خلاف فیصلہ صادر کرتا ہے تو یہ بھی گویا ایک خبر ہے جو شہادت پر مبنی ہوتی ہے۔ یا مدعیٰ علیہ خود قاضی کے سامنے اعتراف جرم کر لیتا ہے۔ اور قاضی اس ضمن میں اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اندریں صورت قاضی کا یہ فیصلہ گویا اسی طرح ہے جیسے وہ حلال یا حرام کی اطلاع دے رہا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قاضی کی خبر واجب التسلیم ہے۔

سترھویں (۱۷) دلیل:

سعید بن المسیب روایت کرتے ہیں کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کیا تھا کہ ہاتھ کے انگوٹھے کی دیت پندرہ (۱۵) اونٹ، انگشت شہادت کی دس (۱۰) اونٹ، درمیانی انگلی کی دس (۱۰) اونٹ اس کے ساتھ والی کی نو (۹) اونٹ اور سب سے چھوٹی انگلی کی چھ (۶) اونٹ (یعنی پانچ انگلیوں کی دیت پچاس (۵۰) اونٹ)، حضرت عمرؓ اس حقیقت سے آشنا تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کی دیت پچاس اونٹ مقرر کی تھی۔ اور ہاتھ کے پانچ اجزا (پانچ انگلیاں) ہیں۔ جن میں سے ہر ایک جداگانہ حسن و جمال اور فوائد کا حامل ہے۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے پانچ انگلیوں کی دیت پورے ہاتھ کے برابر مقرر کی۔ اور ہر انگلی کی دیت اس کی حیثیت کے مطابق ٹھہرائی۔ تو گویا آپ نے حدیث نبوی پر قیاس کیا۔ جب ہم نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خط بنام آل عمرو ابن حزم ملاحظہ کیا تو اس میں آپ کا یہ فرمان موجود تھا کہ ہر انگلی کی دیت دس (۱۰) اونٹ ہے۔ جب لوگ اس خط کے مضمون سے آگاہ ہو گئے تو انہوں نے اس پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ آل عمرو بن حزم کے نام آنحضورؐ کے خط کو اسی بنا پر معمول بہ بنایا گیا کہ یہ آنحضورؐ کا مکتوب گرامی ہے۔

مذکورہ صدر حدیث سے حسب ذیل امور مستفاد ہوتے ہیں:

۱ - اوّل یہ کہ حدیث نبوی جب بھی مل جائے اسے قبول کر لینا چاہیئے۔

۲ - اگر کسی حدیث پر آئمہ دین نے پہلے عمل نہ کیا ہو تو جب وہ مل جائے اس پر عمل کر لینا چاہیے۔

۳ - اگر امام کسی بات پر قبل ازیں عمل کر رہا ہو۔ پھر اس کے خلاف اسے حدیث نبوی مل جائے تو اسے چاہیے کہ اپنے عمل سے باز رہے۔

۴ - یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث نبوی بذاتِ خود ثابت ہو جاتی ہے کسی کے عمل سے نہیں۔

۵ - جب یہ حدیث صحابہ کو ملی تو ان میں سے کسی نے بھی یہ بات نہ کہی کہ مہاجرین و انصار کے سامنے حضرتِ عمرؓ کا عمل اس حدیث کے خلاف تھا۔ بخلاف ازیں سب نے بلا چون و چرا حدیث پر عمل کیا اور اس کے مخالف عمل کو ترک کر دیا۔

۶ - اگر فاروق اعظمؓ کو یہ حدیث مل جاتی تو آپ اپنے تقویٰ اور ادا، واجب کے پیشِ نظر اس حدیث پر عمل کرتے اور اپنا زاویۂ نگاہ بدل لیتے۔

۷ - اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیث کی عدم موجودگی کی صورت میں رائے و قیاس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

۸ - جب حدیث کا پتہ چل جائے تو اپنا ذاتی عمل چھوڑنا پڑے گا اور لوگ بھی اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے کے مکلف و مامور ہوں گے۔

۹ - کسی کا عمل حدیث نبوی پر اثر انداز نہیں ہو سکتا خواہ عامل کوئی بھی ہو۔

اٹھارویں دلیل:

سعید بن المسیّب روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

"دیّت وارثوں کو ملے گی اور بیوی اپنے خاوند کی دیّت سے ہرگز وارث نہ ہو گی"

ضحاک بن سفیان نے حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا تھا کہ اشیم ضبابی کی بیوی کو اس کی دیّت سے حصہ دیا جائے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنا طرزِ عمل تبدیل کر لیا۔ میں نے قبل ازیں اس حدیث پر کتاب الام، ج ۶ ص ۷۷ پر اظہار خیال کیا ہے۔

انیسویں دلیل:

طاؤس روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"جس شخص نے جنین (طفل قبل از ولادت) کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ سے کچھ سنا ہو میں اسے خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ وہ مجھے بتا دے۔"

یہ سن کر حمل بن مالک کھڑے ہو کر کہنے لگے:۔

"میں اپنی دو لونڈیوں کے درمیان کھڑا تھا کہ ایک نے دوسری پر ایک پتھر دے مارا جس سے اس کے شکم میں جو بچہ تھا وہ ساقط ہو کر مر گیا۔ آپ نے قاتلہ کو حکم دیا کہ اس کو ایک غلام دیت میں دے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر میں یہ حدیث نہ سنتا تو اس سے مختلف فیصلہ صادر کرتا۔ دوسرے صحابہ کہنے لگے بہت ممکن تھا کہ ہم اس ضمن میں اپنی رائے سے فیصلہ کرتے" ضحاک کی بیان کردہ حدیث سن کر حضرت عمر جو فیصلہ صادر کرنا چاہتے تھے اس سے باز رہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جب حدیث نبوی سے ثابت ہے کہ ایک شخص کو قتل کرنے کی پاداش سو اونٹ ہے۔ اندریں صورت جو بچہ ساقط ہوا وہ زندہ ہوگا یا مردہ۔ اگر زندہ تھا تو اس میں سو اونٹ بطور دیت دینے واجب تھے۔ اور اگر مردہ تھا تو اس صورت میں کچھ بھی دینا نہیں آتا۔ جب حضرت عمر کو آنحضورؐ کے فیصلہ سے آگاہ کیا گیا تو آپ نے فوراً اس کی پیروی کی۔ سب لوگوں کو اسی طرح کرنا چاہیئے۔

بیسویں دلیل:

امام مالک ابن شہاب سے اور وہ سالم سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عمر ملک شام کو جا رہے تھے تو آپ کو پتہ چلا کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے۔ اس ضمن میں جب آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کی زبانی حدیث سنی کہ ایسے علاقہ میں جانا ممنوع ہے تو آپ مدینہ لوٹ آئے۔

اکیسویں دلیل:

امام مالک جعفر بن محمد سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد سے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا "مجھے نہیں معلوم! کہ میں مجوس کے ساتھ کیا سلوک کروں"، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا:

"میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضورؐ کو یہ فرماتے سنا کہ مجوس سے اہل کتاب کا سا برتاؤ کیجئے"

سفیان عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بجالہ کو یہ کہتے سنا کہ "حضرت عمرؓ پہلے مجوس سے جزیہ وصول نہیں کیا کرتے تھے۔ جب عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بتایا کہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مقام ہجر کے مجوس سے جزیہ لیا تھا تو حضرت عمرؓ نے بھی اس کو معمول بنالیا"۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ مجوس کے بارے میں حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت قبول کرلی۔ آپ یہ آیت قرآنی:

مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى	ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی یہاں تک
يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ	کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور وہ
صَاغِرُوْنَ ۔	جھکنے والے ہوں۔

تلاوت فرماتے تھے اور ان سے جزیہ بھی وصول کرتے جاتے تھے۔

حدیث نبوی کے بارے میں جو مشہور اعتراض کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایک راوی کی روایت تب قبول کرتے تھے جب کوئی دوسرا صحابی اس کے حق میں تائیدی شہادت دیتا۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ تین وجوہ کی بناء پر تائیدی شہادت طلب کرتے تھے۔

۱۔ حزم و احتیاط اور تاکید کے نقطۂ خیال سے۔

۲۔ جب کہ راوی عدالت سے متصف نہ ہو۔

۳۔ جب کہ راوی کی ثقاہت کا علم نہ ہو۔

بقول امام شافعی حضرت عمرؓ نے ابوموسیٰ اشعریؓ سے بناء بر حزم و احتیاط تائیدی شہادت

طلب کی تھی۔ ورنہ حضرت عمر بھی جناب ابوموسیٰ کو ثقہ وامین سمجھتے تھے۔ امام شافعی نے اس ضمن میں حضرت عمر کے اس قول سے استشہاد کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"میں آپ کو متہم نہیں کرتا۔ مجھے یہ خطرہ دامن گیر ہے کہ مبادا لوگ رسول کریم پر جھوٹ باندھنے لگ جائیں۔"

امام شافعی فرماتے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر سے بکثرت ایسی احادیث منقول ہیں جن کو آپ نے ایک ہی راوی سے سن کر تسلیم کر لیا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ آپ ایک راوی کی روایت قبول کر لیتے ہوں اور بعض اوقات قبول نہ کرتے ہوں۔

بائیسویں دلیل:

خداوند تعالیٰ نے قرآن کریم کی مختلف ومتعدد آیات میں انبیاء ورسل کی بعثت کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خبر واحد حجت ہے کیونکہ ایک ہی نبی اپنی قوم کی جانب مبعوث ہو کر آتا تھا۔ سورۂ یٰسین میں انبیاء کی بعثت کا ذکر کر کے فرمایا:-

"فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اتمام حجت تو ایک نبی سے بھی ہو جاتا ہے دیگر انبیاء کی بعثت تاکید مزید کے لیے عمل میں لائی گئی تھی۔ زیادہ انبیاء کو مبعوث کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ ایک نبی سے حجت قائم نہیں ہوتی۔"

تئیسویں دلیل:

فُرَیعہ بنت مالک بن سنان بیان کرتی ہیں کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بنو خُدرہ کے قبیلہ میں اپنے والدین کے یہاں چلے جانے کی اجازت طلب کی۔ فُریعہؓ نے بتایا کہ میرا خاوند غلاموں کی تلاش میں نکلا تھا۔ جب وہ مقام "قَدُّوم" میں پہنچا تو غلاموں نے اسے قتل کر دیا۔ میرے خاوند نے رہنے کے لیے کوئی مکان نہیں چھوڑا۔ آپؐ نے فرمایا "تم اپنے والدین کے یہاں جا سکتی ہو"۔ جب میں مسجد کے قریب پہنچی تو آپ نے پھر بلایا۔ میں حاضر ہوئی تو فرمایا "اپنا واقعہ پھر بیان کرو"۔ میں نے واقعہ دوہرایا تو آپؐ نے فرمایا "عدت پوری ہونے

تک اسی گھر میں مقیم رہو" چنانچہ میں نے وہاں چار ماہ دس روز قیام کیا۔ جب حضرت عثمانؓ کا عہد خلافت آیا تو انھوں نے بلا کر مجھ سے یہ واقعہ دریافت کیا۔ میں نے آپ کے فیصلہ سے آگاہ کیا تو آپ اسی کے مطابق مقدمات فیصل کرنے لگے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جناب عثمان نے صرف ایک عورت کی بات پر پورا پورا اعتماد کیا۔ (ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی بطریق مالک از زہری)

چوبیسویں دلیل:

طاؤس کہتے ہیں میں ابن عباسؓ کے ہمراہ تھا۔ جب زید بن ثابتؓ نے ان سے کہا کیا آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ حائضہ عورت آخری طواف کرنے سے پہلے اپنے وطن لوٹ جائے؟ ابن عباسؓ نے کہا "اگر آپ کو یقین ہو تو فلاں انصاری عورت سے دریافت کر لیں کہ آیا نبی کریمؐ نے اس امر کی اجازت دی تھی یا نہیں"؟ زید بن ثابتؓ ہنستے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے کہ "میرا خیال ہے آپ سچ کہتے ہیں"۔ (مسند احمد۔ بیہقی۔ بخاری و مسلم)

امام شافعی فرماتے ہیں حضرت زید نے سن رکھا تھا کہ کوئی حاجی آخری طواف کیے بغیر وطن واپس نہیں جا سکتا۔ ان کے نزدیک حائضہ عورت بھی اس ممانعت میں شامل تھی۔ جب ابن عباسؓ نے یہ فتویٰ دیا کہ اگر وہ عورت یوم النحر کے دن طواف کر چکی ہو تو آخری طواف انجام دینے سے قبل واپس جا سکتی ہے۔ حضرت زید نے اس بات پر اظہار تعجب کیا۔ جب ابن عباس نے انصاری عورت کا واقعہ سنایا اور حضرت زید نے اس سے پوچھ کر واقعہ کی تصدیق کر لی تو جناب زید نے عورت کی بات کو تسلیم کر لیا اور ابن عباس کے موقف سے متفق ہو گئے۔ حالانکہ ابن عباسؓ کے پاس انصاری عورت کے بیان کے سوا دوسری کوئی دلیل موجود نہ تھی۔

پچیسویں دلیل:

سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں میں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ نوفا[1] بکالی کہتا ہے کہ خضر کے ساتھی موسیٰ

---

[1] نوفا بکالی کی ماں حضرت کعب الاحبار صحابی کی بیوی تھی۔ نوف تابعین میں سے تھا اور قصص کی نقل و روایت میں مشہور تھا بنو بکال قبیلہ حمیر کی ایک شاخ تھے۔ اس کی وفات ۹۰ھ و ۱۰۰ھ کے درمیان ہوئی

وہ نہ تھے جن کو بنی اسرائیل کی جانب نبی بنا کر مبعوث کیا گیا تھا، بلکہ اور شخصیت تھے۔ ابن عباسؓ نے کہا "دشمن خدا جھوٹ کہتا ہے مجھے اُبی بن کعب نے بتایا کہ نبی کریمؐ نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے حضرت موسیٰ و خضر کا واقعہ بیان کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ خضر کے ساتھی حضرت موسیٰ وہی تھے جو بنی اسرائیل کی جانب نبی ہو کر آئے تھے"۔ (بخاری و مسلم)

یہ واقعہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ ابن عباس نے فقہ و ورع کے باوصف ابی بن کعب کی ذکر کردہ حدیث کی تائید کی۔

چھبیسویں[26] دلیل :

طاؤس روایت کرتے ہیں کہ اس نے ابن عباسؓ سے نماز عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کے بارے میں سوال کیا۔ ابن عباسؓ نے اس سے منع کیا۔ طاؤس نے کہا "میں تو ان کو ترک نہیں کروں گا"۔ یہ سن کر ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت کی[1]

"کسی مومن مرد و عورت کا حق نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ صادر کر دیں تو کوئی اختیار بھی ان کو باقی رہے"۔

ابن عباس کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ جب انہوں نے طاؤس کو رسول کریمؐ کی حدیث سنا دی تو اس پر حجت قائم ہو گئی۔ پھر آیت پڑھ کر واضح کیا کہ اب اس کے لیے اطاعت رسول کے سوا کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ طاؤس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث صرف ابن عباسؓ سے سنی تھی۔ تاہم طاؤس نے یوں نہ کہا کہ "یہ حدیث میں نے صرف آپ کی زبان سے سُنی ہے اس لیے مجھ پر حجت نہیں۔ ممکن ہے آپ بھول گئے ہوں"۔

ستائیسویں[27] دلیل :

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بٹائی پر زمین دیتے تھے اور اس میں کوئی

---

[1] بیہقیؒ نے یہ روایت تفصیلاً بیان کی ہے۔ بخلاف ازیں عبدالرزاق، ابن حاتم اور ابن مردویہ نے یہ حدیث مختصراً ذکر کی ہے۔

حرج نہیں سمجھتے تھے۔ جب رافع بن خدیجؓ نے ہمیں بتایا کہ آنحضورؐ نے اس سے منع کیا ہے تو ہم نے اسے ترک کر دیا۔

مندرجہ صدر روایت سے واضح ہُوا کہ ابن عمرؓ بٹائی کو حلال سمجھتے اور اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے۔ جب ایک قابل اعتماد شخص نے انہیں بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا تھا، تو انہوں نے فوراً اسے ترک کر دیا۔ حضرت ابن عمرؓ نے یوں نہیں کہا تھا: "کہ ہم آج تک یہ کام کرتے رہے اور کسی نے اس پر نکتہ چینی نہ کی" اس سے یہ بھی معلوم ہُوا کہ اگر آنحضورؐ کی کوئی حدیث موجود ہو اور اس پر عمل نہ کیا جاتا ہو تو اس سے حدیث میں کوئی ضعف پیدا نہیں ہوتا۔

اٹھائیسویں دلیل:

عطاء بن یسار روایت کرتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ نے چاندی یا سونے کا ایک برتن اس سے زیادہ وزن کی چاندی یا سونے کے عوض فروخت کر دیا۔ ابوالدرداء نے کہا "میں نے نبی کریمؐ کو سُنا وہ اس سے منع فرماتے تھے"۔ امیر معاویہؓ نے کہا "میرے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں"۔ یہ سُن کر ابو درداء نے کہا "معاویہ سے کون شخص میری دادرسی کرے گا؟ میں اسے حدیث رسول سناتا ہوں وہ اپنی رائے بیان کرتے ہیں۔ جس علاقہ میں آپ رہتے ہیں میں اس میں بود و باش نہیں رکھوں گا۔" حضرت ابوالدرداءؓ نے دیکھا کہ اُن کے حدیث بیان کرنے سے حضرت معاویہ پر حجت قائم ہو گئی ہے۔ جب جناب معاویہؓ ان سے متفق نہ ہوئے تو ابوالدرداءؓ وہ علاقہ چھوڑ کر چل دیے۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے ایک ثقہ راوی کی روایت کو تسلیم نہ کیا۔

اُنتیسویں دلیل:

حضرت ابوسعید خدریؓ ایک شخص سے ملے اور اسے ایک حدیث سنائی۔ اس شخص نے اس کے خلاف بات کی۔ ابوسعید خدریؓ نے کہا "خدا کی قسم میں ایک چھت کے نیچے تیرے ساتھ نہیں رہوں گا"۔

تیسویں دلیل:

مخلد بن خفاف بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک غلام خریدا جس کی محنت مزدوری سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ پھر میں نے اس میں کچھ نقص پایا۔ میں نے دادرسی کے لیے یہ مقدمہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ

کی عدالت میں پیش کیا۔ آپ نے فیصلہ صادر کیا کہ غلام فروخت کنندہ کو واپس کر دیا جائے اور جو فائدہ آپ نے اٹھایا ہے وہ بھی لوٹا دیں۔ میں نے عُروہ کو اس فیصلہ سے آگاہ کیا۔ عروہ نے کہا میں آج شام عمر بن عبدالعزیز کے یہاں حاضر ہو کر انہیں بتا دوں گا کہ مجھے حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث سنائی ہے کہ آپ نے فرمایا "فائدہ وہی اٹھائے گا جو نقصان کا ذمہ دار ہو" مخلد کہتے ہیں کہ میں نے اسی وقت جا کر عمر بن عبدالعزیز کو حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے آگاہ کیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے کہا:

"خدا شاہد ہے کہ میں نے حق کا ارادہ کیا تھا۔ اب مجھے رسول کریمؐ کی سنت مل گئی ہے لہٰذا میں اپنا فیصلہ واپس لیتا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم نافذ کرتا ہوں۔"

پھر عروہ عمر بن عبدالعزیز کے یہاں گئے۔ تو فرمایا مخلد سے کہیں کہ فروخت کنندہ سے غلام کی کمائی ہوئی رقم واپس لے لے۔

اکتیسویں دلیل:

مجھے مدینہ کے ایک معتمد شخص نے بتایا کہ ابن ابی ذِئب نے کہا سعد بن ابراہیم نے ایک شخص کے خلاف ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن کی رائے کے مطابق فیصلہ صادر کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ حضور اکرمؐ کا فیصلہ اس کے خلاف تھا۔ سعد نے ربیعہ سے کہا کہ یہ ابن ابی ذئب ہے جو ایک ثقہ راوی ہے اس نے مجھے بتایا کہ رسول کریم کا فیصلہ اس کے خلاف تھا۔ ربیعہ نے کہا "آپ نے اجتہاد کیا اور اس کی تعمیل بھی ہو گئی" سعد نے کہا:

"افسوس ہے کہ میں سعد بن اُمّ سعد کے فیصلہ کو تو نافذ کر دوں اور رسول کریم کے حکم کو رَدّ کر دوں۔ میں تو سعد کے فیصلہ کو مسترد کر دوں گا۔ اور حضور کے فیصلہ پہ عمل کروں گا۔"

چنانچہ سعد نے وہ فیصلہ منگوا کر اسے چاک کر دیا اور مدعٰی علیہ کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔

بتیسویں دلیل:

ابو شُریح کعبی روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے روز فرمایا:

"جس قبیلہ کا کوئی آدمی مارا جائے اسے دو باتوں کا اختیار ہے۔ (۱) اگر چاہے تو پاداش وصول کر لے۔ (۲) اور اگر چاہے قصاص لے لے۔ اس حدیث کے ایک

راوی ابن ابی ذئب سے ان کے شاگرد ابو حنیفہ بن سماک نے پوچھا "کیا آپ اس حدیث پر عمل کرتے ہیں؟" یہ سن کر ابن ابی ذئب نے ابو حنیفہ کے سینہ پر ہاتھ مارا۔ زور سے چلانے اور گالیاں دینے لگے۔ پھر غصہ میں بھر کر کہا:

"میں تجھے حدیث رسولؐ سناتا ہوں اور تم پوچھتے ہو کہ کیا تم اسے تسلیم کرتے ہو؟ حدیث کا ماننا مجھ پر فرض ہے اور ہر اس شخص پر جو اسے سنے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سب کائنات سے چنا اور آپ کے ذریعہ ان کو رشد و ہدایت سے بہرہ ور کیا۔ اب مخلوقات کا فرض ہے کہ بخوشی یا ناخوشی آپ کی اطاعت کریں کوئی مسلم اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔"

ابو حنیفہ کہتے ہیں میں اس بات کا آرزومند تھا کہ وہ خاموش ہو جائیں مگر وہ چپ نہ ہوتے تھے۔

امام شافعی فرماتے ہیں خبر واحد کی حجیت سے متعلق اور بھی بکثرت احادیث ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ بیان کردہ روایات اس ضمن میں کافی ہوں گی

تینتیسویں دلیل:

امام شافعی فرماتے ہیں کہ سلف سے لے کر خلف تک ہمیں لاتعداد لوگوں کے نام معلوم ہیں جو خبر واحد کو حجت قرار دیتے تھے۔ اس ضمن میں امام شافعی نے مکہ مدینہ بصرہ کوفہ شام اور مصر کے بکثرت محدثین کے اسماء گرامی ذکر کیے ہیں۔ جن کو خوف طوالت کی بناء پر نظر انداز کیا جاتا ہے یہ محدثین کرام اخبارِ آحاد کو باہم نقل و روایت کرتے ان کو قبول کرتے ان کی روشنی میں فتویٰ دیتے اور ان کو دین میں بلانزاع وجدال حجت قرار دیتے تھے۔

چونتیسویں دلیل:

امام شافعی فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ:

"عصر قدیم و جدید کے سب اہل اسلام کا اس امر پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ خبر واحد دین میں حجت ہے۔ اہل اسلام کے فقہاء میں سے جن کے اسماء معلوم ہیں وہ سب اس کو حجت گردانتے تھے۔"

تو میرے خیال میں یہ درست ہوگا۔ مگر میں (شافعی) محتاط الفاظ میں یوں کہتا ہوں کہ:

"اہل اسلام کے فقہاء میں سے مجھے ایک کا نام بھی معلوم نہیں جو خبر واحد کو حجت تصور نہ کرتا ہو۔ ان کے مابین یہ مسئلہ سرے سے متنازعہ تھا ہی نہیں"

امام شافعی فرماتے ہیں بعض علماء کے بارے میں جو منقول ہے کہ وہ کئی ایک احادیث پر عمل نہیں کرتے تھے تو اس کے کئی وجوہ واسباب ہیں۔

(۱) اس محدث کے نزدیک دوسری کوئی روایت اس کے خلاف ہوگی۔

(۲) اس کا راوی حافظ وضابط نہ ہوگا۔

(۳) راوی متہم بالکذب ہوگا۔

(۴) حدیث میں دو مختلف معنوں کا احتمال ہوگا۔

ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ کوئی سمجھ دار آدمی ایک حدیث روایت کرے اور پھر بلا عذر و تاویل اسے ترک کردے۔ اگر کوئی شخص احادیث کو رد کرنے کی راہ پر گامزن ہوگا تو وہ ایک ایسی غلطی کا ارتکاب کرے گا جس کے لیے وہ کوئی عذر پیش نہیں کرسکتا۔

لب لباب یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے پرزور اسلوب و انداز کتاب و سنت کے براہین ساطعہ اور صحابہ تابعین اتباع تابعین اور فقہاء کے طرز عمل سے ثابت کردیا ہے کہ خبر واحد سے اخذ و احتجاج اور اس کی تعمیل اہل اسلام پر ایک ایسے فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے جو ازبس ناگزیر ہے

(امام شافعی کا بیان ختم ہوا)

فصل پنجم

معتزلہ و متکلّمین اور حدیث نبوی

علماء کے یہاں یہ مسئلہ متنازع فیہا ہے کہ معتزلہ حدیث نبوی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں علماء سے مندرجہ ذیل اقوال منقول ہیں :۔

(۱) معتزلہ جمہور علماء کی طرح حدیث متواتر اور خبر واحد دونوں کو حجت قرار دیتے ہیں۔

(۲) وہ مذکورہ صدر دونوں قسموں کو حجت تصور نہیں کرتے۔

(۳) معتزلہ حدیث متواتر کو حجت سمجھتے ہیں مگر خبر واحد کو نہیں۔

خلاصہ یہ کہ معتزلہ سے اس ضمن میں تین مختلف و متضاد اقوال منقول ہیں۔ چنانچہ امام آمدی ابوالحسین بصری معتزلی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ خبر واحد کو عقلاً حجت قرار دیتا ہے۔

(الاحکام، ج ۲۔ ص ۷۵)

اسی طرح امام مذکور مشہور معتزلی جُبّائی اور متکلمین کی ایک جماعت کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ وہ عقلاً خبر واحد کو حجت تصور نہیں کرتے۔ (الاحکام، ج ۲۔ ص ۶۸)

امام جلال الدین سیوطی ابو علی جبائی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ عادل راوی کی روایت کو اس وقت تسلیم کرتا ہے۔ جب اسی قسم کا دوسرا راوی اس کی تائید کرتا ہو۔ یا ظواہر کتاب و سنت سے اس کی توثیق ہوتی ہو۔ یا صحابہ کے مابین عام طور سے معروف یا معمول بہ ہو ابوالحسین بصری نے بھی المعتمد میں جبائی سے یہی قول نقل کیا ہے۔ بخلاف ازیں ابو نصر تمیمی نے جبائی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خبر واحد کو اس وقت تسلیم کرتا ہے جب کم از کم اس کو چار راویوں نے روایت کیا ہو۔ (تدریب الراوی، ص ۱۷)

امام ابن حزم کا زاویۂ نگاہ :

امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں :۔

"اہل اسلام کے تمام فرقے مثلاً اہل سنت خوارج شیعہ اور قدریہ ایک راوی کی روایت کو جب کہ وہ ثقہ ہو۔ بالاتفاق قبول کیا کرتے تھے یہاں تک کہ پہلی صدی ہجری کے اختتام پر متکلمین معتزلہ کا ظہور و شیوع ہوا اور انہوں نے اجماع کی خلاف ورزی کا آغاز کیا۔ مشہور معتزلی عمرو بن عُبَید حضرت حسن بصری سے منقول روایات پر اعتماد کرتا اور ان کی روشنی میں فتویٰ دیا کرتا تھا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے ایک کم سواد آدمی بھی بے بہرہ نہیں" (الاحکام لابن حزم، ج ۱۔ ص ۱۱۴)

امام ابن حزم ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ معتزلہ علی العموم خبر واحد کی حجیت کے منکر ہیں۔ فرماتے ہیں:

"جمیع معتزلہ و خوارج کا قول ہے کہ خبر واحد یقینی علم کی موجب نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ جس بات میں جھوٹ یا غلط ہونے کا احتمال ہو خدا کے دین میں نہ اُس کے مطابق فیصلہ صادر کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے خدا اور رسول کی جانب منسوب کیا جا سکتا ہے۔" (الاحکام، ج ۱۔ ص ۱۱۹)

امام ابن قیم فرماتے ہیں کہ:۔

"معتزلہ گنہگار مومنین کی شفاعت کے سلسلہ میں وارد شدہ نصوص صریحہ کے ایک ایسی آیت کے پیش نظر رد کر دیتے ہیں جو متشابہات میں شمار ہوتی ہے فرمایا:

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ ۔ — سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کو فائدہ نہ دے گی۔

(اعلام الموقعین، ج ۲۔ ص ۲۲۱)

مذکورہ صدر متخالف و متضاد اقوال اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ معتزلہ کا موقف اس ضمن میں واضح نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے علم الکلام کی کتب کو کھنگالا تاکہ پتہ چل سکے کہ معتزلہ کا اصل موقف کیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ امام ابو منصور بغدادی امام رازی اور صاحب مواقف معتزلہ کے فرقہ نظامیہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک خبر متواتر نہ حجت کے لیے لائق ہے اور نہ اس سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔

چونکہ فرقہ نظامیہ معتزلہ کے بائیس[22] فرقوں میں سے ایک ہے۔ اور حدیث کے بارے میں

ان کا زاویہ نگاہ اس امر پر موقوف ہے کہ صحابہ کے بارے میں وہ کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ امام ابو منصور بغدادی متوفی ۴۲۹ھ اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں معتزلہ کے فرقوں اور صحابہ و حدیث نبوی سے متعلق ان کے موقف کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے وہ نقل کر دوں۔ چنانچہ معتزلہ کے متفق علیہا عقائد کا ذکر کر کے ان کے باہم اختلافی مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔ سب سے پہلے معتزلہ کے فرقہ واصلیہ کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

واصل بن عطاء متوفی ۱۳۱ھ

"معتزلہ کا فرقہ واصلیہ واصل بن عطاء کا معتقد تھا۔ واصل نے سلف کی راہ سے ہٹ کر ایک تیسری راہ ہموار کی۔ تفصیل اس کی اجمال کی یہ ہے کہ واصل کے معاصرین حضرت علیؓ اور ان کے رفقاء نیز حضرت طلحہ و زبیر و عائشہ و دیگر اصحاب جمل رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں مختلف الرائے تھے۔

خوارج یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرات طلحہؓ و زبیرؓ و عائشہؓ اور ان کے اتباع حضرت علیؓ کے خلاف صف آرا ہونے کی بناء پر اسلام کے دائرہ سے نکل گئے جناب علیؓ اصحاب جمل و اصحاب حضرت معاویہؓ کے خلاف نبرد آزما ہونے میں حق بجانب تھے۔ جب انہوں نے تحکیم کو منظور کر لیا تو کافر ٹھہرے۔ اس ضمن میں اہل السنت کا عقیدہ یہ تھا کہ جنگ جمل میں لڑنے والے دونوں فریق مسلمان تھے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت علی اصحاب جمل کے خلاف لڑنے میں جادۂ حق پر گامزن تھے۔ دوسری جانب اصحاب جمل حضرت علیؓ کے خلاف جنگ آزما ہونے کی بناء پر گنہگار تھے۔ مگر ان کی غلطی ایسی نہ تھی جو کفر و فسق کی موجب ہو اور جو ان کو ساقط العدالت قرار دے۔ اہل السنت جنگ جمل میں لڑنے والے فریقین کی شہادت کو قبول کرتے اور اس کے مطابق فیصلہ صادر کرنے کے قائل تھے۔

واصل خوارج اور اہل السنت دونوں کے خلاف رائے رکھتا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ فریقین میں سے ایک ضرور فاسق ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ کون؟ وہ کہا کرتا تھا کہ حضرت علی اور ان کے اتباع مثلاً حضرات حسن و حسین و ابن عباسؓ

عمار بن یاسر و ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم بھی فاسق ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فریق ثانی میں سے حضرات طلحہ و زبیر عائشہ و دیگر اصحاب جمل رضی اللہ عنہم فاسق ہوں (العیاذ باللہ)

واصل اپنے نظریہ کے اثبات میں کہا کرتا تھا کہ اگر حضرت علیؓ و طلحہؓ یا حضرت علیؓ و زبیرؓ یا اصحاب علی میں سے ایک شخص اور اصحاب جمل میں سے دوسرا شخص مل کر میرے پاس کسی ادباش آوارہ مزاج آدمی کے خلاف شہادت دیں تو میں ان کی شہادت قبول نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ میرے نزدیک دونوں میں سے ایک (بلا تعیین) ضرور فاسق ہے۔ جس طرح کہ دو لعان کرنے والوں کی شہادت میرے یہاں اس لیے مقبول نہیں کہ دونوں میں سے ایک بلا تعیین فاسق ہے البتہ کسی ایک فریق کے خلاف دو آدمی شہادت دیں تو میں ان کی شہادت قبول کر دوں گا۔"

(الفرق بین الفرق۔ صفحہ ۷۱، ۷۲)

عَمرو بن عُبَید :

امام بغدادی معتزلہ کے فرقہ عمرویہ (اتباع عمرو بن عبید) کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"عمرو بن عُبید نے واصل بن عطاء کی مذکورہ صدر بدعت میں اور بھی اضافہ کیا چنانچہ اس نے کہا کہ جنگ جمل میں لڑنے والے دونوں فریق فاسق ہیں۔ اس لیے دونوں میں سے کسی فریق کی شہادت مقبول نہیں۔

واصل بن عطاء اور عمرو کے بعد معتزلہ کے فرقہ قدریہ کے یہاں اس مسئلہ میں اختلاف رونما ہو گیا تھا چنانچہ معتزلی علماء میں سے نظّام مُعمر اور جاحظ جنگ جمل میں لڑنے والے فریقین کے بارے میں واصل کی رائے سے متفق تھے۔ بخلاف ازیں حوشب و ھاشم یہ عقیدہ رکھتے تھے "جنگ جمل کے قائدین نجات یافتہ ہیں اور اُن کے اتباع برباد ہو گئے۔" (الفرق بین الفرق)

ابو الھُذَیل :

امام ابو منصور بغدادی فرماتے ہیں کہ معتزلہ کا فرقہ ھُذَلیہ ابو الھذیل علاف متوفی ۲۲۷ھ کا

۲۳۵ھ کا عقیدت کیش تھا - امت مسلمہ کے تمام فرقے بالاتفاق اس کے کفر کے قائل ہیں - حتیٰ کہ معتزلہ بھی اس کو کافر قرار دیتے ہیں - معتزلی علماء میں جُبائی و جعفر بن حرب نے اس کی تکفیر کی اور اس کے رسوائے عالم اقوال و افعال کے سلسلہ میں مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں -

امام مذکور نے ابوالھذیل کے رسوائے عالم افکار و آراء کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے :

"انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور دیگر غیر محسوس امور کے بارے میں احادیث و اخبار سے حجت اس وقت قائم ہوتی ہے جب راویوں کی تعداد بیس[20] سے کم نہ ہو اور ان میں کم از کم ایک شخص جنتی ہو کافر و فاسق لوگ تعداد میں کتنے بھی ہوں ان کی مرویات سے حجت قائم نہیں ہوتی - خواہ وہ متواتر کی حد تک پہنچ جائیں - جن کا جھوٹ پر جمع ہونا ممکن نہیں جب تک ان میں کم از کم ایک راوی جنتی نہ ہو"

ابوالھذیل کا قول ہے کہ چار[4] سے کم اشخاص کی روایت کی بنیاد پر فیصلہ صادر نہیں کیا جاسکتا جب راوی چار سے زائد ہوں اور ان کی تعداد بیس[20] تک پہنچ جائے تو بعض اوقات ان کی روایت سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے اور گاہے نہیں حاصل ہوتا - جب بیس[20] رواۃ در رجال میں ایک شخص جنتی بھی ہو تو ان کی روایت سے لامحالہ یقینی علم حاصل ہوتا ہے -

بیس راویوں کی روایت کے حجت ہونے پر اس نے آیت کریمہ :

اگر تم میں بیس آدمی صابر ہوں -

سے استدلال کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ بیس مجاہدین کو جہاد کی اجازت اسی لیے دی گئی ہے کہ ان کا قول حجت ہے - امام ابومنصور بغدادی فرماتے ہیں :

"ابوالھذیل نے اخبار و احادیث کی مقبولیت کے بارے میں جو یہ شرط لگائی ہے کہ بیس[20] راوی ہوں اور ان میں ایک راوی جنتی ہو - اس سے اس کا بڑا مقصد شرعی احکام کے ضمن میں وارد شدہ روایات کا ٹھکرانا ہے - جنتی ہونے سے اس کی مراد یہ ہے کہ وہ راوی معتزلہ اور قدریہ میں سے ہو - کیونکہ جو شخص اس کا ہم خیال نہ ہو وہ اس کے زعم میں نہ مومن ہو سکتا ہے نہ جنتی - مزید براں ابوالھذیل سے پہلے کوئی شخص (قدریہ و معتزلہ ہونے میں) اس کا ہم خیال نہ تھا - لہٰذا اس کے

قول کے مطابق ایسا شخص بیس راویوں میں سے کیوں کر ہو سکتا ہے؟"

(الفرق بین الفرق، ص ۷۷)

نظّام :

امام ابو منصور بغدادی پھر ابو اسحٰق بن سیّار المعروف نظّام کے اتباع فرقہ نظامیہ کا ذکر کرتے اور بتاتے ہیں کہ زنادقہ و فلاسفہ کے ساتھ اختلاط و امتزاج کی وجہ سے نظّام کے عقائد بگڑ گئے تھے۔ ذیل میں نظّام کے عقائد فاسدہ کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے :

(۱) نظّام سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا منکر ہے۔ چنانچہ وہ حضور کے اس معجزہ کو تسلیم نہیں کرتا کہ چاند آپ کے لیے پھٹ گیا تھا۔ یا کنکریوں نے آپ کے ہاتھ میں تسبیح کہی تھی۔ یا پانی آپ کی انگلیوں سے پھوٹنے لگا تھا۔ معجزات سے انکار کا اصل مقصد آپ کی رسالت و نبوت کو تسلیم نہ کرنا ہے۔

(۲) نظّام دین اسلام کے جزوی و فروعی مسائل کو ناگوار سمجھتا ہے مگر کھل کر ان کے انکار کی جسارت نہیں کر سکتا۔ اس لیے وہ ان طرق و ذرائع کا ابطال کرتا ہے جن سے وہ ثابت ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اجماع و قیاس کو حجت تصوّر نہیں کرتا۔

(۳) اسی کے پیش نظر نظّام ان احادیث و اخبار کو حجت قرار نہیں دیتا جن سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا۔

(۴) نظّام جلیل القدر صحابہ اور محدثین و فقہاء کے فتاوی کو تسلیم نہیں کرتا اور ان پر معترض ہوتا ہے۔

بقول امام ابو منصور بغدادی اکثر معتزلہ مذکورہ صدر عقائد کی بناء پر نظّام کی تکفیر کرتے ہیں۔ معتزلہ کی نہایت قلیل ترین تعداد ان گمراہانہ عقائد میں نظّام کی ہمنوا ہے۔ اگرچہ معتزلہ میں سے اسواری ابن خابط، فضل حدثی اور جاحظ اس کے پیرو ہیں تاہم اکثر عقائد میں اس کے ساتھ متفق نہیں ہیں شیوخ معتزلہ میں سے ابو الہذیل جبائی، اسکافی اور جعفر بن حرب نظّام کی تکفیر کرتے ہیں اور انھوں نے اس کے گمراہانہ عقائد کی تردید پر مستقل کتب تصنیف کی ہیں۔

امام بغدادی نظّام کے بعض رسوائے عالم گمراہانہ افکار و آراء پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"نظام کا سولھواں غلط عقیدہ یہ ہے کہ خبر متواتر کے رُواۃ و ناقلین اگرچہ عدد و حصر سے باہر ہوتے ہیں اور ان کے دواعی و محرکات بھی یکساں نوعیت کے نہیں ہوتے تاہم ہو سکتا ہے کہ وہ جھوٹی ہو۔ دوسری جانب اس کا کہنا ہے کہ بعض اخبار آحاد سے بھی یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ اسی غلط عقیدہ کی اساس پر ہمارے اصحاب اور نظام کے ہم خیال معتزلہ نے بھی متفقہ طور پر اس کی تکفیر کی ہے۔"

آگے چل کر امام بغدادی نظام کا سترھواں عقیدۂ فاسدہ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"نظام کی رائے میں تمام اَدوار و اَعصار میں رائے و استدلال کے لحاظ سے غلط مسئلہ پر اجماع منعقد ہو سکتا ہے۔"

بقول امام بغدادی اس عقیدہ فاسدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ اجماعی مسائل و احکام سے بالکل اعتماد اُٹھ جائے۔ اس لیے کہ نظام کے نزدیک ان کا غلط اور بعید از صواب ہونا ممکن ہے۔ چونکہ شرعی احکام و مسائل میں سے بعض احادیث متواترہ سے ماخوذ ہیں۔ بعض اخبار آحاد سے اور بعض قیاس و اجتہاد سے اور نظام خبر متواتر اجماع اور قیاس میں سے کسی کو بھی حجت نہیں سمجھتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اخبارِ آحاد جب مفیدِ یقین نہ ہوں تو وہ ان کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ شریعت کے فروعی احکام انہی طُرق و ذرائع سے ثابت ہوتے ہیں۔ بنا بریں نظام ان ذرائع کا ابطال کر کے گویا شریعت کے فروعی احکام کو جھٹلاتا اور ان کا انکار کرتا ہے۔"

بعد ازاں امام بغدادی نظام کا اکیسواں عقیدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مذکورہ صدر عقائد فاسدہ کے علاوہ نظام صحابہ کے مبنی بر اجتہاد فتاویٰ کی وجہ سے صحابہ و تابعین کی مرویات پر معترض ہوتا ہے۔ چنانچہ جاحظ اپنی تصنیفات میں بیان کرتا ہے کہ نظام محدثین پر نقد و جرح کرتا ہے کہ وہ ابوہریرہ سے روایات نقل کرتے ہیں حالانکہ وہ سخت[1] جھوٹا شخص تھا۔ نظام حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر طعن کیا کرتا تھا کہ وہ صلح حُدَیبیہ کے دن اپنے دین کے بارے میں شک کرتے

---

[1] ہم آگے چل کر جس فصل میں استاذ احمد امین کی تردید کریں گے وہاں اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے احمد امین نے یہ اعتراض نظام معتزلی اور عصر حاضر کے مستشرقین سے چرایا ہے۔

لگے تھے ۔ اسی طرح حضورؐ کی وفات کے دن بھی (آنحضورؐ کی رحلت کے بارے میں) وہ مبتلائے شک ہو گئے تھے ۔ نظّام کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو زدوکوب بھی کیا تھا ۔ بقول نظام حضرت عمرؓ نے نصر بن حجاج کو مدینہ سے بصرہ کی طرف نکال دیا تھا ۔ نماز تراویح کی بدعت بھی حضرت عمرؓ نے ایجاد کی ۔ آپ نے حج تمتع سے روکا اور یہ حکم صادر کیا کہ کوئی عجمی، عربی عورت سے نکاح نہیں کر سکتا ۔

نظّام نے حضرت عثمان کو بایں طور ہدف تنقید بنایا ہے کہ انہوں نے حکم بن العاص کو مدینہ میں ٹھہرایا اور ولید بن عقبہ کو کوفہ کا گورنر بنایا ۔ ولید کا یہ عالم تھا کہ شراب کے نشہ میں سرشار لوگوں کو نماز پڑھاتا تھا ۔ سعید بن العاص کی شادی کے موقع پر اس کو چالیس ہزار درہم کا عطیہ دیا ۔ بلاوجہ ایک چراگاہ اپنے لیے مخصوص کر لی ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف یہ بہتان تراشا کہ ایک دفعہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ اگر کوئی گائے گدھے کو ہلاک کر دے تو اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے ؟ حضرت علیؓ نے فرمایا " میں اس ضمن میں اپنی رائے سے فتویٰ دوں گا " نظام کہتا ہے کہ " حضرت علی اپنی رائے سے فتویٰ دینے والے کون ہیں ؟ "

نظّام نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر یہ جرح کی کہ موصوف نے بروع بنت واشق کے واقعہ میں کہا کہ میں اس ضمن میں اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا ۔ اگر درست ہوا تو بتوفیق ربانی ہوگا اور اگر غلط ہوا تو میری جانب سے ہو گا ۔ بقول نظام ابن مسعود کو یہ حق حاصل نہیں تھا ۔ نظام کہتا ہے کہ ابن مسعودؓ کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت کہ " خوش نصیب وہ ہے جو بطن مادر سے خوش نصیب ہو، اور بدبخت وہ ہے جو ماں کے پیٹ میں بدنصیب ہو " جھوٹی روایت ہے ۔ اسی طرح چاند کے پھٹ جانے اور واقعہ جن سے متعلق بھی ابن مسعود کی روایت درست نہیں ۔

نظّام اپنی کتاب میں لکھتا ہے :

" صحابہ میں سے جو لوگ اپنی رائے سے فتویٰ دیتے تھے یا تو وہ اس کے جواز

کے قائل تھے اور حکم بالرائے کی حرمت سے آشنا نہ تھے۔ اور ریا اپنے مذہب ومسلک کے رئیس تھے اور خواہش نفس کو دین کے معاملہ میں ترجیح دیتے تھے۔"

(الفرق بین الفِرَق، ص ۸۹--۹۰)

امام بغدادی لکھتے ہیں:

"نظام نے صحابہ کی جانب جو جہل ونفاق کی نسبت کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جلیل القدر صحابہ بقول اس کے ابدی جہنمی ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص دینی احکام سے بے بہرہ ہے نظام کے نزدیک کافر ہے۔ اور جو شخص بلا دلیل دینی احکام کی دانستہ خلاف ورزی کرتا ہے منافق کافر یا فاسق و فاجر ہے اور ایسے لوگ دائمی جہنمی ہیں۔"

یہ ہیں وہ افکار وآراء جن کا اظہار امام ابومنصور بغدادی نے کیا ہے۔ امام شہرستانی صاحب الملل والنحل متوفی ۵۴۸ھ بھی اکثر امور میں امام بغدادی کے ہمنوا ہیں۔ ان بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ صحابہ کے بارے میں معتزلہ تین فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔

(۱) معتزلہ کا ایک گروہ ظہور فتنہ کے زمانہ سے لے کر صحابہ کی عدالت میں شک وشبہ کا اظہار کرتا ہے جیسے واصل۔

(۲) معتزلہ میں سے عمرو بن عُبَید اور اس کے ہم خیال صحابہ کو بالیقین کافر قرار دیتے ہیں۔

(۳) نظام اور اس کے رفقاء جلیل القدر صحابہ پر دروغ گوئی اور جہل ونفاق کا بہتان لگاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ معتزلہ صحابہ کرام سے مروی ومنقول روایات کو تسلیم نہیں کرتے۔ واصل بن عطاء عمرو بن عُبَید اور ان کے ہم فکر و نظر معتزلہ یہی رائے رکھتے ہیں۔ ابوالہذیل کے نزدیک خبر واحد سے کوئی شرعی حکم اس صورت میں ثابت ہوتا ہے جب اس کی نقل و روایت کرنے والے کم از کم بیس اشخاص ہوں اور ان میں سے ایک معتزلی ہو۔ نظام اجماع و قیاس کو حجت تصور نہیں کرتا اور خبر متواتر کی قطعیت کا منکر ہے۔

سابقہ بیانات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ جمہور اہل اسلام کے خلاف معتزلہ نے حدیث نبوی کے متعلق جو عجیب و غریب موقف اختیار کیا تھا اس نے علمائے حدیث اور رؤساء

معتزلہ کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف بہتان طرازی کرنے لگے۔ چنانچہ معتزلی یہ کہتے کہ محدثین جھوٹی اور بے بنیاد احادیث روایت کرتے ہیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ بعض مرویات کو وہ سمجھتے بھی نہیں۔ معتزلہ نے اس ضمن میں عجیب و غریب کہانیاں بیان کی ہیں جو عام محدثین کے بارے میں تو صحیح ہو سکتی ہیں مگر بلند پایہ محدثین کا دامن ایسی باتوں سے پاک ہے۔ ہم آگے چل کر امام ابو حنیفہ کے حالات بیان کرتے وقت اس کا ذکر کریں گے

اس کے عین برخلاف محدثین کا کہنا یہ تھا کہ معتزلہ فاسق و فاجر اور بدعتی ہیں۔ وہ دین کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہیں جس کی سرے سے کوئی دلیل و برہان موجود ہی نہیں۔ امام ابن قتیبہ اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" میں اور بغدادی اپنی تصنیف "الفرق بین الفرق" میں نظام کے مندرجہ ذیل نظریات بیان کرتے ہیں :-

(۱) کنایہ پر مشتمل الفاظ استعمال کرنے سے طلاق واقع نہیں ہو سکتی۔

(۲) جو شخص شرمگاہ و شکم کا نام لے کر اپنی بیوی سے ظہار کرے وہ مظاہر (ظہار کرنے والا) نہ ہو گا۔

(۳) اگر ریح خارج نہ ہو تو صرف سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

(۴) جو شخص دانستہ فرضی نماز ترک کر دے تو اس کا قضا کرنا نہ درست ہے نہ واجب۔

بقول امام ابن قُتَیبہ نظام معتزلی آوارہ مزاج تھا اور ہر وقت نشہ میں مخمور رہا کرتا تھا۔

مشہور معتزلی ثمامہ بن اشرس نے مامون کے عہد خلافت میں فتنہ خلق قرآن کی قیادت کی تھی۔ ثمامہ نے دیکھا کہ جمعہ کے دن لوگ بھاگم بھاگ جامع مسجد کی جانب جا رہے تھے کہ کہیں نماز جمعہ نہ جاتی رہے۔ ثمامہ یہ دیکھ کر اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگے "دیکھو یہ لوگ کس طرح گدھوں اور بیلوں کی طرح بھاگے جا رہے ہیں۔" پھر بولا اس عربی (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کی کیا گت بنا دی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

(تاویل مختلف الحدیث۔ ص ۲۱)

کچھ یوں نظر آتا ہے کہ ابن قتیبہ اور بغدادی اگرچہ معتزلہ کے دشمن تھے تاہم ان کا یہ بیان رؤسائے معتزلہ کے بارے میں صحیح ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معتزلہ چنداں دین دار نہ تھے، اور

محرمات کے ارتکاب سے بھی ان کو کوئی باک نہ تھا۔ جاحظ کا شمار ائمہ معتزلہ میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی تصنیف "کتاب المضاحک" میں لکھتا ہے :-

"مامون ایک دن سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ مشہور معتزلی ثمامہ نشہ میں مدہوش کیچڑ میں پڑا ہے۔ مامون نے پوچھا "کیا تم ثمامہ تو نہیں؟ ثمامہ نے کہا" ہاں! بخدا" مامون نے کہا" تجھے شرم نہیں آتی" اس نے کہا" نہیں خدا کی قسم" مامون نے کہا :

تجھ پر خدا کی پھٹکار" ثمامہ نے کہا۔ خدا کی پھٹکار مجھ پر بار بار اور پے در پے ہو"۔

منقول ہے کہ ایک دن ثمامہ کے غلام نے اس سے نماز پڑھنے کے لیے کہا۔ ثمامہ بدستور بیٹھا رہا غلام نے کہا" وقت تنگ ہو گیا ہے اس لیے نماز پڑھ کر آرام کریں" ثمامہ نے کہا" آپ مجھ سے کچھ نہ کہیں تو میرے لیے باعث راحت ہو گا" (الفرق بین الفرق ص ۱۰۴)

ہر کیف یہ تھے وہ حالات جن کے پیش نظر محدثین و معتزلہ کے مابین نزاع و جدال کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ۲۱۸ھ میں خلیفہ مامون نے فتنہ خلق قرآن کا بیڑا اٹھایا۔ جس کے زیر اثر لوگوں کو اس عقیدہ کے قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ محدثین کرام نے اس عظیم فتنہ کے دوران دفاع عن الحق کا فریضہ ادا کیا اور طرح طرح کی صعوبات بلکہ قید و بند اور اپنی جانیں تک دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ امام سنت احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اس ضمن میں تیرہ سال قید و بند اور مار پیٹ کے مصائب و آلام برداشت کیے۔

اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اس دور میں علمائے حدیث کس حد تک جور و ستم سے دوچار ہوئے۔ جور و استبداد کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۲۳۲ھ میں متوکل باللہ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ خلیفہ اہل سنت کا ہم خیال تھا۔ اس نے لوگوں کو عظیم فتنہ سے نجات دلائی اور محدثین کی عزت افزائی کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معتزلہ ہمیشہ کے لیے دب گئے اور پھر اس کے بعد کبھی نہ اٹھ سکے محدثین کرام اور معتزلہ کے درمیان جو نزاع بپا ہوئی تھی۔ حدیث کے سلسلہ میں اس سے دو بڑے اہم

نتائج برآمد ہوئے۔

پہلا نتیجہ:

روسائے معتزلہ نے حضرات صحابہ کی قدر و منزلت میں جو رخنہ پیدا کر دیا تھا اس سے گستاخ اور متعصب مستشرقین کو یہ موقع ملا کہ حمایت و نصرت دین کا فریضہ ادا کرنے والے صحابہ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کریں۔ اور نظام جیسے دیگر معتزلی علماء کے نقش قدم پر چل کر صحابہ کو جھوٹے اور دین کا مذاق اڑانے والے قرار دیں۔ حیرت ہے کہ دور حاضر کے بعض مصنفین استاذ احمد امین وغیرہ بھی مستشرقین کی ہموار کردہ راہ پر گامزن ہو گئے۔

دوسرا نتیجہ:

دوسری بات یہ ہے کہ جمہور معتزلہ حنفی المسلک تھے اور امام ابوحنیفہؒ اور آپ کے اصحاب کے پیرو تھے۔ حتیٰ کہ بشر مریسی جو اپنے عصر و عہد میں معتزلہ کا سرخیل تھا۔ قاضی ابویوسف کے فقہی مسلک کا متبع تھا۔ جب اس نے خلق قرآن کے عقیدہ کا اظہار کیا تو قاضی ابویوسف اس سے الگ ہو گئے۔

(الفرق بین الفرق ص ۱۲۴)

جب محدثین و معتزلہ کے مابین نزاع و جدال کا آغاز ہوا تو محدثین نے قائلین خلق قرآن کو علی العموم ہدف جرح و تنقید بنایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض غالی محدثین نے قول بالرائے کی اساس پر اکثر اصحاب ابی حنیفہ کو مجروح قرار دیا۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ ان کے دشمن معتزلہ حنفی المسلک تھے۔ دگر ہیچ اس کی حد یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ تک اپنے بعد میں آنے والے محدثین کے تیر نقد و جرح سے بچ نہ سکے اور ان کو عقیدہ خلق قرآن کا قائل قرار دیا گیا۔ (تانیب الخطیب ص ۵۲)

حقیقت اس کے برعکس ہے۔ امام موصوف ہرگز یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ بخلاف ازیں محمد بن حسن کہا کرتے تھے "جو کسی معتزلی کی اقتداء میں نماز پڑھے وہ اپنی نماز لوٹائے"!

امام ابویوسف سے جب معتزلہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا "وہ زندیق ہیں"

(الفرق بین الفرق ص ۱۰۳)

خلاصہ یہ کہ اس معرکہ کے نتیجہ میں ایسے مسلم ائمہ کو بھی اس میں ملوث کر دیا گیا جو اس میں سرے سے شریک ہی نہ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر تین عباسی خلفاء فتنہ اعتزال کو ہوا نہ دیتے تو شاید یہ چنگاری اس قدر فروزاں نہ ہوتی۔ مگر ؎ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

فصل ششم

حدیث نبوی و مصنفین عصر حاضر

ہم قبل ازیں حدیث نبوی کے سلسلہ میں بعض فرقہ ہائے اسلامی اور ایک معاصر کے شکوک و شبہات اور حجیت حدیث سے انکار کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ اب ہم حدیث نبوی پر یورش کرنے والے ایک اور گروہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ جو مستشرقین کے ساختہ پرداختہ تھے۔ مگر مستشرقین نے حدیث نبوی پر جو حملہ کیا تھا ان لوگوں کا حملہ اس سے مختلف تھا۔ مستشرقین کا حملہ کھلا ہوا تھا۔ بخلاف ازیں ان لوگوں نے علم و ادب کی اوٹ لے کر حملہ کیا اور کھل کر سامنے آنے سے اجتناب کیا۔ یہ پرفریب طریقہ عوام الناس کے غیظ و غضب سے بچنے کے لیے اختیار کیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اثر و نتیجہ کے اعتبار سے یہ بدترین طریق کار اور قوی ترین ہتھیار ہے۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔

احمد امین مصری مرحوم:

عصر حاضر میں جو ادباء انکار حدیث کی روش پر رواں دواں ہوئے ان میں استاذ احمد امین کا نام سرفہرست ہے۔ استاذ موصوف دار القضاء الشرعی کے فارغ التحصیل اور آرٹس کالج کے سابق پرنسپل تھے۔ فجر الاسلام۔ ضحی الاسلام اور ظہر الاسلام آپ کی مشہور تصانیف ہیں فجر الاسلام کا موضوع حدیث نبوی ہے۔ مصنف نے اس میں زہر اور گھی اور حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ چنانچہ اب میں بتاؤں گا کہ مصنف نے کس طرح اسلامی حقائق کو توڑ مروڑ کر جادۂ صدق و صواب سے انحراف کیا اور کبار صحابہ و تابعین کو نقد شدید کا نشانہ بنایا ہے۔

فجر الاسلام کی فصل الحدیث کا خلاصہ:

استاذ احمد امین نے اپنی تصنیف "فجر الاسلام" میں حدیث نبوی سے متعلق ایک مستقل فصل تحریر کی ہے جو ۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس فصل میں استاذ مذکور نے حدیث نبوی کی جمع و تدوین اور اس کی شرعی وقعت و اہمیت پر قلم اٹھایا ہے۔ اس فصل

میں بیان کردہ افکار و نظریات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ حدیث نبوی عہد رسالت میں مدوّن نہیں ہوئی۔ البتہ بعض صحابہ ذاتی طور پر کچھ حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے۔

۲۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ دو قسموں میں بٹ گئے تھے۔ صحابہ کی ایک جماعت کثرتِ تحدیث کے خلاف تھی اور راوی سے بیان کردہ حدیث کی صحت کی دلیل طلب کیا کرتی تھی۔ صحابہ کی دوسری جماعت کثیر الروایۃ تھی۔

۳۔ احادیث کو کسی خاص کتاب میں مدوّن نہ کرنے اور صرف حافظہ پر اعتماد کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدیثیں وضع کی جانے لگیں اور اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دروغ بافی کی داغ بیل پڑ گئی۔ بقول احمد امین حضورؐ پر جھوٹ باندھنے کا آغاز عہد رسالت ہی میں ہو گیا تھا۔

۴۔ مختلف اقوام کے مشرف باسلام ہونے سے وضع حدیث میں اور اضافہ ہوا کثرتِ وضع کا یہ عالم تھا کہ امام بخاری نے "صحیح بخاری" کو چھ لاکھ ایسی احادیث سے مرتب کیا جو آپ کے عصر و عہد میں عام طور سے رائج تھیں۔

۵۔ اسباب وضع کا ذکر کرتے ہوئے احمد امین لکھتے ہیں کہ اس دور میں لوگ صرف انہی علوم کے شائق تھے جن کا کتاب و سنّت سے قریبی تعلق ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء حدیثیں وضع کرنے والوں کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔

۶۔ محدثین نے احادیث کی سند کے سلسلہ میں جس نقد و جرح کا اہتمام کیا تھا متنِ حدیث کے ضمن میں اس کا عُشرِ عشیر بھی نہیں کیا۔

۷۔ کثیر الروایۃ صحابہ کے ضمن میں حضرت ابو ہریرہؓ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"وہ لکھا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے حافظہ سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے بعض اوقات وہ ایسی حدیثیں بھی بیان کرتے جو بذاتِ خود بلا واسطہ انہوں نے آپ سے نہیں سنی تھیں۔"

یہی وجہ ہے کہ بعض صحابہ ان کی مرویات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کو شدید

تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔

۸۔ تدوینِ حدیث کے مختلف تاریخی ادوار کے ذکر و بیان پر احمد امین نے اس بحث کو ختم کیا ہے
تدوینِ حدیث کے ادوار میں امام بخاری، مسلم اور اصحاب صحاح ستہ تک کا ذکر آگیا ہے۔
یہ ہے "فجر الاسلام" کی فصل "الحدیث" از صفحہ ۲۰۵ تا ۲۴۸ کا خلاصہ! احمد امین کے نظریات
پر تنقید کرنے سے قبل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ استاذ موصوف کے حدیث نبوی سے متعلق آراء و افکار
نے بڑی شہرت حاصل کی چنانچہ مصر کے ایک ملحد اسماعیل ادہم نامی نے ۱۳۵۳ھ میں حدیث نبوی کی
تاریخ سے متعلق ایک رسالہ شائع کیا۔ اس میں علانیہ ذکر کیا کہ حدیث کا جو ذخیرہ ہمارے پاس
موجود ہے۔ اور جو احادیث کتب صحاح ستہ میں مندرج ہیں سب بے بنیاد مشکوک اور من گھڑت
ہیں۔ مصر کے دین پسند لوگوں نے بالاتفاق اس رسالہ کی اشاعت پر اظہار غیظ و غضب کیا۔ یہاں
تک کہ شیخ الازہر کی خواہش پر مصری حکومت اس رسالہ کے ضبط کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اور مصنف
نے اپنی مدافعت میں ایک خط ایک اسلامی ماہنامے (الفتح عدد ۴۹۴ ص ۱۲) کو لکھا۔

اسماعیل ادہم نے مذکورہ خط میں تحریر کیا تھا کہ حدیث نبوی کے بارے میں میں نے جن خیالات
کا اظہار کیا ہے میں اُن میں منفرد نہیں ہوں۔ بلکہ کبار علماء و ادباء کی ایک جماعت اس باب میں میری
ہمنوا ہے۔ اسماعیل نے بتایا کہ استاذ احمد امین نے مجھے ایک خط لکھ کر اس نظریہ کی تائید کی ہے۔ ہم
منتظر رہے کہ استاذ احمد امین خط لکھ کر اس زعم کا ابطال کریں گے۔ مگر افسوس کہ موصوف نے ایسا نہ
کیا۔ بلکہ ایک ہفتہ وار ادبی رسالہ میں اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ لوگوں نے بلا وجہ اسماعیل ادہم
کے خلاف احتجاج کیا۔ ان کے خیال میں یہ احتجاج حریت فکر و نظر کے منافی تھا اور اس سے علمی کاوش
و تحقیق کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

جب ۱۳۶۱ھ کو جامع ازہر میں ڈاکٹر علی حسن عبد القادر کے امام زہری سے متعلق نظریات کے
خلاف بحث و نظر کا آغاز ہوا تو استاذ احمد امین نے ڈاکٹر موصوف سے کہا کہ جامع ازہر میں آزاد علمی
افکار کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس لیے مستشرقین کے جو اقوال آپ مناسب سمجھیں
وہ لے لیں۔ مگر صراحتہً ان اقوال کو ان کی طرف منسوب نہ کریں۔ بلکہ ان کو اپنے آزاد افکار کی حیثیت
سے ایسے رفیق و لطیف انداز میں پیش کریں کہ سننے والے گھبرا نہ جائیں۔ میں نے "فجر الاسلام" اور

"ضحی الاسلام" میں یوں ہی کیا ہے۔"

میں نے یہ بات بذات خود ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر سے سُنی۔ نظر بریں جب ہم حدیث نبوی سے متعلق احمد امین کے پیدا کردہ شکوک وشبہات اور اسلامی حقائق کی تحریفات کو ہدف تنقید بناتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان پر الزام تراشی کر کے ایک بے گناہ کو مجرموں کے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں۔ بخلاف ازیں ہمارا شمار ان لوگوں میں ہوگا۔ جو ایک شبہات کے جال میں گرفتار حقیقی مجرم کی تحقیقِ حال کے لیے دلائل جمع کرتے ہیں۔ بنابریں احمد امین نے اپنی کتاب "فجر الاسلام" میں حدیثِ نبوی اور اس کی تاریخ سے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر میری نقد وجرح اسی حقیقت کی روشنی میں ہوگی۔ میں نے استاذ احمد امین کی زندگی میں چند مضامین شائع کیے تھے۔ استاذ موصوف نے وہ مضامین ملاحظہ کیے۔ اور اس امر کا اعتراف کیا تھا۔ کہ ان کی کتاب "فجر الاسلام" پر یہ اولین علمی تنقید ہے[1]

کیا عہد رسالت میں وضع حدیث کا آغاز ہو چکا تھا؟

استاذ احمد امین "فجر الاسلام" میں وضع حدیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کچھ یوں نظر آتا ہے کہ وضعِ حدیث کا آغاز عہدِ رسالت میں ہو گیا تھا۔ مثلاً یہ حدیث کہ "جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنا لے" ظنِ غالب یہ ہے کہ یہ حدیث کسی ایسے واقعہ کے سلسلہ میں ارشاد کی گئی ہے۔ جس میں آپ پر جھوٹ باندھا گیا تھا۔" (فجر الاسلام ص ۲۵۸)

استاذ احمد امین نے جو بات کہی ہے تاریخ سے اس کی سند نہیں ملتی۔ اور نہ قابل اعتماد کتب میں تحریر ہے کہ یہ حدیث آپ نے ایسے موقع پر ارشاد فرمائی۔

تاریخ اسلام سے یہ بات قطعی ویقینی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ عہد رسالت میں ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ کہ آپ کے صحبت یافتہ کسی مسلم نے کوئی بات گھڑ کر آپ کی طرف منسوب کر دی اور اس حیثیت سے روایت کی ہو کہ وہ آپ کی فرمودہ حدیث ہے۔ اور اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آتا تو اس

---

[1] جب ہم مشہور مجلہ الفتح کے فاضل ایڈیٹر علامہ محب الدین الخطیب کے دفتر میں بیٹھے تھے تو یہ بات مجھے نامور محقق ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی نے بتائی تھی (مصنف)

کی قباحت وشناعت کی وجہ سے صحابہ علی العموم اس کو نقل کرتے۔ اس لیے کہ صحابہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہر بات کے نقل کرنے کے شیدائی تھے۔ اس کی حد یہ ہے کہ آنحضورؐ کے سونے جاگنے اٹھنے بیٹھنے لباس اور سر مبارک کے سفید بالوں تک کا ذکر کرتے ہیں۔

احادیث صحیحہ پر مشتمل معتمد کتب اس امر پر متفق ہیں کہ مذکورہ صدر حدیث آپ نے اس وقت ارشاد فرمائی۔ جب اپنی احادیث کو بعد میں آنے والے لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیا۔

۱۔ امام بخاری حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک آیت بھی ہو تو مجھ سے سُن کر آگے پہنچادو۔ اور بنی اسرائیل کی روایات بیان کیجئے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے (صحیح بخاری)

۲۔ حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"مجھ سے سُن کر مت لکھو جس نے قرآن کے سوا کوئی بات مجھ سے سن کر لکھی ہو وہ مٹا ڈالے۔ میری حدیثیں روایت کریں اس میں کوئی حرج نہیں۔ جس نے دانستہ مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے۔" (صحیح مسلم)

۳۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضورؐ نے فرمایا:

"میری وہی حدیث روایت کرو۔ جو تمہیں اچھی طرح معلوم ہو جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ بولا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے" (ترمذی)

۴۔ حضرت ابوموسیٰ غافقیؓ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے آخری عہد یہ لیا کہ:

کتاب اللہ کا دامن تھامے رکھو تمہارا گزر ایک ایسی قوم پر ہوگا جو احادیث کو چاہتی ہوگی۔ یاد رکھو! جس نے مجھ پر وہ بات تھوپ دی جو میں نے نہیں کہی وہ اپنا گھر دوزخ میں بنالے۔ اور جس کو کوئی حدیث یاد ہو۔ وہ بے شک بیان کرے

(مسند احمد۔ مشکل الآثار۔ امام طحاوی جلد ا ص ۱۷۱)

دیگر محدثین نے بھی اس سے ملتی جلتی روایات ذکر کی ہیں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ اسلام اکناف عالم میں پھیلے گا اور مختلف اقوام اس میں داخل ہوں گی۔ بنابریں آپ نے صحابہ کو متنبہ کر دیا تھا کہ روایت حدیث میں احتیاط سے کام لیا جائے۔ اور آپ پر جھوٹ باندھنے سے احتراز کیا جائے۔ یہ خطاب صحابہ سے کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ صحابہ آپ کے بعد آپ کے اقوال کو امت تک پہنچانے والے اور آپ کی رسالت و نبوت کے گواہ تھے۔ کسی روایت میں ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں۔ کہ یہ حدیث آپ نے اس وقت ارشاد فرمائی جب کسی نے آپ پر جھوٹ باندھا تھا۔

مگر اس ضمن میں دو روایتیں اور بھی منقول ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ حدیث "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ" جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے اس کی وجہ وہ نہ تھی جو قبل ازیں بیان کی گئی ہے۔

پہلی روایت :

امام طحاوی مشکل الآثار میں بُریدہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص ایک قوم کے یہاں گیا جو مدینہ کی ایک جانب سکونت پذیر تھی۔ اس نے کہا مجھے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ فلاں معاملہ میں میں اپنا فیصلہ صادر کروں۔ قبل ازیں دورِ جاہلیت میں اس نے ایک عورت کا رشتہ طلب کیا تھا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ اب کے وہ اس عورت کے خاندان میں جا کر قیام پذیر ہوا۔ لوگوں نے کسی کو بھیج کر آنحضورؐ سے حقیقت حال دریافت کی آپؐ نے فرمایا "دشمن خدا نے جھوٹ بولا" پھر آپ نے ایک شخص کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "اگر اس شخص کو زندہ پاؤ تو اسے قتل کر دو"۔ مگر تم اسے زندہ نہ پاؤ گے"۔ اگر اسے مردہ پاؤ تو اسے جلا دو" چنانچہ وہ شخص جب پہنچا تو دیکھا کہ وہ سانپ کے ڈسنے سے مر چکا تھا۔ اس نے اسے جلا دیا۔ تب آپ نے فرمایا "جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا۔ وہ اپنا گھر دوزخ میں بنا لے۔"

(مشکل الآثار ج ۱ ص ۱۶۴)

دوسری روایت :

حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسا لباس پہنا اور مدینہ کے ایک خاندان کے یہاں جا کر کہا کہ مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے حکم دیا ہے کہ جس گھر میں چاہوں چلا جاؤں۔ گھر والوں نے اسے ایک کمرہ میں بٹھا کر آنحضورؐ کو اطلاع دی۔ آپ نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ رضی اللہ عنہما سے کہا کہ اس کی طرف جاؤ۔ اگر اسے زندہ پاؤ تو قتل کر کے آگ میں جلا دو۔ اور اگر مردہ پاؤ ——— اور میرا خیال ہے کہ تم اُسے مردہ ہی پاؤ گے۔ تب بھی اسے جلا دو۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ وہاں تشریف لائے تو پتہ چلا کہ وہ رات کو پیشاب کے لیے نکلا اور ایک سانپ کے ڈسنے سے مر گیا۔ چنانچہ دونوں اُسے جلا کر آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا:

"جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا گھر دوزخ میں بنا لے" (طبرانی فی الاوسط)

مذکورہ صدر دونوں روایات پر کئی طرح سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔

۱۔ دونوں روایات کا متن منکر ہے اور ان پر موضوع ہونے کے علامات نمایاں ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و اخلاق سے بعید ہے کہ آپ مُردوں کو جلانے کا حکم صادر کریں حدیث کی قابل اعتماد کتب میں ایک واقعہ بھی ایسا مذکور نہیں ہے۔

۲۔ دونوں کی سند ضعیف ہے اور ان کے راویوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کی روایت قبول نہیں کی جاتی۔ اسی لیے امام سخاوی نے اس قصہ کو موضوع (خود ساختہ) اور غیر صحیح کہا ہے۔

۳۔ ان روایتوں کو اگر صحیح بھی فرض کیا جائے تو ان سے واضح ہوتا ہے کہ ایک دنیوی کام کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا گیا تھا۔ جو دروغ گو کی ذات تک محدود تھا۔ ایسا نہیں ہوا کہ دین کے کسی معاملہ سے متعلق حدیث کو گھڑ کر عام مسلمانوں کے سامنے اس کو حدیث رسول کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہو۔ ایک دنیوی واقعہ میں دروغ گوئی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عہد رسالت ہی میں حدیث رسول میں وضع کا آغاز ہو گیا تھا۔ خصوصاً جب کہ یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی واقعہ ہے اور دوسرا کوئی واقعہ اس ضمن میں منقول نہیں ہے۔

۴۔ دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ انجام دینے والا ایک مجہول (غیر معروف) شخص ہے جو صحابہ میں شامل نہیں اس لیے صحابہ کی صداقت کو مشکوک قرار دینے کے

لیے اس میں کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔

مندرجہ صدر بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ حدیث

کا سبب خواہ وہ ہو جو عام معتمد کتب حدیث میں مذکور ہے یا وہ جو ان دونوں غیر صحیح روایتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ کسی صورت میں بھی اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وضع حدیث کا آغاز عہدِ رسالت میں ہو گیا تھا۔ لہٰذا دونوں روایتوں سے اس سلسلہ میں استدلال قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔ خصوصاً جب کہ اس کا اولین نتیجہ یہ ہے کہ اس میں اصحابِ رسول کی جانب دروغ گوئی کو منسوب کیا گیا ہے۔ یہ بات خلافِ واقعہ اور اصحاب کرام کی تاریخ کے منافی ہے۔ جب کہ شیعہ اور خوارج معتزلہ کو چھوڑ کر جمہور اہل اسلام ان کی عدالت علی الاطلاق کے قائل ہیں۔

نظر بریں اگر استاذ احمد امین کا مقصد یہ ہے کہ وہ خوارج و معتزلہ کی رائے کو اپنی تائید میں پیش کر کے حضرت ابوہریرہ اور دیگر صحابہ کو ہدفِ تنقید بنانے کی تمہید قائم کرنا چاہتے اور حدیث نبوی کی عمارت میں اولین رخنہ پیدا کرنے کے خواہاں ہیں تو یہ بات جادۂ حق و صداقت سے بعید ہے۔ استاذ موصوف نے اتنے بڑے دعوٰی کی بنیاد ایسے ظنی دلائل پر رکھی ہے جو نہ تاریخ صحیح سے ثابت ہے اور نہ حدیث نبوی سے۔

استاذ موصوف کے حق میں انصاف کی بات تو یہ ہے کہ یہ نظریہ ان کی اپنی ذہنی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ معانی و مطالب تو در کنار اس کے الفاظ تک ایک خطبہ سے ماخوذ ہیں جو "نہج البلاغۃ" میں حضرت علی کی جانب منسوب ہے۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۱۳)

اس کے بعد استاذ احمد امین نے خطبہ مذکورہ کی توضیح کے سلسلہ میں نہج البلاغۃ کی شرح ابن ابی الحدید (مشہور شیعہ عالم کی تصنیف) سے پورے دو صفحے نقل کیے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ استاذ موصوف اس خطبہ سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ یہاں سے ہمیں استاذ احمد امین اور غالی شیعہ کی باہم یک رنگی و ہم آہنگی کا پتہ چلتا ہے۔ اگر شیعہ صحابہ کرام کی زندگی کو اس لیے داغدار کرنا چاہتے ہیں تاکہ حضرت علی کی امامت اور ان کے بعد میں آنے والے آئمہ کی معصومیت ثابت ہو سکے۔ تو احمد امین صحابہ کو اس لیے متہم کرنا چاہتے ہیں تاکہ حدیث نبوی کو شکوک و شبہات کی آماجگاہ بنا دیا جائے۔

کتب تفسیر میں منقول احادیث :

احمد امین فجر الاسلام میں رقمطراز ہیں:

"کثرتِ وضع کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہو گی کہ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں :

"میرے نزدیک ان میں سے کوئی روایت صحیح نہیں"

حالانکہ کتب تفسیر میں ہزاروں حدیثیں منقول ہیں۔ صحیح بخاری کل سات ہزار احادیث پر مشتمل ہے جن میں سے تین ہزار مکرر ہیں۔ محدثین کا قول ہے کہ آپ نے یہ احادیث چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب کی تھیں جو آپ کے عصر و عہد میں عام طور سے متداول تھیں"

(فجر الاسلام ص ۲۵۹)

موضوعات کی کثرت سے مجالِ انکار نہیں۔ مگر احمد امین دو باتوں سے کثرتِ وضع پر استشہاد کرتے ہیں۔

۱- کتب تفسیر میں منقول احادیث

۲- صحیح بخاری کی احادیث

امام احمد کا مقولہ نقل کر کے احمد امین یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کتب تفسیر میں منقول جملہ روایات مشکوک ہیں۔ حالانکہ ان میں سینکڑوں احادیث موجود ہیں۔ امام احمد کا منصب و مقام علم حدیث میں محتاج بیان نہیں اس لیے احمد امین یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ کتب تفسیر میں ذکر کردہ روایات اگر موضوع نہیں تو مشتبہ ضرور ہیں۔ یہ امام احمد کے قول کا منطقی نتیجہ ہے۔ ہم دو باتوں میں استاذ احمد امین کی طرز فکر پر تنقید کرنا چاہتے ہیں۔

۱- کتب تفسیر میں مندرج احادیث کی حقیقت کیا ہے۔؟

۲- امام احمد کا مقولہ کہاں تک صحیح ہے۔؟

تفسیری روایات کی حقیقت :

کتب حدیث کا مطالعہ کرنے والے پر یہ حقیقت خوب عیاں ہے کہ ان میں مندرج اکثر احادیث بلاشک و شبہ صحیح ہیں۔ حدیث کی ہر کتاب میں ایک باب ان تفسیری روایات کے لیے مخصوص کیا گیا ہے جو رسول کریمؐ صحابہ و تابعین سے مروی و منقول ہیں۔ مفسرین کرام نے قرآن کریم

کی تفسیر کرنے والے کے لیے ضروری ٹھہرایا ہے کہ قرآن کی تشریح کرتے وقت آنحضورؐ سے منقول روایات پر اعتماد کرے۔

مفسرِ اعظم امام ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"خداوند کریم نے جو کتاب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اس کی تاویل و تفسیر آپ کی جانب رجوع کیے بغیر معلوم نہیں کی جا سکتی۔ قرآن کریم میں امر و نہی یا مندوب و مستحب سے متعلق جو امور مذکور ہیں وہ آنحضورؐ کی معرفت ہی معلوم کیے جا سکتے ہیں" (تفسیر ابن جریر ج ۱ ص ۲۶)

امام ابوحیان صاحبِ تفسیر البحر المحیط مفسر کے لوازم و شرائط بیان کرتے ہوئے چوتھی شرط یہ بیان کرتے ہیں کہ:

"مبہم کی تعیین بیان مجمل سبب نزول اور نسخ یہ جملہ امور احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتے ہیں جو آنحضورؐ سے منقول ہوتی ہے۔ یہ احادیث ان معتبر کتب میں موجود منقول ہیں جو ہم نے سنیں اور روایت کیں۔ مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم جامع ترمذی سنن ابی داؤد و دیگر کتبِ حدیث"

امام سیوطی نے الاتقان میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

"معلوم ہونا چاہیئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو قرآن کریم کے مطلب و معانی بتا دیئے تھے جس طرح ان کو اس کے الفاظ سے آگاہ کیا تھا چنانچہ آیت لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔" میں یہی حقیقت بیان فرمائی ہے"۔

امام زرکشی فرماتے ہیں:

قرآن کریم کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ آیات جن کی تفسیر نبی کریمؐ اور یا اصحاب و تابعین سے منقول ہے۔

۲۔ وہ آیات جن کی تفسیر آنحضورؐ اور صحابہ سے منقول نہیں۔"

مندرجہ صدر بیان سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ مفسرین نے تفسیر کو دو قسموں میں منقسم کیا ہے۔

۱- تفسیر منقول۔

۲- غیر منقول تفسیر۔

علماء نے مفسر کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ تفسیری روایات سے باخبر ہو۔ اگر کوئی تفسیری روایت یا اکثر روایات صحیح نہ ہوتیں تو مفسرین اس کو لازمی قرار نہ دیتے۔ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ قرآن کی تفسیر صرف آنحضورؐ کے اقوال کی روشنی ہی میں کی جا سکتی ہے۔

امام سیوطی الاتقان میں لکھتے ہیں۔

"لوگ اس ضمن میں مختلف الرائے ہیں کہ آیا ہر شخص قرآن کی تفسیر میں غور و فکر کر سکتا ہے یا نہیں؟ ایک جماعت کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ ایک شخص اگرچہ عالم و فاضل ادیب و فقیہ نحوی اور اخبار و آثار کا ماہر ہی کیوں نہ ہو وہ قرآن کی تفسیر کا مجاز نہیں۔ اِلّا یہ کہ وہ آنحضورؐ کی احادیث سے قرآن کی تفسیر و توضیح کرتا ہو"

مذکورہ بالا قول اگرچہ قابل اعتماد نہیں ہے تاہم اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر میں ایسے اقوال ضرور منقول ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ان سے انکار کرنے کی گنجائش ہے یہاں تک کہ امام شافعی رحمۃ اللہ نے مختصر البویطی میں ذکر کیا ہے کہ:

"آیات متشابہات کی تفسیر حدیث رسول اقوالِ صحابہ اور اجماعِ علما کے بغیر نہیں کی جا سکتی"

البتہ یہ بات درست ہے کہ جن آیات کی تفسیر آنحضورؐ سے منقول ہے۔ ان آیات کی نسبت قلیل العدد ہیں جن کی تفسیر آپ سے منقول نہیں ہے۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ تفسیری روایات میں سے صحیح کم ہے اور غیر صحیح زیادہ۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ کوئی تفسیری روایت بھی صحیح نہیں۔

تفسیری روایات کے بارے میں امام احمد کا جو قول ذکر کیا گیا ہے۔ وہ دراصل حسب ذیل ہے۔

ثَلَاثَةٌ لَيْسَ لَهَا أَصْلٌ اَلتَّفْسِيْرُ وَالْمَلَاحِمُ وَالْمَغَازِيْ — تین باتوں کی کوئی اصل نہیں۔ تفسیر۔ ملاحم اور مغازی۔

اور ایک روایت یوں ہے:

ثَلَاثُ كُتُبٍ لَا اَصْلَ لَهَا۔ اَلْمَغَازِيْ وَالْمَلَاحِمُ وَالتَّفْسِيْرُ

تین قسم کی کتابوں کی کوئی اصل نہیں۔ مغازی[1]، ملاحم[2] اور تفسیر[3]۔

اس مقولہ کے بارے میں کئی طرح سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔

۱۔ اس قول کی صحت مشکوک ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ امام احمد نے مسند میں بذاتِ خود بہت سی تفسیری روایات نقل کی ہیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ امام احمد اپنے شیوخ و اساتذہ سے اخذ کر کے ایسی روایات اپنی مسند میں ذکر کریں۔ اور پھر خود ہی یہ فیصلہ صادر فرمادیں کہ تفسیر قرآن سے متعلق کوئی روایت بھی صحیح نہیں۔ اس قول کا حاصل یہ ہے کہ اخبارِ عرب اور مغازی کے بارے میں جو کچھ منقول ہے سب جھوٹ کا پلندہ ہے۔ حالانکہ ایک شخص بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ صحت کی نفی کرنے سے تفسیری روایات کا موضوع یا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا۔ یہ ایک جانی پہچانی بات ہے کہ امام احمد نے چند احادیث کو غیر صحیح قرار دیا ہے حالانکہ ان کا شمار مقبول روایات میں ہوتا ہے۔ محدثین اس کی تاویل میں کہتے ہیں کہ یہ جنابِ امام کی مخصوص اصطلاح ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحی لکھنوی اپنی کتاب الرفع والتکمیل میں لکھتے ہیں:

محدثین اکثر کہتے ہیں کہ فلاں روایت صحیح نہیں یا ثابت نہیں" اس سے ایک کم علم آدمی یہ تاثر لیتا ہے کہ فلاں روایت موضوع یا ضعیف ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایسا شخص محدثین کی اصطلاحات سے بیگانہ ہے۔ مولانا علی قاریؒ تذکرۃ الموضوعات میں لکھتے ہیں:

"کسی روایت کے غیر ثابت ہونے سے اس کا موضوع ہونا لازم نہیں آتا"

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ "نتائج الافکار" میں لکھتے ہیں:

امام احمد کے بارے میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا میرے علم کی حد تک وضو سے قبل بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔ میں (ابن حجر)

کہتا ہوں کہ امام احمد کو علم نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ایسی روایت واقعۃً موجود ہی نہیں۔ دیگر یہ کہ ثبوت کی نفی سے اس حدیث کا ضعیف ہونا لازم نہیں آتا کیوں کہ ممکن ہے کہ ثابت نہ ہونے سے ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ صحیح نہیں۔ لہٰذا اس میں حدیث حسن کی نفی نہیں کی گئی (اس لیے اس حدیث کے حسن ہونے کا احتمال موجود ہے۔ (الرفع والتکمیل)

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ امام احمد نے یہ نہیں کہا کہ "تفسیری روایات میں سے کچھ بھی صحیح نہیں" بخلاف اس کے آپ نے یہ فرمایا ہے۔ کہ "تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں" دراصل آپ نے تین علوم سے متعلق بعض مخصوص کتب کے بارے میں یہ مقولہ ارشاد فرمایا ہے۔ ایک روایت کے مطابق آپ کے قول میں "ثلاثۃ کتب" کی تصریح بھی موجود ہے۔ شہرۂ آفاق محدث خطیب بغدادی نے بھی امام احمد کے قول کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ بغدادی فرماتے ہیں

"امام احمد کا مقولہ دراصل علوم سہ گانہ کی مخصوص کتب سے متعلق ہے۔ اس ضمن میں سب سے مشہور کلبی اور مقاتل بن سلیمان کی دونوں کتب ہیں۔ کلبی کی تفسیر کے بارے میں امام احمد کا قول ہے کہ:

"از اول تا آخر جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اس کا دیکھنا حلال نہیں"

۴۔ ممکن ہے کہ جناب امام کا مقصد یہ ہو کہ تفسیری روایات میں سے صحیح کم ہیں اور غیر صحیح زیادہ۔ کثیر اہل علم نے امام احمد کے قول کا یہی مطلب قرار دیا ہے۔ الاتقان میں امام سیوطی نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ:

"احادیث کی وہ قسم جس میں سے صحیح حدیثوں کو پہچانا جا سکتا ہے بکثرت ہے اگرچہ امام احمد کا قول یہ ہے کہ تین چیزوں کی کوئی اصل نہیں۔ آپ کا یہ ارشاد بجا ہے۔ اس لیے کہ تفسیری روایات زیادہ تر مرسل ہیں"

علامہ زرکشی البرہان میں رقمطراز ہیں:

جو شخص قرآن کریم کی تفسیر و تاویل کا طلب گار ہو وہ بہت سے مصادر و مآخذ سے استفادہ کر سکتا ہے۔ مگر ان میں سے چار مصادر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان چار میں

میں اولین و اساسی ماخذ حدیث رسول ہے جس کی حیثیت سنگ میل سے کم نہیں۔
تاہم ضعیف اور موضوع روایات سے احتراز واجب ہے۔ اس لیے کہ وہ بہت ہیں
اور امام احمد کا مقولہ اس ضمن میں معروف ہے کہ تین قسم کی کتب بے اصل ہیں۔ وہ
مغازی و ملاحم اور تفسیری روایات پر مشتمل کتب ہیں۔ محققین حنابلہ کا قول ہے کہ
امام احمد کا مقصود اس سے یہ تھا کہ اکثر تفسیری احادیث صحیح اور متصل سند کے
ساتھ مروی و منقول نہیں۔ ورنہ بہت سی تفسیری روایات صحیح بھی ہیں۔"

خلاصہ یہ کہ تفسیر قرآن میں وارد شدہ جملہ احادیث کو مشکوک ثابت کرنے کے سلسلہ میں امام احمد کے قول سے استدلال و استناد درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث کی امہات الکتب مثلاً بخاری و مسلم و مؤطا و ترمذی بلکہ خود مسند امام احمد تک میں ایسی تفسیری احادیث بکثرت موجود ہیں۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا امام بخاری رحمۃ اللہ نے صحیح بخاری میں جملہ احادیث صحیحہ کا احاطہ کیا ہے۔ استاذ احمد امین نے دعویٰ کیا ہے کہ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث میں سے احادیث صحیحہ کو منتخب کر کے صحیح بخاری کو مرتب کیا تھا۔ محل بحث و نزاع یہاں دو امور ہیں۔

امر اول:

پہلا سوال یہاں یہ ہے کہ اس دور میں کتنی احادیث لوگوں میں عام طور سے رائج تھیں؟
اس میں شبہ نہیں کہ امام بخاری کے عصر و عہد میں چھ لاکھ سے بھی زائد احادیث لوگوں میں رائج تھیں
امام احمد سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

"احادیث صحیحہ کی تعداد سات لاکھ سے زیادہ ہے اور اس جوان (ابوزرعہ) کو سات لاکھ حدیثیں یاد ہیں۔"

مگر سوال یہ ہے کہ احادیث کی اس ہولناک کثرت کا مطلب کیا ہے۔؟

۱۔ آیا جملہ احادیث کا مفہوم و موضوع الگ الگ ہے؟ یا تعدد طرق کی وجہ سے احادیث کی تعداد اس حد تک بڑھ گئی؟

۲۔ دوسرے یہ کہ آیا یہ آنحضورؐ کی فرمودہ احادیث ہیں یا صحابہ وتابعین کے اقوال و آثار ہیں؟ ان سوالات کا جواب دینے سے قبل ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ محدثین کے یہاں "حدیث" اور "خبر و اثر" کے معنی و مفہوم میں کیا نزاع و اختلاف پایا جاتا ہے۔

حدیث:

محدثین کی ایک جماعت کی رائے میں "حدیث" وہ قول ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہو۔ اس تعریف کے بارے میں لفظ "حدیث" علی الاطلاق حدیث مرفوع پر بولا جاسکتا ہے "موقوف" پر لفظ حدیث کا اطلاق اس وقت کیا جائے گا جب کوئی قرینہ موجود ہو۔

خبر:

باقی رہا لفظ "خبر" تو اس کا اطلاق مرفوع و موقوف دونوں پر یکساں طور پر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اقوال صحابہ وتابعین سب شامل ہیں۔ نظر بریں ہر حدیث کو خبر کہہ سکتے ہیں۔ مگر ہر خبر حدیث نہیں کہلا سکتی۔

محدثین کی دوسری جماعت یہ نظریہ رکھتی ہے کہ لفظ حدیث مرفوع و موقوف دونوں قسم کی مرویات کو شامل ہے۔ بنابریں حدیث و خبر کے الفاظ ہم معنی ہیں۔

اَثَر:

اثر و خبر کے الفاظ مترادف ہیں اور ان کے مابین کوئی معنوی فرق نہیں پایا جاتا۔ اس لیے اثر میں مرفوع و موقوف روایات سب شامل ہیں۔ البتہ فقہائے خراسان موقوف کو اثر کہتے ہیں اور مرفوع کو خبر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ (توجیہ النظر ص ۳)

کثرت احادیث کا راز:

یہ ہے حدیث۔ اثر اور خبر کی اصطلاحات میں محدثین کا اختلاف! اس اختلاف کو سامنے رکھتے ہوئے احادیث نبویہ کے چھ سات لاکھ کی ہیبت ناک کثرت تک پہنچ جانے کا راز بھی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں آنحضورؐ سے منقول روایات اور اقوالِ صحابہ وتابعین سب شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک ہی حدیث کو جن مختلف و متعدد طُرق سے روایت کیا جاتا ہے وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ بعض اوقات محدث ایک ہی حدیث کو مختلف اسانید کے ساتھ

روایت کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ صحابی و تابعی سے روایت کرنے والے متعدد راوی ہوتے ہیں۔ محدث ان تمام طُرق کو جمع کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ وہ طرق و اسانید بعض اوقات دس تک پہنچ جاتے ہیں اور محدث ان کو دس حدیثیں شمار کرتا ہے۔ حالانکہ دراصل وہ ایک ہی حدیث ہوتی ہے۔ مشہور محدث ابراہیم بن سعید جوہری کہا کرتے تھے۔

"جو حدیث میرے نزدیک سو طرق سے منقول نہ ہو تو میں اس میں یتیم ہوں"

(تانیب الخطیب ص ۱۵۱)

نظر بریں جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی فعلی اور تقریری احادیث کو اقوال صحابہ و تابعین کے ساتھ یکجا کیا جائے اور اس کے پہلو بہ پہلو احادیث و اقوال کے مختلف و متعدد طرق کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو ان کے لاکھوں تک پہنچ جانے میں قطعی طور پر حیرت و استعجاب کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

علامہ شیخ طاہر الجزائری فرماتے ہیں:

"ہم نے جو بات کہی ہے کہ بعض محدثین مرفوع و موقوف دونوں پر لفظ حدیث کا اطلاق کرتے ہیں اس سے یہ اشکال زائل ہو جاتا ہے کہ احادیث اس قدر کثیر العدد کیوں کر ہو سکتی ہیں؟ بعض لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو سات لاکھ احادیث صحیحہ یاد ہیں تو اس پر اظہار تعجب کرنے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اتنی احادیث کہاں سے آگئیں اور وہ ہم تک کیوں نہ پہنچیں، اور حفاظ حدیث نے ان کو کس لیے نقل و روایت نہ کیا؟ آخر محدثین کے لیے اس کی وجہ جواز کیا تھی کہ انہوں نے آنحضورؐ سے ثابت شدہ روایات کو نظر انداز کر دیا۔ حدیث نبوی کے ساتھ محدثین نے جو اعتناء و اہتمام کیا ہے اور جس کی شہرت بھی بہت ہے اس کا تقاضا تھا کہ وہ امکانی حد تک کسی روایت کو ترک نہ کرتے۔"

ہم ایسے معترض کو محدثین کے ان اقوال سے آگاہ و آشنا کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے احادیث کے عدد و شمار کے بارے میں ارشاد فرمائے ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

"احادیث صحیحہ کی تعداد سات لاکھ سے زائد ہے اور اس جوان (ابو زرعہ) کو سات لاکھ حدیثیں یاد ہیں"

مشہور محدث امام بیہقی فرماتے ہیں کہ:

"امام احمد کی مراد اس سے احادیث اور اقوالِ صحابہ و تابعین ہیں"

حافظ ابو بکر محمد بن عمر رازی کا قول ہے:

"ابو زرعہ کو سات لاکھ احادیث اور چالیس ہزار دیک صد تفسیری اقوال ازبر تھے"

امام بخاری سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

"مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح یاد ہیں"

امام مسلم نے فرمایا:۔

"میں نے صحیح مسلم کو ایسی تین لاکھ احادیث سے مرتب کیا جو میں نے خود سنی تھیں"

آیت قرآنی:

وَلَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ‏ اور تم سے نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائیگا

میں "النعیم" سے متعلق مفسرین کے دس اقوال ہیں۔ ان سے ہر قول بطریق عموم حدیث کہلاتا ہے۔ اسی طرح:۔

يَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ کے لفظ الماعون کے بارے میں مفسرین کے چھ اقوال ہیں۔ چھٹے قول کو چھوڑ کر پانچوں اقوال کو حدیث کہتے ہیں۔ (توجیہ النظر ص ۳ نیز فتح الملہم ج ۱ ص ۲)

مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ محدث ابو زرعہ کو چالیس ہزار دیک صد تفسیری روایات کیوں کر یاد تھیں۔ کثرتِ احادیث کے بارے میں جس حیرت کا اظہار کیا جاتا ہے وہ ان بیانات سے دور ہو جاتی ہے۔

امر ثانی:

استاد احمد امین نے "فجر الاسلام" میں دعویٰ کیا ہے کہ امام بخاری کے عصر و عہد میں چھ لاکھ احادیث زبان زد عام تھیں۔ ان میں سے کل چار ہزار (بحذف مکررات) حدیثیں تھیں۔ جو آپ نے صحیح بخاری میں جمع کر دیں۔

افسوس ہے کہ محدثین کے یہاں وہ بات معروف نہیں جو استاذ موصوف نے کہی ہے۔ بخلاف ازیں علمائے حدیث یہ جانتے ہیں کہ امام بخاری کے نزدیک جو احادیث صحیح تھیں

وہ سب آپ نے صحیح بخاری میں جمع نہیں کیں۔

محدث ابن الصلاح مقدمہ میں فرماتے ہیں۔

امام بخاری و مسلم نے اپنی اپنی کتاب میں تمام احادیث صحیحہ کو جمع نہیں کیا اور نہ اس بات کی پابندی اپنے پر عائد کی۔ چنانچہ ہم نے امام بخاری سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا۔

"میں نے اپنی کتاب میں صرف احادیثِ صحیحہ درج کی ہیں اور بہت سی احادیث کو خوفِ طوالت سے چھوڑ دیا ہے۔"

امام مسلم نے فرمایا،

"میں نے اپنی کتاب میں تمام احادیث صحیحہ شامل نہیں کیں۔ بلکہ صرف وہی حدیث اس میں شامل کی ہے جس کی صحت پر علماء کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔" (مقدمہ علوم الحدیث ص ۱۰)

مشہور محدث حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

"بخاری و مسلم نے جملہ احادیث صحیحہ کو اپنی کتب میں جمع کرنے کا التزام نہیں کیا بخلاف ازیں دونوں نے ایسی احادیث کو بھی صحیح قرار دیا ہے۔ جو ان کی کتب میں مندرج نہیں ہیں۔ محدث ترمذی امام بخاریؒ سے نقل کرتے ہیں کہ موصوف نے ایسی احادیث کی بھی تصحیح کی ہے جو صحیح بخاری میں مذکور نہیں بلکہ دیگر کتب سنن میں پائی جاتی ہیں۔" (اختصار علوم الحدیث ص ۹-۱۰)

محدث حازمی اپنی تصنیف "شروط الائمۃ الخمسہ" میں لکھتے ہیں:

"امام بخاری نے تمام احادیث صحیحہ کو جمع کرنے کی پابندی نہیں کی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ محمد بن حمدویہ کہتے ہیں میں نے امام محمد بن اسماعیل بخاری کو یہ کہتے سنا کہ "مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں اور دو لاکھ غیر صحیح" بسند دیگر امام بخاری کا یہ قول نقل کیا کہ "میں نے اپنی کتاب میں صرف احادیث صحیحہ جمع کی ہیں اور جو صحیح حدیثیں میں نے چھوڑ دی ہیں وہ زیادہ ہیں۔" (شروط الائمۃ الخمسہ ص ۴۷)

جب علمائے حدیث اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ امام بخاری نے اپنی تصنیف میں تمام احادیث صحیحہ کو جمع کرنے کا اہتمام نہیں کیا۔ نیز یہ کہ آپ ایک لاکھ احادیث صحیحہ کے حافظ تھے

تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ استاذ احمد امین نے جو بات نقل کی ہے وہ درست نہیں ہے۔ یہ اس صورت میں ہے جب احمد امین کے نزدیک یہ علماء کا قول ہو۔ اور اگر یہ اہل علم کا قول نہیں بلکہ اس کے قائل عوام الناس یا طلبہ ہیں تو یہ امر دیگر ہے۔ مگر موقع محل کے پیش نظر یہ اہل علم کا قول ہونا چاہیئے۔

کیا عبداللہ بن مبارک روایت حدیث میں سہل انگار تھے؟

احمد امین فجر الاسلام صفحہ ۲۶۰ پر وضاعین (حدیثیں وضع کرنے والے) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حدیثیں وضع کرنے والوں میں بعض صادق النیت بھی تھے۔ جو حدیث انہیں ملتی اسے صحیح سمجھ کر اپنی بیاض میں لکھ لیتے۔ اپنے طور پر وہ سچے بھی تھے اس لیے جو حدیث سنتے اسے (بلا تحقیق) روایت کر دیتے۔ اور لوگ ان کی صدق بیانی کے دام فریب میں آکر اس روایت کو قبول کر لیا کرتے تھے۔ اس کی مثال میں عبداللہ بن مبارک کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ:

ثقہ اور راست گفتار تھے مگر ہر آنے جانے والے سے روایت لے لیا کرتے تھے"

احمد امین فجر الاسلام کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک سے متعلق یہ قول صحیح مسلم میں موجود ہے۔" (فجر الاسلام ص۲۶۰)

اس ضمن میں گذارش یہ ہے کہ احمد امین نے واضعینِ حدیث کے ذکر و بیان کے سلسلہ میں یہ بات کہی ہے۔ وضاع حدیث اس شخص کو کہتے ہیں۔ جو کسی ذاتی غرض کے لیے کوئی حدیث خود گھڑ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دے۔ جن اغراض و مقاصد کے پیش نظر حدیثیں وضع کی جاتی تھیں۔ ان کا ذکر ہم نے اس کتاب کے مناسب مقامات پر کیا ہے۔ جہاں تک اس شخص کا تعلق ہے۔ جو نیک نیت ہو اور جو حدیث اسے ملے۔ (کسی ذاتی غرض کے بغیر) اپنی کتاب میں اسے جمع کر لے۔ ایسا شخص واضعِ

حدیث نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اس نے سند و متن میں سے کسی میں بھی دروغ گوئی کا ارتکاب نہیں کیا۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غافل مزاج ہے اور بلا نقد و جرح حدیث کو قبول کر لیتا ہے۔ ایسے راوی کی روایت کو چھان پھٹک کے بغیر قبول نہیں کرنا چاہیے۔

اگر وہ ثقہ راویوں سے حدیث نقل کرے اور دوسرے ثقہ راوی بھی روایتِ حدیث میں اس کے ہمنوا ہوں تو اس کی روایت قبول کی جائے گی، ورنہ نہیں۔ البتہ استاذ احمد امین کی طرح اس کو وضاعین کے زمرہ میں شمار کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں۔ اور یہ تعبیر و بیان میں لاپرواہی اور بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ واضعینِ حدیث کے سلسلہ میں عبداللہ بن مبارک کا ذکر کرنے سے قاری یہ تاثر لے سکتا ہے کہ شاید وہ بھی واضعین میں شامل ہیں۔ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے استاذ احمد امین کے بیان سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ عبداللہ بن مبارک ایک نیک طینت شخص تھے جو حدیثیں سن کر جوں کا توں اُن کو آگے پہنچا دیتے اور ان پر نقد و تبصرہ نہیں کیا کرتے تھے۔

۲۔ لوگ ان کی صداقت بیانی کے دھوکہ میں آکر جو حدیث بھی اُن سے سنتے صحیح سمجھ کر قبول کر لیتے۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ صحیح مسلم سے جو عبارت استاذ امین نے نقل کی ہے وہ عبداللہ بن مبارک سے متعلق ہے۔

اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ استاذ احمد امین کے یہ تینوں نظریات بے بنیاد اور غلط ہیں اب علی الترتیب ہم ان تینوں باتوں پر تنقید کرتے ہیں۔

۱۔ عبداللہ بن مبارک نقادِ حدیث تھے:

استاذ احمد امین کا یہ قول کہ "عبداللہ بن مبارک سادہ لوح تھے اور جو حدیث سنتے بیان کر دیا کرتے تھے" حق و صداقت سے بعید ہے۔ اس لیے کہ عبداللہ بن مبارک اپنے زمانہ کے ان مشاہیر ائمہ حدیث میں سے تھے جو نقد حدیث میں خاص شہرت کے حامل تھے۔ چنانچہ امام

مسلم نے مقدمہ صحیح مسلم میں عبداللہ بن مبارک کی تنقید شدید کی چند مثالیں بیان کی ہیں۔ جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ امام مسلم بسند خود ابراہیم بن عیسیٰ طالقانی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مبارک سے کہا کہ یہ حدیث جو زبان زد عام ہے کہ "یہ بہت بڑی نیکی ہے کہ جب تو نماز پڑھے یا روزہ رکھے تو اپنے والدین کے لیے بھی یہ عبادت انجام دے" عبداللہ بن مبارک نے کہا "وہ تو ثقہ ہے مگر وہ کس سے روایت کرتا ہے؟" میں نے کہا "حجاج بن دینار سے" ابن مبارک نے کہا "وہ بھی ثقہ ہے وہ کس سے روایت کرتا ہے؟" میں نے کہا "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے" ابن مبارک نے کہا "حجاج بن دینار آنحضورؐ سے کیوں کر روایت کر سکتے ہیں۔ اس کے اور آپؐ کے درمیان اتنی مسافت حائل ہے کہ سواریوں کی گردنیں (تھک کر) ٹوٹ جائیں اور وہ طے نہ ہو۔ (یعنی حجاج بن دینار آنحضورؐ کی وفات کے بعد پیدا ہوا پھر وہ آپ سے روایت کیوں کر کر سکتا ہے؟) جناب ابن مبارک نے فرمایا کہ حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے مگر مفہوم درست ہے۔ اس لیے کہ صدقہ دینے میں کسی کا اختلاف نہیں۔

۲۔ امام مسلم علی بن شقیق کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مبارک سے سنا وہ علانیہ لوگوں کے سامنے کہہ رہے تھے کہ:

"عمرو بن ثابت سے حدیث روایت نہ کیا کرو۔ اس لیے کہ وہ اسلاف کو بُرا بھلا کہا کرتا تھا"

۳۔ امام مسلم احمد بن یوسف ازدی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عبدالرزاق سے سنا وہ کہتے تھے کہ عبداللہ بن مبارک "عبدالقدوس" کے سوا کبھی کسی کو "کذاب" نہیں کہا کرتے تھے۔

امام مسلم نے مقدمہ میں اس کے علاوہ اور بھی بہت سی امثلہ ذکر کی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مبارک بڑے نقادِ رجال تھے اور اسانید حدیث سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے۔

مذکورہ بالا مثالوں سے بڑھ کر امام مسلم نے ابو رزمہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے عبداللہ

بن مبارک کو یہ کہتے سنا کہ "ہمارے اور رواۃِ حدیث کے مابین اصلی معیار و مقیاس "اسناد" ہے"

حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابن واضح کا قول نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن مبارک سے جب پوچھا گیا کہ حدیث کس سے اخذ کی جائے؟ اس کے جواب میں موصوف نے کہا۔

"جو شخص رضائے الٰہی کے لیے علم حاصل کرتا ہے وہ اسناد کے معاملہ میں سخت ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک شخص ثقہ آدمی کو ملتا ہے اور وہ غیر ثقہ سے روایت کرتا ہے۔ بخلاف ازیں گاہے غیر ثقہ سے ملتا ہے۔ اور وہ غیر ثقہ ایک دوسرے ثقہ راوی سے حدیث روایت کرتا ہے۔ چاہیئے یہ کہ ایک ثقہ راوی سے حدیث نقل کرے۔"

ذہبی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ہارون الرشید نے جب ایک زندیق کو قتل کرنے کے لیے پکڑا تو اس نے کہا:

"ان ایک ہزار احادیث کا کیا بنے گا جو میں نے وضع کی ہیں؟"

خلیفہ نے کہا "اے دشمن خدا! ابو اسحاق فزاری اور ابن مبارک ابھی زندہ ہیں۔ وہ ایسی احادیث کو ایک ایک کر کے (احادیث صحیحہ میں سے) نکال لیں گے۔"

عبداللہ بن مبارک سے کہا گیا کہ "موضوع احادیث کی نشان دہی کون کرے گا؟

فرمایا "اس کام کے لیے جید علماء موجود ہیں۔

محدث ذہبی نے ابراہیم بن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ میں نے سنا ابن مبارک سے کہہ رہے تھے کہ:

"مجھے چار ہزار شیوخ کی حدیثیں سنائی گئیں جن میں سے میں نے صرف ایک ہزار کی مرویات قبول کیں۔"

یہ بیانات صاحب "فجر الاسلام" کے اس دعویٰ کی پرزور تردید کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک سادہ لوح تھے۔ اور ہر روایت کو قبول کر لیا کرتے تھے۔

۲۔ عوام الناس کی فریب خوردگی:

باقی رہا احمد امین کا یہ دعویٰ کہ لوگ ابن مبارک کی صدق بیانی کے فریب میں آگئے

تھے تو یہ بات غلط ہے۔ آپ جان چکے ہیں کہ آپ اسناد کے معاملہ میں کافی متشدد واقع ہوئے تھے جب کسی راوی میں صداقت و عدالت اور ثقاہت جمع ہو جائے تو اس کی روایت کو قبول کرنا واجب ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ لوگ آپ کی راست گفتاری کے دھوکہ میں آگئے تھے

مزید برآں ائمہ جرح و تعدیل کے نزدیک اجماعاً ابن مبارک ایک جلیل القدر امام حدیث تھے۔ محدث ابن مہدی فرماتے ہیں:

"امام چار ہیں۔ سفیان ثوریؒ۔ مالکؒ۔ حماد بن زیدؒ۔ ابن مبارکؒ۔

محدثین کے اقوال اس ضمن میں ملاحظہ ہوں۔

امام احمد: ابن مبارک کے عصر و عہد میں کوئی طالب العلم ان سے بڑھ کر نہ تھا۔ علم کا بہت سا ذخیرہ جمع کیا اور اس میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہونے دیا۔ ابن مبارک عظیم محدث تھے اور ہر کتاب سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے:

امام معین: "عبداللہ بن مبارک بڑے دانا بیدار مغز ثقہ عالم اور محدث تھے۔"

ابن سعد صاحبِ طبقات: "ابن مبارک ثقہ قابلِ اعتماد حجت اور کثیر الحدیث تھے۔"

محدث حاکم: "ابن مبارک امام العصر اعلم الناس بڑے زاہد بہادر اور سخی تھے۔"

نسائی: "ابن مبارک کے زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم و فاضل اور بزرگ تھا اور نہ تمام اخلاقِ حمیدہ کا جامع۔"

نووی شارح مسلم: "ابن مبارک کی امامت و جلالت عظمت اور علوِ مرتبت پر تمام علماء کا اجماع قائم ہوا ہے۔"

ابن ابی حاتم: "ابن ابی حاتم نے اپنی کتاب "الجرح والتعدیل" میں مستقل عنوان کے تحت ابن مبارک کا ذکر کیا ہے۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ نقادِ حدیث اور ائمہ جرح و تعدیل جس شخص کی عدالت و ثقاہت پر یک زبان ہوں۔ حیرت و افسوس کی بات ہے کہ دورِ حاضر میں ایک شخص اٹھے اور یوں کہے کہ:

"لوگ اس کی صدق بیانی کے دھوکہ میں آکر اس سے حدیثیں اخذ کیا کرتے تھے۔"

محدثین کرام نے عبداللہ بن مبارک کی امامت و سیادت اور علم حدیث میں مہارت و

دبراعت سے متعلق جو کچھ کہا ہے اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ان کے بارے میں استاذ احمد امین کا یہ کہنا کہ "وہ ہر حدیث سُن کر (بلا تحقیق) بیان کر دیا کرتے تھے" صاف جھوٹ ہے

امام مسلم نے اپنی سند کے ساتھ امام مالکؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

خوب جان لو کہ جو شخص ہر بات سُن کر آگے پہنچا دے وہ (جھوٹ کی آمیزش سے) بچ نہیں سکتا۔ اسی طرح ایسا شخص ہرگز امام فن نہیں بن سکتا"

امام مسلم نے بیان کیا کہ عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں۔

"ایک شخص قابل اقتدار امام نہیں بن سکتا جب تک بعض سُنی ہوئی باتوں کے کشف و اظہار سے رک نہ جائے"

ان اقوال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ علمائے حدیث کسی شخص کی امامت کو اس وقت تسلیم کرتے تھے۔ جب اسے اپنے حافظہ پر پورا اعتماد ہو اور جو احادیث وہ روایت کرے ان میں غور و فکر بھی کرتا ہو۔ اور ہر سنی سنائی بات بلا تحقیق نقل و روایت نہ کرتا ہو۔

۳۔ عبداللہ بن مبارک کے بارے میں امام مسلم کی رائے:

استاذ احمد امین نے عبداللہ بن مبارک سے متعلق جو رائے امام مسلم سے نقل کی ہے وہ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مصنف نے کس قدر جسارت سے کام لیا ہے۔

دراصل صحیح مسلم کی عبارت یوں ہے۔

سفیان ابن مبارک سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے کہا کہ "بقیہ" نامی راوی یوں تو راست گفتار ہے۔ مگر ہر آنے جانے والے شخص سے حدیث لے لیا کرتا ہے"۔

مذکورہ صدر عبارت پڑھ کر واضح ہوتا ہے کہ یہ بقیہ نامی راوی کے بارے میں عبداللہ بن مبارک کی رائے ہے بقیہ ابن مبارک کے ہم عصر ایک محدث تھے۔ مگر احمد امین نے یہ سمجھا کہ یہ رائے ابن مبارک کے بارے میں دی گئی ہے۔ اگر استاذ احمد امین اس قول کی سند کو بغور ملاحظہ کرتے تو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ سند سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قول کا قائل عبداللہ بن مبارک ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ بات ان کے بارے میں کہی جا رہی ہو۔ مزید برآں یہ لفظ "بقیہ" ہے ثقہ نہیں۔ جیسا کہ احمد امین نے سمجھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ عبداللہ بن مبارک بَقیّہ بن ولید حمصی کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہیں مزید یہ کہ ابن مبارک نے جو رائے بقیہ سے متعلق دی ہے وہ اس کے بارے میں عام طور سے مشہور ہے۔اس کی دلیل یہ ہے کہ امام مسلم اس سے ذرا آگے چل کر ابو اسحاق فزاری کا قول بقیہ کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ:

"بقیہ جو حدیث معروف راویوں سے نقل کرے وہ لے لو اور جو غیر معروف رواۃ ورجال سے بیان کرے وہ نہ لو۔"

امام ذہبی نے عبداللہ بن مبارک سے جو قول نقل کیا ہے اس سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔بقول ذہبی ابن مبارک بقیہ کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ وہ مُدلّس ہے۔ضعیف راویوں سے روایت کرتا ہے۔اور ان کا نام نہیں بتاتا۔نیز وہ ہر کس و ناکس سے حدیثیں لے لیا کرتا ہے۔

بیان سابق سے واضح ہوتا ہے کہ احمد امین نے صحیح مسلم کی عبارت میں دو جگہ غلطی کھائی ہے

۱۔ احمد امین نے سمجھا کہ عبداللہ بن مبارک کے بارے میں یہ کسی اور شخص کا قول ہے۔حالانکہ یہ عبداللہ بن مبارک کا قول ہے جو بَقیّہ نامی راوی کے بارے میں کہا گیا۔

۲۔ احمد امین نے لفظ "ثِقَہ" نقل کیا ہے۔حالانکہ صحیح مسلم میں لفظ "بقیہ" ہے۔ظاہر ہے کہ یہاں تین باتوں کا امکان ہے۔چوتھی کوئی بات نہیں۔

اوّل:۔استاذ احمد امین نے صحیح مسلم میں بذاتِ خود یہ عبارت پڑھی ہوگی مگر سمجھ نہ سکے اسی لیے یہ غلطی ان سے سرزد ہوئی۔

دوم: دوسرے یہ کہ موصوف نے عبارت کا صحیح مطلب سمجھ لیا تھا۔مگر دانستہ اس کی تحریف کے مرتکب ہوئے۔

سوم: تیسرا احتمال یہ ہے کہ احمد امین نے یہ عبارت بذاتِ خود صحیح مسلم میں ملاحظہ نہیں کی بلکہ کسی مستشرق کی کتاب سے نقل کی جس نے اسے مسخ کرنے کے بعد صحیح مسلم سے نقل کیا ہوگا۔استاذ نے کسی دشمن دین کی کتاب سے یہ عبارت تو نقل کرلی مگر صحیح مسلم کو بچشم خود ملاحظہ کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

میری رائے میں تیسرا احتمال قوی تر ہے۔پہلی صورت بعید از قیاس ہے۔اس لیے کہ

ایک واضح عبارت کا سمجھ میں نہ آنا کسی طرح عقل و قیاس میں نہیں آسکتا۔ دوسری صورت بھی قابل قبول نہیں۔ کیونکہ ایک ایسی مشہور کتاب کی عبارت کو دانستہ مسخ کر کے پیش کرنا جو ہر مسلم گھرانہ میں موجود ہو، بڑی عجیب بات دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا تیسرا احتمال ہی قرینِ عقل و قیاس ہے اور بس۔

میں نے صحیح مسلم کے مطبوعہ نسخوں کو بڑی احتیاط سے دیکھا کہ کسی نسخہ میں وہ عبارت اس طرح غلط لکھی گئی ہو جیسے احمد امین نے نقل کی۔ تاکہ استاذ موصوف کے لیے معذرت کی کوئی گنجائش نکل سکے۔ مگر افسوس کہ مجھے کوئی نسخہ البتہ نہ مل سکا۔ صحیح مسلم کے تمام نسخوں میں عبارت واضح طور پر بلا تحریف مرقوم تھی۔ اس لیے میرے نزدیک ترجیحی رائے یہی ہے کہ یہ کسی دشمن اسلام کا کارنامہ ہے۔ یا تو ایک امام حدیث کی زندگی کو داغدار ثابت کرنے کے لیے اس نے دانستہ تحریف کا ارتکاب کیا جیسا کہ گولڈ زیہر نے امام زہری کے ساتھ کیا۔ یا یہ کہ وہ بقیہ کے لفظ کو "تقیہ" سمجھا اور اس طرح اس عظیم غلطی میں مبتلا ہوا۔ اس لیے کہ یہ دونوں لفظ باہم ملتے جلتے ہیں۔

کسی مستشرق کو اس غلطی میں ہم اس لیے معذور قرار دے سکتے ہیں کہ وہ عجمی نژاد ہے۔ اور عربی دانی کے اس ذوق سے محروم ہے۔ جس کی بنا پر سیاقِ کلام کو دیکھ کر کسی لفظ کی صحت عدم کو جانچا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دشمن اسلام بھی ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ احمد امین نے اس تحریف میں اس مستشرق کی پیروی کس لیے کی۔ اور حیرت ہے کہ اس رائے فاسد کی اساس پر ایک جلیل القدر محدث کی زندگی کو داغدار کرنے کی جسارت کی۔

حدیث سدّ الابواب:

"فجر الاسلام" کے مصنف استاذ احمد امین نے کتاب ہذا کے صفحہ ۲۶۰ پر وضعِ حدیث کے اسباب و محرکات ذکر کرتے ہوئے حضرت علیؓ و ابوبکرؓ حضرت علیؓ و معاویہؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ و عبدالملک اور بنو امیہ و بنو عباس کے سیاسی تنازعات پر روشنی ڈالی ہے۔

یہاں تک تو بات ٹھیک ہے۔ اس کے بعد مشہور شیعہ عالم ابن ابی الحدید کا قول نقل کیا ہے کہ "فضائل پر مشتمل احادیث میں جھوٹ کی بنا شیعہ فرقہ نے ڈالی ہے"۔ حضرت ابوبکرؓ کے طرف داروں نے جب دیکھا کہ شیعہ نے حضرت علیؓ کی فضیلت سے متعلق احادیث وضع کر لی

ہیں تو انہوں نے بھی حضرت ابوبکر کی تعریف و توصیف میں حدیثیں تصنیف کر ڈالیں۔ مثلاً حدیث "لَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا" اس حدیث کے مقابلہ میں گھڑی گئی ہے جس میں آیا ہے کہ "علیؓ میرے بھائی ہیں" اسی طرح "دروازوں کے بند کرنے سے متعلق حدیث" دراصل حضرت علیؓ کے حق میں تھی۔ مگر حضرت ابوبکر کے ہوا خواہوں نے اس کو حضرت ابوبکر کے حق میں تبدیل کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ چونکہ ابن الحدید معتزلی شیعہ ہے اور شیعہ کی طرفداری تعصب کی حد تک کرتا ہے۔ اس لیے وہ مذکورہ صدر دونوں حدیثوں کو موضوع قرار دینے میں معذور ہے۔ مگر حیرت ہے کہ احمد امین نے ابن ابی الحدید پر گرفت کرنے کے بجائے الٹا اس کی حمایت کی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے۔ کہ ابن ابی الحدید کی طرح احمد امین بھی ان دونوں احادیث کو موضوع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں اور ائمہ حدیث نے ان کو روایت کیا ہے

جہاں تک حدیث "لَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا" کا تعلق ہے اس کو امام بخاری نے بطریق ابن عباسؓ و ابن زبیرؓ اور امام مسلم نے بواسطہ ابو سعید و ابن مسعود روایت کیا ہے۔

دوسری حدیث جس میں دروازے بند کرنے کا ذکر ہے اس کو امام بخاری نے حضرت ابو سعیدؓ و ابن عباسؓ سے اور امام مسلم نے حضرت ابو سعید و جُندب و ابی بن کعب سے روایت کیا ہے۔ بخاری و مسلم کے علاوہ ان دونوں حدیثوں کو امام مالک ترمذی طبرانی احمد ابن عساکر ابن حبان اور دیگر محدثین رحمہم اللہ نے بھی نقل و روایت کیا ہے۔

باقی رہی شیعہ کی روایت کردہ حدیث جس میں آیا ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے آپ کو حضرت علیؓ کا بھائی قرار دیا تو یہ حدیث کسی قابل اعتماد طریقہ سے مروی و منقول نہیں۔ نہ حدیث کی کسی قابل اعتماد کتاب میں اس کا نشان ملتا ہے اور نہ کسی ثقہ راوی نے اس کو روایت کیا ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ فرماتے ہیں

یہ حدیث محدثین کے نزدیک موضوع ہے۔ علمائے حدیث کسی شک و شبہ کے بغیر اس کو موضوع کہتے آئے ہیں۔ اس کا واضع ایسا جاہل اور کذاب ہے کہ جس کی دروغ گوئی میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔" (منہاج السنۃ ج ۴ ص ۹۶)

باقی رہی شیعہ کی روایت کردہ یہ حدیث کہ آپؐ نے (مسجد کی جانب کھلنے والے) سب دروازے بند کرنے کا حکم دیا۔ اور حضرت علیؓ کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ تو اکثر نقادِ حدیث اس کو موضوع تصور کرتے ہیں۔ محدث ابن الجوزی عراقی اور امام ابن تیمیہؒ کی یہی رائے ہے۔ اور اگر اس حدیث کو صحیح تسلیم کیا جائے تو علماء نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ذکر کیا ہے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے (مسجد کی طرف کھلنے والے) سب دروازے بند کر دینے کا حکم دیا مگر حضرت علی کا دروازہ کھلا رہنے دیا۔ نتیجہ کے طور پر صحابہ نے یہ کیا کہ مسجد کی طرف کھڑکیاں کھول لیں۔ آپ نے حضرت ابوبکر کے سوا سب کو کھڑکیاں بند کرنے کا حکم دے دیا۔ حضرت ابوبکر سے متعلق جس روایت میں "باب" (دروازہ) کا ذکر آیا ہے اس سے کھڑکی مراد ہے۔ اس لیے کہ دیگر روایات میں "خوختہ" (کھڑکی) کا لفظ موجود ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ دونوں حدیثوں میں جمع و تطبیق دینے کے لیے یہ طریقہ بہت مناسب ہے۔ چنانچہ ابوجعفر طحاوی نے اپنی کتاب "مشکل الآثار" میں اور محدث ابوبکر کلاباذی نے "معانی الاخبار" میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ انہوں نے صراحتہً لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر کے گھر کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا اور ایک کھڑکی مسجد میں داخل ہونے کے لیے تھی۔ بخلاف ازیں حضرت علیؓ کے گھر کا ایک ہی دروازہ تھا اور وہ مسجد کی طرف کھلتا تھا۔

احادیثِ فضائل:

احمد امین "فجر الاسلام" کے صفحہ ۲۶۱ پر لکھتے ہیں:

> بکثرت احادیث آپ کی نگاہ سے گزری ہوں گی جو بنو امیہ، بنو عباس اور علویہ کی عظمت و فضیلت اور یا ان کی تحقیر و تذلیل کے سلسلہ میں وضع کی گئی ہیں۔ پھر اس سے ملتی جلتی وہ احادیث ہیں جو مختلف قبائل کے مدح و ثنا میں گھڑی گئیں۔ مثلاً بہت سی حدیثیں قبیلہ قریش، انصار، جہینہ اور مزینہ وغیرہ کے بارے میں وضع کی گئیں۔ اسی طرح بعض شہروں کی تعریف میں بھی حدیثیں وضع کی گئیں۔ چنانچہ بڑے شہروں میں سے کوئی شہر ایسا نہ تھا۔ جس کی مدح و ستائش

میں ایک حدیث یا متعدد احادیث نہ گھڑی گئی ہوں۔ (فجر الاسلام ص ۲۶۱)

دراصل بات یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے صحابہ کے درمیان مقیم تھے جو دل و جان سے آپ پر فدا تھے۔ مگر جاں نثاری۔ ایثار و قربانی اور اہلیت و صلاحیت کے بھی درجے ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرات صحابہ اس ضمن میں مختلف النوع تھے۔ اسی طرح سبقت اسلام کے اعتبار سے بھی وہ یکساں نوعیت کے نہ تھے۔ اس لیے کچھ بعید نہیں کہ آپ نے کسی صحابی کا نام لے کر اس کی تعریف ہو۔ اس سے اظہار پسندیدگی کیا یا ان کے منصب و مقام کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا ہو۔

مدینہ و مکہ کے شہروں کے بارے میں بھی مدحیہ کلمات کہنا کچھ عجیب نہیں۔ اس لیے کہ مکہ وہ شہر ہے جہاں سے دعوت اسلام کا چشمہ ابلا۔ مدینہ میں اسلامی ریاست کی داغ بیل پڑی اسی طرح بیت المقدس وہ شہر ہے جس کی تعریف قرآن کریم میں کی گئی ہے۔ اسی قسم کے دیگر بلاد و امصار اور قبائل جو اسلام کی نشر و اشاعت اور دیگر نیک کاموں میں دلچسپی لیتے تھے مگر اس کے دوش بدوش اس امر کا امکان ہی نہیں بلکہ عملاً ایسا ہوا کہ جہلا اور متعصب لوگوں نے اپنے رؤسا اور اپنے بلاد و قبائل کی مدح و ثنا میں یا تو خود حدیثیں وضع کیں اور یا احادیث صحیحہ میں اپنی طرف سے بعض الفاظ کا اضافہ کر دیا۔

یہ دو باتیں ہیں جن میں نزاع و جدال کی کوئی گنجائش نہیں۔ بعض اشخاص و بلاد اور قبائل کی مدح و توصیف سے متعلق احادیث صحیحہ کے وارد ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ان کے بارے میں جھوٹی حدیثیں موجود ہی نہیں۔ ایک باانصاف عالم کا کام یہ ہے کہ جب ایسی صورت حال پیش آئے تو نہ ساری احادیث کی تصدیق کرے اور نہ سب کو رد کرے۔ ان میں سے کسی حدیث کو جھوٹا پا کر وہ سب کو نہ جھٹلا دے۔ اور کسی صحیح حدیث کو دیکھ کر سب کی صحت کا قائل نہ ہو جائے۔

علماء کے یہاں ایسا معیار و مقیاس موجود ہے جس سے وہ صحیح اور ضعیف حدیث کو جانچ تول سکتے ہیں۔ وہ معیار یہ ہے کہ سند و متن دونوں کو خوب جانچا تولا جائے۔ نقد و تمحیص کے بعد جو حدیث صحیح السند والمتن نکلے وہ صحیح ہو گی۔ اور جس میں یہ وصف موجود نہ ہو وہ ضعیف ہو گی۔ ایسے حالات میں معقول طریقہ یہی ہے۔ ہمارے ائمہ نے جب کثرتِ احادیث کا مسئلہ

امنڈا ہوا دیکھا۔ جس میں احادیثِ فضائل بھی شامل ہیں۔ تو انہوں نے یونہی کیا تھا۔ نقد و تبصرہ کے بعد جو حدیثیں اس معیار پر پوری اتریں ائمہ حدیث نے ان کو اپنی تصانیف میں جگہ دی تھی۔

اس کی مثال میں ہم صحیح بخاری کا نام لے سکتے ہیں۔ استاذ احمد امین نے خود اعتراف کیا ہے کہ صحیح بخاری تمام کتب حدیث کی نسبت صحیح تر ہے۔ اور اس کا معیار نقد و جرح بھی بہت سخت ہے۔ بایں ہمہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں انصار و مہاجرین اور دیگر صحابہ کے فضائل سے متعلق متعدد الواب قائم کیے ہیں۔ مثلاً حضرات ابوبکر و عثمان و علی و سعد و ابیّ و معاذ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں وارد شدہ احادیث ذکر کی ہیں۔ اسی طرح مکہ مدینہ یمن شام اور دیگر اسلامی بلاد و دیار کی فضیلت سے متعلق احادیث ذکر کی ہیں۔ علاوہ ازیں صحیح بخاری میں مختلف قبائل مثلاً قبیلہ قریش و جُہَینہ و مُزَینہ کی مدح و منقبت میں وارد شدہ احادیث بھی مذکور ہیں۔

اسی طرح دیگر محدثین کرام مثلاً امام احمد مسلم ترمذی وغیرہم کے یہاں بھی ایسی احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ تاہم اس کے باوصف محدثین نے اس ضمن میں وارد شدہ احادیث موضوعہ بھی اپنی کتب میں درج کی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی راویانِ حدیث کی قلعی بھی کھول دی ہے اور بڑی بارک بینی اور عرق ریزی سے ان پر تنقید کی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ یہ احادیث کس نے کیوں اور کن حالات میں وضع کیں؟

اب سوال یہ ہے کہ استاذ احمد امین نے ایک کھلی ہوئی حقیقت سے تجاہل عارفانہ کا شیوہ کیوں اختیار کیا۔ اور جملہ احادیث فضائل کو کس بنا پر مشکوک ٹھہرایا؟ اس میں شبہ نہیں کہ یہ مستشرقین کا وطیرہ ہے جن کی رائے اس ضمن میں ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ استاذ احمد امین نے بھی مستشرق عیسائیوں کا رویہ اختیار کیا ہے۔

احادیث ابی حنیفہ:

استاذ احمد امین رقمطراز ہیں:

وضع حدیث کا محرک ثانی کلامی اور فقہی اختلافات ہیں۔ چنانچہ کوئی فقہی مسئلہ ایسا نہیں ہے۔ جس کی تائید میں کوئی حدیث موجود نہ ہو۔ اس کی حد یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ جن کے

بارے میں علماء سے منقول ہے کہ صرف چند احادیث صحیحہ ان کے یہاں موجود تھیں اور بقول ابن خلدون آپ سترہؔ احادیث سے آگاہ تھے۔ مگر حنفی فقہ کی کتب احادیث سے لبریز ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعض احادیث کی عبارت کتب فقہ کے متن سے ملتی جلتی ہے۔ (فجر الاسلام ص ۲۴۲)"

جواباً گذارش ہے کہ بلاشبہ کلامی و فقہی مباحث وضع حدیث پر اثر انداز ہوتے تھے ہمیں اس سے انکار نہیں ہے اور قبل ازیں وضع حدیث کے اسباب و محرکات کے ضمن میں ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ مگر یہ دعویٰ کہ حضرت امام ابو حنیفہ کو صرف سترہ احادیث صحیحہ کا علم تھا اور علماء کی جانب اس کا انتساب عجیب ستم ظریفی ہے۔ احمد امین نے یقیناً اس میں جادۂ صدق و صواب کو چھوڑ دیا ہے اور علماء کا شیوہ اختیار نہیں کیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہ حنفی کا دامن تفریع و استنباط کے اعتبار سے جملہ فقہی مذاہب و مسالک سے کشادہ تر ہے۔ جو مسائل آپ سے منقول و ماثور ہیں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ آپ معدودے چند آیات احکام اور تھوڑی سی احادیث سے اس قدر احکام اخذ کر سکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے یہ فقہی مسائل قیاس کی مدد سے اخذ و استنباط کیے تھے۔ تو ہم کہیں گے کہ مسانید ابی حنیفہ میں جو احادیث جمع ہیں اور جو آپ کے اصحاب و تلامذہ نے آپ سے نقل و روایت کیں ایسی مسانید کئی ایک ہیں۔ اس سے یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ فقہ حنفی کے بہت سے مسائل حدیث سے منقول و ماخوذ ہیں۔ پھر یہ بات کیونکر صحیح ہو سکتی ہے کہ آپ کو صرف چند احادیث صحیحہ کا علم تھا۔ جب آپ ان سے تفریع و احتجاج کرتے ہیں تو ان کے صحیح نہ ہونے کی دلیل کیا ہے۔؟

باقی رہا ابن خلدون کا یہ قول کہ امام ابو حنیفہؒ کو صرف سترہ احادیث صحیحہ کا علم تھا تو یہ بات موصوف نے صیغہ تمریض (قیل) کے ساتھ کہی ہے جس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ وہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہہ رہے۔ ہمارے علم کی حد تک ابن خلدون سے پہلے کسی نے بھی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ بخلاف ازیں علما کے بیانات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے یہاں بکثرت احادیث صحیحہ موجود تھیں۔ ہم آگے چل

کہ جہاں جناب امام کے بارے میں اظہار خیال کریں گے وہاں اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے

حدیث پر اعتماد کرنے میں غلو و مبالغہ:

استاذ احمد امین اسباب وضع کی نشان دہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میری رائے میں وضع حدیث کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ لوگ اس وقت تک کسی علمی بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جب تک کتاب و سنت کے ساتھ اس کا قریبی ربط و تعلق نہ ہو۔ اس کے سوا ان کے یہاں کوئی بات قدر و قیمت کی حامل نہیں۔ مثلاً حلال و حرام سے متعلق احکام جب صرف اجتہاد پر مبنی ہوں تو ان کو وہ اہمیت حاصل نہ ہو گی جو حدیث پر مبنی احکام کو دی جاتی ہے۔ بلکہ اس دور کے اکثر علماء تو سرے سے ایسے احکام کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ اور ایسی روش اختیار کرنے والوں پر کڑی تنقید کرتے تھے۔ حکمت و موعظت پر مشتمل بات اگر ہندی یونانی فارسی اور شروح تورات و انجیل سے ماخوذ ہو تو اس کو کوئی وقعت حاصل نہ تھی۔

قبولیت حدیث میں اس مبالغہ آمیزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام الناس نے ایسی چیزوں کو مذہبی رنگ دینا شروع کر دیا تاکہ لوگ ان کو قبول کر لیں۔ انہوں نے دیکھا کہ حدیث کا دروازہ چوپٹ کھلا ہے۔ وہ اس میں گھس کر لوگوں کے یہاں پہنچے اور اس ضمن میں خوف خداوندی کو ملحوظ نہ رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ من گھڑت فقہی احکام ہندی و زردشتی فلسفہ اور اسرائیلی و نصرانی حکمت و موعظت سب پر مذہبی ملمع سازی کر دی گئی" (فجر الاسلام ص ۲۶۴)

اصحاب بدعت کو چھوڑ کر جمہور اہل اسلام سلفاً و خلفاً اس امر پر متفق رہے ہیں کہ کتاب و سنت دونوں اسلامی قانون کے اصولوں میں سے ایک عظیم اصل و اساس ہیں کوئی شخص احکام قرآن و حدیث کے خلاف فیصلہ صادر کرنے کا مجاز نہیں۔ نہ کسی مجتہد کو یہ حق حاصل ہے کہ کتاب و سنت کی طرف رجوع کیے بغیر کسی مسئلہ میں اجتہاد کرے۔

پھر علماء دو قسموں میں بٹ گئے۔

۱- علماء کی ایک جماعت قیاس میں وسعت پیدا کیے اور احکام کی علت معلوم کیے بغیر ظواہر نصوص پر عمل کرتی ہے۔ یہ ظاہریہ اور اکثر اہل الحدیث کا مسلک ہے۔

۲- دوسری قسم کے علماء نصوص سے احکام اخذ کرنے میں غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور اس طرح کتاب و سنت کے ساتھ ساتھ قیاس پر بھی عمل پیرا ہوتے ہیں۔ وہ علت سے بحث کرتے ہیں۔ عام کی تخصیص اور مطلق کی تقلید کرتے اور کسی قرینہ کے پیش نظر ناسخ و منسوخ کے درمیان امتیاز قائم کرتے ہیں۔ یہ جمہور مجتہدین اور علماء کا گروہ ہے جو عصر صحابہ سے لے کر تا ہنوز بدستور چلا آرہا ہے۔

البتہ قیاس و علت سے اخذ و استخراج کرنے میں علماء کا طرز عمل مختلف رہا ہے۔ اسی طرح علم حدیث میں مہارت و براعت اور شروط صحت کے بارے میں بھی مختلف النوع واقع ہوئے ہیں۔ اہل الرائے اور اہل الحدیث کے مکتبہ ہائے فکر میں جو اختلاف و نزاع پایا جاتا ہے وہ اسی پر مبنی ہے۔ مگر اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ حدیث نبوی کی جانب رجوع کیے بغیر فقہی مسائل میں اجتہاد کرنا درست نہیں۔ سب علماء اس امر پر متفق ہیں کہ احادیثِ احکام پر حاوی ہونا ایک مجتہد کے لیے ازبس ناگزیر ہے۔ اس میں کسی فرو گذاشت کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

امام ابن عبد البرؒ اپنی کتاب "جامع بیان العلم" میں امام شافعی سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

> "علمی دلیل کے بغیر کسی شخص کے لیے روا نہیں کہ وہ کسی چیز کے حلال و حرام ہونے کا فیصلہ صادر کرے۔ اور علمی دلیل وہ ہے جو کتاب و سنت یا اجماع و قیاس سے ماخوذ ہو" (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۶)

اس امر پر ائمہ مجتہدین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ مجتہد پہلے کتاب اللہ پر ایک نگاہ ڈالتا ہے۔ پھر حدیث نبوی اور اقوال صحابہ کو دیکھتا ہے۔ اگر وہ مسئلہ اجماعی نہ ہو تو پھر قیاس و استنباط کی جانب رجوع کرتا ہے۔ ہم آگے چل کر جہاں ائمہ اربعہ کے اجتہاد سے متعلق اصول مذاہب بیان کریں گے۔ وہاں اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

مذکورہ صدر بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ استاذ احمد امین کا یہ قول کہ:

"حلال و حرام کے احکام جب اجتہاد پر مبنی ہوں تو ان کو وہ وقعت نہیں دی جاتی جو حدیث پر مبنی احکام کو حاصل ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ احمد امین کے نزدیک اجتہاد کی بعض اقسام حدیث نبوی پر مبنی نہیں ہوتیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے کسی نے بھی ایسا اجتہاد نہیں کیا۔ سب مجتہدین کے یہاں یہ مسلّمہ قاعدہ ہے کہ نص کے مقابلہ میں اجتہاد ناروا ہے۔

جہاں تک حکمت و موعظت کا تعلق ہے ہمارے علم میں کوئی امام ایسا نہیں جس نے کسی حکیمانہ بات کو صرف اس لیے رد کر دیا ہو کہ وہ قرآن و حدیث میں مذکور نہیں۔ بشرطیکہ وہ بات نصوصِ شرعیہ ان کی روح اور غایت و مقصد سے ٹکراتی نہ ہو۔ علماء ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ دانائی کی بات مومن کی ایک گمشدہ چیز ہے۔ جہاں پائے اسے اٹھا لے۔ خداوند کریم نے اہلِ ایمان کی شان میں فرمایا ہے کہ وہ باتوں کو سُن کر جو اچھی ہوتی ہیں اس کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اقوام ماضیہ کے واقعات اور ان کے حکم و مواعظ بیان کیے گئے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے واضح کیا کہ گذشتہ اقوام کی جو بات اسلامی شریعت کے غایات و مقاصد سے ٹکراتی نہ ہو۔ اس کے قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ علمائے اصول کے یہاں یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ:

"جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول گذشتہ اقوام کی کوئی بات بلا تنقید بیان کریں تو وہ ہمارے لیے واجب الاتباع ہے۔"

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک آیت بھی ہو تو مجھ سے سُن کر آگے پہنچا دو۔ بنی اسرائیل سے سن کر حدیث بیان کرو اس میں کچھ مضائقہ نہیں"

حافظ ابن حجر عسقلانی اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل سے سُن کر روایات بیان کرنے میں کوئی

حرج نہیں۔ قبل ازیں آپ نے بنی اسرائیل سے اخذ ونقل اور ان کی کتابوں کے مطالعہ سے منع کیا تھا۔ پھر اجازت دے دی۔ منع اس وقت کیا تھا۔ جب کہ اسلامی احکام وقواعد اچھی طرح مستحکم نہیں ہوئے تھے۔ مبادا لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں۔ جب یہ خطرہ باقی نہ رہا تو اجازت مرحمت فرما دی۔ اس لیے کہ بنی اسرائیل کے واقعات میں عبرت پذیری کا پہلو موجود ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل سے کسی اچھی بات کی نقل درست ہے۔ جس بات کے متعلق معلوم ہو کہ وہ جھوٹی ہے اس کی روایت درست نہیں" (فتح الباری)

بعض صحابہ نے کعب الاحبار اور وہب بن منبہ سے بکثرت روایات اخذ کی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتب تفسیر اسرائیلیات کا پلندہ بن گئیں۔ اسی طرح تصوف واخلاق پر مشتمل کتب دیگر اقوام سے منقول حکم ومواعظ سے بھرپور تھیں۔ پھر احمد امین کا یہ قول کیونکر صحیح ہے کہ مسلمانوں نے غیر اسلامی ذرائع سے منقول حکیمانہ باتیں رد کر دی تھیں۔

خلاصہ یہ کہ استاذ احمد امین نے وضعِ حدیث کا جو سبب بیان کیا ہے وہ قطعی طور پر بے بنیاد اور خلافِ واقعہ ہے۔ دینی کتب ایسے حکیمانہ اقوال سے پُر ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ احمد امین کو یہ بات کہنے کی کیا ضرورت پڑی غالباً موصوف کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ کتاب وسنت سے اخذ واستدلال میں جو تشدد پایا جاتا تھا۔ اس سے دین کو یہ نقصان پہنچا کہ لوگوں نے حدیثیں وضع کرنا شروع کر دیں۔

صحابہ کی عدالت وثقاہت:

احمد امین لکھتے ہیں:

"اکثر نقادِ حدیث نے صحابہ کو انفرادی واجتماعی طور پر "عدول" قرار دیا ہے وہ کسی کو بُرا نہیں کہتے اور نہ کذب ودروغ کو ان کی جانب منسوب کرتے ہیں محدثین کی ایک قلیل جماعت دیگر رُواۃِ حدیث کی طرح صحابہ کو بھی موردِ الزام ٹھہراتی ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اکثر ناقدین حدیث اور خصوصاً متاخرین عدالتِ صحابہ کے قائل ہیں اور کسی صحابی کو بھی کذب ووضع کے ساتھ متہم نہیں

کرتے بلکہ صحابہ کے بعد صرف دیگر راویانِ حدیث کو نقد و جرح کا نشانہ بناتے ہیں۔ (فجر الاسلام ص ۲۶۵)

بر حقیقت ثابتہ ہے کہ تابعین کرام۔ ان کے بعد آنے والے جمہور اہل اسلام اور نقادِ حدیث صحابہ کی عدالت اور ان کے کذب و وضع سے پاک ہونے پر متفق چلے آتے ہیں۔ البتہ خوارج و معتزلہ اور شیعہ اس کے خلاف ہیں۔ یہ ہے مسئلہ زیر بحث کی اصلی پوزیشن۔!

مگر احمد امین اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر اس حقیقت کو مشکوک بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس زعم فاسد کی تکمیل کے لیے پہلے یہ کہا کہ اکثر نقادِ حدیث عدالتِ صحابہ کے قائل ہیں۔ حالانکہ اکثر نہیں بلکہ سب محدثین یہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہی کہ محدثین کی قلیل جماعت صحابہ کو بھی مجرم ٹھہراتی ہے۔ اس کے اثبات میں امام غزالی کی عبارت پیش کی۔ حالانکہ صحابہ پر طعن کرنے والے محدثین کے زمرہ میں شامل نہیں۔ بخلاف ازیں یہ لوگ تھے جو بعض صحابہ کی حمایت و نصرت اور بعض کے خلاف بغض و عداوت کے جذبات رکھنے کی بنا پر تاریخ اسلام میں مشہور چلے آتے ہیں

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:۔

"اہل السنت والجماعت کے نزدیک جملہ صحابہ عدول ہیں۔ باقی رہا معتزلہ کا یہ قول کہ "حضرت علی کے خلاف لڑنے والوں کو چھوڑ کر باقی سب صحابہ عدول ہیں" تو یہ قول باطل اور مردود ہے۔ شیعہ فرقوں کی کم عقلی اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ وہ صرف سترہؔ صحابہ کا نام لے کر ان کو مسلم قرار دیتے ہیں اور باقی سب کی تکفیر کرتے ہیں۔ یہ ایک لغو اور بے دلیل بات ہے۔"

(اختصار علوم الحدیث ص ۲۲۰-۲۲۲)

اب آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ حضرات صحابہ پر طعن کرنے والے ایسے فرقوں سے وابستہ تھے جو اپنے مخصوص سیاسی رجحانات رکھنے میں مشہور تھے۔ وہ ان ناقدین حدیث میں ہرگز شامل نہ تھے جن کا ذکر احمد امین نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ:

"علمائے صادقین کی ایک جماعت حدیث نبوی کو رطب و یابس سے پاک کرنے اور کھری کھوٹی احادیث کو ممیز کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔"

احمد امین نے تیسرا بے بنیاد دعویٰ یہ کیا ہے کہ اکثر نقادِ حدیث خصوصاً متاخرین صحابہ کو عدول قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ عہد تابعین سے لے کر کسی عالم سے بھی یہ بات منقول نہیں کہ اس نے کسی صحابی کو موردِ طعن ٹھہرایا ہو یا اس سے روایت کرنا ترک کر دیا ہو۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ احمد امین نے اس ضمن میں امام غزالی کی عبارت سے استشہاد کیا ہے۔ حالانکہ ان کے الفاظ ببانگ دہل اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ صحابہ کی تعدیل پر علمائے سلف کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں:

"صحابہ کے عدول ہونے پر جمہور علمائے سلف و خلف کا اجماع قائم ہو چکا ہے"

جناب امام کے یہ الفاظ احمد امین کے اس فاسد دعویٰ کا ابطال کر رہے ہیں کہ متقدمین کی نسبت متاخرین میں تعدیل صحابہ کا رجحان رکھنے والے زیادہ تھے۔

کیا صحابہ ایک دوسرے کو جھٹلاتے تھے؟

پھر اسی پر بس نہیں۔ صحابہ کی تعدیل و تزیین کے سلسلہ میں احمد امین نے اس سے بڑھ کر ایک اور دعویٰ بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"کچھ یوں دکھائی دیتا ہے کہ صحابہ ایک دوسرے کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے اور بعض کو بعض سے اعلیٰ و افضل قرار دیتے تھے۔"

مذکورہ صدر عبارت سے احمد امین کا مقصد ان نقادِ حدیث پر اعتراض کرنا ہے جو عدالت صحابہ کے قائل ہیں۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ صحابہ کو علی الاطلاق عدول کہنا ٹھیک نہیں۔ اس لیے کہ بقول احمد امین خود صحابہ کے نزدیک بعض کی صداقت مشتبہ تھی۔ صحابہ ایک دوسرے پر تنقید بھی کیا کرتے تھے۔ وہ تین امور سے اس پر استدلال کرتے ہیں۔

۱- حضرت عائشہ صدیقہ اور ابن عباس نے حضرت ابوہریرہ پر نقد و جرح کی تھی۔

۲- بعض صحابہ جب کوئی حدیث سنتے تو راوی سے اس کی صداقت کی دلیل طلب کرتے۔

۳- وہ واقعہ جو جناب فاروق رضی اللہ عنہ اور فاطمہ بنت قیس کے درمیان پیش آیا۔

اب ہم باری باری احمد امین کے پیش کردہ دلائل سہ گانہ کا جواب دیتے ہیں۔

۱- احمد امین کا یہ قول کہ "صحابہ ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے" ایک

ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل و برہان موجود نہیں البتہ غالی شیعہ کی کتب میں اس کا نشان مل سکتا ہے۔ شیعہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ اپنے مخالف صحابہ کی تکذیب کرتے اور برا بھلا کہا کرتے تھے۔ مگر نقل صحیح اور وہ تاریخ جس کو کسی غرض مند شخص نے مرتب نہ کیا ہو۔ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ صحابہ کا مقام اس سے کہیں بلند تھا۔ کہ وہ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے یا دوسرے صحابہ کی صداقت میں شک وشبہ کا اظہار کرتے یہ بات لاتعداد دلائل و براہین سے ثابت ہے۔

حضرات صحابہ کا یہ عالم تھا کہ جب کسی دوسرے صحابی سے کوئی حدیث سنتے تو اس کو تسلیم کر لیتے اور اسی طرح آنحضورؐ کی جانب منسوب کرتے جیسے بذات خود انہوں نے آپ سے سنی ہو۔ مراسیلِ صحابہ کا ذکر ہم قبل ازیں کر چکے ہیں۔ ہم نے حضرت انسؓ کا یہ قول نقل کیا تھا کہ:

"صحابہ ایک دوسرے کو جھٹلاتے نہ تھے۔"

اسی طرح حضرت براءؓ کا قول بھی ہم نے ذکر کیا کہ:

"ہم نے ساری حدیثیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نہیں سنیں بلکہ آپ کے صحابہؓ ہمیں حدیثیں سنایا کرتے تھے۔"

منقولہ صدر اقوال سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ صحابہ باہم اس قدر اعتماد کرتے تھے کہ اس میں شک وشبہ کی کوئی مجال نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہ کے نزدیک راست بیانی دین کا جزو اعظم اور رأس الفضائل تھی۔ اسی کے بل بوتے پر دین اسلام کی عمارت استوار ہوئی اور اسی کے طفیل اولین و برگزیدہ صحابہ کو سیادت و قیادت نصیب ہوئی۔
باقی رہی یہ بات کہ حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ پر تنقید کی تھی تو اس سے متعلق فصل میں ہم اس پر تفصیلاً اظہار خیال کریں گے۔

۲۔ استاد احمد امین نے جو یہ بات کہی ہے کہ صحابہ حدیث روایت کرنے والے سے ایسی تائید کی شہادت طلب کیا کرتے تھے جس سے حدیث کا صحیح ہونا ثابت ہو سکے۔ تو یہ وہی بات ہے جو ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے مغیرہؓ بن شعبہؓ سے اور حضرت عمرؓ

نے ابو موسیٰ اشعریؓ سے تائیدی شہادت طلب کی تھی۔ ہم نے اس موقع پر اس کی حکمت و مصلحت بھی بتائی تھی اور ذکر کیا تھا کہ دونوں حضرات نے بارہا صحابہ کی مرویات کو بلا شہادت قبول کر لیا تھا۔ ہم نے وہاں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ کسی تائید و تثبیت کے بغیر صحابہ کی مرویات کو کرنا دونوں کی دائمی عادت تھی۔ البتہ گاہے لوگوں کو یہ بات سکھانے کے لیے حدیثِ نبوی میں کس قدر حزم و احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ شہادت طلب کر لیا کرتے تھے۔

جناب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے بارے میں فرمایا

"میں بخوبی جانتا ہوں کہ آپ روایتِ حدیث میں حد درجہ امین ہیں۔ مگر میرا خیال یہ تھا کہ لوگ حدیث نبوی میں سودا بازی نہ کرنے لگیں۔"

اس اعتماد کی موجودگی میں جناب ابو موسیٰ کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سے بڑھ کر صحیح مسلم کی اس روایت پر غور فرمائیے کہ حضرت عمرؓ کے اس موقف پر جو انہوں نے ابو موسیٰ اشعری کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ حضرت اُبی بن کعبؓ نے ان کو معتوب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اے عمر! اصحابِ رسولؐ کے لیے عذاب نہ بن جائیے"

یہ عتاب شدید اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک صحابی (حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ) کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا۔ وہ صحابہ کو پسند نہ تھا۔

۳۔ جناب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے فاطمہ بنت قیسؓ کے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا احمد امین اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فاطمہ بنت قیسؓ روایت کرتی ہیں کہ جب ان کے خاوند نے ان کو طلاق دے دی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاوند پر فاطمہ کو نان و نفقہ اور سکونت مہیا کرنے کی ذمہ داری عائد نہ کی اور حکم دیا کہ وہ عدت کے ایام ایک نابینا صحابی عبداللہ بن ام مکتوم کے یہاں گزارے۔ مگر حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر فاطمہ کی بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ:

ہم ایک عورت کے کہنے پر خدا کی کتاب اور حدیثِ رسولؐ کو ترک نہیں کر سکتے
ہمیں اس عورت کے بارے میں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس نے سچ کہا یا جھوٹ نیز یہ
کہ آیا اسے آنحضورؐ کی بات یاد رہی یا بھول گئی۔ حضرت عائشہؓ نے فاطمہ کو مخاطب
کر کے کہا: "تم خدا سے نہیں ڈرتی ہو"۔ (فجر الاسلام ص ۲۶۵)

مذکورہ صدر روایت اکثر کتبِ حدیث میں موجود ہے اور سب فقہاء اس سے آگاہ ہیں اس حدیث پر کئی اعتبار سے بحث کی جا سکتی ہے۔

۱۔ دراصل بات یہ ہے کہ فہم وادراک اور قوتِ استنباط کے اعتبار سے سب صحابہ یکساں نہ تھے۔ بعض اوقات یوں ہوتا کہ خاص حالات کے پیشِ نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی سے کوئی معاملہ کرتے اور وہ اسے عام حکم سمجھ کر لوگوں کے سامنے بیان کر دیتا اس سے صحابہ کے مابین علمی بحث چھڑ جاتی۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوتا کہ صحابہ اس شخص کی صداقت بیانی کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مثلاً ایک صحابی کوئی حدیث روایت کرتا اور دوسرا صحابی اسے منسوخ مخصوص یا مقیّد تصور کرتا۔ یا ایک صحابی حدیث روایت کرتا اور دوسرا سمجھتا کہ حضورؐ کا یہ ارشاد کسی خاص شخص سے متعلق ہے اور مخصوص حالات کے نتیجہ میں صادر ہوا ہے۔ یا ایک صحابی کسی حدیث کو ایک طریقہ سے بیان کرتا اور دوسرا اسے مختلف انداز سے نقل وروایت کرتا۔ اور اس صحابی کے بارے میں اس خیال کا اظہار کرتا کہ اسے وہم ہوا ہے یا وہ بھول گیا یا اس سے کوئی فروگذاشت ہوئی ہے۔ اس سے ملتے جلتے جس قدر بھی اقوال وآثار مروی ومنقول ہیں جن میں ایک فریق دوسرے کو جھٹلا رہا ہے۔ وہ باطل اور مردود ہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ استاذ احمد امین نے جو الفاظ (ہم نہیں جانتے کہ اس عورت نے سچ کہا یا جھوٹ) حضرت عمرؓ کی جانب منسوب کیے ہیں وہ حدیث کی کسی کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ جس قدر کتب حدیث مجھے مختلف لائبریریوں میں مل سکی ہیں ان میں سے کسی حدیث میں یہ الفاظ نہیں دیکھے۔ بخلاف ازیں صرف یہ الفاظ موجود ہیں کہ "معلوم نہیں اس عورت کو آپؐ کے الفاظ یاد ہیں یا بھول گئے۔" البتہ احمد امین کے ذکر کردہ

الفاظ اصول فقہ کی بعض کتابوں میں موجود ہیں مثلاً مسلم الثبوت میں ان الفاظ کو صحیح مسلم کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے۔ حالاں کہ صحیح مسلم میں صرف "حَفِظْتَ أَمْ نَسِيتَ" (یاد رکھا یا بھول گئی) کے الفاظ موجود ہیں۔ مسلم الثبوت کے شارح نے اس جانب توجہ دلائی ہے کہ صحیح مسلم میں۔۔
"حَفِظْتَ امر نَسِيتَ" کے الفاظ مذکور ہیں۔

یہ امر باعث صد حیرت و استعجاب ہے کہ یہ حدیث نقل کرنے کے بعد استاذ احمد امین نے فجر الاسلام کے حاشیہ میں صحیح مسلم کی شرح النَّوَوِی اور مسلم الثبوت کی شرح کا حوالہ دیا ہے۔ جب ہم نے شرح نَوَوِی کی جانب رجوع کیا تو اس میں ہمیں احمد امین کے ذکر کردہ الفاظ "صَدَقْتَ أَمْ كَذَبْتَ" نہیں ملے جب شرح مسلم الثبوت ملاحظہ کی تو وہاں صاف یہ الفاظ ملے کہ۔۔
"مسلم الثبوت میں جو اضافہ مذکور ہے وہ صحیح مسلم میں موجود نہیں" مزید برآں احمد امین سے زیادہ کون اس حقیقت سے آگاہ ہوگا کہ مسلم الثبوت حدیث کی کتاب نہیں ہے۔ اس لیے حدیث رسول کی بحث و تحقیق کے دوران اس کی جانب رجوع نہیں کیا جا سکتا مقام افسوس ہے کہ کثیر فقہاء و اہل اصول نے کتب حدیث کی طرف رجوع کیے بغیر صاحبِ مسلم الثبوت کی اندھی تقلید کا شیوہ اختیار کیا۔

مقام حیرت ہے کہ احمد امین نے کتب حدیث کو کھنگالنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ حدیث نبوی کی تاریخِ تدوین مرتب کرتے وقت ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا تھا کہ حدیث کے اصلی مصادر کو دیکھتے اور جو کچھ نقل کرتے وہاں سے کرتے اسی طرح ایک عالم ہونے کے اعتبار سے احمد امین کا یہ فرض تھا کہ علمی دیانت و احتیاط کی راہ پر گام زن ہوتے اور کسی کتاب کی عبارت کو اس وقت نقل کرتے جب اصلی مصدر و ماخذ کو دیکھ کر خود اطمینان حاصل کر لیتے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ نہ تو اس نے کتب حدیث کی طرف مراجعت کی اور نہ اُن کا حوالہ دینے میں امانت و دیانت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔ بخلاف ازیں من گھڑت جھوٹی عبارت کو شرح نَوَوِی اور شرح مسلم الثبوت کی طرف منسوب کر دیا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آیا احمد امین اس زعم فاسد میں مبتلا تھے کہ فجر الاسلام کے قارئین صرف ان دو کتابوں کا حوالہ دیکھ کر مطمئن ہو جائیں گے؟ یا اس کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ کر اصل مراجع کی جانب رجوع کریں گے؟

۳ - اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ عبارت صحیح ہے ــــــ حالانکہ تاہنوز اس کی صحت ثابت نہیں ہوئی ــــــ تو احمد امین کو چاہیے تھا کہ "كَذَبَتْ" کے لفظ میں کذب سے غلط کا مفہوم مراد لیتے اور "صَدَقَتْ" کو درست کے معنی پر محمول کرتے ہیں۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا ہے کہ "اہل مدینہ کذب کے لفظ کو بھول چوک کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔"

۴ - حضرت عمرؓ نے فاطمہؓ کی روایت کو اس لیے رد کر دیا تھا کہ ان کے خیال میں وہ کتاب و سنّت کے دلائل صحیحہ سے ٹکراتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب دو حدیثیں باہم متعارض ہوں تو ان دونوں میں سے جو اقوی ہو اُس کی طرف رجوع کیا جائے گا اس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ جو بات کتاب اللہ سے ثابت ہو وہ یقینی طور پر قوی تر ہو گی۔ لہٰذا حضرت عمر کے لیے یہ امر ناگزیر ہو گیا تھا کہ فاطمہ کی روایت کو چھوڑ کر ان دلائل کتاب وسنّت کی جانب رجوع کریں جو ان کے یہاں موجود تھے۔ فاطمہ کی جانب سے انہوں نے یہ معذرت پیش کی کہ ہو سکتا ہے اس نے بھول کر وہ روایت بیان کی ہو۔ اس میں طعن و تشنیع یا تنقیص کی کوئی بات نہیں۔

۵ - فاطمہ کے حق میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ کہ "کیا تو خدا سے نہیں ڈرتی" اس امر پر مبنی تھے کہ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ رسول کریمؐ نے کسی خاص وجہ سے اس کو نان و نفقہ اور سکونت کا حق نہیں دلوایا۔ آپ کا یہ مطلب نہ تھا کہ کسی مطلقہ عورت کو بھی نان و نفقہ اور سکونت مہیا نہیں کرنی چاہیے۔ جب حضرت عائشہؓ کو پتہ چلا کہ فاطمہ ایک عمومی حکم کی حیثیت سے آپ کے الفاظ کو لوگوں تک پہنچا رہی ہیں تو فاطمہ کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا اور بتایا کہ یہ حکم صرف اسی کے لیے ہے۔ (ایک عام حکم نہیں ہے)۔ صحیح مسلم میں صراحتہً یہ الفاظ موجود ہیں کہ فاطمہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دے دی ہیں۔ مجھے یہ خطرہ لاحق ہے کہ (اوباش و بدقماش لوگ) میرے گھر میں داخل نہ ہو جائیں چنانچہ آپ نے اس کو دوسری جگہ عدت گزارنے کی اجازت دے دی۔ بخاری کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے کہا:

"یہ حدیث بیان کرنے سے فاطمہ کو کچھ حاصل نہیں ۔ واقعہ یہ تھا کہ فاطمہ کا گھر ایک دُور افتادہ ویرانے میں تھا اور وہاں رہنے میں خطرہ در پیش تھا اس لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو گھر چھوڑنے کی اجازت دے دی تھی"

(صحیح بخاری)

مصنف فجر الاسلام کے جملہ شکوک و شبہات کی تردید و ابطال کے بعد مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ صحابہ نے کبھی ایک دوسرے کے خلاف نہ اظہار شک و شبہ کیا اور نہ کسی پر ایسی تنقید کی جس سے اس کی تکذیب لازم آئے۔ صحابہ سے اس ضمن میں جو کچھ ماثور و منقول ہے خواہ احمد امین نے اس کا ذکر کیا ہو یا نہ کیا ہو ——— وہ صرف اس قدر ہے کہ وہ فہم حدیث میں ایک دوسرے سے تبادلۂ افکار کرتے تھے۔ یا ان کا نزاع و اختلاف اس امر پر مبنی تھا کہ آنے والی نسلیں حدیث نبوی کے بارے میں ان کے حزم و احتیاط سے سبق حاصل کریں اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ حضرات صحابہ کس حد تک حق و صداقت کے حریص، عاشق حدیث سچے خادم علم اور سرگرم داعی و مبلغ تھے۔ خلوص دل سے ہماری دعا ہے کہ خداوند کریم تاریخ انسانیت کے اس ممتاز گروہ سے راضی ہو اور انہیں جزائے خیر سے نوازے۔

جرح و تعدیل میں علماء کا اختلاف:

احمد امین لکھتے ہیں

"جرح و تعدیل پر مذہبی اختلاف بڑی حد تک اثر انداز ہوا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اہل سنت اکثر شیعہ رواۃ کو مجروح قرار دیتے ہیں۔ علمائے اہل سنت نے صراحۃً یہ کہا ہے کہ شیعہ نے حضرت علیؓ سے جو حدیثیں روایت کی ہیں وہ قابل اعتماد نہیں۔ اس لیے ان کی نقل و روایت درست نہیں۔ حضرت علیؓ سے صرف وہ حدیث اخذ کی جا سکتی ہے جو اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ نے روایت کی ہو۔ شیعہ نے بھی اہل سنت کے خلاف یہی طرز عمل اختیار کیا۔ شیعہ کے یہاں صرف اہل بیت کی مرویات قابل اعتماد ہیں اور بس۔"

اس گروہی تعصب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی راوی ایک فرقہ کے نزدیک مجروح اور دوسرے کے نزدیک ثقہ قرار پایا۔

محدث ذہبی فرماتے ہیں:-

"علمائے جرح وتعدیل میں سے دو عالم کبھی کسی راوی کو ثقہ یا ضعیف قرار دینے پر متفق نہیں ہوئے"

اگرچہ یہ قول مبالغہ آمیزی سے خالی نہیں تاہم اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جرح و تعدیل میں علماء کے یہاں کس قدر نزاع و خلاف بپا تھا۔ مثال کے طور پر ہم محمد بن اسحاق کا نام پیش کرتے ہیں جو اسلام کے ابتدائی واقعات کے اولین مورخ تھے۔ ان کے بارے میں علماء کے مختلف و متضاد آراء ملاحظہ فرمائیے۔

قتادہ کہتے ہیں:-

"جب تک محمد بن اسحاق بقید حیات ہیں علم دنیا میں باقی رہے گا"

امام نسائی کا قول ہے:-

"محمد بن اسحاق ثقہ نہیں ہے"

سفیان کہتے ہیں:-

"میں نے کسی شخص کو نہیں سنا جو محمد بن اسحاق کو متہم کرتا ہو"

امام دارقطنی فرماتے ہیں:-

"محمد بن اسحاق اور اس کا والد دونوں ناقابل احتجاج ہیں"

امام مالک کا قول ہے:-

"میں شہادت دیتا ہوں کہ محمد بن اسحاق کذاب ہے"

(فجر الاسلام ص ۲۶۶)

یہاں دو امر محل بحث و نزاع ہیں:-

اول:- جرح و تعدیل کے قواعد کون سے ہیں؟

دوم:- امام ذہبی اور محمد بن اسحاق کے بارے میں منقول مختلف اقوال کہاں تک صحیح ہیں؟

جہاں تک امر اول کا تعلق ہے احمد امین نے جرح و تعدیل کے قواعد کے ضمن میں اجمال و ابہام سے کام لیا ہے۔ اسی طرح گروہی اختلافات کے بارے میں بھی تفصیلاً نہیں لکھا۔ ان کے ظاہری

الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے کہ جرح و تعدیل میں اختلاف کی بڑی وجہ فرقہ وارانہ اختلاف تھے اس ضمن میں اصل بات یہ ہے کہ جرح و تعدیل میں اختلاف دو قسم کا ہوا کرتا ہے :-

(۱) - جب کہ اہل سنت کے علماء کسی شخص کی جرح و تعدیل میں باہم مختلف الرائے ہوں

(۲) - جب کہ جرح و تعدیل کا اختلاف اہل سنت اور ان کے مخالف فرقوں کے درمیان واقع ہو۔

جب اہل سنت کے علماء کسی شخص کی جرح و تعدیل میں باہم مختلف الرائے ہوں تو اس کا موجب و منشا یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک راوی کے صدق و کذب اور اس کے فاسق و عادل یا حافظ و ناسی ہونے میں ان کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے

اہل سنت اور دیگر فرقوں کے مابین جو اختلاف کسی راوی کی جرح و تعدیل کے بارے میں بپا ہوتا ہے وہ مسلکی اختلاف کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں اہل سنت مخالف فرقہ کے راوی کو اس وقت مجروح قرار دیتے ہیں جب کہ :-

(۱) اس کی بدعت کفر تک پہنچا دینے والی ہو۔

(۲) وہ صحابہ کو بُرا بھلا کہتا ہو۔

(۳) بدعت کا سرگرم داعی و مبلغ ہو۔

(۴) اگرچہ بدعت کا داعی تو نہ ہو مگر اس کی روایت کردہ حدیث اس کے مخصوص مبتدعانہ افکار کی مؤید ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ وہ امور ہیں جن سے راوی کی صداقت و امانت مشکوک ہوئے بغیر نہیں رہتی اس سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جرح و تعدیل میں اختلاف کی اصل وجہ مسلکی وگروہی اختلاف نہیں بلکہ راوی کی صداقت و ثقاہت کا مشکوک ہو جانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر کتب حدیث خصوصاً صحیحین میں ایسے ارباب بدعت کی روایت کردہ احادیث موجود ہیں جن کے بارے میں تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جھوٹے راوی نہ تھے۔ مثلاً عمران بن حطان خارجی اور ابان بن تغلب شیعہ امام ذہبی فرماتے ہیں :-

"ابان بن تغلب کوفی اگرچہ شیعہ ہے مگر صادق راوی ہے۔ سچا ہونے کی بنا پر ہم اس کی روایت پر اعتماد کریں گے۔ باقی رہی اس کی بدعت تو اس کا وبال اسی پر ہوگا"

شیعہ جب حضرت علی سے روایت کریں تو اہل سنت کے یہاں یہ اس لیے مقبول نہیں کہ شیعہ حضرت علی کے علم کو بگاڑ کر پیش کرنے کے عادی ہیں اور ایسے اقوال وافکار کو آپ کی جانب منسوب کرتے ہیں جو سرے سے آپ نے فرمائے ہی نہیں۔ محمد بن اسحاق سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :-

"جب حضرت علی کے بعد (شیعہ نے) بہت سی نئی باتیں اختراع کر لیں تو اصحاب علیؓ میں سے ایک نے کہا "خدا ان کو غارت کرے انہوں نے کیسے علم کو بگاڑ کر رکھ دیا" جب اصحاب علی کے یہاں آپ پر جھوٹ باندھنے کا عام چرچا ہوا تو احتیاطاً لوگوں نے ان کی روایات کو قبول کرنا ترک کر دیا۔"

مذکورہ صدر اقتباس اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ استاذ احمد امین کی عبارت میں حدّ درجہ اجمال وابہام پایا جاتا ہے۔ مزید برآں اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جرح و تعدیل میں نزاع و جدال کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے مذہبی اختلاف اور بس !

جرح و تعدیل کے سلسلہ میں جو اختلاف رونما ہوتا ہے احمد امین نے اس ضمن میں محدث ذہبی کے قول سے استشہاد کیا ہے اور محمد بن اسحاق کا نام مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس میں مصنف نے متعدد غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ اور وہ حسب ذیل ہیں۔

اول :

مذہبی اختلاف کے جرح و تعدیل پر اثر انداز ہونے کے سلسلہ میں محمد بن اسحاق کی مثال دینا اس لیے درست نہیں کہ ان کی جرح و تعدیل کے بارے میں جو تخالف و متضاد نظریات پائے جاتے ہیں وہ گروہی اختلافات پر مبنی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ محمد بن اسحاق خود بھی اہل سنت میں سے ہیں اور ان کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کرنے والے سب اہل سنت ہیں۔ اس لیے یہ مثال قطعاً بے محل ہے۔

دوم :

دوسرے یہ کہ احمد امین نے امام ذہبی کی عبارت کا جو مطلب سمجھا ہے نہ کسی دوسرے شخص کے ذہن میں آسکتا ہے اور نہ امام ذہبی کا وہ مقصد ہی تھا۔ احمد امین نے اس عبارت کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ شدید نظریاتی اختلاف کی بنا پر محمد بن اسحاق کی جرح و تعدیل میں اختلاف رونما ہوا۔ بقول

احمد امین۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ دو شخص نہ کسی کو ضعیف قرار دینے پر متفق ہوئے اور نہ اس کی ثقاہت وعدالت ثابت کرنے پر۔ بلکہ اگر ایک عالم کسی راوی کو مجروح قرار دیتا ہے تو دوسرا اس کی توثیق کرتا ہے اور بالعکس۔

یہ ہے وہ مفہوم جو استاذ احمد امین نے امام ذہبی کی سابقاً ذکر کردہ عبارت سے مراد لیا ہے! اگر امام موصوف کی عبارت میں اگر معمولی سے غور و فکر کی زحمت بھی گوارا کی جائے تو اس سے جو مستفاد ہوتا ہے وہ مولف فجر الاسلام کے بیان کردہ معنی و مفہوم کے بالکل خلاف ہے۔ دراصل امام ذہبی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محدثین رواۃ حدیث کی جرح و تعدیل میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے یہاں ایسے راوی کی توثیق کے بارے میں کبھی اختلاف رونما نہیں ہوا جو ضعیف راوی ہونے کے اعتبار سے معروف ہو۔ اور نہ ہی ایسے راوی کو ضعیف قرار دینے میں اختلاف پیدا ہوا جو سب کی رائے میں ثقہ و قابل اعتماد ہو۔ البتہ ایسے رُواۃ و رجال کے بارے میں اختلاف ضرور پیدا ہوتا ہے جو نہ صداقت و ثقاہت میں معروف ہوں اور نہ ضعیف و ناقابل اعتماد ہونے میں۔ خلاصہ یہ کہ محدثین کسی شخص کے انہی اوصاف کو بیان کرتے ہیں جو درحقیقت اس میں پائے جاتے ہیں۔

سند و متن کو جانچنے کے قواعد:

احمد امین لکھتے ہیں:۔

"محدثین نے جرح و تعدیل کے قواعد وضع کیے ہیں جن کا ذکر یہاں بے محل ہوگا مگر حق بات یہ ہے کہ انھوں نے متن حدیث کی جانچ تول کی نسبت اسناد کے پرکھنے پر زیادہ زور دیا ہے چنانچہ ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ محدثین نے کبھی اس امر پر بھی زحمت غور و فکر گوارا کی ہو کہ جو بات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہے وہ جن احوال و ظروف میں کہی گئی تھی وہ ان سے لگا بھی کھاتی ہے یا نہیں۔ یا یہ کہ تاریخی واقعات اس سے ٹکراتے تو نہیں؟ یا یہ کہ حدیث کی عبارت ایسی فلسفیانہ ہے جو آنحضور کے طرز کلام سے ملتی جلتی نہیں ہے۔ یا یہ کہ حدیث میں ایسی شروط و قیود ذکر کی گئی ہیں جیسے کتب فقہ میں مذکور ہوتی ہیں۔ متن حدیث کی جانچ پڑتال میں اس کدّ و کاوش کا عشر عشیر بھی صرف نہیں کیا گیا جو رُواۃ و رجال کی جرح و نقد کے سلسلہ

میں گوارا کی گئی ہے اس کی حد یہ ہے کہ امام بخاری جیسا جلیل القدر اور باریک بین محدث بھی ایسی احادیث کو صحیح قرار دیتا ہے جو تاریخی واقعات و مشاہدات کے خلاف ہیں اس لیے کہ انہوں نے صرف نقدِ رجال پر اکتفاء کیا تھا۔ (متن حدیث کی جانب توجہ نہ دی) مثلاً یہ حدیث کہ "سو سال کے بعد خطہ ارضی پر کوئی شخص زندہ نہیں رہے گا" یا یہ حدیث کہ "جو شخص صبح کے وقت سات کھجوریں کھائے تو اس روز رات تک اس پر زہر اور جادو اثر انداز نہیں ہوگا"

(فجر الاسلام ص ۲۶۶)

احمد امین کا یہ کلام دو امور پر مشتمل ہے:

اوّل:۔ علماء نے نقد حدیث کے سلسلہ میں کون سے قواعد وضع کیے تھے؟

دوم:۔ مذکورہ صدر دونوں احادیث پر نقد و جرح۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا محدثین نے متنِ حدیث پر نقد و تبصرہ کے سلسلہ میں کوتاہی سے کام لیا ہے؟ اور آیا اس ضمن میں جو مساعی جمیلہ انہوں نے انجام دی ہیں اس سے زیادہ سعی و جہد ممکن بھی ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب دینے سے قبل تمہیدی طور پر گزارش ہے کہ جب ایک شخص کسی دوسرے آدمی کے بارے میں آپ کو کوئی خبر سناتا ہے تو سب سے پہلے آپ کے ذہن میں یہ بات آئے گی کہ خبر دہندہ کی امانت و دیانت اور معاملات کا جائزہ لے کر یہ دیکھا جائے کہ وہ شخص کس حد تک سچا ہے۔ اس تائید و توثیق کے بعد آپ یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ وہ خبر کہاں تک درست ہے۔ نیز یہ کہ یہ بات صاحب واقعہ کے احوال و اقوال سے کس حد تک لگا کھاتی ہے۔ اس تحقیق کے بعد آپ کو یقین آجائے گا کہ خبر دہندہ نے جو بات کہی تھی وہ بالکل درست ہے اور اگر وہ بات صاحبِ واقعہ کے احوال و اقوال سے ہم آہنگ و یک رنگ نہیں ہے تو آپ اس خبر کو قبول کرنے میں توقف سے کام لیں گے۔ اس لیے نہیں کہ خبر دہندہ کی شخصیت مشکوک ہے ـــــ اس لیے کہ آپ کو اس کی راست گوئی کا یقین ہے ـــــ بلکہ اس لیے کہ وہ خبر آپ کے نزدیک درست نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ خبر دہندہ کے قول کو وہم و نسیان پر مبنی خیال کر کے آپ اس بات کو درست تسلیم نہ کریں۔

اسی طرح اس امر کا بھی امکان ہے کہ اس کی عدم صحت کی وجہ ایک ایسا راز ہو جو سر دست آپ کو معلوم نہیں مگر آگے چل کر اس کے کھل جانے کا امکان ہے ان حالات کے پیش نظر جب آپ اس خبر کے قبول کرنے میں متوقف نہیں رہے بلکہ اس کے جھوٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے خبر دہندہ کے بارے میں اپنا زاویۂ نگاہ بدل لیا اور اس کو جھوٹا قرار دیا۔ حالانکہ قبل ازیں آپ اسے راست گفتار ٹھہرا چکے ہیں۔

حدیث رسولؐ کے بارے میں علماء نے جو موقف اختیار کیا ہے یہ اس کی ایک مثال ہے۔ محدثین کے یہاں نقدِ سنت کے دو مرحلے ہیں۔

(۱) نقدِ سند

(۲) نقدِ متن

نقدِ سند | ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ سلسلۂ سند کے ہر راوی میں صحابی تک ضبط و عدالت حفظ و سماع جیسے شروط کا پایا جانا ضروری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ احمد امین اور اس کے پیش رو مستشرقین علمائے حدیث کو اس بات سے متہم نہیں کر سکتے کہ انہوں نے رواۃ و رجال کی نقد و جرح میں کوتاہی اور سہل انگاری سے کام لیا تھا۔ بخلاف ازیں مستشرقین تک اس ضمن میں ہمارے ہمنوا ہیں کہ محدثین رُواۃِ حدیث کی چھان پھٹک میں اس بلند مقام تک پہنچ گئے تھے جس سے آگے قدم رکھنا کسی ناقد و محقق کے بس کا روگ نہیں۔

نقدِ متن | جہاں تک متن حدیث کی جانچ پرکھ کا تعلق ہے اس سے متعلق قواعد ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔ نقد متن سے متعلق اہم قواعد حسب ذیل ہیں۔

۱ - حدیث ایسے رکیک الفاظ پر مشتمل نہ ہو جو کسی فصیح و بلیغ شخص سے صادر نہ ہو سکتے ہوں۔

۲ - حدیث عقلی بدیہیات کے خلاف نہ ہو جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو۔

۳ - حکیمانہ اقوال و اخلاق کے منافی نہ ہو۔

۴ - حس و مشاہدہ کے خلاف نہ ہو۔

۵ - بدیہیات طب و حکمت کے خلاف نہ ہو۔

۶ - حدیث ایسے گھٹیا امور کی دعوت پر مشتمل نہ ہو جو شرائع و ادیان کے منافی ہیں۔

۷ - بنیادی عقائد مثلاً صفاتِ الٰہی و انبیاء سے متصادم نہ ہو۔

۸ - کائنات سے متعلق سنت اللہ کے خلاف نہ ہو۔

۹ - ایسی دُور از کار باتوں پر مشتمل نہ ہو جن سے عقلاء کا دامن پاک ہوتا ہے۔

۱۰ - قرآن محکمات سنت اور اجماعی و معروف دینی امور کے خلاف نہ ہو۔

۱۱ - معروف تاریخی حقائق کے خلاف نہ ہو۔

۱۲ - وہ حدیث اس بدعت کی مؤید نہ ہو جس کی طرف اس کا راوی دعوت دیتا ہو۔

۱۳ - حدیث میں ایسا واقعہ بیان نہ کیا گیا ہو جو لوگوں کے ایک جم غفیر کے رُوبرو پیش آیا ہو اور اس کی روایت کرنے میں کوئی راوی منفرد رہا ہو۔

۱۴ - راوی کی کسی ذاتی غرض اور خواہش پر مبنی نہ ہو۔

۱۵ - کسی چھوٹی سی بات پر عظیم اجر و ثواب کا وعدہ نہ کیا گیا ہو یا اس کے برعکس معمولی سی بات پر شدید دھمکی نہ دی گئی ہو۔

یہ ہیں وہ مضبوط و محکم اساسات جن کے بل بوتے پر محدثین نے اپنے آپ کو نقد احادیث کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نقد احادیث کے یہ سانچے اور پیمانے مبنی بر عدل و انصاف ہیں اور کوئی منصف مزاج شخص ان کی مضبوطی و گہرائی سے انکار نہیں کر سکتا۔ مزید یہ کہ ہمارے علماء نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ سابق الذکر کمزوریوں سے پاک ہونے کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی ہے کہ حدیث کا متن اضطراب و شذوذ اور اعلال سے ملوث نہ ہو۔ نیز یہ کہ متن میں قلب و غلط یا ادراج کا بھی کوئی امکان نہ ہو۔ اس کے شواہد و امثلہ کتب اصولِ حدیث میں بکثرت موجود ہیں۔

مگر بایں ہمہ دقیقہ رسی و بالغ نظری محدثین نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ احادیث آحاد میں اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ صحیح السند ہونے کے باوجود کوئی حدیث نفس الامر میں صحیح نہ ہو۔ اگرچہ یہ احتمال حد درجہ کمزور اور بعید از قیاس ہے۔ محدثین کا کہنا یہ ہے کہ احادیث میں راوی کے مبتلائے وہم و نسیان ہونے کا احتمال ہوتا ہے ——— اگرچہ یہ بات ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی ——— اسی قسم کے احتمالات ہیں جن کی اساس پر جمہور علماء نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ احادیث آحاد سے ظنی علم حاصل ہوتا ہے مگر ان کے واجب العمل ہونے میں شک و شبہ کی مجال نہیں

خدا کے دین اور علمی حقائق کے اثبات میں یہ وہ انتہائی حزم و احتیاط ہے جو ایک انسان ملحوظ رکھ سکتا ہے۔

مگر مقام صد افسوس ہے کہ استاذ احمد امین کو یہ سب حزم و احتیاط اور شدتِ تبصرہ و انتقاد اس لیے پسند نہیں کہ ان کے مستشرقین اساتذہ اس تمام کاوش کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔ بنابریں وہ محدثین کی نقد و جرح پر معترض ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کو مندرجہ ذیل امور کی تحقیق کرنا چاہیے تھی۔

(۱) آنحضور کی جانب جو اقوال منسوب ہیں وہ ان احوال و ظروف کے ساتھ کس حد تک ہم آہنگ ہیں جن کے دوران وہ ارشاد فرمائے گئے۔

(۲) تاریخی واقعات کس حد تک ان کی تائید کرتے ہیں؟

(۳) حدیث کا انداز تعبیر و بیان ایسا فلسفیانہ تو نہیں جو آنحضور کے انداز کلام سے مختلف ہو؟

(۴) کیا حدیث مطابق واقعہ بھی ہے یا نہیں؟

(۵) کیا حدیث کے الفاظ کتب فقہ سے ملتے جلتے تو نہیں ہیں؟

(۶) آیا حدیث عہد رسالت کے ماحول سے لگا کھاتی ہے یا نہیں؟

(۷) آیا حدیث کو کسی سیاسی مقصد کے لیے وضع تو نہیں کیا گیا؟

(۸) آیا راوی نے وہ حدیث کسی ذاتی غرض کے لیے تو وضع نہیں کی؟

یہ ہیں وہ قواعد جدیدہ جو احمد امین نے بزعم خویش نقدِ متن کے لیے وضع کیے ہیں اور ان کے خیال میں علمائے حدیث نے ان کی جانب توجہ مبذول نہیں کی۔ احمد امین کا دعویٰ ہے اگر محدثین ان امور کی جانب متوجہ ہوتے تو ان پر بکثرت ایسی احادیث کا راز کھل جاتا جن کو وہ صحیح کہتے چلے آئے ہیں۔ حالانکہ دراصل وہ موضوع ہیں۔

احمد امین نے اپنی کتاب "فجر الاسلام" میں اس کی مثال میں صحیح بخاری کی دو حدیثوں کا ذکر کیا ہے اور "ضحی الاسلام" میں ترمذی کی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث ذکر کی ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا:

"کھمبی (پنجابی کھمب) من (ترنجبین جو بنی اسرائیل پر اتاری جاتی تھی) میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لیے باعث شفا ہے۔ عجوہ (مدینہ میں ایک خاص قسم کی

کھجور) ایک جنتی میوہ ہے اور یہ زہر کے لیے شفا بخش ہے۔"

احمد امین کا کہنا ہے کہ محدثین نے کبھی آزما کر نہیں دیکھا کہ فی الواقع کمرِ متاد (کھمب) کے پانی سے آنکھ کی بیماری دور بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انہیں حدیث کی صحت و صداقت کا پتہ چل جاتا۔ مگر حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ نسخہ آزمایا اور اسے صحیح پایا۔ احمد امین نے آگے چل کر اعتراف کیا ہے کہ بعض اوقات راویانِ حدیث بھی ایک دوسرے پر تنقید کرتے تھے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث میں جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اَوْ کَلْبَ زَرْعٍ (یا کھیتی کی رکھوالی کرنے والا کتا) کا اضافہ دیکھا تو کہا کہ "ابو ہریرہؓ کے کھیت بھی ہیں۔"

آئیے ہم دیکھیں کہ احمد امین نے نقدِ حدیث کے جو جدید سانچے و پیمانے بتائے اور اس ضمن میں احادیث کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ کس حد تک درست ہیں؟

(۱) احمد امین کا یہ اعتراض کہ "محدثین اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جو بات آنحضورؐ کی جانب منسوب ہے وہ ان احوال و ظروف کے کس حد تک مطابق و موافق ہے جن میں وہ کہی گئی" بالکل خلاف واقعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے اس قاعدہ کو نقدِ متن کے لیے معیار و مدار ٹھہرایا ہے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ جس حدیث میں حمام کا ذکر آیا ہے محدثین نے اس کو صرف اس لیے رد کر دیا ہے کہ آنحضورؐ کبھی حمام میں داخل نہ ہوئے۔ نیز یہ کہ حجاز میں اس وقت حمام کا وجود نہ تھا۔

(۲) حدیث کے تاریخی حقائق سے ہم آہنگ ہونے کو بھی محدثین نے صحت حدیث کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے اہل خیبر پر جزیہ عائد کرنے سے متعلق حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ یہ تاریخی واقعات کے خلاف ہے مزید برآں علماء تاریخ سے یہ حقیقت معلوم کرتے ہیں کہ آیا راوی اپنے شیخ سے ملا بھی ہے یا نہیں؟ کیا تاریخ ولادت و وفات سے تلمیذ کی ملاقات شیخ سے ممکن بھی ہے یا نہیں؟

(۳) جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ حدیث ایسے فلسفیانہ اسلوبِ کلام پر مشتمل ہو جس کے سرورِ کائنات عادی نہ تھے۔ تو یہ بات "لفظی رکاکت" کی بحث میں شامل ہے۔ محدثین کے یہاں یہ ضابطہ پایا

جاتا ہے کہ الفاظ رکیکہ کو آنحضورؐ کی جانب منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ہم قبل ازیں امام ابن دقیق العید کا مندرجہ ذیل قول پیش کر چکے ہیں کہ:

"بسا اوقات حدیث کے الفاظ کو دیکھ کر بھی اس کے موضوع ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس امر پر غور کیا جاتا ہے کہ حدیث میں جو الفاظ مذکور ہیں آیا ایسے الفاظ رسالت مآب کی زبان سے صادر ہو بھی سکتے ہیں یا نہیں؟"

بنا بریں فلسفیانہ الفاظ پر مشتمل حدیث کا رد کر دینا محدثین کے لیے مشکل نہیں۔ ہم احمد امین کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کوئی حدیث ایسی پیش کریں جو فلسفیانہ الفاظ پر مشتمل ہو اور محدثین نے اس کی تصحیح کی ہو۔

(۴) جہاں تک اس قاعدہ کا تعلق ہے کہ حدیث کے الفاظ کتب فقہ سے ملتے جلتے نہ ہوں تو یہ محدثین کے یہاں پہلے سے موجود ہے۔ علمائے حدیث نے یہ شرط عائد کی ہے کہ حدیث متعصب راوی کے مذہب و مسلک کی تائید نہ ہو اسی بنا پر عقائد میں وارد شدہ بہت سی احادیث کو رد کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح فقہی مسائل سے متعلق احادیث کو بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ مثلاً یہ حدیث کہ: "جنبی کے لیے تین مرتبہ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے" نیز یہ حدیث کہ "جب کپڑے پر ایک درہم کے برابر خون لگا ہو تو اسے دھو یا جائے اور نماز لوٹائی جائے" ایسی احادیث کو علماء نے موضوع قرار دیا ہے۔

حسب ذیل کتب ملاحظہ فرمائیں:۔

(نصب الرایہ و موضوعات ابن الجوزی و اللآلی المصنوعۃ از سیوطی)

(۵) یہ قاعدہ کہ آیا حدیث واقعہ کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟ محدثین کے یہاں پہلے سے چلا آتا ہے۔ اور اسی کی اساس پر انہوں نے بہت سی احادیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ مثلاً یہ احادیث:۔

(۱) "ایک صدی کے بعد کوئی ایسا بچہ جنم نہ لے گا جس میں بھلائی کا کچھ بھی عنصر شامل ہو" یہ حدیث تجربہ و مشاہدہ کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ پہلی صدی ہجری کے بعد بڑے بڑے آئمہ و فضلاء پیدا ہوئے۔

(۲) - "بینگن ہر مرض کی دوا ہے"

(۳) - "مسور کی دال کھایا کرو کیونکہ وہ دل کو نرم کرتی اور آنسو بکثرت لاتی ہے"

یہ دونوں حدیثیں اس لیے باطل ہیں کہ علم طب اور لوگوں کے تجربہ کے خلاف ہیں۔

(۶) یہ قاعدہ بھی محدثین کے یہاں تسلیم شدہ ہے کہ حدیث سیاسی حالات کی پیداوار نہ ہو۔ نظر بریں محدثین متعصب اہل بدعت کی مرویات کو قبول نہیں کرتے۔ اسی اساس پر غالی عثمانیہ کی روایات حضرت عثمانؓ سے متعلق متعصب امویوں کی بنو امیہ اور بنی عباس کے طرف داروں کی بنو عباس کے بارے میں ناقابل تسلیم ہیں۔ محدثین اس امر سے آگاہ تھے کہ سیاسی اختلافات وضع حدیث کے اہم عوامل و محرکات میں سے ہیں۔ علمائے حدیث نے ایسی احادیث ڈھونڈھ نکالی تھیں اور ان پر شدید نقد و جرح کیا۔ بحث و تمحیص کے بعد ان میں سے اکثر احادیث کو ترک کر دیا اور بہت کم قبول کیں۔

(۷) محدثین کے یہاں یہ قاعدہ بھی مسلمہ حیثیت رکھتا تھا کہ روایت کردہ حدیث اس ماحول سے کہاں تک ہم آہنگ ہے جس میں وہ ارشاد فرمائی گئی۔ اسی کے پیش نظر علماء نے بہت سی احادیث کو رد کر دیا تھا۔ مثلاً یہ حدیث کہ :-

"میری آنکھیں دکھنے لگیں اور میں نے جبریل سے شکایت کی تو مجھے کہا کہ قرآن مجید کو دیکھتے رہئے"

محدثین نے اس حدیث کو اس لیے قبول نہیں کیا کہ عہد رسالت میں قرآن کتابی صورت میں موجود نہ تھا جسے دیکھا جا سکتا۔

(۸) محدثین کے یہاں یہ قاعدہ بھی پایا جاتا تھا کہ راوی کسی ذاتی غرض کے تحت وضع حدیث کا ارتکاب نہ کر رہا ہو۔ اس کی مثال میں محدثین نے یہ حدیث پیش کی ہے کہ :-

دلیا کمر کو مضبوط کرتا ہے۔

یہ حدیث ایک دلیا فروش نے وضع کی تھی۔ اسی طرح یہ حدیث :-

"تمہارے بچوں کے اساتذہ تم میں شریر ترین ہیں"

اس کے راوی سعد بن طریف نے یہ حدیث اس وقت بیان کی جب اس کا بیٹا روتا ہوا آیا۔

اور اس نے بتایا کہ استاد نے مجھے پیٹا ہے۔

مندرجہ صدر بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ احمد امین نے بزعم خویش نقد متن کے لیے جو قواعد وضع کیے ہیں اور اس کے خیال میں علمائے حدیث جن سے غافل تھے محدثین کے یہاں پائے جاتے ہیں اور وہ ہرگز ان سے بے بہرہ نہ تھے۔ محدثین نے صراحتہً یہ قواعد بیان کیے اور ان سے بڑھ کر اور بھی بہت سے ضوابط وضع کیے ہیں۔ پھر ان کو اساس قرار دے کر بہت سی احادیث کو رد کر دیا۔ اگر احمد امین احادیث موضوعہ پر مشتمل کتب کا مطالعہ کرتے اور علماء کی وہ تصانیف بنظر غائر دیکھتے جو علمائے اصول و فضلائے جرح و تعدیل نے مرتب کی ہیں تو وہ اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر نہ رہتے کہ علمائے حدیث قواعد و ضوابط وضع کرنے کے ان سے زیادہ حریص تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ محدثین نے احادیث موضوعہ کی جانچ پرکھ کے لیے جو علامات وضع کی ہیں وہ پندرہ[15] سے بھی زیادہ ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ علماء نے نقدِ حدیث کے ان پیمانوں کو اسی جگہ استعمال کیا ہے جہاں ضروری سمجھا۔ محدثین نے کسی حدیث کو اسی وقت رد کیا جب دیکھا کہ اس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں۔ نیز جہاں حتمی و قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ اس میں صحت کی کوئی شرط مفقود ہے اور وضع کی علامت پائی جاتی ہے۔

محدثین کے یہاں سند حدیث کی جانچ پرکھ اولین و اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ سند کی چھان پھٹک سے حدیث نبوی کا راستہ صاف ہو گیا اور اس کے بل بوتے پر ہزار ہا جھوٹی احادیث کو چھانٹ کر الگ کر دیا گیا۔ نقد سند کے بعد ایک محدود دائرہ کے اندر متن حدیث کو جانچا پرکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ محدثین حد درجہ محتاط تھے اور خدا کے دین میں جذبات و خواہشات کو دخل نہیں دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے وہ فاش غلطیاں سرزد نہ ہو سکیں جن کا ارتکاب احمد امین نے کیا ہے۔ اس کا واحد سبب ان قواعد کا اندھا دھند استعمال ہے اور بس۔ اس غلط کاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ احمد امین نے ایسی احادیث صحیحہ کو بھی موضوع قرار دے دیا جن کی صحت شک و شبہ سے بالا ہے۔

یہ رویہ اختیار کرنے میں علماء کا عذر واضح ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ علماء ان احادیث پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہیں ظاہر ہے کہ نبی کے خاص حالات ہوتے ہیں۔ جن کی بنا پر اس کی ارشاد فرمودہ احادیث کا مقیاس و معیار عوام الناس کی باتوں کے معیار سے دقیق تر و شدید تر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ آپ خدا کے فرستادہ اور جوامع الکلام کے حامل تھے۔

آپ قانونی اقتدار سے بہرہ ور اور ان غیبی اسرار سے آگاہ تھے جن سے کوئی بشر آشنا نہیں ہے۔
بنابریں عقلاً یہ عین ممکن ہے کہ آپ ایک ایسی بات ارشاد فرماتے جو آنحضورؐ کے عصر و عہد میں رہنے والوں کے لیے بالائے فہم و ادراک ہو۔ مگر وہی فلسفیانہ ارشاد اس دور کے عین مطابق ہو جب فلسفہ اپنے نقطۂ کمال پر پہنچ جائے گا۔ اس میں بھی کوئی عقلی استحالہ درپیش نہیں کہ آپ باہمی معاملات کے احکام ایسے مختصر الفاظ میں بیان فرمائیں جو قانونی و فقہی الفاظ سے قریب تر ہوں۔ مثلاً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب ذیل اقوال و ارشادات :-

(۱) بائع و مشتری کو باہم الگ ہونے سے قبل بیع کے فسخ کرنے کا اختیار ہے۔
(۲) پھوپھی کی موجودگی میں بھتیجی سے اور خالہ کے ہوتے ہوئے بھانجی سے نکاح نہ باندھا جائے
(۳) دودھ پلانے سے اسی طرح حرمت قائم ہو جاتی ہے جیسے نسب سے۔

ظاہر ہے کہ مذکورہ صدر اقوال کو صرف اس دلیل کی اساس پر ٹھکرایا نہیں جا سکتا کہ ان کے الفاظ کتب فقہ سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے کہ ان مدلولاتِ صریحہ کے اظہار و بیان کے لیے ان سے فصیح و بلیغ تر الفاظ کا تلاش کرنا ممکنات میں سے نہیں ہے۔ زبان وحی ترجمان سے جب یہ الفاظ صادر ہو گئے۔ تو اس کے بعد فقہاء کا عصر و عہد آیا۔ انہوں نے یہ کیا کہ ان الفاظ کو بعینہا کتب فقہ میں مندرج کر لیا اب یہ کہنا درست نہیں کہ یہ الفاظ فقہی متون سے ملتے جلتے ہیں۔

اسی طرح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض نباتات اور پھلوں کی خاصیات سے بھی آگاہ فرمایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ آپ کی نبوت کا اعجاز ہو اور اس کا مقصد یہ ہو کہ ہر دور میں رسالتِ محمدی کی صداقت کا ثبوت مل سکے۔ اگر کسی زمانہ میں لوگوں پر کسی ارشاد رسول کی حکمت و مصلحت واضح نہ ہو سکے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ حدیث ہی موضوع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے حدیث نے نقد متن کے دائرہ کو نقد سند کے دائرہ سے مقابلۃً بہت تنگ رکھا ہے۔ اس لیے کہ سند کے رواۃ و رجال میں سے کسی ایک پر جو قوانین جاری ہوں گے وہ تمام پر چسپاں کیے جائیں گے۔ مگر متن کا معاملہ جداگانہ نوعیت کا ہے۔ کیونکہ اس کی نسبت اس ذات کی جانب جاتی ہے جو اپنے علوم و معارف اور اہلیت و صلاحیت کے اعتبار سے عام انسانوں سے بدرجہا بلند تھی۔

بعض اوقات قرآن کریم کی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و ارشادات بھی حقیقت کے

بجائے مجاز پر مبنی ہوا کرتے ہیں۔ جو شخص ان کو پہلی مرتبہ دیکھتا ہے وہ یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ کلام صحیح نہیں ہے۔ حالاں کہ ان الفاظ سے وہ لغوی حقیقت مراد و مقصود نہیں جو جلدی ذہن میں آتی ہے۔ گاہے یوں بھی ہوتا ہے کہ آپ پیش آنے والے غیبی امور سے قبل از وقوع آگاہ و آشنا کرتے ہیں۔ ایک شخص بسرعت تمام ان پر تنقید کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ ان کے وقوع پذیر ہونے میں ابھی کافی وقت ہوتا ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ جلد بازی میں ایسے واقعات سے انکار نہیں کر دینا چاہیے۔

بعض اوقات آپ ایسے علمی حقائق کو واضح فرماتے ہیں جو نہ تو عہد رسالت میں وقوع پذیر ہوئے اور نہ ناقدین کے عصر و عہد میں۔ بلکہ آگے چل کر معرض ظہور میں آئے۔ مثلاً وہ حدیث جس میں کتے کے برتن میں منہ ڈالنے کا ذکر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علوم جدیدہ نے حدیث کی صحت کو واضح کر دیا ہے۔ حالانکہ قبل ازیں ہمارے علماء نے اس کے بارے میں یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ یہ حدیث ایسے امور سے تعلق رکھتی ہے جن کی اطاعت تو کی جا سکتی ہے مگر حکمت و مصلحت کا احاطہ ممکن نہیں۔ دور حاضر کے بعض محققین نے انتہائی عجلت سے کام لیتے ہوئے جو بعض احادیث کو رد کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے علماء کا یہ طریق کار مبنی بر حزم و احتیاط تھا کہ احادیث کی تضعیف و تردید میں عجلت سے کام نہ لیا جائے جب حدیث میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہو یا اس کے فہم و ادراک میں دشواری پیش آتی ہو تو جلدی سے اس کو ردی کے ٹوکرے کی نظر نہ کیا جائے۔ کسی حدیث کو اس صورت میں رد کیا جا سکتا ہے جب وہ صحیح السند نہ ہو اور اس میں کوئی کذاب یا متہم بالکذب راوی پایا جاتا ہو۔

جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے ان کا موقف آنحضورؐ کی ذات گرامی کے بارے میں اس سے مختلف تھا۔ وہ احادیث نبویہ کو اسی ترازو میں تولتے تھے جس سے عوام الناس کے اخبار و اقوال کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسولؐ خدا کا منصب و مقام ان کی نگاہ میں ایک عام انسان کا تھا جس میں نہ تو وحی کی کوئی خصوصیت پائی جاتی ہے اور نہ اس کو غیبی امور سے آگاہ و آشنا کیا گیا ہے خلاصہ یہ کہ اس میں کوئی ایسی غیر معمولی بات سرے سے پائی ہی نہیں جاتی جو اسے عام بنی نوع انسان سے ممیز و ممتاز کر دے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے

کوئی ایسی حدیث منقول ہو جس میں کسی علمی معجزہ کی خبر دی گئی ہو جو عہد رسالت میں معروف نہ تھا تو مستشرقین بایں دلیل بلا تامل اس کو موضوع قرار دیتے ہیں کہ یہ عہد رسالت میں رائج علوم و معارف سے ہم آہنگ نہیں ہے اور جب آپ سے قانونی الفاظ کے ساتھ ملتی جلتی کوئی حدیث منقول ہو تو اس کو موضوع ٹھہراتے ہیں اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث اس عصر و عہد کی نمائندگی کرتی ہے جب فقہ اسلامی مرتب و مدون ہو چکی تھی۔ اگر کسی حدیث میں کوئی بشارت دی گئی ہو یا کسی ایسے واقعہ سے آگاہ کیا گیا ہو جو آگے چل کر مسلمانوں کو پیش آنے والا ہو تو پوری بے باکی کے ساتھ پکار اٹھتے ہیں کہ نبی کے خاص حالات ان کو ایسی بات کہنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ مستشرقین نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا ہے جو ایک منکر رسالت اور آپ کے ارشادات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے والا کر سکتا ہے۔ وہ رسالت مآب کی اس روحانی بلندی کو تسلیم ہی نہیں کرتے جو ملأ اعلیٰ کے ساتھ ملی ہوئی تھی اور جس سے نور و حکمت اور علم و معرفت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مستشرقین نے اس جرم میں ہمارے علماء کے خلاف محاذ قائم کیا کہ وہ کیوں کر ان کے ہمنوا نہ ہوئے؟

اس غلط موقف میں مستشرقین کے ہمنوا نہ ہونے میں ہمارے علماء اس لیے معذور تھے کہ وہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے تھے۔ وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ خداوند کریم نے آپ کو تمام بنی نوع انسان کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ آپ کو ایک مضبوط و مستحکم شریعت عطا ہوئی آپ کے حصہ میں وہ سعادت آئی جو دین و دنیا سب کو شامل ہے۔

مقام صد حیرت و تاسف ہے کہ مسلمانوں میں سے احمد امین جیسے مستشرقین کے اندھے مقلدین اسی رو میں بہہ گئے اور یہ معلوم کرنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ یہ راہ کس قدر اغلاط سے پُر ہے۔ بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر انھوں نے اہل اسلام علماء کی مذمت کرنا شروع کی کہ وہ متن حدیث پر تنقید نہیں کرتے اور خود ان کی یہ حالت ہے کہ انھوں نے مستشرقین کے پیش کردہ دلائل پر اکتفاء کیا اور خود اس پر کسی بات کا اضافہ نہ کر سکے۔

احمد امین نے اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں مجھے تو ایک بات بھی ایسی نہیں ملی جو انگریز مستشرقین کی خوشہ چینی یا دریوزہ گری پر مبنی نہ ہو۔ مگر حیرت ہے کہ اس کے باوصف احمد امین اور ان کے ہمنوا نقد احادیث کے سلسلہ میں عقل کی اندھا دھند پیروی کرتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کونسی عقل ہے جس کو وہ حکم ٹھہراتے ہیں اور ہمارے علماء سے بڑھ کر اس سے مغلوب ہیں۔ عقل بھی کوئی ایک قسم کی نہیں جس سے امور کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔ عقل کے درجات و اقسام مختلف و متعدد ہیں ایک چیز ایک شخص کے لیے بالائے فہم و ادراک ہوتی ہے۔ مگر دوسرا شخص اس کو خوب سمجھتا ہے اسی طرح ایک امر کی حکمت و مصلحت ایک خاص عصر و عہد میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ مگر دوسرے زمانہ میں علوم و فنون اور اسرار حیات کے منکشف ہو جانے سے اس چیز کی حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

نظر بریں صرف عقل کی اساس پر جو شتر بے مہار ہے نقدِ متن کا دروازہ چوپٹ کھول دینا اور ایک ناقد کو اس بات کی کھلی چھٹی دے دینا کہ وہ حسب مرضی اپنے جذبات و احساسات سے کام لے اور ایسے شکوک و شبہات پر اپنے نظریات و افکار کی بنیاد رکھے جو کوتاہی فکر و نظر اور غفلت پر مبنی ہوں بے حد خطرناک ہے اور اس سے ایسی انارکی جنم لیتی ہے جس کا نتیجہ خدا ہی کو معلوم ہے۔ نقد متن کی اس کھلی اجازت کا یہ ثمرہ برآمد ہو گا کہ سنت صحیحہ کے لیے سرے سے کوئی مضبوط اساس نہ ہو گی۔ نتیجہ کے طور پر ایک شخص ایک حدیث کو قبول کرے گا اور دوسرا رد کر دے گا۔ تیسرا اس میں توقف سے کام لے گا۔ یہ اس لیے کہ عقل انسانی کے فیصلے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔

ظاہر ہے کہ اس کی کوئی وجہ جواز نہیں۔ استاذ احمد امین نے اپنے لیے غلط طریق کار انتخاب کر کے جن فاش غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے وہ ہمارے لیے سُرمہ چشم عبرت و موعظت ہے۔ کس قدر جسارت ہے کہ احمد امین نے ایسی حدیثوں کی تکذیب کی ہے جن کو جھٹلانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اور ایسی احادیث کو موضوع ٹھہرایا ہے۔ جن کی صحت پر دلائل و شواہد قائم ہو چکے ہیں۔ اب اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے۔

احمد امین کی عظیم جسارت:

حدیث اوّل:۔ لا یبقی علیٰ ظھر ... سو سال کے بعد زمین پر کوئی جاندار زندہ

الارض بعد مائة سنة نفس منفوسة۔ نہیں رہے گا۔

اس حدیث کو امام بخاری و مسلم اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔ احمد امین نے حدیث کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ دنیا سو سال کے بعد ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے اس نے روایت زیر تبصرہ کو موضوع ٹھہرایا ہے کہ یہ تاریخی حقائق اور حس و مشاہدہ کے خلاف ہے۔

درحقیقت مذکورہ صدر روایت طویل حدیث کا ایک جزو ہے جس کو امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری دور میں عشاء کی نماز پڑھی اور پھر کھڑے ہو کر فرمایا "آج جو لوگ کائنات ارضی پر بقید حیات ہیں جب یہ صدی ختم ہو گی تو ان میں سے کوئی بھی اس وقت زندہ نہ ہو گا۔" آنحضورؐ کے ارشاد گرامی میں سے لوگوں کے ذہن میں صرف صدی کا مفہوم باقی رہ گیا۔ حالاں کہ آپ نے فرمایا یہ تھا کہ "جو لوگ آج "پشت زمین پر زندہ ہیں" آپ کا مقصد یہ تھا کہ اس صدی والوں میں سے اس وقت کوئی بھی زندہ نہ ہو گا۔ بلکہ سب موت سے ہمکنار ہو جائیں گے۔

یہ ہے حدیث کی اصل عبارت جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ خبر آپ نے صحابہ کو اپنی زندگی کے آخری دور میں دی تھی۔ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ آنحضورؐ نے اپنی وفات سے ایک ماہ پہلے فرمایا کہ :-

"جو شخص آج جب کہ میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں زمین کی پشت پر زندہ ہے وہ سو سال سے زیادہ عمر نہیں پائے گا۔"

بعض صحابہؓ نے آنحضورؐ کے ان الفاظ "آج جو زمین کی پشت پر زندہ ہے" کی جانب توجہ نہ دی۔ اس لیے انہوں نے ارشاد گرامی کا مطلب یہ سمجھا کہ دنیا سو سال کے بعد ختم ہو جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صحابہ کو آنحضور کا مقصد سمجھایا اور آگاہ کیا کہ آپ کے ارشاد میں "آج زندہ" کے الفاظ ہیں۔ طبرانی کی روایت کے مطابق حضرت علی نے بھی صحابہ کو سمجھایا تھا۔

علماء کی تحقیق کے مطابق سب سے آخری صحابی ابو طفیل عامر بن واثلہ تھے جن کی وفات ۱۱۰ھ میں۔ یعنی فرمان رسول کے پورے ایک سو سال بعد ہوئی۔ بنابریں یہ حدیث معجزات رسول میں سے ایک عظیم معجزہ پر مشتمل ہے۔ آپ نے ایک غیبی امر کی اطلاع دی اور آپ کی اطلاع کے مطابق ظہور پذیر

ہوا۔ یہ ہے اس حدیث کا اصل معنی و مفہوم! اب اس ضمن میں شارحین حدیث کے ارشادات ملاحظہ فرمایئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں فرماتے ہیں :۔

"حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا مطلب واضح کر دیا تھا کہ جب آپ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اس وقت سے لے کر ایک صدی گزرنے پر موجودہ لوگوں میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہے گا۔ اور اسی طرح ہوا بھی تھا۔ صحابہ میں سے جس کی موت سب کے بعد واقع ہوئی وہ ابوالطفیل عامر بن واثلہ تھے۔ اس پر تمام محدثین کا اجماع ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ابوالطفیل ؓ نے ۱۱۰ھ میں وفات پائی تھی اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضورؐ کا یہ ارشاد بھی تو ۱۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس لیے ۱۰ھ سے لے کر صدی کا اختتام ۱۱۰ھ ہی پر ہوتا ہے۔"

امام مسلم نے یہ حدیث متعدد طرق سے روایت کی ہے۔ ایک روایت حضرت جابر سے منقول ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :۔

ما من نفس منفوسةٍ "الیوم" تأتی علیها مائة سنةٍ وهی حیةٌ یومئذٍ	کوئی جاندار "آج" ایسا موجود نہیں کہ اس پر سو سال گزرے اور وہ اس وقت زندہ ہو۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں :۔

یہ حدیثیں باہم ایک دوسرے کے معنی و مفہوم پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان میں آپؐ کی رسالت کی ایک عظیم علامت پائی جاتی ہے ان سے مراد و مقصود یہ ہے کہ آج کی رات جو جاندار کرۂ ارضی پر موجود ہے وہ اس کے بعد ایک سو سال سے زیادہ زندگی نہیں پائے گا۔ خواہ اس سے پہلے اس کی عمر کم ہو یا تھوڑی۔ جو آج کی رات کے بعد پیدا ہوا اس حدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ وہ سو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔"

شارح کرمانی نے محدث ابن بطال کا قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ ایک صدی کی مدت میں یہ نسل ختم ہو جائے گی۔ جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اس اُمت کی عمریں سابقہ اُمم و اقوام کی طرح طویل نہیں ہیں۔ اس لیے عبادت کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا چاہیے۔"

صحابی ابوالطفیل کی وفات کے بارے میں محدث ابن الصلاح مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

"ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بالاتفاق تمام صحابہ کے آخر میں سنہ ۱۰۰ھ میں وفات پائی۔" (مقدمہ علوم الحدیث ص ۱۵)

اُسد الغابہ میں مرقوم ہے :-

"ابوالطفیل رضی اللہ عنہ نے سنہ ۱۰۰ھ میں اور دوسرے قول کے مطابق سنہ ۱۱۰ھ میں وفات پائی۔ ان کی وفات سب صحابہ کے بعد ہوئی۔"

حافظ ابن حجرؒ الاصابہ میں لکھتے ہیں :-

"دوسری شرط معاصرت ہے جس کا اندازہ سنہ ۱۱۰ھ کے گزر جانے سے لگایا جاتا ہے اس لیے کہ آنحضورؐ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ "آج جو جاندار روئے زمین پر زندہ ہیں ایک سو سال گزرنے کے بعد ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔" بخاری و مسلم نے یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے۔ مسلم نے بروایت حضرت جابرؓ یہ اضافہ کیا ہے کہ آپ نے یہ الفاظ اپنی موت سے ایک ماہ پہلے ارشاد فرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے سنہ ۱۱۰ھ کے بعد صحابی ہونے کا دعویٰ کیا ہے محدثین نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ رتن ہندی بھی صحابیت کا دعویٰ کرنے والوں میں سے ایک ہیں۔"

(الاصابۃ - ج ۱ - ص ۸)

حیرت کی بات ہے کہ جو حدیث نبوت کے ایک عظیم معجزہ پر مشتمل تھی احمد امین کی تنقید جدید کی نذر ہو کر جھوٹی اور من گھڑت قرار پائی ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

استاذ احمد امین نے اس حدیث کی تکذیب کے سلسلہ میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ بے حد عبرت ناک ہے۔ محدث ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" میں نظام اور دیگر معتزلہ کے وارد کردہ اعتراضات ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محدثین ایسی احادیث روایت کرتے ہیں جو خلافِ واقع ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے مذکورہ صدر حدیث کا ذکر بھی کیا ہے۔ محدث ابن قتیبہ نے معتزلہ کے

اس اعتراض کا تقریباً وہی جواب دیا ہے جو ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔

مگر اس کا کیا کیا جائے کہ استاذ احمد امین کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہے کہ نقدِ جدید کی آڑ لے کر کسی نہ کسی طرح محدثین کو ہدفِ تنقید بنایا جائے اور ان کی خامیوں کو منظرِ عام پر لایا جائے ظاہر ہے کہ جو شخص حدیث نبوی پر قدماء میں سے نظام و دیگر معتزلہ اور متاخرین میں سے مستشرقین کے اعتراضات سن کر اظہارِ مسرت کرتا ہو اس کو محدثین کی جانب سے ابن قتیبہ کا دفاع کیسے پسند آئے گا؟

شارحین نے اس حدیث کی شرح میں جو کچھ لکھا ہے احمد امین نے مطلقاً اس کی طرف توجہ مبذول نہ کی۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی تشریحات کو بھی نظر انداز کر دیا جو خود صحیح بخاری میں مذکور ہیں۔ صحیح مسلم میں منقول حضرت جابرؓ کی روایت کو بھی ناقابل التفات قرار دیا۔ ان کے لیے حدیث کا صرف وہ ٹکڑا جاذبِ توجہ ثابت ہوا ہے جو صحیح بخاری کتاب العلم میں مذکور ہے۔ امام بخاری اس ضمن میں اس لیے معذور ہیں کہ وہ ایک ہی حدیث کے مختلف اجزاء کو متعدد ابواب میں ذکر کرنے کے عادی ہیں۔ مگر استاذ احمد امین کی اس فروگذاشت کے لیے کوئی وجہ جواز موجود نہیں کہ انہوں نے شارحینِ حدیث کے افکار و نظریات کو ذکر نہیں کیا۔

حافظ ابن حجرؒ صحیح بخاری کتاب العلم کی حدیث کے اس جزو کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "حدیث کے اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ پشتِ زمین پر بقید حیات ہیں وہ سو سال کے بعد زندہ نہیں رہیں گے۔ دوسری روایات میں یہ تفصیل موجود بھی ہے جیسا کہ شعیب کی امام زہری سے منقول روایت جو کتاب الصلوٰۃ میں آگے آ رہی ہے۔
> اس کے بعد ابن حجر نے ابن بطال اور امام نووی کی وہ عبارتیں نقل کی ہیں جو ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔"

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ استاذ احمد امین نے فجر الاسلام کے آخر میں جہاں اہم مصادر و مآخذ کی فہرست پیش کی ہے وہاں فتح الباری شرح بخاری قسطلانی علی البخاری اور شرح مسلم للنووی کا نام سرِ فہرست لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ امام بخاری نے یہ حدیث دو مقامات پر ذکر کی ہے۔ جہاں مختصر حدیث لکھی ہے وہاں شارحین نے مکمل روایت بیان کر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ احمد امین نے اگر اس حدیث کی مختلف

روایات اور شارحین کے اقوال کو دیکھا تھا تو پھر اس حدیث کو جھوٹ کیوں کر قرار دیا؟ اور اگر وہ شارحین کے ان اقوال سے آگاہ و آشنا نہیں ہیں تو ان شروح کو مراجع و مآخذ میں کیوں شمار کیا؟ بلکہ اس سے بڑھ کر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ شروح حدیث کو دیکھے بغیر انہوں نے اس حدیث پر گفتگو کرنے کی جسارت کیوں کی؟

حدیث دوم:

دوسری حدیث جس کو احمد امین نے ہدفِ تنقید بنایا ہے حسب ذیل ہے:

"جس نے علی الصبح عجوہ (ایک خاص کھجور) نامی سات کھجوریں کھائیں اس پر تا شب جادو اور زہر اثر انداز نہ ہوگا"

امام بخاری نے اس حدیث کو کتاب الطب میں روایت کیا ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں بھی موجود ہے۔ امام احمد نے اس کو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کے بارے میں علماء نے مختلف افکار و آراء کا اظہار کیا ہے۔

(الف) بعض علماء نے صحیح مسلم کی روایت کے پیش نظر اس حدیث کو مدینہ کی کھجوروں سے مختص قرار دیا ہے۔ صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ "جس نے مدینہ کے دو کناروں کے درمیان کی سات کھجوریں کھائیں"۔ صحیح مسلم میں دوسری روایت جو عائشہ رضؓ سے منقول ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا "عجوہ عالیہ نامی کھجور باعث شفاء ہے"۔ کچھ بعید نہیں کہ ایک شہر میں جو خصوصیت پائی جاتی ہو وہ دوسرے میں موجود نہ ہو۔ جس طرح کسی شہر کی ایک دوا میں جو تاثیر ہوتی ہے وہ دوسرے شہر کی اسی دوا میں مفقود ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یا تو ارضی خصوصیات ہوتی ہیں یا اس شہر کی ہوا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دستِ مقدس کی برکت سے خاص تاثیر کی حامل تھی۔ کیوں کہ عجوہ نامی کھجور آنحضورؐ نے اپنے دست مبارک سے مدینہ طیبہ میں کاشت کی تھی۔

(ب) بعض علماء کا قول ہے کہ ہر عجوہ میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے (مدینہ کی تخصیص نہیں ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ زہر فرطِ برودت کے باعث موجب ہلاکت ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص روزانہ نہار منہ عجوہ کھائے گا تو حرارت اس میں پختہ ہو جائے گی۔ حرارت غریزی اس کی مزید معاون ہوگی

یہ دونوں حرارتیں مل کر زہر کی برودت کا مقابلہ کریں گی۔

(ج) اکثر علماء کے نزدیک یہ مدینہ کی عجوہ نامی کھجور کے ساتھ مخصوص ہے۔ امام ابن قیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں:-

"کھجور جسم کی حفاظت کرنے والی بہترین غذا ہے۔ خصوصاً اُس شخص کے لیے جو اس کا عادی ہو چکا ہے۔ مثلاً اہل مدینہ اور دیگر لوگ۔ یہ سرد ممالک اور ان علاقوں کے لیے بہت عمدہ غذا ہے جہاں دوسرے درجہ کی حرارت پائی جاتی ہو۔ العالیہ نامی کھجور بہت عمدہ ہوتی ہے یہ لطیف مزے دار اور شیریں ہوتی ہے۔ کھجور دوا بھی ہے غذا بھی اور میوہ بھی۔ یہ اکثر لوگوں کے مزاج کے موافق ہوتی ہے۔ حرارتِ غریزی کو تقویت دیتی ہے۔ دیگر غذاؤں اور میوہ جات سے جو ردّی فضلات پیدا ہوتے ہیں اِس سے نہیں ہوتے۔ جو شخص اس کا عادی ہوتا ہے، اخلاط کے تعفّن و فساد سے محفوظ رہتا ہے۔ اس حدیث کے اصلی مخاطب اہل مدینہ اور گرد و نواح کے لوگ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بلاد و امصار کا ادویہ سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک دوا جو کسی خاص علاقہ میں پیدا ہوتی ہے ایک مرض کے لیے شفا بخش ہوتی ہے۔ وہی دوا جب دوسری جگہ پیدا ہوتی ہے تو اس میں وہ تاثیر موجود نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ مٹی یا ہوا یا دونوں دوا میں تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ زمین کے خواص و طبائع میں اسی طرح اختلاف پایا جاتا ہے جیسے انسانی طبائع میں۔ نباتات کی بعض قسمیں ایسی ہیں جو بعض علاقوں میں غذا سمجھی جاتی ہیں اور بعض جگہ انہیں مہلک زہر تصوّر کیا جاتا ہے"۔

امام ابن قیم دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

"نہار منہ کھجور کھانے سے پیٹ کے کیڑے مر جاتے ہیں۔ اس لیے کہ کھجور میں حرارت کے ساتھ ساتھ تریاقی قوت بھی پائی جاتی ہے۔ جب نہار منہ کھجور کھانے کو معمول بنایا جائے تو جس مادہ سے کیڑے بنتے ہیں وہ کمزور پڑ جاتا ہے اور کیڑے مر جاتے ہیں۔ کھجور میوہ غذا شربت اور مٹھائی سب کا کام دیتی ہے۔ کھجوروں کی یہ تعداد جو حدیث

میں مذکور ہے دسات، خصوصاً جب کہ وہ کھجوریں سرزمین حجاز بلکہ مدینہ کی پیداوار ہوں زہر اور جادو کے اثر کو دُور کر دیتی ہے۔ یہ ایسی خاصیت ہے کہ اگر بقراط جالینوس یا کوئی اور طبیب اسے بیان کرتا تو لوگ قبول کرتے اور ان پر اعتماد کرتے۔ حالانکہ ان کا کلام ظن و تخمین پر مبنی ہوتا ہے جب کہ اس کے ارشاد فرمانے والے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں جن کا قول وحی و برہان پر مبنی ہونے کی وجہ سے قطعی و حتمی ہوتا ہے تو وہ اس کے زیادہ قابل ہے کہ اُسے قبول کیا جائے اور اس پر اعتراض نہ کیا جائے۔"

(زاد المعاد۔ ج ۳۔ ص ۹۴)

یہ ہے حدیث زیر تبصرہ سے متعلق شارحین حدیث کے بیانات کا خلاصہ! میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ کسی حدیث کی تکذیب و تردید میں جلد بازی اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے۔ جب کہ اس کی سند کمزور ہو یا عقل و طب سے اس کا بطلان ثابت ہوتا ہو۔ مگر اس حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ یہ آئمہ حدیث سے بطرقِ متعددہ منقول و مروی ہے۔ اس کے راوی ثقہ و عدول ہیں جن کو کاذب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا متن بطریق اجمال صحیح ہے اس حدیث میں عجوہ نامی کھجور کے فوائد بتلا کر اس کے کھانے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

طبِ جدید میں یہ امر ایک طے شدہ حقیقت کے اعتبار سے تسلیم کیا گیا ہے کہ عجوہ غذا بخش اور ملین معدہ ہوتی ہے۔ یہ جسم میں فرحت و نشاط پیدا کرتی اور کیڑوں کو ہلاک کرتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اندرونی امراض کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ انتڑیوں میں بدبو اور کیڑوں کا پیدا ہو جانا ہے جب یہ معاملہ بڑھ جاتا ہے تو جسم میں زہر پیدا ہو جانے کی وجہ سے جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔

نظر بریں حدیث میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ عجوہ زہریلے اثرات کو ختم کر دیتی ہے، بالکل درست ہے اور اس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ عجوہ سے جادو کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جادو ایک نفسیاتی مرض ہے اس کا علاج بھی نفسیاتی ہونا چاہیے نفسیاتی خیالات و نظریات کو ایسے بیماریوں کے دُور کرنے میں بڑا دخل ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ عجوہ جسم انسانی کے لیے بڑی نفع بخش ہوتی ہے۔ یہ بدن کو تقویت دیتی ہے کیڑوں کو مارتی اور فضلات کے تعفّن کا ازالہ کرتی ہے۔ خصوصاً مدینہ کے عجوہ جس کی یہ تاثیر خود آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے

بیان فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کہتے تھے۔

ایک مسحور دجادو زدہ شخص، جب عجوہ کے ان تمام پہلوؤں پر غور کرے گا تو اس پر اس کا بڑا خوش آمیز اثر پڑے گا۔ طب نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ تخیلات و توہمات بعض امراض میں بڑا اہم پارٹ ادا کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات اچھی طرح کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جب کسی حدیث کی عقلی توجیہ ممکن ہو تو اس کی تکذیب میں جلد بازی کرنا کوئی دانش مندی کا کام نہیں ہے۔

جب طب جدید تا ہنوز عجوہ کی تمام تاثیرات و خاصیات معلوم کرنے میں قاصر رہا ہے تو یہ کس قدر بعید از عقل و قیاس ہے کہ حدیث زیر تبصرہ کو بلا سوچے سمجھے موضوع قرار دے دیا جائے۔ کیا کسی شخص نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ طب اپنی آخری حد تک پہنچ گیا ہے۔ اور اب اس پر کسی اضافے کا امکان نہیں ؟ کیا طب نے دنیا کے تمام ماکولات مشروبات نباتات اور میوہ جات کی خاصیات کا احاطہ کر لیا ہے ؟ آپ یقیناً میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ ان حالات کی موجودگی میں احمد امین کا اس حدیث کو موضوع قرار دینا ایک عظیم جسارت ہے جس کو کسی علمی حلقہ میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً جب کہ حدیث زیر نظر کی سند میں کوئی کلام نہیں۔ اس کا متن بھی شک و ریب سے پاک ہے۔ حدیث کو اس سے کچھ ضرر نہیں پہنچتا کہ طب تا ہنوز عجوہ کی تمام خاصیات دریافت نہیں کر سکا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حجاز میں ترقی یافتہ طبی ادارے ہوتے یا یہ کھجور اہل مغرب کے یہاں موجود ہوتی تو اس کا تجزیہ کرنے سے بہت سے خواص کا پتہ چلتا۔ اگر عجوہ میں ابھی تک اس خاصیت کا سراغ نہیں لگایا گیا تو مستقبل قریب میں اس کی قوی امید کی جاتی ہے۔

حدیث سوم :

تیسری حدیث جس کو احمد امین نے ہدف تنقید بنایا ہے یہ حدیث ہے کہ :-

"کُکر مُتا (کھمب)، ترنجبین (اَلمنّ) میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے باعثِ شفا ہے۔ عجوہ جنتی کھجور ہے اور یہ زہر سے شفا بخشتی ہے"

اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اور امام احمد نے مُسند میں سعید بن زید سے روایت کیا ہے۔ (مسند احمد، ج ۳ - ص ۱۱)

اُستاذ احمد امین اس حدیث پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"سوال یہ ہے کہ آیا کسی نے آزما کر دیکھا ہے کہ کُمّتا میں درحقیقت یہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ اور یہ زہر کے لیے تریاق ہے؟ البتہ محدثین نے ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ "میں نے تین یا پانچ یا سات عدد کُمّتا لیے اور ان کو ایک شیشی میں نچوڑا۔ میری ایک لونڈی تھی جس کی نظر کمزور تھی۔ میں نے یہ پانی اس کی آنکھوں میں ڈالا تو اس کی بینائی لوٹ آئی" مگر حدیث کی صحت ثابت کرنے کے لیے یہ بات کافی نہیں۔ اس لیے کہ ایک جزئی اور انفرادی تجربہ سے دوا کی تاثیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ بار بار تجربہ کر کے اس کو آزمایا جائے۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ اس کے اجزا معلوم کرنے کے لیے اس کا تحلیل و تجزیہ کیا جائے یہ تسلیم کہ اس دور میں تجزیہ کا امکان نہ تھا۔ مگر بار بار تجربہ کرنے سے کوئی امر مانع نہ تھا۔ پیہم تجربہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی تھی کہ آیا یہ حدیث صحیح ہے یا موضوع"

(ضحی الاسلام، ج ۲ - ص ۱۳۱)

اس ضمن میں دو باتیں قابل غور ہیں :-

(۱) یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری و مسلم و دیگر کتب حدیث میں منقول ہے۔ اس کی سند میں کوئی راوی متہم یا مجروح نہیں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے اس کو آزمایا اور درست پایا۔ مزید برآں دیگر محدثین نے بھی تجربہ کے بعد اس کی تصدیق کی۔ امام نوویؒ شارح صحیح مسلم فرماتے ہیں کہ ان کے ایک ہم عصر عالم نابینا ہو گئے۔ موصوف نے کُمّتا کا پانی آنکھ میں ڈالا تو بصارت عود کر آئی۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ وہ بڑے ثقہ راوی اور صالح شخص تھے۔ بعض علماء نے دعویٰ کیا ہے کہ اگر کُمّتا میں اثمد نامی سرمہ ملا لیا جائے تو یہ بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ مسلم اطباء نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں :-

"مشاہیر اطباء نے اعتراف کیا ہے کہ کُمّتا کا پانی بصارت کو تیز کرتا ہے۔ چنانچہ ابو سہل مسیحی اور بوعلی سینا کا بیان یہی ہے۔ اگر اس کو سرمہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے ظلمت بصر اور دکھتی آنکھ ٹھیک ہو جاتی ہے۔ مشہور عالم اور طبیب غافقی نے

مفردات میں لکھا ہے کہ اگر کُھمبی کے پانی کو مشہور دوا اثمد کے پانی میں گوندھ کر سُرمہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو اس سے آنکھ کی پلکوں کو تقویت پہنچتی ہے اور بصارت کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ داؤد نے اپنی کتاب تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس کے پانی سے آنکھ کو جلا حاصل ہوتی رہتی ہے۔"

(زاد المعاد، ج ۳ - ص ۱۸۱)

علماء کے مندرجہ صدر بیانات اس حقیقت کو اُجاگر کرتے ہیں کہ نہ علماء نے تجربہ کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا اور نہ اطباء سے کوتاہی سرزد ہوئی۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ مؤلف "فجر الاسلام" پر ایک ہی دُھن سوار ہے کہ اس کائنات پر بسنے والا ہر مسلم چند عدد کُھمبی لائے۔ پھر ان کو نچوڑ کر ہر مسلم کی آنکھ میں ڈالا جائے۔ اگر نتیجہ کے طور پر سب مسلم اندھے ہو جائیں تو حدیث جھوٹی ہو گی ورنہ سچی۔

ہم احمد امین سے پوچھتے ہیں کہ جب حضرت ابو ہریرہؓ امام نووی شارح صحیح مسلم اور قدیم اطباء اس کو آزما چکے ہیں اور انہوں نے اسے امراض چشم کے لیے مفید پایا ہے تو آیا ان کا بیان غلط ہے؟ کیا احمد امین نے بذات خود ایسا تجربہ کیا اور اسے کوئی تکلیف پہنچی؟ یا کسی اور نے اسے آزمایا اور وہ تکلیف میں مبتلا ہوا؟ کیا احمد امین نے روئے زمین پر پیدا ہونے والی کھمبی کا تجربہ و تجزیہ کر لیا اور اس کی سب قسموں کو ملاحظہ کیا ہے؟ اور اگر اس نے تجربہ کر لیا ہے اور اسے معلوم ہوا کہ کُھمبی سے آنکھ کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا تو ہم اس سے پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ جس کھمبی کا آپ نے تجربہ کیا یہ اسی طرز و انداز کی کھمبی تھی جو عہد رسالت میں سرزمین حجاز میں پائی جاتی تھی اور جس کی خاصیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تھی؟ نیز یہ کہ آیا طب اپنے نقطۂ کمال تک پہنچ گیا ہے کہ جب کوئی حدیث اس کے خلاف ہو تو تم اس حدیث کو جھوٹی اور موضوع قرار دے سکو؟

حق بات یہ ہے کہ استاذ احمد امین کی تہی دامنی اس ضمن میں اب منظرِ عام پر آگئی ہے۔ یہی معاملہ سابقہ دو حدیثوں میں پیش آچکا ہے۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ایک صحیح المتن والسند حدیث کی صحت پر احمد امین کو کیا شک ہو سکتا ہے؟ حالانکہ اطباء اس کی صحت پر متفق ہیں۔ البتہ اگر طب جدید سے ثابت ہو جاتا کہ کُھمبی میں یہ تاثیر نہیں پائی جاتی تب بھی ایک بات تھی۔ احمد امین اس صورت میں یہ کہہ

سکتے تھے کہ متقدمین اطباء سے کوتاہی سرزد ہوئی ہے۔ مگر اے کاش! کہ طبِ جدید سے ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہوئی اور ان شاء اللہ العزیز ہو بھی نہیں سکتی۔

حدیث چہارم:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کتا پالا اس کے اعمال میں سے ہر روز دو قیراط (ایک وزن و پیمانہ) کم ہوتے رہیں گے۔ البتہ شکار یا مویشیوں کی حفاظت کے لیے کتا پالنے کی اجازت ہے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ ابوہریرہؓ کی روایت میں تو کھیتی کی حفاظت کے لیے کتا پالنے کی اجازت بھی دی گئی ہے۔ یہ سُن کر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ "ابوہریرہؓ کی کھیتی بھی تھی"۔

اس حدیث پر تنقید کرتے ہوئے احمد امین لکھتے ہیں:۔

"حضرت عبداللہ کی جانب سے ابوہریرہؓ پر یہ لطیف طنز ہے۔ احمد امین کا مطلب یہ ہے کہ ابن عمر ابوہریرہؓ کو متہم کر رہے ہیں کہ انہوں نے یہ لفظ حدیث میں از خود اس لیے بڑھایا تاکہ وہ کھیتی کی حفاظت کے لیے کتا پال سکیں"۔

(ضحی الاسلام، ج ۲۔ ص ۱۳۱، ۱۳۲)

حضرت ابوہریرہ کی وہ روایت جس میں کھیتی کی حفاظت کے لیے کتا پالنے کی اجازت ہے صحیح بخاری کتاب المزارعۃ میں موجود ہے اس میں ابن عمرؓ کی روایت موجود نہیں۔ بخاری میں سفیان بن زُہیر سے بھی اسی قسم کی حدیث مروی و منقول ہے۔ ترمذی کتاب الصَّید میں ابوہریرہؓ کی روایت کیساتھ ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن مُغَفَّل کی روایات بھی مذکور ہیں۔ امام مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ و ابن عمرؓ دونوں کی روایت کردہ احادیث نقل کی ہیں۔ امام مسلم نے اس کے ساتھ ساتھ وہ روایات بھی ذکر کی ہیں جن میں صراحۃً کھیتی کے لیے کتا پالنے کی اجازت آئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابوہریرہ رضؓ اس لفظ کے روایت کرنے میں منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ کثیر صحابہ نے آپ کی تائید کی ہے۔

بکثرت شارحین حدیث نے حضرت ابوہریرہؓ کے اس اضافہ پر روشنی ڈالی اور بتایا ہے کہ یہ الفاظ کہنے سے حضرت عبداللہ کا مقصد کیا تھا۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں پہلے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ کا مقصد ابوہریرہؓ کی روایت کی تصدیق کرنا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ رُواۃ حدیث میں سے سفیان بن

زُھَیر اور عبداللہ بن مُغفّل نے ابو ہُریرہ کی تائید کی ہے - ان کی روایات صحیح مسلم میں موجود ہیں -

امام نووی شارح صحیح مسلم نے حضرت ابن عمر کے اس قول پر کہ "ابو ہریرہ کی کھیتی بھی ہے" ارشاد فرمایا ہے - اس سے حضرت عبداللہ کا مقصد نہ ابو ہریرہؓ کی روایت کی تحقیر ہے اور نہ اس کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار - بخلاف ازیں ان کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ زمیندار تھے اس لیے انہوں نے اس لفظ کا زیادہ اہتمام کیا اور اسے خوب یاد رکھا - یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی کام میں مبتلا ہوتا ہے وہ دوسروں سے بڑھ کر اس کے احکام کو یاد رکھتا ہے - اور اس کے لیے وہ بلیغ اہتمام کرتا ہے جو دوسرے نہیں کرتے -

یہ اضافہ کہ "ابو ہریرہؓ کی کھیتی بھی تھی" صحیح مسلم میں بروایت ابن مغفل و سفیان بن زہیر نیز بروایت عبدالرحمن بن ابی نُعَیم بَجَلی از ابن عمر مذکور ہے - ہو سکتا ہے کہ ابن عمرؓ نے جب ابو ہریرہ سے اسے سنا ہو اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تحقیق کر لی ہو تو پھر خود روایت کرنے لگے ہوں - اور اس حدیث میں جو ابن عمرؓ خود روایت کیا کرتے تھے ان الفاظ کا اضافہ بھی کر دیا ہو - اس امر کا بھی احتمال ہے کہ ابن عمرؓ کو کسی وقت یاد آ چکا ہو کہ میں نے آپ سے یہ الفاظ سنے تھے اور پھر ان کو بیان کر دیا ہو حالانکہ پہلے بھول چکے تھے - خلاصہ یہ ہے کہ ابو ہریرہ ان الفاظ کے روایت کرنے میں ہرگز منفرد نہیں بلکہ صحابہ کی ایک جماعت اس ضمن میں ان کی ہمنوا ہے - تاہم اگر وہ اس کی نقل و روایت میں تنہا بھی ہوتے تب بھی ان کا یہ اضافہ بہر حال قبول کر لیا جاتا -

یہ ہے مسئلہ زیر قلم کی اصلی شکل و صورت! اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کا مقصد نہ تو ابو ہریرہ کی تکذیب ہے اور نہ یہ کہ اس اضافہ کی نسبت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب مشکوک ہے - حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ جناب ابو ہریرہ سے متعلق ایسی رائے دے سکتے ہیں - اس لیے کہ انہوں نے خود فرمایا ہے کہ ابو ہریرہؓ احادیث رسولؐ کے سب سے بڑے حافظ ہیں - ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ حضرت ابن عمر اور دیگر اجلّہ صحابہ کے دل میں ابو ہریرہؓ کی کس قدر عظمت و وقعت تھی - مزید یہ کہ محدثین حضرت ابو ہریرہؓ کی تکذیب پر مشتمل حضرت ابن عمرؓ کے قول کو اپنی تصانیف میں کیوں کر درج کر سکتے تھے؟ نیز یہ کہ اندریں صورت فقہاء کے لیے ابو ہریرہؓ کی حدیث سے استناد و احتجاج کر کے اس سے مسائل کے استخراج کی کیا وجہ جواز ہو سکتی تھی؟

عظیم علمی خیانت :

حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ اُستاذ احمد امین کی بات درست نہیں۔ مگر اس حد سے بڑھی ہوئی "علمی امانت و دیانت" کا کیا جائے کہ موصوف حضرت ابن عمرؓ کے قول کو ابو ہریرہؓ کی تکذیب پر محمول کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اسی "دیانت" کا تقاضا ہے کہ احمد امین ساتھ ساتھ کتب حدیث کا حوالہ بھی دیتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں ان کی نوک قلم پر شرح نووی کا نام بھی آیا ہے۔ آپ امام نووی کے الفاظ دیکھ چکے ہیں۔ حیرت ہے کہ ان میں حضرت ابو ہریرہ کی تکذیب کی بُو تک نہیں پائی جاتی۔ بلکہ وہ اس غلط نظریہ کی پرزور تردید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اب اس کے بعد آپ یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ آیا احمد امین شارح مسلم کی بات سمجھ نہ پائے؟ یا سمجھ تو گئے تھے۔ مگر انہوں نے یہودی مستشرق گولڈ زیہر کی رائے کو زیادہ وزنی خیال کیا اور اس کے مقابلہ میں اہل اسلام علماء اور آئمہ دین کے زاویۂ نگاہ کو کوئی وقعت نہ دی۔ گولڈ زیہر کا قول آگے آرہا ہے۔

یہ ہیں وہ احادیث جن کو احمد امین نے بزعم خویش اپنے عمیق و دقیق نقد و جرح کا نشانہ بنایا ہے آپ پر یہ حقیقت آشکار ہو چکی ہے کہ نقدِ حدیث کے میدان میں احمد امین کوئی نئی بات نہیں لائے جو ہمارے علمائ نے نہ کہی ہو۔ اگر کوئی نئی بات ہے تو وہ صرف اتنی کہ احمد امین نے نقد حدیث کے قواعد کا اندھا دھند استعمال کیا ہے اور اس ضمن میں حد درجہ بے باکی اور جسارت سے کام لیا ہے اس نے ایسی احادیث صحیحہ کو نقدِ شدید کے تیروں سے گھائل کر کے رکھ دیا ہے جن کی صحت تنقید سے بالا ہے اور جن کے بارے میں مستشرقین کے غلط اور محرّف علم کا بھی بس نہیں چل سکا۔

بخلاف ازیں ہمارے محدثین جادۂ صدق و صواب پر گام زن رہے اور جذبات کی رَو میں بہہ کر انہوں نے صراطِ مستقیم کو نہیں چھوڑا۔ محدثین نے نقدِ رجال و متن کے لیے جو قواعد وضع کیے تھے انہوں نے ان کو بطریق احسن استعمال کیا۔ تنقید حدیث کے ضمن میں صحیح راستہ بھی یہی ہے۔ جو حدیث ہمارے پاس صحیح علمی طریقہ سے پہنچی ہو، اس کے تمام راوی ثقہ ہوں اور اس کے متن میں بھی کوئی قابل اعتراض چیز نہ ہو اور وہ اسی طرح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے تو اس سے انکار و تکذیب کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یا تو اس سے قول رسول سے

انکار لازم آتا ہے ۔ جس کی جرأت کوئی مسلم نہیں کر سکتا ۔ بصورتِ دیگر ان صحابہ و تابعین کی تکذیب لازم آتی ہے ۔ جن سے نقل ہو کر وہ حدیث ہم تک پہنچی ۔ حالاں کہ ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ تمام صحابہ راست گفتار تھے اور جو شخص بھی ان کی سیرت و اخلاق کا مطالعہ کرتا ہے اس پر یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ پوری کائنات میں نہ ان سے زیادہ کوئی سچ بولنے والا ہے اور نہ خدا سے زیادہ ڈرنے والا ۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مرویات میں شک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ پوری اسلامی تاریخ کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا جائے ۔ اگر احمد امین یہ کہیں کہ ہم عدول اور ثقہ راویوں کی تکذیب نہیں کرتے ۔ ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ ان سے وہم و خطاء کا صدور ممکن ہے ۔ تو ہم کہیں گے کہ یہ احتمال بڑا کمزور ہے ۔ اس لیے ظن قوی پر غالب نہیں آسکتا ۔ خصوصًا جب کہ چند ایک کے سوا ہمارے اکثر علماء نے احتیاطًا یہ بات کہی ہے کہ خبر واحد سے ظنی علم حاصل ہوتا ہے ۔ اب اس کے بعد کیا چیز باقی رہ جاتی ہے ؟

خبر واحد پر عمل :

احمد امین لکھتے ہیں کہ :-

” محدثین نے حدیث کی دو قسمیں بیان کی ہیں ۔

(۱) خبر متواتر — (۲) خبر واحد ۔

خبر متواتر سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے مگر وہ موجود نہیں ۔ بعض نے ایک اور بعض نے سات احادیث کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے ۔

خبر واحد سے ظنی علم حاصل ہوتا ہے ۔ گر غلبۂ صدق کے وقت اس پر عمل جائز ہوتا ہے “

(فجر الاسلام ۔ ص ۲۶۷)

احمد امین کا مذکورہ صدر قول قابل غور ہے ۔ دراصل بات یہ ہے کہ جن علماء نے احادیث متواترہ کی تعداد میں اختلاف کیا ہے ان کے زاویہ ہائے نگاہ یکساں نوعیت کے نہیں ہیں ۔ امام سیوطی نے صراحتہً اس پر روشنی ڈالی ہے ۔ ورنہ اس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں ہے کہ احادیث متواترہ بہت ہیں ۔ اور وہ ایک دو یا سات میں محدود و محصور نہیں ہیں ۔

احمد امین نے دعویٰ کیا ہے کہ محدثین خبر واحد پر عمل کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں ۔ ہمیں نہیں

معلوم کہ اس قول کا قائل کون ہے؟ آپ قبل ازیں دیکھ چکے ہیں کہ غالی شیعہ خبر واحد کو بالکل قابل عمل تصور نہیں کرتے۔ جمہور اہل اسلام خبر واحد کو واجب العمل حجت قرار دیتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کی سند صحیح ہو۔ بعض علماء کے نزدیک خبر واحد سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے اس لیے واجب العلم والعمل ہوتی ہے۔

نظر بریں احمد امین نے خبر واحد پر عمل کرنے کے جواز کا جو قول علماء سے نقل کیا ہے اس کی صرف دو صورتیں ممکن ہیں تیسری کوئی نہیں:

(۱) یا تو یہ بات احمد امین نے بے خبری و ناشناسی کے عالم میں کہی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جو شخص اسلامی دعوت و تبلیغ اور اسلامی تہذیب و حضارت کی تاریخ قلمبند کر رہا ہو اور رواۃ و رجال پر نقد و تبصرہ کا خواہاں ہو اور اپنے آپ کو مختلف مذاہب و مسالک کے مابین ثالث کے طور پر پیش کر رہا ہو اس کا مبلغ علم یہ ہو۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ احمد امین حقیقت نفس الامری سے آگاہ ہے اور دانستہ تحریف کا مرتکب ہو رہا ہے۔

اس تحریف بازی سے احمد امین کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ حدیث نبوی کو مشتبہ و مشکوک بنا کر رکھ دیا جائے۔ جیسا کہ قبل ازیں ہم بیان کر چکے ہیں۔ احمد وہ یوں کہ جب حدیث متواتر کا کہیں وجود ہی نہیں۔ اور خبر واحد صرف جائز العمل ہوتی ہے۔ تو اس کے بعد حدیث نبوی میں سے کیا چیز باقی رہی اور شرعی مصادر و ماخذ میں اس کو کیا مقام حاصل ہوگا؟ اس سے بڑھ کر یہ کہ پھر حدیث کی ضرورت ہی کیا ہے۔ احمد امین کی تنقید حدیث کے اس نتیجہ پر غور فرمائیے اور پھر اس کی علمی امانت و دیانت پر سر دھنیے۔!

کچھ حضرت ابو ہریرہ رضؓ کے بارے میں

اب ہم "فجر الاسلام" کی اس فصل پر تنقید کرنا چاہتے ہیں جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ استاذ احمد امین حضرت ابوہریرہؓ کو ہدف مطاعن بنانے اور ان پر حملہ آور ہونے کے سلسلہ میں عیسائی مستشرقین اور معتزلہ کی راہ پر گام زن ہونے کے بے حد مشتاق نظر آتے ہیں۔ چنانچہ بحث و تمحیص کے دوران موصوف نے اکثر جگہ حضرت ابوہریرہؓ کو مورد طعن ٹھہرایا ہے۔ مگر وہ ابوہریرہ کے بارے میں بیچ بیچ کر بات کرتے اور ایسا منافقانہ انداز اختیار کرتے ہیں کہ ان کے قلب و ضمیر میں جو گستاخانہ احساسات پائے جاتے ہیں وہ ظاہر نہ ہونے پائیں۔

تاہم احمد امین نے حضرت ابوہریرہؓ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جس طرح حقائق کو توڑا مروڑا، آپ کی صداقت کو مشکوک ثابت کرنے کی کوشش کی اور ان کے بارے میں صحابہ کے شکوک کو نقل کیا ہے اس سے ان کے دل کی بات کھل کر منظر عام پر آگئی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا کہ

"جو شخص کسی بات کو چھپائے گا اللہ تعالیٰ اس کو اسی قسم کی چادر پہنائے گا"

میں نے مناسب خیال کیا کہ احمد امین کے وارد کردہ اعتراضات و مطاعن ذکر کرنے سے قبل حضرت ابوہریرہؓ کے مختصر سیر و سوانح ذکر کر دوں۔ تاکہ ان کی صحیح تاریخ سامنے آجائے اور یہ حقیقت بھی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جائے کہ آنحضورؐ کے صحابہ علماء تابعین اور ائمہ دین اس جلیل القدر صحابی کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے پھر آپ بسہولت ابوہریرہؓ کے اس تابان و درخشان حسن و جمال اور اس مسخ شدہ صورت کے مابین تقابل کر سکیں گے جو احمد امین نے اپنے عیسائی شیوخ و اساتذہ کی پیروی میں پیش کی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی سیرت ہم نے استیعاب ابن عبد البر اصابہ ابن حجر تہذیب الاسماء نودی اور دیگر کتب رجال سے پیش کی ہے۔

نام و کنیت حضرت ابوہریرہؓ اور ان کے والد کے بارے میں علماء کے بکثرت اقوال ہیں

مشہور مورّخ قطب حلبی نے اس ضمن میں چوالیسؔ اقوال نقل کیے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ ظہورِ اسلام سے پہلے آپ کا نام عبدشمس بن صخر تھا۔ جب حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو آپ نے ان کا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ آپ یمن کے قبیلہ دَوس سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ بھی اسی قبیلہ سے تھیں اور ان کا نام اُمیمہ تھا۔ امام ترمذی نے ان کی کنیت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں "میں اپنے گھر والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ میں نے ایک چھوٹی سی بلی پال رکھی تھی۔ جب رات آتی تو میں اسے ایک درخت میں چھپا دیتا۔ دن کے وقت میں اس سے کھیلتا رہتا اس لیے لوگوں نے مجھے ابوہریرہ (چھوٹی سی بلی کا باپ) کہنا شروع کر دیا۔

اسلام و صحبت حضرت ابوہریرہؓ ۷ھ کو صلح حدیبیہ اور غزوۂ خیبر کے درمیانی عرصہ میں مشرف باسلام ہوئے۔ آپ کی عمر اس وقت تقریباً تیس سال تھی۔ جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر سے لوٹے تو حضرت ابوہریرہؓ آپ کی معیّت میں مدینہ پہنچے اور مسجد نبوی کے سائبان (صفہ) میں سکونت پذیر ہوئے۔ اس کے بعد سایہ کی طرح ہمیشہ آپ کے ساتھ ساتھ رہے اور کبھی جدا نہ ہوئے۔ اکثر اوقات کھانا بھی آپ کے یہاں سے کھاتے۔ حتیٰ کہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وفات پائی۔

اوصاف و اخلاق حضرت ابوہریرہؓ گندم گوں تھے۔ سینہ چوڑا سر پہ بالوں کی دو لٹیں تھیں، دانت کشادہ، داڑھی بلی جس پہ زرد رنگ لگاتے تھے۔ مونچھیں منڈواتے تھے۔ آپ صادق العقول خوش مزاج دوستوں کے دوست اور ظریف الطبع تھے۔

محدث ابن ابی الدنیا نے کتاب المزاح میں زُبیر بن بکّار سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابوہریرہؓ سے کہا "میں نے صبح روزہ رکھا تھا۔ میں اپنے والد کے یہاں آیا تو وہاں میں نے روٹی اور گوشت دیکھا جو میں نے سیر ہو کر کھالیا۔ یہ مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں روزہ سے ہوں" ابوہریرہؓ نے کہا "تجھے خدا نے کھلایا۔ پھر میں وہاں سے چل دیا اور کسی اور شخص کے یہاں گیا۔ میں نے دیکھا کہ بکری کا تازہ دودھ موجود ہے۔ چنانچہ میں نے سیر ہو کر بکری کا دودھ پی لیا۔ ابوہریرہؓ نے کہا "تجھے خدا نے پلایا" اس نے کہا پھر میں اپنے گھر آ کر دوپہر کو سو رہا۔ جب بیدار ہوا تو پانی منگوا کر پیا۔ ابوہریرہؓ نے کہا۔ بھتیجے! تو نے کبھی روزہ رکھا ہی نہیں۔

ابن قتیبہ نے اپنی کتاب " المعارف " میں روایت کیا ہے کہ مروان نے ابو ہریرہؓ کو مدینہ کا عامل مقرر کیا۔ آپ ایک پالان کس کر گدھے پر سوار ہو گئے۔ سر پر کھجور کی چھال اٹھا رکھی تھی جب راستہ میں کوئی شخص ملتا تو کہتے راستہ سے ہٹ جاؤ۔ مسلمانوں کا امیر آرہا ہے۔ ابو ہریرہؓ پر طعنہ زنی کرنے والوں نے جن میں گولڈزیہر جیسے لوگ شامل ہیں کہا کہ ابو ہریرہؓ ضعیف العقل تھے دلیل کے طور پر انہوں نے یہ واقعہ پیش کیا ہے۔

(انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ج ۱ ص ۴۰۸)

کچھ یوں دکھائی دیتا ہے کہ احمد امین عیسائی مستشرقین کی اس رائے کو بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسی لیے ابو ہریرہؓ کی سیر و سوانح پر روشنی ڈالتے ہوئے اس نے ابن قتیبہ کے بیان کردہ واقعہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ ابو ہریرہؓ کے اخلاق و عادات میں احمد امین کو اس کے سوا کوئی سقم نظر نہیں آیا۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابی پر یہ بہت بڑا حملہ اور بے بنیاد الزام ہے جو حقائق کی توڑ مروڑ پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ خوش طبعی اور ظرافت و مزاح سے انسان کی عزت و عظمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ اس کے یہ معنی بھی نہیں ہوتے کہ وہ شخص کم عقل اور احمق ہے۔ ورنہ اس سے لازم آئے گا کہ ہر لطیف مزاج اور خوش ذوق آدمی احمق ہو۔ اس کے برعکس ہر چڑچڑا اور درشت طبع شخص بہت بڑا مدبر اور دانشمند ہو۔

زہد و عبادت

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ابو ہریرہؓ اہل صفہ میں سے تھے۔ زیادہ تر مسجد نبوی میں رہتے کھانا بھی آپ کے یہاں کھاتے۔ اکثر بھوک سے صرف اس لیے دو چار رہتے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث سننے سے رہ نہ جائے۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ " مجھے اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں بھوک کی وجہ سے اپنے جگر کو زمین سے لگا لیتا۔ اور پیٹ پر پتھر باندھ لیتا۔ میں آنحضورؐ کے منبر اور حضرت عائشہ کے حجرہ کے درمیان پڑا رہتا۔ لوگ کہتے کہ پاگل ہے۔ میں پاگل تو نہ تھا۔ البتہ بھوک کا ستم رسیدہ تھا۔

جو شخص حضرت ابو ہریرہؓ کے الفاظ " اُصرَعُ " سے یہ مفہوم مراد لیتا ہے کہ ابو ہریرہؓ مرگی کے مریض تھے، وہ افترا پردازی سے کام لیتا ہے۔ ابو ہریرہؓ نے بذات خود واضح کر دیا ہے

کہ اس سے مراد وہ غشی ہے جو فاقہ کشی کی وجہ سے ان پر طاری ہو جایا کرتی تھی۔ جن اہل اسلام مؤرخین نے ابوہریرہؓ کے سیر و سوانح بیان کیے ہیں اُن میں سے کسی نے بھی تحریر نہیں کیا۔ کہ آپ اس قسم کے مرض میں مبتلا تھے۔ حیرانی ہے کہ عیسائی مستشرقین نے یہ اتہام کیسے باندھ دیا، حالانکہ موصوف کے احوال و کوائف انہوں نے مسلم مؤرخین کی تصانیف سے اخذ کیے ہیں۔

جہاں تک حضرت ابوہریرہؓ کے ورع و زہد کا تعلق ہے ابن حجر نے قبیلہ طفادہ کے ایک شخص سے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہؓ کے یہاں قیام پذیر ہوا۔ میں نے اس سے زیادہ مہمان کی خدمت کرنے والا اور کوئی نہیں دیکھا۔ امام احمد نے ابو عثمان نہدی سے روایت کیا ہے کہ میں ابوہریرہؓ کے یہاں سات مرتبہ مہمان ٹھہرا۔ ابوہریرہؓ ان کی بیوی اور خادم رات کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا کرتے تھے۔ تینوں میں سے ایک نماز پڑھتا اور پھر دوسرے کو بیدار کر دیتا۔ یہاں تک کہ رات گزر جاتی۔

ابن سعد نے حضرت عکرمہؓ سے روایت کیا ہے کہ ابوہریرہؓ ہر روز بارہ ہزار تسبیح پڑھا کرتے اور کہتے تھے کہ میں اپنے گناہوں کے مطابق تسبیح پڑھتا ہوں۔ عبدالرزاق نے ابن سیرین سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابوہریرہؓ کو بحرین کا عامل مقرر کیا۔ ابوہریرہؓ وہاں سے دس ہزار (درہم یا دینار) لائے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا "یہ مال کہاں سے لیا؟" ابوہریرہؓ نے کہا "گھوڑوں کے بچوں کو فروخت کر کے نیز متعدد تنخواہوں اور غلام کی آمدنی سے حاصل کیا" حضرت عمرؓ نے تحقیق کی تو درست پایا۔ حضرت عمرؓ نے پھر آپ کو عامل بنانا چاہا تو نہ مانے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا "آپ سے بہتر شخصیت نے عامل بننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا" ابوہریرہؓ نے عرض کیا "وہ حضرت یوسفؑ خود نبی اور نبی کے بیٹے تھے اور میں اُمیمہ کا بیٹا ابوہریرہؓ ہوں میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ بلا دلیل کوئی بات کہوں۔ یا بلا دلیل کوئی فیصلہ صادر کروں۔ اگرچہ مجھے پیٹا جائے۔ مجھے گالیاں دی جائیں اور میرا مال چھین لیا جائے۔

قوتِ حافظہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی دائمی صحبت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوہریرہؓ آپ کے ان اعمال و افعال سے آگاہ ہو گئے۔ دوسرے جن سے بے بہرہ تھے۔ جب اسلام لائے تو حافظہ خراب تھا۔ بارگاہ رسالت میں شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا ذرا چادر پھیلاؤ

ابوہریرہؓ نے تعمیل ارشاد کر دی۔ حضورؐ نے فرمایا اب اس کو اپنے سینہ کے ساتھ لگا لو۔ اس کے بعد کبھی کوئی حدیث فراموش نہ ہوئی۔ چادر پھیلانے کے واقعہ کو مختلف ائمہ حدیث مثلاً بخاری و مسلم احمد و نسائی ابن ابی یعلیٰ اور ابو نعیم نے روایت کیا ہے۔

یہودی مستشرق گولڈ زیہر نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ قصہ من گھڑت ہے۔ عوام نے اس کو اس لیے وضع کیا ہے کہ ابوہریرہ کو احادیث کثیرہ کی نقل و روایت کے الزام سے بری ثابت کیا جائے یہ ایک عظیم افترا اور ظن و تخمین ہے جس کی کوئی علمی دلیل نہیں ہے۔ اس یہودی نے احادیث رسولؐ کی روایت کرنے والے ایک جلیل القدر صحابی پر از رہِ تعصب یہ طوفان باندھا ہے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کے من گھڑت ہونے کی کیا دلیل ہے؟ کیا اس یہودی نے ان تاریخی کتب میں اس کا کچھ نشان پایا تھا جو اس کے پیش نظر تھیں؟ ورنہ محدثین کے روایت کردہ واقعہ کو جھٹلانے کی کیا وجہ تھی۔؟

مستشرقین حضرت ابوہریرہؓ کی قوت حافظہ پر اظہار حیرت و استعجاب کرتے ہیں۔ اگر اس کو انصاف کی نگاہ اور علم النفس اور علم الاجتماع کی روشنی میں دیکھتے تو اس میں ان کو کوئی اعجوبہ نظر نہ آتا۔ اس لیے کہ ہر قوم میں ایک خصوصیت پائی جاتی ہے۔ جو دوسری اقوام میں موجود نہیں ہوتی قوتِ حافظہ عربوں کی عظیم خصوصیت ہے۔ صحابہ تابعین اور اتباع تابعین میں ایسے لوگ گزرے ہیں جو سرعت و قوت حفظ میں یگانہ روزگار تھے۔ جو شخص اس حقیقت سے بخوبی آگاہ و آشنا ہو کہ

۱۔ امام بخاریؒ کو تین لاکھ احادیث مع اسانید یاد تھیں۔

۲۔ امام احمد بن حنبل چھ لاکھ احادیث کے حافظ تھے۔

۳۔ محدث ابوزرعہ کو سات لاکھ حدیثیں ازبر تھیں۔

وہ ابوہریرہؓ کی محفوظ احادیث پر اظہار حیرت نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ مسند تقی بن مخلد میں مذکور ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے کل پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) احادیث منقول ہیں۔ ہمیشہ ہی سے علمائے عربیت اور شعراء میں نظم و نثر کے ایسے عظیم حافظ چلے آئے ہیں۔ کہ ان کے مقابلہ میں ابوہریرہؓ کی مرویات کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ مثلاً اصمعی ہی کو لیجئے مقبول ادبان

اشعار آپ کو عرب کے پندرہ ہزار اشعار یاد تھے۔

ہمارے مکرم دوست پروفیسر محب الدین الخطیب نے شیخ شنقیطی رحمہ اللہ تعالیٰ کا قوتِ حافظہ کے جو چشم دید واقعات سنائے ہیں اس سے حیرانی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہم استاذ علامہ شیخ احمد بن امین شنقیطی کی شخصیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ آپ کو جاہلی شعراء اور ابوالعلاء معرّی کے تمام اشعار یاد تھے۔ اور اگر ان اشعار کو شمار کیا جائے تو موجب حیرت ہو۔ آپ نے اپنی کتاب "الوسیط" از اوّل تا آخر شیخ طاہر الجزائری کی فرمائش پر اپنے حافظہ کی مدد سے تحریر کی تھی۔ اس کتاب میں شنقیط نامی شہر کے رہنے والے تمام مردوں اور عورتوں کے انساب و قبائل اور ان کی نظم و نثر کی تفصیلات مندرج ہیں۔ کتاب لکھنے سے پہلے علامہ شنقیطی کے پاس دوسرا کوئی ماخذ موجود نہ تھا۔ نظر بریں اس کے مقابلہ میں جب ابوہریرہؓ کی محفوظ احادیث کو دیکھا جائے جو موصوف نے طویل صحبتِ نبوی میں یاد کیں تو ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ مزید براں اُمت مسلمہ میں جو دیگر اکابر پیدا ہوئے ہیں جن کی قوتِ حافظہ ضرب المثل کی حد تک مشہور تھی ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔" (مجلۃ الفتح شمارہ ۷۲۵)

آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ صحابہ نے خود ابوہریرہؓ کے کثرتِ حفظ کا اعتراف کیا تھا۔ مروان نے جب حضرت ابوہریرہؓ کی قوتِ حافظہ کا امتحان لیا۔ تو آپ اس میں کامیاب ثابت ہوئے تھے۔ یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں مروان کے کاتب سے نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کو بلایا۔ آپ تشریف لا کر حدیثیں روایت کرنے لگے۔ مروان کا کاتب پس پردہ بیٹھ کر وہ حدیثیں لکھتا جاتا تھا۔ پورا ایک سال گزرنے کے بعد مروان نے حضرت ابوہریرہؓ کو بلا کر ان احادیث کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے کوئی لفظ تبدیل کیے بغیر من وعن وہ حدیثیں دہرا دیں۔ مروان نے جب کاتب کی تحریر کردہ احادیث دیکھیں تو وہ بالکل ان کے مطابق تھیں۔

یہ واقعہ اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ متعصب مستشرقین اور ان کے مسلم اتباع و تلامذہ نے حضرت ابوہریرہؓ سے متعلق جو افک پردازی کی ہے۔ اس کی کوئی وجہ جواز نہیں۔ ابوہریرہؓ کی

صداقت کو مشکوک ثابت کرنے سے ان کا مقصد ابو ہریرہؓ کی قدر و منزلت کو گھٹانا نہیں تھا۔ بلکہ ازیں یہ تحقیر و توہین اسلام اور اس کی تعلیمات کو مشتبہ و مشکوک ثابت کرنے کی ایک ناکام کوشش تھی۔

صحابہ تابعین دیگر علماء اور ابو ہریرہ رضؓ :۔ حضرت صحابہ تابعین اور دیگر اہل علم سے ابو ہریرہؓ کی مدح و ستائش میں لاتعداد اقوال منقول ہیں۔ ذیل میں چند اقوال درج کیے جاتے ہیں

۱۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ فرماتے ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ ابو ہریرہؓ نے رسول کریمؐ سے جو کچھ سنا ہم نے نہیں سنا"

۲۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے فرمایا:

"ابو ہریرہؓ مجھ سے افضل اور احادیث رسولؐ کا مجھ سے زیادہ علم رکھتے تھے۔"

۳۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے ایک شخص سے کہا:

ابو ہریرہؓ کے وابستہ دامن ہو جائیے۔ ایک دفعہ میں ایک دوسرا شخص اور ابو ہریرہؓ مسجد نبوی میں بیٹھ کر ذکر و دعا میں مشغول تھے کہ رسول کریمؐ تشریف لائے اور ہمارے پاس بیٹھ گئے۔ فرمایا "اپنا مشغلہ جاری رکھو" چنانچہ میں نے اور میرے ساتھی نے دعا مانگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین کہی۔ ابو ہریرہؓ نے ان الفاظ میں دعا مانگی اے اللہ! میرے ساتھیوں نے تجھ سے جو کچھ مانگا ہے میں وہ تجھ سے مانگتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ مجھے ایسا علم عطا کر جو فراموش نہ ہو۔ حضورؐ نے آمین کہی۔ پھر میں نے اور میرے ساتھی نے کہا کہ "اے اللہ کے رسول! ہم بھی ایسے علم کی دعا کرتے ہیں جو فراموش نہ ہو" فرمایا "دوسی نوجوان (ابو ہریرہؓ) تم سے سبقت لے گیا"

۴۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

ابو ہریرہؓ کو ہم سے بڑھ کر رسول کریمؐ کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل تھا اور وہ ہم سے بڑے حافظ حدیث تھے"

۵۔ حضرت اُبی بن کعب کا قول ہے:

"ابوہریرہؓ رسول کریم سے ایسی باتیں پوچھنے کی جرأت کرتے جو ہم نہیں کرسکتے تھے۔"

۶- امام شافعی فرماتے ہیں:

"ابوہریرہؓ اپنے تمام ہم عصر راویان حدیث سے بڑے حافظ تھے۔"

۷- امام بخاری کا قول ہے:

"آٹھ سو اہل علم نے ابوہریرہؓ سے حدیثیں روایت کیں - یہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے حافظ تھے۔"

۸- ابوصالح ارشاد فرماتے ہیں:

"ابوہریرہؓ اصحاب رسولؐ میں سب سے بڑے حافظ تھے۔"

۹- حضرت حسن بصری کے بھائی سعید بن ابی الحسن کا قول ہے،

"اصحاب رسولؐ میں سے کسی کو ابوہریرہؓ سے زیادہ حدیثیں یاد نہ تھیں"

۱۰- امام حاکم فرماتے ہیں:

"ابوہریرہؓ کو سب صحابہ سے زیادہ رفاقت رسولؐ کا شرف حاصل ہوا یہ سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ صرف کھانا کھاتے اور رسول کریمؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ادھر ادھر گھومتے رہتے - یہاں تک کہ وفات پائی۔ اسی لیے ان کی محفوظات سب سے زیادہ تھیں۔"

۱۱- محدث ابونعیم فرماتے ہیں:

"یہ احادیث رسول کے عظیم حافظ تھے - ابوہریرہؓ نے دعا کی تھی کہ اے اللہ! مجھے اہل ایمان کا دوست بنا دے - چنانچہ سب اہل ایمان آپ کو چاہتے ہیں"

۱۲- حافظ ابن حجر کا قول ہے:

"جملہ محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ ابوہریرہؓ سب سے بڑے حافظ حدیث تھے - ابوہریرہؓ کے چادر پھیلانے کا واقعہ بیان کر کے ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہ معجزات نبوت میں سے ایک عظیم معجزہ ہے - ابوہریرہ اپنے عصر و عہد میں لحاظ شرف نبویہ کے سب سے بڑے حافظ تھے۔"

حضرت ابوہریرہؓ نے کثیر صحابہ سے حدیثیں روایت کیں جن میں مندرجہ ذیل حضرات کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ وفضل بن عباسؓ و ابی بن کعبؓ و اسامہ بن زیدؓ و عائشہ صدیقہؓ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

آپ کے تلامذہ میں مندرجہ ذیل صحابہ قابل ذکر ہیں:

عبداللہ بن عمرؓ و عبداللہ بن عباسؓ و جابرؓ و انسؓ اور واثلہ بن اسقعؓ رضی اللہ عنہم۔

تابعین میں مندرجہ ذیل اکابر نے آپ سے استفادہ کیا۔

حضرت ابوہریرہؓ کے داماد سعید بن المسیّبؒ۔ عبداللہ بن ثعلبہؒ۔ عروہ بن زبیرؒ۔ قبیصہؒ۔ سلمانؒ الاغر۔ سلمان بن یسارؒ۔ عراکؒ بن مالک۔ سالم بن عبداللہؒ۔ حضرت عبدالرحمٰن کے دونوں صاحبزادوں ابوسلمہؒ و حمیدؒ۔ محمد بن سیرینؒ۔ عطاء بن ابی رباحؒ۔ عطاء بن یسارؒ۔

و دیگر اہل علم تابعین جن کی تعداد بقول امام بخاریؒ آٹھ سو تک پہنچتی ہے۔ مذکورہ صدر کبار صحابہ و تابعین کا ابوہریرہؓ سے استفادہ کرنا اور ان پر اعتماد کرنا اس امر کی روشن دلیل ہے کہ ابوہریرہ بڑے جلیل القدر اور صادق القول صحابی تھے۔ نیز اس میں ان متعصب مستشرقین اور ان کے ہمنوا مسلم مصنفین کی زبردست تردید ہے۔ جن کے دل کو حسد و عداوت کی آگ نے بھسم کر کے رکھ دیا تھا۔

مرض و وفات

محدث ابن ابی الدنیا نے بسند صحیح ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے کہ ابوہریرہؓ جب مرض الموت میں مبتلا تھے تو میں ان کے یہاں گیا۔ اس وقت انہیں شدید درد ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے سینہ سے لگا کر ان کو بٹھا لیا اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے ابوہریرہ نے دو مرتبہ کہا۔ "میں زندگی نہیں چاہتا۔ میرے بس میں ہو تو میں مرنا پسند کرتا ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں ابوہریرہؓ کی جان ہے۔ ایک وقت آئے گا جب ایک شخص کا گزر اپنے بھائی کی قبر پر ہو گا۔ وہ چاہے گا کہ اے کاش! میں اس کی جگہ ہوتا۔

امام احمد اور نسائی نے بسند صحیح عبدالرحمٰن بن مہران سے اور اس نے ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ جب ابوہریرہؓ کا آخری وقت قریب آیا تو فرمایا: "میری قبر پر خیمہ نہ لگانا نہ میرے جنازہ کے ساتھ انگیٹھی لے کر چلنا اور میرے جنازہ کو جلدی سے لے جانا" بغوی نے ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو رونے لگے۔ اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا:

"زاد راہ کم ہے اور سفر لمبا"

ابوہریرہؓ جب مرض الموت میں مبتلا تھے تو مروان حاضر ہوا اور آپ کے لیے دعائے صحت کی یہ سن کر ابوہریرہؓ نے کہا "اے اللہ میں تیری ملاقات چاہتا ہوں تو بھی میری ملاقات پسند کر" مروان ابھی چل کر بازار تک ہی پہنچا تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ عازم فردوس ہوئے۔

ولید بن عقبہ نے باختلاف روایات ۵۷ھ یا ۵۸ھ یا ۵۹ھ کو عصر کے بعد ابوہریرہؓ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو آپ کی وفات کی خبر پہنچی تو مدینہ کے عامل کو لکھا کہ ابوہریرہؓ کے ورثاء کو دس ہزار درہم دے دیں اور ہر طرح ان کا خیال رکھیں۔ اس لیے کہ محاصرہ کے دن حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امداد کی تھی۔

حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں احمد امین کے شبہات:

یہ ہے حضرت ابوہریرہؓ کی صحیح تصویر جو تاریخ نے پیش کی اور ہمارے علماء نے جس طرح اسے جانا پہچانا۔ مگر احمد امین نے اس تصویر کو کسی اور ہی رنگ میں پیش کیا ہے۔

احمد امین نے فجر الاسلام کی حدیث سے متعلق فصل میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہ اور ابن عباس نے حضرت ابوہریرہؓ کی تردید کی تھی اور ان کی روایت کردہ بعض احادیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بزعم خویش احمد امین نے ابوہریرہؓ کا جو ترجمہ (سیر و سوانح) تحریر کیا ہے اس میں صرف ان کے حسب و نسب اسلام لانے کے واقعہ اور ان کی ظرافت طبع پر روشنی ڈالی ہے جس کی غرض و غایت ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں۔

علمی امانت و دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ احمد امین ابوہریرہؓ کا ترجمہ ذکر کرتے وقت ان

مقام و مرتبہ بھی بیان کرتے جو صحابہ تابعین اور ائمہ حدیث کے درمیان ان کو حاصل تھا۔ مزید برآں اہل علم نے ان کی تعریف و توصیف میں جو کچھ کیا اور ان کے حفظ و ضبط اور صداقت بیانی کا جو اقرار و اعتراف کیا وہ بھی بیان کرتے۔ اس لیے کہ ابو ہریرہؓ کے ترجمہ میں جس چیز کو موضوع زیر بحث سے زیادہ ربط و تعلق تھا وہ یہی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ احمد امین نے اس جانب مطلقاً توجہ مبذول نہیں کی۔ بخلاف ازیں احمد امین نے ابو ہریرہؓ کے ترجمہ میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے ان کی منقبت کی بجائے مذمت کا پہلو نکلتا ہے۔ گویا گولڈ زیہر اور دیگر مستشرقین کی پیروی کرتے ہوئے یہ بھی ابو ہریرہ کو مورد طعن و تشنیع بنانے کی ایک پوشیدہ کوشش تھی۔ احمد امین کے حضرت ابو ہریرہؓ پر وارد کردہ اعتراضات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ بعض صحابہ مثلاً حضرت عائشہؓ و ابن عباسؓ نے ابو ہریرہؓ کی بعض مرویات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

۲۔ ابو ہریرہؓ حدیثیں تحریر نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ اپنی یادداشت پر بھروسہ کرتے تھے۔

۳۔ ابو ہریرہؓ بعض ایسی حدیثیں بھی بیان کیا کرتے تھے جو انہوں نے آنحضورؐ سے براہ راست نہیں بلکہ دیگر صحابہ کے واسطہ سے سنی تھیں۔

۴۔ بعض صحابہ نے ابو ہریرہؓ پر تنقید کی اور ان کی صداقت بیانی پر شک و شبہ کا اظہار کیا۔

۵۔ جب ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث خلافِ قیاس ہو تو احناف یہ کہہ کر اس کو ترک کر دیتے ہیں کہ ابو ہریرہ فقیہ نہیں۔

۶۔ واضعین حدیث نے ابو ہریرہؓ کی کثرتِ روایت کو غنیمت سمجھا اور بے شمار حدیثیں گھڑ کر ان کی جانب منسوب کر دیں۔

اب ہم بتائیں گے کہ ان اعتراضات میں کس قدر تحریف اور مغالطہ بازی سے کام لیا گیا ہے۔ ہم ان شاء اللہ العزیز حضرت ابو ہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے خلاف کی گئی اس علمی سازش کا پردہ چاک کریں گے اور اس کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیں گے۔

۱۔ بعض صحابہ کے ابو ہریرہؓ پر اعتراضات:

احمد امین فجر الاسلام صفحہ ۲۶۵ پر لکھتے ہیں:

منقول ہے کہ ابوہریرہؓ نے یہ روایت بیان کی کہ:

"جو شخص جنازہ اٹھائے وہ وضو کرے"

مگر حضرت ابن عباسؓ نے اس سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ:

"خشک لکڑیاں اٹھانے سے ہمارے لیے وضو کرنا لازم نہیں ہوتا۔"

اسی طرح ابوہریرہ نے بخاری و مسلم میں ذکر کردہ ایک حدیث روایت کی کہ:

"جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو برتن میں ڈالنے سے پہلے اپنا ہاتھ دھولے نہ جانے وہ رات بھر کہاں رہا ہے؟"

حضرت عائشہ نے اس کو حجت قرار نہ دیا اور فرمایا:

"پھر ہم پانی سے بھرپور مٹکے کا کیا کریں کہ وہ سارا خراب ہو جائے گا؟"

(بحوالہ شرح مسلم الثبوت ج ۲ ص ۱۷۸)

استاذ احمد امین نے مذکورہ صدر دونوں واقعات کو اس امر کی دلیل ٹھہرایا ہے کہ صحابہ باہم ایک دوسرے پر تنقید کرتے اور بعض کو بعض کی نسبت افضل تصور کرتے تھے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ صحابہ جب باہم ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد صرف علمی تبادلۂ افکار ہوتا ہے اس کی وجہ نظریاتی اختلاف اور استنباط و اجتہاد کے مراتب کا تفاوت ہے۔ یا اس لیے کہ ایک صحابی کو ایک حدیث یاد ہوتی ہے اور دوسرے کو نہیں ہوتی اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ایک صحابی دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے یا اس کو جھٹلاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ اور دیگر صحابہ کے مابین جو بھی مناقشات تھے ان کو اسی پر محمول کرنا چاہیے دگر ہیچ اس لیے کہ صحابہ ایک دوسرے کی تصدیق کرتے تھے۔ خصوصاً ابوہریرہ کی صداقت ثقاہت اور حفظ و ضبط پر ان کو پورا پورا اعتماد تھا۔ ابوہریرہ اور دیگر صحابہ کے مابین جو علمی تنازعات بپا ہوئے یہ ان پر اجمالی تبصرہ ہے۔ اب ہم احمد امین کے ذکر کردہ اعتراض کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی حدیث:۔ احمد امین نے پہلی حدیث یہ پیش کی ہے کہ: "جس نے جنازہ اٹھایا ہو وہ وضو کرلے" اور کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر

کئی طرح سے گفتگو کی جا سکتی ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ مجھے حدیث و فقہ اور اختلافی مسائل پر مشتمل کسی کتاب میں نہیں ملی۔ وہ واقعہ بھی مجھے کہیں نظر نہیں آیا جس میں حضرت ابن عباسؓ نے ابوہریرہؓ کی روایت کو ماننے سے انکار کیا تھا۔ اور اگر یہ حدیث اور واقعہ دونوں درست ہوتے تو لازماً کسی حدیث کی کتاب میں ان کا نشان مل جاتا۔ البتہ علمائے اصول نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے جن میں مسلم الثبوت کے مصنف بھی شامل ہیں۔ مگر علمائے اصول سے حدیث کے ذکر و بیان میں ہمیشہ فروگذاشتیں سرزد ہوتی ہیں۔ یہ اکثر بے اصل اور ضعیف روایتیں ذکر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو حدیث کے فن میں خصوصی بصیرت و مہارت حاصل نہیں ہوتی۔ بہر کیف کتب اصول کو حدیث کا مرجع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ معتبر کتب حدیث کو نظر انداز کر کے کتب اصول کو حدیث کی جانچ پرکھ کے لیے وہی شخص مرکزی حیثیت دے گا جو حاطب لیل ہو اور بلا امتیاز ہر قسم کی حدیثیں جمع کرنے کا متمنی ہو اور یا صاحب غرض ہو۔

۲۔ بعض کتب حدیث کے الفاظ اس سے مختلف ہیں۔ چنانچہ ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً منقول ہے کہ :

"جو شخص میت کو غسل دے وہ نہائے اور جو اسے اٹھائے وہ وضو کرے۔"

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد امام ترمذی فرماتے ہیں کہ ایسی روایت حضرت علی و عائشہ سے بھی مروی ہے۔ ابوہریرہؓ کی روایت حسن ہے۔ اور یہ موقوفاً بھی نقل کی گئی ہے۔ میت کو غسل دینے والے کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض اہل علم صحابہ کا خیال ہے کہ جو شخص میت کو غسل دے اس پر غسل لازم ہے۔ اور بعض نے کہا کہ غسل نہیں بلکہ اس کے لیے وضو ضروری ہے۔ امام مالک بن انس فرماتے ہیں :

"میت کو غسل دینے والے کے لیے میں غسل کو مستحب سمجھتا ہوں واجب نہیں۔ امام شافعی کا قول بھی یہی ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ میت کو غسل دینے والے پر غسل واجب نہیں البتہ اسے وضو ضرور کرنا چاہیئے۔ اسحاق فرماتے ہیں

کہ اس کے لیے وضو ضروری ہے۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ اس کے لیے نہ غسل واجب ہے نہ وضوء۔ (انتہیٰ کلام الترمذی)

مذکورہ صدر کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوہریرہؓ اس حدیث کے نقل کرنے میں منفرد نہیں۔ بلکہ حضرت علیؓ و عائشہؓ بھی اس ضمن میں ان کے ہمنوا ہیں۔ مزید براں یہ حدیث ابوہریرہ سے مرفوعاً و موقوفاً دونوں طرح نقل کی گئی ہے۔ لہٰذا ابن عباس نے ابوہریرہؓ کی روایت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بے اثر ہے۔ نیز یہ کہ یہ مسئلہ علماء کے مابین متنازعہ رہا ہے۔ بنظر بریں احمد امین نے اس واقعہ کو پیش کر کے جو استدلال کیا ہے اس کا کوئی جواز نہیں۔ خصوصاً جب کہ خود یہ واقعہ بھی ثابت نہیں اور دیگر صحابہ کی تائیدی روایات بھی موجود ہیں۔

۳۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ واقعہ صحیح ہے اور ابن عباس نے حقیقۃً ابوہریرہؓ کی روایت کو تسلیم نہیں کیا تھا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ حضرت ابن عباس ابوہریرہؓ کو طعن دیتے یا ان کی تکذیب کرتے ہیں۔ بخلاف ازیں دونوں جلیل القدر صحابہ کے مابین یہ اختلاف حدیث مذکور کے فہم وادراک میں رونما ہوا ہے۔ چنانچہ ابوہریرہؓ حدیث کا ظاہری مفہوم مراد لیتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ جنازہ اٹھانے سے وضو کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس ابن عباسؓ اندریں صورت وضو کرنے کو مستحب و مندوب قرار دیتے ہیں۔ ابن عباس کے بیان کردہ الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ جنازہ اٹھانے والے کے لیے وضو کو واجب قرار نہیں دیتے۔ جب کہ ابوہریرہؓ اس کو واجب سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں آنحضورؐ کے جلیل القدر اور صاحب اجتہاد صحابی ہیں۔ اس لیے حدیث کے فہم و ادراک اور اس سے استنباطِ مسائل میں ان کے باہمی اختلاف میں کچھ مضائقہ نہیں۔

دوسری حدیث:۔ دوسری حدیث جس کو احمد امین نے ہدفِ طعن و تنقید بنایا ہے یہ ہے کہ

"جو شخص نیند سے بیدار ہو وہ برتن میں ڈالنے سے پہلے اپنے ہاتھوں کو دھولے"

یہ حدیث بخاری و مسلم اور دیگر کتب صحاح میں حضرت ابن عمر و جابر و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

بقول احمد امین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس حدیث پر جو تنقید کی ہے۔ کتب حدیث

میں اس کا کوئی نشان موجود نہیں۔ البتہ ابن العربی اور حافظ عراقی نے بیہقی سے نقل کیا ہے کہ ابو ہریرہؓ پر اعتراض کرنے والے کا نام قین الاشجعی ہے جو اصحاب عبداللہ بن مسعود میں سے تھا حافظ عراقی رقمطراز ہیں:

"صحیح مسلم کی ایک روایت میں "فی انائہ" کے الفاظ ہیں اور دوسری میں "فی الاناء" ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ ڈالنے کی ممانعت برتنوں سے مخصوص ہے۔ ایسے حوض اور تالاب میں ہاتھ ڈالنا ممنوع نہیں جو ہاتھ ڈالنے سے پلید نہ ہوتا ہو۔ اسی لیے قین الاشجعی نے ابو ہریرہؓ سے کہا تھا کہ جب ہمارے پاس پانی کا مٹکا بھرا ہو تو اس کا کیا کریں؟ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا وخدا مجھے تمہاری شر سے بچائے"۔ (بیہقی) حدیث کے مقابلہ میں مثالیں بیان کرنے کو حضرت ابو ہریرہؓ نے پسند نہیں کیا تھا۔ اسی طرح دار قطنی اور بیہقی نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے کہا "اگر پانی کا حوض ہو تو اس کا کیا کیا جائے؟ یہ سن کر ابن عمر نے حدیث کے ہوتے ہوئے مثالیں بیان کرنے کو ناپسند کیا۔ اس لیے کہ آپ سنت نبوی کا بہت اتباع کرتے تھے"۔

مندرجہ صدر بیان سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ابو ہریرہؓ حدیث ہذا کے روایت کرنے میں منفرد نہیں ہیں۔ بلکہ یہ حدیث ابن عمرؓ اور بقول امام ترمذی حضرت عائشہ سے بھی مروی ہے۔ نیز یہ کہ ابن عمرؓ نے جب یہ حدیث روایت کی تو ان پر بھی اعتراض وارد کیا گیا تھا۔ اعتراض کنندہ قین الاشجعی اصحاب عبداللہ بن مسعود میں سے ایک تابعی شخص تھا۔ نہ کہ حضرت ابن عباسؓ و عائشہؓ۔ تابعی مذکور کے بارے میں حافظ ابن حجر کا قول ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

قین الاشجعی اصحاب ابن مسعودؓ میں سے ایک تابعی ہیں۔ ان کے اور حضرت ابو ہریرہؓ کے مابین ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ بنابریں محدث ابن مندہ نے ان کو صحابی سمجھ لیا۔ چنانچہ ابن مندہ ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ قین الاشجعی نے کہا پھر ہم حوض کو کیا کریں؟ یہ حدیث بروایت محمد بن عمرو

از ابوسلمہ از ابوہریرہؓ معروف ہے۔ یہ سن کر قین معترض ہوا تھا۔ یہ حدیث اعمش نے بطریق ابوصالح از ابوہریرہؓ بھی مرفوعاً روایت کی ہے۔ اعمش کہتے ہیں۔ میں نے ابراہیم سے اس حدیث کا ذکر کیا تو اس نے کہا کہ اصحاب عبداللہ بن مسعودؓ نے اس پر اعتراض وارد کیا تھا؟" (الاصابہ ج ۳ ص ۲۸۵)

مذکورہ صدر تصریحات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ابوہریرہؓ پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ اور اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ واقعہ صحیح ہے تو یہ فہم حدیث میں فرق و اختلاف پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ ابوہریرہؓ ہاتھ دھونے کو واجب قرار دیتے ہیں۔ امام احمد، داؤد اور طبری کا زاویہ نگاہ بھی یہی ہے۔ بخلاف ازیں حضرت عائشہؓ و ابن عباسؓ اس سے متفق نہیں ہیں۔ جمہور اہل علم کا قول بھی یہی ہے۔ اس میں شک و ریب یا تکذیب کی کوئی گنجائش سرے سے موجود ہی نہیں۔

یہاں ایک امر قابل غور ہے اور وہ یہ کہ احمد امین نے شرح مسلم الثبوت کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ابوہریرہؓ کی روایت پر اعتراض کیا تھا۔ مگر شرح مذکور دیکھنے سے پتہ چلا کہ یہ بات مسلم الثبوت کے مصنف نے کہی ہے نہ کہ شارح نے۔ بلکہ شارح نے مصنف مسلم الثبوت کی غلطی واضح کی ہے اور کہا ہے کہ اس اعتراض کی نسبت حضرت عائشہ کی جانب درست نہیں۔ شارح موصوف فرماتے ہیں۔

تیسیر میں لکھا ہے کہ حضرت عائشہؓ و ابن عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ پر اعتراض وارد نہیں کیا تھا۔ بخلاف ازیں معترض قین نامی ایک شخص تھا جس کا صحابی ہونا بھی ثابت نہیں۔

شارح مسلم الثبوت نے تیسیر کی جس عبارت کا ذکر کیا ہے۔ وہ ابن امیر الحاج کی کتاب "التقریر" سے منقول ہے۔ فرماتے ہیں:

> ہمارے شیخ محترم فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ و ابن عباسؓ کی جانب جس قول کی نسبت کی گئی ہے۔ وہ کتب حدیث میں کہیں موجود نہیں۔ دراصل اس کا قائل قین اشجعی ہے۔ سعید بن منصور نے حضرت ابوہریرہؓ سے سابق الذکر حدیث روایت کی اور پھر قین اشجعی کے اعتراض کا ذکر کیا۔ یہ سن کر۔ ابوہریرہؓ نے فرمایا۔ "خدا تیرے شر سے بچائے" ابن مندہ نے قین کو صحابہ میں شمار کیا ہے"

اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ ابو سلمہ نے ابو ہریرہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یقین کا ذکر بھی ہے۔ محدث ابو نعیم نے اس پر یہ گرفت کی ہے کہ اس سے یقین کا صحابی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ہمارے شیخ محترم نے بھی اس کی تائید و حمایت کی ہے۔"

(التقریر۔ ج ۲۔ ص ۲۰۰)

مذکورہ صدر حقائق اس بات کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ اُستاذ احمد امین نے اس روایت کے پیش کرنے میں دو علمی خیانتوں کا ارتکاب کیا ہے:

(۱) اس کی نسبت شارح مسلم الثبوت کی جانب کی۔ حالانکہ یہ مصنفِ مُسلّم کا قول ہے۔

(۲) احمد امین نے یہ ذکر نہیں کیا کہ شارح مسلم الثبوت نے مصنفِ مسلم الثبوت کی غلطی واضح کر دی اور واقعہ کو صحیح طریقہ سے نقل کر دیا ہے احمد امین کے اس طرز عمل کی وجہ ہمارے نزدیک اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان پر ہر وقت یہ دُھن سوار رہتی ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ صحابہ ایک دوسرے کو عموماً اور ابو ہریرہ کو خصوصاً جھٹلایا کرتے تھے۔ خدا تعصب و عناد کا بُرا کرے کہ اسی کی خاطر احمد امین نے بہیم غلطیوں کا ارتکاب کیا اور حضرت ابو ہریرہؓ کے خلاف یہ طومار باندھا۔

۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ حدیثیں نہیں لکھا کرتے تھے:

احمد امین نے فجر الاسلام صفحہ ۲۶۸ پر حضرت ابو ھریرہ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ حدیثیں لکھا نہیں کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں ابو ھریرہ منفرد نہیں تھے۔ بلکہ تمام راویان حدیث صحابہ کا طریق کار یہی تھا۔ صرف عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ اپنے صحیفہ میں حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے حدیث کی تاریخ جاننے والے تمام اہل علم آگاہ ہیں۔ احمد امین نے فجر الاسلام میں بذاتِ خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

احمد امین لکھتے ہیں:۔

"عصر اول میں تدوین حدیث کا رواج نہ تھا۔ صحابہ اپنے حافظہ کی مدد سے زبانی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ جو لوگ حدیثیں لکھتے تھے، وہ اپنے خاتی استعمال کے لیے لکھتے تھے۔

(فجر الاسلام۔ صفحہ ۲۷۲)

احمد امین کا اشارہ ان تابعین کی طرف ہے جو قرن اوّل میں حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ جہاں تک صحابہ کا تعلق ہے ان میں سے صرف حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اپنے ایک صحیفہ میں احادیث تحریر کر لیا کرتے تھے۔ پھر اس میں ابوھریرہ کی تخصیص کے کیا معنی؟ ایک معروف اور مسلمہ بات کو دُھرانے کا کیا مطلب؟ احمد امین کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ابوہریرہ کی روایت کردہ احادیث کو مشکوک ثابت کیا جائے۔ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ابوہریرہ چونکہ حدیثیں نہیں لکھا کرتے تھے، بلکہ اپنے حافظہ کی مدد سے روایت کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ حافظہ سے ہر وقت سہو و خطا ہو کا احتمال رہتا ہے اس لیے ابوھریرہ کی ذکر کردہ احادیث مشکوک ہیں۔

احمد امین کا حتمی و قطعی ارادہ یہی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو صحابہ نے ابوہریرہؓ کی امانت و صداقت ان کی قوتِ حافظہ اور حدیث کی حفظ و روایت میں تمام صحابہ پر برتری کا جو اقرار و اعتراف کیا ہے۔ اس کو دانستہ نظر انداز نہ کرتے۔ بقول امام بخاری ابوہریرہؓ کے اہل علم تلامذہ کی تعداد آٹھ صد تک پہنچتی ہے۔

اگر احمد امین علماء کے وہ اقوال ذکر کر دیتے جو ابوہریرہؓ کی مدح و ستائش میں ان سے منقول ہیں تو ابوہُریرہ کو ہدفِ طعن نہ بناتے۔ اس لیے کہ حدیث کا راوی جب حافظ، صادق اور بیدار مغز ہو اور اہل علم اس کی امانت و دیانت پر بھروسہ بھی کرتے ہوں تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کتاب سے دیکھ کر ہی حدیثیں روایت کرے۔ بلکہ بعض علماء کے نزدیک اس صدوق راوی کی روایت زیادہ قابل اعتماد ہے جو اپنے حافظہ سے حدیثیں روایت کرتا ہو۔ علمائے اصول فرماتے ہیں کہ جب دو حدیثیں باہم متعارض ہوں۔ ان میں سے ایک حدیث زبانی سُنی گئی ہو اور دوسری مکتوب ہو تو اندریں صورت مسموع روایت کو ترجیح دی جائے گی۔

امام آمدی اپنی کتاب "الاحکام" میں لکھتے ہیں:

"جب راوی ایک حدیث سن کر بیان کرے اور دوسرا تحریر کردہ حدیث روایت کرے تو سُنی ہوئی روایت قابل ترجیح ہوگی۔ اس لیے کہ مسموع روایت میں تصحیف اور غلطی کا احتمال کم ہوتا ہے۔" (الاحکام، ج ۴۔ ص ۳۳۴)

یہی وجہ ہے کہ صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کتابت حدیث کو اس لیے ناپسند کرتی تھی کہ

مبادا انُداۃ حدیث تحریر پر بھروسہ کرنے لگیں اور ان کا حافظہ کمزور پڑ جائے ۔

امام ابن عبدالبر اپنی کتاب جامع بیان العلم میں بسند خود ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں:

"لکھا نہ کرو کہ تم لکھنے پر بھروسہ کرنے لگو گے۔ جو آدمی بھی کوئی تحریر لکھتا ہے۔ وہ اس پر بھروسہ کر لیتا ہے۔" (جامع بیان العلم، ج ا۔ ص ۶۸)

ابن عبدالبرؒ امام اوزاعی سے نقل کرتے ہیں :۔

"یہ علم اس وقت تک باعزت رہا جب تک لوگ اسے بالمشافہہ دوسروں سے مل کر نقل و روایت کرتے رہے ۔جب کتابوں میں قلمبند ہو گیا تو اس کا نور جاتا رہا اور نالائق لوگ اس کے حامل بن گئے۔"

ابن عبدالبر فرماتے ہیں :۔

"جو لوگ کتابت حدیث کو ناپسند کرتے تھے مثلاً ابن عباس شعبی زُہری نخعی قتادہ اور ان کے ہمنوا یہ فطری حافظ تھے اور سماع پر اکتفاء کرتے تھے ۔ امام زُہری کہا کرتے تھے " میں بقیع کے مقام پر سے گزرتا اور اپنے کان بند کر لیتا کہ ان میں کوئی فضول بات داخل نہ ہو ۔ بخدا میرے کانوں میں کوئی چیز داخل نہیں ہوئی جسے میں بھول گیا ہوں" شعبی سے بھی اسی طرح مروی ہے ۔ یہ سب لوگ خالص عرب تھے ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے " ہم ایک اَن پڑھ اُمت ہیں، ہم حساب و کتاب نہیں جانتے" قوت حافظہ عربوں کی عظیم خصوصیت ہے ۔ عرب صرف ایک مرتبہ ایک لمبا قصیدہ سن کر اس کو یاد کر لیا کرتے تھے ۔ حضرت ابن عباسؓ نے مشہور شاعر عمر بن ابی ربیعہ کا قصیدہ صرف ایک دفعہ سُنا تھا جو اُن کو یاد ہو گیا تھا ۔ یہ واقعہ کتب ادب و تاریخ میں مذکور ہے ۔" (جامع بیان العلم)

تحدیث بلا سماع :

احمد امین نے حضرت ابو ہریرہؓ پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ آنحضورؐ سے براہ راست حدیثیں سنے بغیر بھی وہ حدیثیں روایت کیا کرتے تھے ۔ مثلاً ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم نے فرمایا " جو شخص حالتِ جنابت میں صبح کرے اس کا روزہ نہیں ہوگا ۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے اس پر تبصرہ کرتے

ہوئے فرمایا :۔

"رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ماہ رمضان میں بحالتِ جنابت صبح کرتے تھے ۔ پھر غسل فرماتے حالاں کہ آپ روزہ سے ہوتے تھے"

ابوہریرہؓ نے یہ سن کر کہا :۔

"حضرت عائشہؓ کو مجھ سے زیادہ علم ہے ۔ یہ حدیث میں نے براہِ راست آنحضورؐ سے نہیں سُنی تھی ۔ بلکہ فضل بن عباسؓ سے سُنی تھی" (فجر الاسلام، ص ۲۶۹)

احمد امین کے وارد کردہ اعتراض پر دو طرح سے گفتگو کی جا سکتی ہے ۔

(۱) جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ابوہریرہؓ بعض ایسی باتوں کو آنحضورؐ کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے جو انہوں نے براہِ راست آپ سے نہیں سُنی تھیں تو ابوہریرہ اس میں منفرد نہیں ہیں ۔ بخلاف ازیں بیشتر صغیر السن اور متاخر الاسلام صحابہ بھی اس ضمن میں ان کے ہمنوا ہیں ۔ مثلاً حضرت عائشہؓ، انس، براء بن عازب، ابن عباس، ابن عمر اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بکثرت احادیث دیگر صحابہ سے سُنیں اور ان کو نبی کریمؐ کی جانب منسوب کر دیا ۔ چونکہ صحابہ ایک دوسرے کو عدول اور صادق القول تصور کرتے تھے اس لیے ان سے شنیدہ احادیث کو رسول کریم کی جانب منسوب کرنے میں وہ کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے ۔ چند امثلہ ملاحظہ ہوں :۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ :۔

اِنَّمَا الرِّبَا فِی النَّسِیئَۃِ ۔ ربا صرف اُدھار میں ہوتا ہے ۔

اسی طرح دوسری حدیث یہ روایت کی کہ :۔

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمرہ عقبہ پر کنکریاں پھینکنے تک تلبیہ کہتے رہے ۔"

جب پہلی حدیث کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے تو حضرت ابن عباس نے جواب دیا کہ یہ حدیث میں نے اُسامہ بن زید سے سُنی تھی ۔ (بخاری)

دوسری حدیث کے بارے میں فرمایا کہ یہ حدیث میں نے فضل بن عباس سے سُنی تھی ۔

(الاحکام للامام آمدی، ج ۱ ۔ ص ۲۰۴)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو کسی کی نماز جنازہ

پڑھے اس کو ایک قیراط (ایک پیمانہ) اجر ملے گا۔ دوسری مرتبہ حضرت عبداللہ نے جب یہ حدیث بیان کی تو اس کو ابو ہریرہؓ کی جانب منسوب کر دیا۔ (حوالہ مذکور) خادم رسولؐ حضرت انس بن مالکؓ کا یہ قول ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں کہ جناب انسؓ نے فرمایا :-

"ہم جو احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں ہم نے وہ سب کی سب آپ سے براہ راست نہیں سنی تھیں۔ دراصل بات یہ تھی کہ ہم ایک دوسرے کو جھٹلایا نہیں کرتے تھے۔"

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :-

"ہم نے سب حدیثیں آنحضورؐ سے بلاواسطہ نہیں سنی تھیں بلکہ صحابہ سے سن کر روایت کیں۔ اونٹ چرانے کی وجہ سے ہم ہر وقت آپ کی مجلس میں حاضر نہیں ہو سکتے تھے"

ایسی روایات کو علمائے حدیث مراسیلِ صحابہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو اجماعاً حجت ہیں۔ البتہ ابو اسحٰق اسفراینی ان کو قابل احتجاج قرار نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں ہو سکتا ہے کہ صحابی نے یہ حدیث (رسول کریمؐ سے نہیں بلکہ) تابعی سے روایت کی ہو۔ یہ قول اس لیے مردود ہے کہ اس کے خلاف علمائے حدیث واصول کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

محدث ابن الصلاح مقدمہ میں لکھتے ہیں :-

"حدیث مرسل کے انواع میں ہم نے ایسی احادیث کو شامل نہیں کیا جن کو اصول الفقہ کی اصطلاح میں مراسیلِ صحابہ کہتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابن عباس اور دیگر نوخیز صحابہ کی بیان کردہ احادیث جن کو وہ رسول کریم سے روایت کرتے ہیں حالانکہ انہوں نے بلاواسطہ وہ احادیث آپ سے نہیں سنیں۔ کیونکہ ایسی روایات موصول و مسند احادیث کا حکم رکھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نوعمر صحابہ نے یہ احادیث معمر صحابہ سے نقل و روایت کی ہیں اور کسی صحابی کا نام نہ ذکر کرنے سے حدیث میں کچھ نقص واقع نہیں ہوتا کیوں کہ صحابہ عدول ہیں" (مقدمہ ابن الصلاح ص ۲۶)

علامہ عراقی مقدمہ ابن الصلاح کی شرح میں لکھتے ہیں :-

"محدثین نے اگرچہ مراسیل صحابہ کا ذکر کیا ہے مگر وہ ان سے احتجاج کرنے کے سلسلہ میں

مختلف الرائے نہیں ہیں۔ البتہ علمائے اصول کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ استاذ ابواسحاق اسفرائینی مراسیل کو ناقابل استناد قرار دیتے ہیں۔ بخلاف ازیں دیگر اہل اصول پورے جزم و وثوق کے ساتھ ان سے احتجاج و استدلال کو درست خیال کرتے ہیں۔"

امام نووی حجیتِ مرسل میں علماء کا اختلاف ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ جملہ اختلافات مراسیل صحابہ کے علاوہ دیگر مرسل احادیث کے ضمن میں پائے جاتے ہیں۔ باقی رہیں مراسیلِ صحابہ تو ان کے بارے میں صحیح مشہور اور ہمارے اصحاب اور جمہور اہل علم کا حتمی و قطعی فیصلہ یہ ہے کہ وہ قابلِ احتجاج ہیں۔ مرسلِ صحابی کی مثال یہ ہے کہ صحابی کسی ایسے فعل کا ذکر کرے جو آنحضورؐ نے انجام دیا ہو اور وہ صحابی کم عمر یا متاخرالاسلام ہونے یا کسی اور وجہ سے بچشم خود اسے دیکھ نہ سکا ہو۔ جملہ محدثین جو قبولیت حدیث کے لیے صحیح کی شرط لگاتے ہیں اور حدیث مرسل کو حجت نہیں سمجھتے مراسیلِ صحابہ سے بالاتفاق اخذ و احتجاج کرتے اور ان کو احادیث صحیحہ کے زمرہ میں شمار کرتے ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم میں لاتعداد مراسیل صحابہ موجود ہیں۔ البتہ ہمارے اصحاب میں سے ابواسحٰق اسفرائینی مراسیل صحابہ کو حجت نہیں مانتے اور ان کو دیگر مراسیل کی صف میں شامل کرتے ہیں بجز اس صورت کے جب کہ صحابی صراحتہً یہ کہے کہ "میں وہی احادیث مرسلاً بیان کرتا ہوں جو میں نے رسول کریمؐ یا کسی دوسرے صحابی سے سُنی ہیں۔" ابو اسحاق نے عدم حجیت کی وجہ یہ بتائی ہے کہ صحابہ بعض اوقات تابعین وغیرہم سے بھی حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ اس ضمن میں صحیح تر مسلک یہ ہے کہ مراسیل صحابہ علی الاطلاق قابل احتجاج ہیں۔ اس لیے کہ صحابہ شاذ و نادر حالات ہی میں تابعین وغیرہم سے حدیث روایت کرتے ہیں اور جب وہ غیر صحابہ سے روایت کرتے ہیں تو اس کی تصریح کر دیتے جب صحابہ علی الاطلاق کوئی مرسل روایت بیان کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ صحابہ ہی سے منقول ہوتی ہے اور صحابہ سب کے سب عدول ہیں۔"

(المجموع شرح المہذب۔ ج ۱۔ ص ۶۲)

یہ ہیں مراسیل صحابہ سے متعلق علماء کے اقوال! اب ان سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آئی کہ:
مراسیل ابی ہریرہ جن کو احمدامین نے ھدفِ تنقید بنایا ہے ان کی حقیقت کیا ہے اور آیا وہ قابل قبول ہیں یا نہیں؟

اُستاذ احمد امین نے حضرت ابوہریرہ کی جس روایت کو یہاں مثال کے طور پر پیش کیا ہے اس پر کئی طرح گفتگو کی جا سکتی ہے۔

(الف) اس ضمن میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ مستند کتب میں یہ بات مذکور نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ابوہریرہؓ کی بیان کردہ حدیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا در اصل واقعہ صرف اتنا تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے دریافت کیا گیا کہ اگر کوئی شخص حالت جنابت میں سحری کھا کر روزہ رکھ لے اور طلوع فجر تک غسل جنابت نہ کر سکے تو اس کے روزہ کا شرعی حکم کیا ہے؟ حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا کہ اس کا روزہ نہیں ہوگا۔ جب یہ سوال حضرت عائشہ و اُم سلمہ رضی اللہ عنہما سے کیا گیا تو دونوں نے بالاتفاق ایسے شخص کے روزہ کو درست قرار دیا۔ اور فرمایا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ جنابت میں صبح کرتے تھے اور آپ روزہ سے ہوتے تھے۔ جب حضرت ابوہریرہؓ اُن کے فتویٰ سے آگاہ ہوئے تو اپنے نظریہ سے رجوع کر لیا اور فرمایا کہ وہ دونوں محترمات مجھ سے بڑھ کر علم رکھتی ہیں۔

مندرجہ صدر بیان سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ اس واقعہ کا تعلق ایک شرعی فتویٰ سے ہے ہر مفتی نے وہی فتویٰ دیا جو اس کے علم کی حد تک درست اور رسول کریمؐ سے ثابت تھا۔ اس میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے ابوہریرہ کی تردید کی تھی۔ اس ضمن میں اب ہم امام مسلم رحمہ اللہ کی تصریحات ذکر کرتے ہیں۔

امام مسلم نے بسند خود ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابوہریرہؓ کو یہ کہتے سنا کہ جو شخص حالت جنابت میں صبح کرے اس کا روزہ نہیں ہوگا۔ میں نے اپنے والد سے اس فتوے کا ذکر کیا۔ وہ حضرت عائشہ و اُم سلمہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں بھی ان کے ہمراہ گیا۔ دونوں نے کہا کہ آنحضورؐ حالت جنابت میں صبح کیا کرتے تھے۔ اور آپ روزہ سے ہوتے تھے۔ ہم نے مروان کے یہاں جا کر یہ واقعہ بیان کیا۔ مروان نے کہا "میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ ابوہریرہؓ کے یہاں جا کر ان کے فتوے کی تردید کیجیے۔ چنانچہ ہم ابوہریرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور حقیقتِ حال عرض کی۔ ابوہریرہ نے دریافت کیا کیا حضرت عائشہ و اُم سلمہؓ نے یوں فرمایا ہے؟ میرے والد نے اثبات میں جواب دیا۔ ابوہریرہ نے کہا وہ دونوں مجھ سے بڑھ کر عالم ہیں۔ دراصل میں نے یہ بات فضل بن عباس سے سُنی تھی براہ راست رسول کریمؐ سے نہیں سُنی۔ چنانچہ ابوہریرہ نے اس فتویٰ سے رجوع کر لیا۔

یہ ہیں امام مسلم رحمہ اللہ کی تصریحات! ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ابوہریرہؓ کی تردید نہیں کی تھی۔ چنانچہ شارح مسلم الثبوت نے بھی صراحتہً اس صداقت کا اعتراف کیا ہے۔ صاحب مسلم الثبوت نے مذکورہ صدر واقعہ "سفر السعادۃ" کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ شارح مسلم الثبوت لکھتے ہیں کہ مصنف کا بیان کردہ واقعہ بجائے خود صحیح ہے مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ نے حضرت ابوہریرہ کی تردید و تکذیب کی تھی۔ شارح مذکور مزید فرماتے ہیں کہ مسلم الثبوت کے حاشیہ میں بیان کردہ یہ بات درست نہیں کہ حضرت عائشہ نے ابوہریرہ کی حدیث کو ماننے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ وہ قرآن کے خلاف ہے۔ شارح لکھتے ہیں کہ یہ بات بناء الفاسد علی الفاسد کی مصداق ہے۔ حضرت عائشہؓ نے صرف آنحضورؐ کا فعل نقل کیا تھا۔ اس کو تردید و تکذیب پر محمول کرنے کے لیے کوئی وجہ جواز موجود نہیں۔

(شرح مسلم الثبوت، ج ۲۔ ص ۱۲۵)

مذکورہ صدر بیان پڑھیے اور احمد امین کے رویہ پر سر دُھنیے۔ احمد امین نے شارح مسلم الثبوت کے موقف سے نہ صرف چشم پوشی اختیار کی بلکہ یہ بھی نہیں بتایا کہ اس نے حضرت عائشہ کے ابوہریرہ پر معترض ہونے اور ان کی تردید کرنے کی نفی کی ہے۔ حیرت بالائے حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس سے بڑھ کر احمد امین نے شارح مسلم الثبوت کی طرف تردید و انکار کو منسوب کیا ہے۔ پھر اس طرفہ پر طُرہ یہ کہ احمد امین نے فجر الاسلام کے کئی مقامات پر اسی طرح کیا ہے۔ یہ علمی بد دیانتی نہیں تو اور کیا ہے؟

(ب) ۔ بفرض محال اگر ہم تسلیم کر لیں کہ حضرت عائشہ نے ابوہریرہ کی روایت کو تسلیم نہیں کیا تھا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہ نے ابوہریرہؓ کی تکذیب کی تھی۔ بخلاف ازیں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ حضرت عائشہ اس روایت سے آگاہ نہ تھیں بلکہ ان کو جو مسئلہ معلوم تھا وہ ابوہریرہؓ کی روایت کے برعکس تھا۔ گویا حضرت عائشہ کے دیگر استدراکات کی طرح یہ بھی ایک استدراک ہے۔

ایسے استدراکات حضرت عائشہ نے دیگر صحابہ کبار مثلاً حضرت عمر، ان کے بیٹے عبداللہ وابوبکر و علی وابن مسعود وابن عباس و زید بن ثابت وابوسعید خدری وغیرہم رضی اللہ عنہم پر بھی کیے تھے۔ صحابہ ایک دوسرے پر علمی گرفت کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ اس کو ایک دوسرے کی تکذیب قرار نہیں دیتے تھے۔ بلکہ اس کا مقصد دوسرے کے معلومات کی تصحیح کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ علمی امانت کی ادائیگی بھی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"جو شخص کسی علمی بات کو چھپائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے منہ میں آگ کی لگام دیں گے"

(ابوداؤد و ترمذی)

(ج)۔ اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہ اس حدیث کو مرفوعاً روایت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ یہ ان کا ذاتی فتویٰ تھا۔ بہت کم روایات ایسی ہیں جن میں اس حدیث کو مرفوعاً روایت کیا گیا ہے۔ بعض طُرق میں وارد ہوا ہے کہ ابوہُریرہ نے اس حدیث کی نسبت فضل بن عباس کی طرف کی۔ اور بعض میں اُسامہ بن زید کی طرف۔ اور ایک روایت میں یوں ہے کہ مجھے فلاں و فلاں شخص نے بتایا اس سے معلوم ہُوا کہ ابوہُریرہؓ نے یہ حدیث فضل بن عباس اور اُسامہ سے سُنی تھی مگر بعض راویوں نے صرف اُسامہ کا ذکر کیا۔ راویوں سے یہ غلطی بکثرت سرزد ہو جایا کرتی ہے۔

(د)۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

"حضرت ابوہریرہؓ نے اس فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا۔ یا تو اس لیے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت دوسری روایات کے مقابلہ میں راجح ہے۔ دیگر یہ کہ اس میں بحالت جنابت صبح کرنے کا جواز صراحتہً مذکور ہے۔ بخلاف ازیں دیگر روایات میں یہ احتمال موجود ہے کہ شاید غسل قبل از فجر کا حکم استحباباً دیا گیا ہے نہ کہ فرضاً۔ یہی بات اس دن کے روزہ کی ممانعت کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ نہی تنزیہی ہے۔ یا اس لیے کہ ابوہُریرہ نے حضرت عائشہ کی روایت کو دیگر روایات کی ناسخ قرار دیا ہو۔ اکثر علماء کا مسلک بھی یہی ہے۔ بعض تابعین مسلک ابی ہُریرہ کے پیرو تھے۔ جیسا کہ امام ترمذی نے بیان کیا ہے۔ پھر آگے چل کر یہ اختلاف جاتا رہا اور اس امر پر اجماع منعقد ہو گیا کہ حالتِ جنابت میں صبح کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ امام نووی نے پورے

جزم و ثوق سے یہ بات کہی ہے۔" (فتح الباری، ج ۴ - ص ۱۱۸)

جو شخص مسئلہ زیر قلم میں حق و صدق کا طالب ہو اس کے لیے جادۂ صدق و صواب یہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا۔ اس میں ذاتی غرض و مفاد کو کوئی دخل نہیں۔

صحابہ ابو ہریرہ کی مرویات کو تسلیم نہیں کرتے تھے:

احمد امین لکھتے ہیں:-

"بعض صحابہ کثرتِ مرویات کی بناء پر ابو ہریرہ پر تنقید کرتے اور ان کی روایت کردہ احادیث کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ جیسا کہ امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ ابو ہریرہ نے کہا "تمہارا خیال ہے کہ ابو ہریرہ زیادہ حدیثیں روایت کرتا ہے۔ بخدا! میں ایک مسکین شخص تھا اور صرف اپنا پیٹ بھر کر رسول کریم کی خدمت کرنے کے سوا میرا کوئی کام نہ تھا۔ مہاجرین تجارتی کاموں میں لگے رہتے اور انصار کو اپنے مال کی دیکھ بھال سے فرصت نہیں ہوتی تھی" صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ابو ہریرہؓ نے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ زیادہ حدیثیں روایت کرتا ہے۔ جب کہ مہاجرین و انصار اس قدر زیادہ حدیثیں روایت نہیں کرتے۔ خدا شاہد ہے کہ میرے بھائی انصار اپنی زمینوں میں لگے رہتے تھے۔ مہاجرین کو تجارتی کاموں سے فرصت نہیں ہوتی تھی۔ ادھر میری حالت یہ تھی کہ صرف اپنا پیٹ بھر کر آنحضور کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ جب مہاجرین و انصار غیر حاضر ہوتے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور جب وہ آپ کے فرمودہ اقوال کو بھول جاتے تو میں انہیں یاد رکھتا۔" (فجر الاسلام، ص ۲۶۹)

احمد امین کی نقل کردہ عبارت ماسوا چند الفاظ کے بالکل وہی ہے جو گولڈزیہر نے تحریر کی ہے۔

گولڈزیہر لکھتا ہے:-

"کچھ یوں دکھائی دیتا ہے کہ ابو ہریرہ احادیث نبویہ کا جو وسیع علم رکھتے تھے اور جو ہر وقت ان کے پاس موجود رہتا تھا ان لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب ہوا جو براہِ راست ان سے حدیثیں اخذ کیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ وہ ان شکوک کا اظہار انتہائی تمسخرانہ انداز میں کیا کرتے تھے۔ (اس سے گولڈ زیہر نے ان دونوں حدیثوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن کو احمد امین نے امام مسلم سے نقل کیا ہے)۔" (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ج ۱۔ ص ۴۰۸)

مندرجہ صدر بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ کہ احمد امین کے شکوک و مطاعن کا اصل ماخذ گولڈ زیہر کی نگارشات ہیں اور بس۔ مگر دونوں (استاد و شاگرد) کے مابین ایک نمایاں فرق بھی پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ گولڈ زیہر نے شک کی نسبت ان تابعین کی جانب کی ہے جو براہ راست حضرت ابوہریرہ سے کسب فیض کیا کرتے تھے۔ مگر احمد امین نے اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر شک کی نسبت بعض صحابہ کی جانب کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ احمد امین کی نیش زنی گولڈ زیہر کی نسبت زیادہ ضرر رساں اور خطرناک ہے۔ اور یہ ایک ایسا وصف ہے جس کی اساس پر مؤلفِ فجر الاسلام کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

بہرکیف احمد امین نے ابوہریرہ کے بارے میں جو کچھ نقل کیا اور ابوہریرہ نے اپنی جانب سے جو دفاع کیا اس میں کوئی ایسی بات نہیں پائی جاتی جس سے ابوہریرہ کو مطعون کیا جا سکے اور ان کی صداقت مشکوک ہو کر رہ جائے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ابوہریرہ متاخر الاسلام ہونے کے باوجود کثیر الروایۃ صحابہ کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیشہ آنحضورؐ کی صحبت میں رہتے تھے۔ جہاں آپ جاتے ابوہریرہ ساتھ جاتے۔ جب آنحضورؐ نے وفات پائی تو ابوہریرہ کبار صحابہ سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔

حدیث نبوی کے ساتھ ابوہریرہ کی جو وابستگی و دلبستگی تھی یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ صحابہ میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بذاتِ خود اس امر کی شہادت دی ہے کہ ابوہریرہ حدیث رسول کے سب صحابہ سے بڑھ کر حریص ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے عہد و عہد میں جب صحابہ ادھر ادھر مختلف بلاد و امصار میں پھیل گئے تو ابوہریرہ نے اس علمی امانت کا تقاضا یہ محسوس کیا کہ اس کو ہر حال میں امت مسلمہ تک پہنچا دیا جائے۔ اس کو ظاہر نہ کرنے کی صورت میں انہیں کتمانِ حق کے جرم میں ملوث ہونے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ ابوہریرہ نے بخاری و مسلم کی ایک روایت کے مطابق بذاتِ خود اس کی تصریح کی ہے۔ ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:

"اگر قرآن مجید کی دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا۔ پھر سورہ بقرہ کی آیات تلاوت کیں۔ جن کا مفہوم یہ ہے ———— "جو لوگ ہدایت اور ان دلائل کو چھپاتے ہیں جن کو ہم نے نازل کیا۔ اس کے بعد کہ ہم نے ان کو کتاب میں لوگوں کے لیے واضح کر دیا ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ اور لعنت بھیجنے والے فرشتے لعنت بھیجتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں اور اپنے اعمال کی اصلاح کرلیں۔ اور ان کو واضح کر دیں میں ایسے لوگوں کی توبہ قبول کروں گا۔ اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں"۔

(البقرۃ، ۱۵۹-۱۶۰)

یہ ایک طبعی امر تھا کہ ابوہریرہ ایک سمندر کی روانی کے ساتھ، جس کثرت کے ساتھ حدیثیں روایت کرتے تھے اس سے بعض تابعین اور ان صحابہ کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوں، جو مدینہ سے دور بود و باش رکھتے تھے۔ خصوصاً جب کہ آپ متاخرالاسلام بھی تھے۔ کچھ بعید از قیاس نہ تھا کہ وہ پکار اُٹھتے کہ ابوہریرہ کثرتِ احادیث میں کیوں منفرد ہیں؟ اور دوسرے صحابہ اس سے کیوں کر بہرہ ور نہیں؟

یہ ایک سوال تھا جو ان کے ذہنوں پر وارد ہوتا تھا اور جس کو وہ ابوہریرہ پر عائد کرتے تھے۔ مگر کسی شک و تکذیب کی بناء پر نہیں بلکہ اس حیرت و استعجاب کو دور کرنے کے لیے جو ان کے نفوس میں پیدا ہوتا تھا۔ اور جب ابوہریرہ حقیقتِ حال واضح کرتے تو وہ مطمئن ہو کر خاموشی اختیار کر لیتے۔ پھر احمد امین کی یہ بات کیوں کر درست ہو سکتی ہے کہ صحابہ عام طور سے ابوہریرہ کو تنقید شدید کا نشانہ بناتے تھے؟ اور پھر ابوہریرہ کے حفظ و صداقت میں شک و شبہ کی کیا گنجائش باقی رہی؟ ذکر کردہ حدیث میں ابوہریرہ کی کثرتِ روایت پر صرف اظہار تعجب کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اظہار حیرت کرنے سے تکذیب کیونکر لازم آئی؟

بعض اوقات ایک گہرا دوست جس کی صداقت بیانی شک و شبہ سے ..... بالا ہوتی ہے۔ ایک عجیب واقعہ بیان کرتا ہے اور آپ اس پر حیرت و دہشت کا اظہار کرتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ اس کو جھٹلاتے ہیں۔ بخلاف ازیں آپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ کا دوست معاملہ کی اصل حقیقت واضح کر کے آپ کے تعجب کا ازالہ کرے۔ ابوہریرہؓ کے ساتھ بھی بالکل یہی واقعہ پیش آیا

جب ابوہریرہؓ نے کثرتِ احادیث کی وجہ بتائی توصحابہ نے بخوشی خاطر اس کو قبول کر لیا۔ اگر صحابہ ان کی تکذیب پر آمادہ ہوتے یا ان کی صداقت و ثقاہت کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوتے تو وہ ابوہریرہؓ کی اس بات سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے کہ "میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ کچھ سُنا جو تم نے نہیں سُنا مجھے یاد رہا اور تم بھول گئے"۔

مزید برآں اگر صحابہ ابوہریرہؓ کی مرویات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوتے تو وہ ان کو اس بات کی اجازت کیوں کر دے سکتے تھے کہ وہ کھلم کھلا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں روایت کرنے کا مشغلہ جاری رکھیں۔ نیز یہ کہ اندریں صورت ابوہریرہؓ کے لیے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جری اور بے باک حق پرست کی سزا سے بچنا بہت مشکل ہو جاتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جیسی غیرت مند خاتون اس پر کیوں کر خاموش رہ سکتی تھیں جن کی حق پسندی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عثمان کا انتقام لینے اور حضرت علیؓ کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھیں۔ پھر یہ کہ صحابہ کبار کے لیے اس کو صبر و سکون کے ساتھ سُننا اور برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ حالانکہ ابوہریرہ کے زمانہ میں بہت سے صحابہ بقیدِ حیات تھے۔ صحابہ کی دینی غیرت کا یہ عالم تھا کہ حدیث میں غلطی کا ارتکاب کرنے والے کو وہ فوراً ٹوک دیتے تھے۔ وہ عمر فاروقؓ یا ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ ہی کیوں نہ ہوں پھر وہ حدیث میں اضافہ یا دروغ بافی کرنے والے کو کیوں کر معاف کر سکتے تھے؟

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون لوگ تھے جو حضرت ابوہریرہؓ پر معترض ہوئے اور آپ نے ان کو مخاطب کر کے جواب دیا؟ حدیث کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ نہ تو چیدہ و برگزیدہ صحابہ کرام میں شامل تھے اور نہ ان کو اسلام میں سبقت کرنے اور عرصہ مدید تک آنحضورؐ کی صحبت و رفاقت کا شرف حاصل کرنے کا موقع ملا۔ بخلاف ازیں میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ وہ سرے سے صحابہ میں شامل ہی نہ تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

"یہ کیا بات ہے کہ مہاجرین و انصار ابوہریرہ کی طرح زیادہ حدیثیں روایت نہیں کرتے"

اگر اعتراض کرنے والے مہاجرین و انصار میں سے ہوتے تو وہ ابوہریرہ کو مخاطب کر کے یوں کہتے کہ "ہم ابوہریرہ کی طرح کس لیے زیادہ حدیثیں روایت نہیں کرتے؟"

مزید برآں حضرت ابوہریرہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میرے مہاجرین و انصار بھائی کام کاج میں لگے رہتے تھے" اور اگر تنقید کرنے والے خود مہاجرین و انصار ہوتے تو آپ ان سے یوں مخاطب ہوتے :

"تم تجارت و زراعت میں لگے رہتے تھے "

علاوہ ازیں بخاری کی روایت میں حضرت ابوہریرہ کے یہ الفاظ ہیں کہ "جو باتیں میں یاد رکھتا وہ بھول جاتے "

اگر صحابہ خود معترض ہوتے تو ابوہریرہ ان سے یوں کہتے کہ "تم بھول جاتے "

حدیث کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ حقیقت مجھ پر کھلی ہے۔ جب میں نے ابوہریرہ کے سیر و سوانح کی طلب و تلاش میں انتہائی جانفشانی سے کام لیا کہ کسی ایک صحابی کا نام ہی مل جائے ۔ جس نے ابوہریرہ کو کثرتِ روایات کی بناء پر مطعون کیا ہو۔ تو میں نے حافظ ابن حجر کی الاصابہ میں مندرجہ ذیل واقعہ پایا :

"ابن سعد نے بطریق ولید بن رباح روایت کیا ہے کہ جب لوگوں نے حضرت حسنؓ کو ان کے نانا کے پہلو میں دفن کرنا چاہا تو ابوہریرہ نے مروان سے کہا "تم ایسی بات میں دخل دیتے ہو جس سے تمہیں کچھ سروکار نہیں۔ تمہارا مقصد اس شخص کو راضی کرنا ہے جو موجود نہیں" اس وقت امیر مدینہ مروان کے علاوہ کوئی اور شخص تھا۔ مروان یہ سن کر ناراض ہوا اور کہا "لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ بکثرت احادیث روایت کرتا ہے "

ظاہر ہے کہ مروان ایک تابعی تھا (صحابی نہ تھا) اور یہ واقعہ عہد رسالت کے بہت بعد وقوع پذیر ہوا۔ اور وہ بھی اس حالت میں جب مروان غصہ سے بھرا ہوا تھا۔ مزید یہ کہ مروان نے اس بات کو عام لوگوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ اور اگر شک میں مبتلا ہونے والے خود صحابہ ہوتے تو وہ کسی نہ کسی طرح ابوہریرہ کو اس سے ضرور آگاہ کرتے اور ابوہریرہ کسی موقع پر یہ بات مروان کے گوش گزار کر دیتے ۔

احمد امین اور منکرین حدیث کو کھلا چیلنج :

بہرکیف حضرت ابوہریرہ نے خود اپنے بارے میں جو کچھ فرمایا ــــــــ اور کسی دوسرے شخص کی روایت اس ضمن میں ہمیں آج تک نہیں مل سکی ــــــــ اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان پر تنقید کرنے والے مشاہیر صحابہ میں سے تھے۔ اور اگر ایسا ہوتا تو تاریخ کے اوراق میں یہ بات ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتی جس طرح صحابہ کی باہمی ردّ وقدح کا ذکر کتب تاریخ میں ملتا ہے۔ ہم احمد امین اس کے مستشرقین اساتذہ اور روئے زمین کے تمام منکرین حدیث (اس میں پاکستان کے منکرین سنت بھی شامل ہیں) کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایسی صحیح تاریخی شہادت پیش کریں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ کسی معروف صحابی نے یہ بات کہی ہو۔ یا کسی صحابی نے ابوہریرہ کی دروغ گوئی کا ذکر کرکے ان کو حدیثیں روایت کرنے اور دوسروں کو اُن کی مرویات سننے سے روکا ہو۔ مگر یہ بات وہ ہرگز ثابت نہیں کر سکتے۔ بخلاف ازیں تاریخ کے قطعی وحتمی دلائل سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ صحابی علی العموم ابوہُریرہ کی قوتِ حافظہ کے معترف تھے۔ اور ان کے کثیر الروایات ہونے کو تسلیم کرتے تھے۔ گاہے ایسا ہوتا کہ حضرت عائشہؓ و ابن عمرؓ ابوہریرہ کی بعض مرویات پر اظہارِ حیرت کرتے مگر ان کی علمی جامعیت کا اعتراف کرکے جلد ہی ان احادیث کو تسلیم کر لیتے اور اپنی علمی کوتاہی کا اقرار کرتے۔

حضرت ابوہُریرہؓ نے ایک مرتبہ یہ حدیث بیان کی کہ "جو جنازہ کے ساتھ جائے اسے ایک قیراط (ایک خاص پیمانہ) اجر وثواب ملے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے سن کر کہا "ابوہُریرہؓ نے ہم پر بہت زیادتی کی ہے" حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا ابوہُریرہ ٹھیک کہتے ہیں"۔ یہ سن کر ابن عمر بولے "پھر تو ہم نے بہت سا ثواب کھو دیا"۔ پھر یہی روایت ابن عمر خود بیان کرنے لگے اور کہتے کہ میں نے ابوہُریرہ سے یہ حدیث سُنی ہے" ابن عمر ابوھُریرہ کو مخاطب کرکے کہا کرتے تھے۔

"تم آنحضورؐ کے وابستۂ دامن رہا کرتے تھے اور اس لیے ہم سے بڑھ کر حدیث دان ہو"

محمد بن عُمارہ بن حزم ایک مجلس میں بیٹھے تھے۔ چند اکابر صحابہ بھی تشریف فرما تھے۔ اندریں اثنا ابوہُریرہؓ حدیثیں بیان کرنے لگے۔ صحابہ ان کو دُھرائے اور ایک دوسرے سے پوچھتے۔ بعد ازاں، ابوہریرہ بھی اسی طرح وہ حدیث ان کو سُنا دیتے۔ کئی مرتبہ یونہی ہوا۔ محمد بن عمارہ کا بیان ہے مجھے

اس روز پتہ چلا کہ ابوھریرہؓ سب سے بڑے حافظ حدیث ہیں۔

(بخاری فی التاریخ والبیہقی فی المدخل)

احناف کا بے ابوہریرہؓ کی روایت تسلیم نہیں کرتے:

احمد امین لکھتے ہیں:-

"حنفیہ بعض اوقات ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث کو جب کہ وہ خلافِ قیاس ہو تسلیم نہیں کرتے۔ مثلاً ابوہریرہ کی یہ روایت کہ رسول کریم نے فرمایا کہ اونٹنی اور بکری کا دودھ تھنوں میں روکا نہ کرو جس نے کوئی ایسا مویشی خریدا جس کا دودھ تھنوں میں روکا گیا ہو تو دوہنے کے بعد اسے دو باتوں کا اختیار ہے اگر وہ مویشی اسے پسند ہو تو رکھ لے۔ اور اگر ناپسند ہو تو اسے واپس کر دے اور (جو دودھ اس نے پیا ہے اس کے عوض) کھجوروں کا ایک صاع بھی فروخت کنندہ کو دے دے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ فقیہ نہ تھے۔ یہ حدیث خلافِ قیاس ہے۔ اس لیے کہ دودھ دوہنا بائع کے خلاف ایک طرح کی زیادتی ہے اور زیادتی کی ضمانت بالمثل ہونی چاہیے یا بالقیمۃ مگر کھجوروں کا صاع نہ قیمت میں شامل ہے اور نہ دودھ کی مثل ہے۔

(فجر الاسلام، ص ۲۶۹)

مذکورہ صدر عبارت میں مولفِ فجر الاسلام نے تین باتوں کا دعویٰ کیا ہے۔

(۱) جب حدیث اور قیاس باہم متعارض ہوں تو حنفیہ قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۲) حنفیہ نے ابوہریرہ کی مذکورہ صدر حدیث میں قیاس کو ترجیح دی ہے۔

(۳) احناف حضرت ابوہریرہ کو غیر فقیہ قرار دیتے ہیں۔

اب ہم بالترتیب امور سہ گانہ پر اظہار خیال کریں گے اور بتائیں گے کہ ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ہے۔

(الف) یہ بات غلط ہے کہ حنفیہ حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔ بخلاف ازیں امام ابوحنیفہ صاحبینؒ اور ان کے جمہور اتباع کے نزدیک حدیث علی الاطلاق قیاس سے مقدم ہے۔ خواہ اس کا راوی فقیہ ہو یا غیر فقیہ۔ امام شافعی احمد اور جمہور اہل اصول کی بھی رائے ہے۔ احناف

میں سے فخر الاسلام ابن ابان اور ابوزید کا مسلک یہ ہے کہ جب راوی فقیہ ہو تو اس کی روایت قیاس کے مقابلہ میں مطلقاً مقدم ہو گی۔ اور اگر غیر فقیہ ہو تب بھی حدیث کو قیاس پر ترجیح دی جائے گی۔ الّایہ کہ وہ حدیث تمام قیاسات سے ٹکراتی ہو اور قیاس کا دروازہ اس سے بالکل مسدود ہو جاتا ہو اس کی مثال میں وہ مذکورہ صدر حدیث پیش کرتے ہیں علمائے اصول میں سے علامہ آمدی ابن حاجب اور کمال نے اس نظریہ کا اظہار کیا ہے کہ جب قیاس میں علّت کا وجود راجح ہو اور علّت اصل کی طرح فرع میں بھی پائی جاتی ہو تو قیاس کو ترجیح دی جائے گی۔ اور اگر علّت کا وجود اصل و فرع میں مساوی ہو تو اُس میں توقف کیا جائے گا ورنہ حدیث کو ترجیح دی جائے گی۔

یہ ہیں حدیث و قیاس کے تعارض کے سلسلہ میں علماء کے اقوال! اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ جمہور حنفیہ جن کے سرخیل امام ابوحنیفہ و صاحبین ہیں، حدیث کو قیاس کے مقابلہ میں مطلقاً مقدم سمجھتے ہیں۔ خواہ راوی فقیہ ہو یا غیر فقیہ۔ لہٰذا احمد امین نے جو بات حنفیہ کی جانب منسوب کی ہے قطعی طور پر بے بنیاد ہے، اس ضمن میں مجھے علماء اصول کے اقوال نقل کرنے کی کچھ ضرورت نہیں وہ اپنی جگہ تفصیلاً مذکور ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے ترجمہ میں اس پر مزید تبصرہ کیا جائے گا۔

(ب) جو فقہاء حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح دیتے ہیں وہ ہر غیر فقیہ راوی کی روایت کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں۔ اس میں ابوہریرہ کی کوئی تخصیص نہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں مسلم الثبوت اور اس کی شرح کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"فخر الاسلام فرماتے ہیں اگر حدیث کا راوی ائمہ اربعہ یا عبادلہ اربعہ (عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمرو بن العاص) اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح مجتہد ہو تو اس کی روایت کردہ حدیث کو ترجیح دی جائے گی۔ بخلاف ازیں اگر راوی عدالت و ثقاہت میں معروف ہو مگر فقیہ نہ ہو مثلاً ابوہریرہؓ و انسؓ تو اُس کی روایت کو خلافِ قیاس ہونے کی وجہ سے ترک نہیں کیا جائے گا۔ الّا یہ کہ اس کی روایت کو تسلیم کرنے سے قیاس کا دروازہ بالکل ہی مسدود ہو جاتا ہو مثلاً وہ حدیث جس میں اس مویشی کی فروختگی کا ذکر کیا گیا ہے جس کا دودھ تھنوں میں بند کر دیا گیا ہو۔"

(ج)۔ مذکورہ صدر بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ احمد امین کے صرف حضرت

ابوہریرہ کو اس ضمن میں مورد طعن بنانے کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں۔ نیز یہ کہ احمد امین کا یہ قول بھی درست نہیں کہ حنفیہ ابوہریرہ کو غیر فقیہ تصور کرتے ہیں۔ اس لیے کہ احناف میں سے صرف فخر الاسلام اور ان کے دو ساتھی اس کے قائل ہیں۔ جب کہ جمہور حنفیہ اس ضمن میں ان کے خلاف ہیں۔ اور ان کے اس قول کی مذمت کرتے ہیں۔ مشہور فقیہ کمال الدین ان کا یہ قول مسلم الثبوت سے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ”ابوہریرہ فقیہ تھے“ ابن امیر الحاج فرماتے ہیں:

> ”حضرت ابوہریرہؓ جملہ شرائط اجتہاد کے جامع تھے۔ وہ عہد صحابہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔ اور اس زمانہ میں فتویٰ وہی شخص دیا کرتا تھا جو مجتہد ہوتا تھا۔ ان سے آٹھ سو راویان حدیث نے روایت کی جن میں صحابی بھی تھے اور تابعی بھی۔ آپ کے تلامذہ میں حضرت ابن عباس و جابر و انس رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ شامل تھے۔ اس ضمن میں صحیح بات یہی ہے۔“

(التقریر، ج ۲۔ ص ۲۵۱ نیز التیسیر، ج ۲۔ ص ۵۳)

البتہ یہ بات درست ہے کہ حنفیہ اگرچہ قیاس کے مقابلہ میں حدیث کو ترجیح دیتے ہیں تاہم وہ حدیث زیر تبصرہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ابوہریرہ کی روایت کردہ ہے اور نہ یہ کہ وہ اپنے مسلّمہ قاعدہ کو ترک کر دیتے ہیں۔ بلکہ اس حدیث کو وہ ایک دوسرے قاعدہ کی اساس و بنیاد پر ترک کرتے ہیں جو نہ صرف ان کے بلکہ جمہور علماء کے نزدیک تسلیم شدہ ہے۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ خبر واحد جب کتاب و سنت اور اجماع سے ٹکراتی ہو تو اُس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ جب شرعی دلائل باہم متعارض ہوں تو ان میں ترجیح کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے جو قوی تر ہو اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ کتاب و سنت اور اجماع کا مدلول و مفہوم خبر واحد کے مقابلہ میں بہر حال اقویٰ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی زیر تبصرہ روایت حنفیہ کے نزدیک کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ معمول بہا نہیں ہو سکتی۔ حنفیہ نے اس حدیث کے متعدد و مختلف جواب دیے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان کے چھ جوابات نقل کیے ہیں۔ ان میں سے ایک جواب یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے یہی منقول ہے۔ خلاصہ یہ کہ جواب

کچھ بھی ہو حنفیہ کسی صورت میں بھی ابوہریرہ کو موردِ طعن نہیں ٹھہراتے۔ مشہور فقیہ فخر الاسلام ہی کو لیجیے جو ابوہریرہ کو غیر فقیہ کہتا ہے تاہم وہ آپ کی عظمت و فضیلت اور امانت و صداقت کا اعتراف کرتا ہے۔ خدا کی پناہ کہ اہل علم اور خوف خدا رکھنے والوں میں سے کوئی اس کے خلاف عقیدہ رکھے۔

غالباً آپ پر حقیقت حال واضح ہو چکی ہو گی اور آپ اچھی طرح جان چکے ہوں گے کہ احمد امین نے مذکورہ صدر امور سہ گانہ میں فاش غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے یہ موقف کیوں اختیار کیا؟ اس کے جواب میں ہم وہ باتیں بیان کریں گے جس سے آپ پر احمد امین کی علمی امانت و دیانت اور باریک بینی کا راز آشکار ہو جائے گا۔

مسلم الثبوت کے مصنف نے ایک فصل میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ راوی میں کن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے اور کن کا نہیں اس میں ذکر کیا ہے کہ مجتہد ہونا راوی کے لیے ضروری نہیں۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اجتہاد راوی کے لیے شرط نہیں۔ مگر بعض احناف راوی کے مجتہد ہونے کی شرط اس صورت میں لگاتے ہیں جب اس کی روایت کردہ حدیث ہر لحاظ سے خلافِ قیاس ہو۔"

مذکورہ صدر عبارت میں احناف سے فخر الاسلام اور ان کے ہمنوا مراد ہیں۔ شارح مسلم الثبوت نے ان کے زاویہ نگاہ کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے:

"فخر الاسلام اور ان کے ہم خیال اس کی مثال میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث "المصراۃ" پیش کرتے ہیں۔ فخر الاسلام کی تصنیف کے شارحین نے ان کے نکتہ نگاہ کی وضاحت اسی طرح کی ہے مگر ان کا نظریہ محل نظر و فکر ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابوہریرہؓ کے فقیہ اور مجتہد ہونے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ وہ عہد رسالت میں اور اس کے بعد فتویٰ دیا کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ عبداللہ بن عباس کے فتویٰ کے خلاف فیصلہ صادر کرتے تھے۔ جیسا کہ روایاتِ صحیحہ میں وارد ہوا

ہے کہ جب حاملہ عورت کا خاوند فوت ہو جائے تو ابن عباس نے اس کی عدت اَبْعَدُ الْاَجَلَیْن (عدت وفات اور وضع حمل میں سے جو زیادہ دُور ہو) قرار دی تھی۔ اس کے خلاف ابوہریرہؓ نے وضع حمل کو عدت ٹھہرایا۔ حضرت سلمان فارسیؓ جیسے جلیل القدر صحابہ ابوہریرہ سے فتاویٰ دریافت کیا کرتے تھے۔ لہٰذا اس حدیث کے روایت کرنے سے ان کی ثقاہت و صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا"

(شرح مسلم الثبوت، ج ۲۔ ص ۱۴۰-۱۴۶)

یہ ہے شارح مسلّم الثبوت کی عبارت کا معنی و مفہوم! اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ صرف فخر الاسلام اور اس کے چند ہم خیال فقہاء کا نظریہ ہے۔ مگر حیرت ہے کہ احمد امین نے اس نظریہ کو جمیع احناف کی جانب منسوب کر دیا اور دو اشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جملہ احناف ابوہریرہؓ کو غیر فقیہ راوی قرار دیتے ہیں۔ قبل ازیں یہ کہا کہ سب حنفیہ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ احمد امین نے مطلقاً یہ نہیں لکھا کہ شارح مسلّم نے ان فقہاء کی تردید کی ہے جو ابوہریرہ کو غیر فقیہ راوی تصور کرتے ہیں:

اب یہاں دو باتیں ہیں تیسری صورت کا کوئی امکان نہیں۔

(۱) ۔ اُستاذ احمد امین صاحبِ مسلّم الثبوت اور شارح کے کلام کو سمجھ نہیں پائے اور ان کو کچھ خبر نہیں کہ اس ضمن میں حنفیہ کا مسلک کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مختلف اقوال کو گڈمڈ کر دیا ہے اور فخر الاسلام اور ان کے ہم خیال فقہاء کے قول کو جمیع احناف کی جانب منسوب کر دیا ہے۔ احمد امین نے شارح کے کلام کو بھی اسی پر محمول کیا اور جو گرفت انہوں نے ابوہریرہ کو غیر فقیہ قرار دینے والوں پر کی تھی، سرے سے اُس کو سمجھا ہی نہیں۔ مگر یہ بات تو ایک مبتدی سے بھی صادر نہیں ہو سکتی۔ چہ جائیکہ اُستاذ احمد امین جیسا مشہور و معروف عالم اور ادیب، معمولی سی عبارت کو سمجھنے سے قاصر رہتا۔

(۲) دوسرا احتمال یہ ہے کہ اُستاذ احمد امین عبارت کو بخوبی سمجھتے تھے مگر انہوں نے دانستہ غلط مبحث سے کام لیا اور اس کی نسبت احناف کی جانب اس لیے کی کہ وہ ابوہریرہ کے خلاف سازش کی تکمیل کر سکیں اور اپنی کتاب کے قاری کو ایک جلیل القدر صحابی سے بدظن کر سکیں

جو شخص اُستاذ احمد امین کے علم و فہم پر بھروسہ کرتا ہے وہ اسی پہلو کو ترجیح دے گا۔ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

ابوہریرہ کی کثرت روایت سے وضاعین کی مقصد برآری:

جہاں تک احمد امین کے اس الزام کا تعلق ہے کہ وضاعین حدیث نے ابوہریرہ کی کثرتِ روایت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بہت سی حدیثیں وضع کرکے ان کی جانب منسوب کردیں:

(فجر الاسلام ص ۲۷۰)

تو یہ ایک ایسی بات ہے جس میں ابوہریرہ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ بلکہ وضاعین نے حضرات عمر و عائشہ و ابن عباس و ابن عمر و جابر و انس وغیرہم رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا تھا اور بہت سی حدیثیں وضع کرکے ان کی جانب منسوب کردی تھیں۔

نظر بریں اس بات کا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ بہت سے وضاعین نے لاتعداد حدیثیں گھڑ کر ان کی جانب منسوب کردیں۔ بلکہ کسی صحابی یا تابعی کا تعارف بیان کرتے وقت اس امر کا ذکر دبیان بھی نامناسب ہے۔ پھر حیرت ہے کہ ابوہریرہ کے ترجمہ میں احمد امین کو اس کی کیا ضرورت پیش آئی؟ نیز یہ کہ احمد امین نے خصوصی طور سے اس ضمن میں ابوہریرہ کا نام کیوں لیا اور حضرت عائشہؓ و دیگر صحابہ کو کیوں نظر انداز کردیا؟ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ گولڈ زیہر نے بھی حضرت ابوہریرہ پر بحث کرتے ہوئے یہی نتیجہ نکالا ہے۔ گولڈ زیہر لکھتا ہے:

"بہت سی احادیث جن کو راویان حدیث نے ابوہریرہ کی جانب منسوب کیا ہے پچھلے تاریخی ادوار میں گھڑ کر ان کی جانب منسوب کی گئیں تھیں"

اس سے گولڈ زیہر کا مقصد یہ ہے کہ ابوہریرہ کی جملہ مرویات کو مشکوک بنا کر رکھ دیا جائے چنانچہ وہ مزید کہتا ہے:

"ان احوال و ظروف کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم ابوہریرہ کی مرویات کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھیں"۔ (انسائیکلو پیڈیا، ج ۱- ص ۴۱۸)

چونکہ گولڈ زیہر نے ابوہریرہ پر نقد و تبصرہ کرتے وقت یہی نتیجہ نکالا تھا۔ اس لیے احمد امین کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ بھی ابوہریرہ سے متعلق بحث کا خاتمہ اسی بات پر کرتے۔ اب آپ پر یہ حقیقت

روشن ہو چکی ہے کہ احمد امین کس حد تک اعداء اسلام کی پیروی اور خوشہ چینی کرنے میں اور اس میں وہ کس قدر مخلص نظر آتے ہیں۔ حیرت بالائے حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہ کس بے باکی اور جسارت سے ابوہریرہ جیسی یگانہ ویکتا ہستی کو طعن وطنز کی آماج گاہ قرار دیتے ہیں اور اس کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ جب وہ اس بات کا تذکرہ چھیڑتے ہیں کہ صحابہ باہم ایک دوسرے کی تردید کیا کرتے تھے تو مثال کے طور پر حضرت عائشہ اور ابن عباس کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ ابوہریرہؓ کی مرویات کو تسلیم نہیں کیا کرتے تھے۔ جب ابوہریرہ کا ترجمہ ذکر کرتے ہیں تو اس میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے حافظہ کی مدد سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ گویا صحابہ میں ایک ابوہریرہ ہی تھے جو اپنے حافظہ سے حدیثیں روایت کرتے تھے۔ دوسرا کوئی صحابی اس طرح نہیں کرتا تھا۔

احمد امین متقدمین پر یہ تنقید کرتے ہیں کہ وہ متن حدیث کو نظر انداز کر کے صرف سند سے بحث کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ بعض ایسی حدیثوں کو صحیح قرار دیتے تھے جو واقع میں صحیح نہ تھیں۔ وہ اس کی مثال میں بھی ابوہریرہ ہی کی روایت ذکر کرتے ہیں۔ گویا دوسری کوئی حدیث ان کو مل ہی نہیں سکتی۔ جب احمد امین یہ ثابت کرنے کے درپے ہوتے ہیں کہ وضع حدیث کے کچھ نفسیاتی اسباب ووجوہ بھی تھے ہیں تو اس ضمن میں بھی ان کی نوک قلم پر صرف ابوہریرہ اور ان کی مرویات کا نام ہی آتا ہے۔

احمد امین اس طرح بڑے نرم اور لطیف انداز میں جلیل القدر صحابی حضرت ابوہریرہ کو اپنے نرم وگرم جملوں سے گھائل کیے جاتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس ضمن میں وہ کسی تحقیق وتلاش کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ احمد امین کی یہ سب تگ ودو اور کدوکاوش صرف اس لیے ہے کہ ایک خواہشات کے پجاری مستشرق کے ناپاک عزائم کی تکمیل کی جائے جس کا مقصدِ وحید ہمارے ان اسلاف کی سیرت کو بگاڑ کر پیش کرنا ہے جنہوں نے دین اسلام کو ہم تک پہنچایا اور اس کی حمایت وصیانت کا فریضہ ادا کیا۔

ہم اُستاذ احمد امین اس کے پیش رَو مستشرقین اور بعد میں آنے والے منکرین حدیث سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جو صحابی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سینتالیس[۴۷] سال تک اکابر صحابہ کی موجودگی میں حدیثیں روایت کرتا رہا ہو۔ جو آپؐ کو اپنے اصحاب وازواج سے بھی عزیز تر ہو۔

جس کو سب لوگ عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہوں اور احادیث کی پہچان حاصل کرنے میں ان کی طرف رجوع کرتے ہوں۔ تابعین ہر طرف سے بھاگے بھاگے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہوں۔ سعید بن المسیب جیسا بے باک متقی اور سید التابعین جس کو اپنا داماد بنا نا پسند کرے جس کے اصحاب وتلامذہ کی تعداد آٹھ سو تک پہنچ جائے اور کسی صحابی سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد اتنی نہ ہو پھر یہ کہ تمام صحابہ وتابعین اس کی جلالت وثقاہت کی شہادت دیتے ہوں۔ اور تیرہ صد سالہ تاریخ اس بات کی شاہد عدل ہو کہ کسی صحابی کو وہ مرتبہ نہیں ملا جو ابو ہریرہ کے حصہ میں آیا۔

مقام افسوس ہے کہ عصر حاضر کا ایک شخص اگر یہ کہے کہ تمام اصحاب تابعین اور محدثین ابو ہریرہ کو معلوم نہ کر سکے اور انہیں یہ پتہ نہ چلا کہ دراصل وہ کذاب اور مفتری تھا۔ جو شخص اس جلیل القدر صحابی کے بارے میں یہ موقف اختیار کرے گا۔ وہ خود بھی حقیر وذلیل ہوگا اور اس کے ہمنوا بھی۔ مزید یہ کہ ایسا شخص اپنے علم وفن اور فہم وادراک کو بھی رسوا کر کے رہے گا۔

چند منٹ ابو ریّہ (منکرِ حدیث) کے ساتھ

اب ہم ان مطاعن کا ذکر کریں گے جو ابو ریّہ نے اپنی کتاب "اضواء علی السنۃ المحمدیۃ" میں حضرت ابوہریرہؓ سے متعلق ذکر کیے ہیں۔ تاکہ ان کے بارے میں جو کچھ کہا جاچکا ہے وہ کھل کر سامنے آجائے۔

ابو ریّہ نے ابوہریرہؓ کو مندرجہ ذیل نقائص وعیوب کا نشانہ بنایا ہے:۔

۱ — ابوہریرہ ایک حقیر اور کمینہ شخص تھے (نعوذ باللہ من ذالک)

۲ — اس نے دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

۳ — وہ جھوٹی حدیثیں بیان کرتے تھے۔

۴ — وہ دنیوی مال کے بڑے حریص اور شکم پرست انسان تھے۔

۵ — وہ بنوامیہ کے طرف دار تھے۔

وغیر ذالک من الخرافات۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ معتزلہ روافض اور قدیم وجدید مستشرقین میں سے جن لوگوں نے بھی ابوہریرہ پر نکتہ چینی کی ہے ان سب میں ابو ریّہ زیادہ فحش گو دریدہ دہن اور گستاخ تھا۔ اس سے ابو ریّہ کے بغض وعناد اور خبث باطن کا پتہ چلتا ہے اس نے جس افتراپردازی اور تحریف سے کام لیا ہے اور ابوہریرہ سے متعلق حقائق کو جس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ وہ اس کی سزا سے بچ نہیں سکتا۔

۱ - ابوہریرہؓ کے نام میں اختلاف:

ابو ریّہ نے حضرت ابوہریرہؓ کے بارے میں جو تہمت طرازی کی ہے اب ہم مختصراً اس کا جائزہ لیتے ہیں ——— ابو ریّہ لکھتا ہے:۔

> "جاہلیت ہو یا اسلام آج تک کسی شخص کے نام کے بارے میں اس قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ جیسے ابوہریرہ کے نام ہیں۔ صحیح طور سے کسی شخص کو معلوم ہی نہیں کہ گھر والوں نے ان کا کیا نام تجویز کیا تھا۔ ابو ریّہ نے امام نووی سے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ کے نام کے بارے میں تیس اقوال ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ان کا نام عبدالرحمٰن بن صخر ہے قطب حلبی

کہتے ہیں کہ ابوہریرہ اور ان کے والد کے بارے میں چوالیس[۴۴] اقوال وارد ہوئے ہیں۔"

(اضواء۔ص ۱۵۲)

ابوریّہ دراصل حضرت ابوہریرہ کی تحقیر کرنا چاہتا ہے۔ اس کا منشا یہ بتانا ہے کہ ابوہریرہ صحابہ میں اس قدر گمنام تھے کہ ان کے نام کے بارے میں بھی سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کا جواب حسب ذیل ہے:

(۱) کسی آدمی کے نام میں اختلاف پیدا ہونے سے اس کی عزت و وقعت میں کچھ فرق نہیں پڑتا آدمی کی قدر و قیمت اس کے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے اس کے یا والد کے نام سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دخول جنت اور اخروی مراتب و درجات کے لیے اسماء و القاب کو معیار نہیں ٹھہرایا۔ جو شخص اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے وہ خدا کے دین سے بے بہرہ اور جاہل ہے۔

(۲) بہت سے صحابہ کے نام میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم اس سے ان کے عزّ و وقار اور اسلامی خدمات میں کچھ فرق نہیں آیا۔

(۳) ابوہریرہ کے نام میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ وہ جب سے اسلام لائے انہیں ابوہریرہ کے نام سے پکارا جاتا رہا۔ نام کے معلوم نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ قبائل قریش میں سے نہیں تھے تاکہ لوگ ان کے اصلی نام سے واقف ہوتے۔ دورِ حاضر میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو حضرت ابوبکر صدیق کے اصلی نام سے واقف ہوں۔ وہ ان کی کنیت سے آشنا ہیں اور بس۔ اس لیے کہ شروع ہی سے ان کے کان میں صرف آپ کی کنیت ہی پڑتی رہی ہے۔ اگر ابوہریرہ کا اصلی نام لوگوں کو معلوم نہ ہو تو اس میں کیا حرج ہے؟ حضرت ابوہریرہ قبیلہ دَوس سے تعلق رکھتے تھے۔ جو کہ مدینہ سے نہایت دُور سکونت پذیر تھا۔ جب حلقہ بگوش اسلام ہو کر صحبت نبوی میں آئے تو ابوہریرہؓ کے نام ہی سے پکارے جاتے رہے۔ پھر اس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ لوگ ابوہریرہ کا وہ نام بھول جائیں جو ان کے والدین نے ان کے لیے تجویز کیا تھا۔

(۴) ابوہریرہ اور ان کے والد کے نام میں جو اختلاف رُونما ہُوا ہے وہ حقیقۃً تیس[۳۰] یا چالیس[۴۰] اقوال تک نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس کثرت کی وجہ راویوں کا وہم اور الفاظ کی تقدیم و تاخیر ہے۔ اصلی اور حقیقی اختلاف تین اقوال سے زیادہ نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر اپنی کتاب الاصابہ میں لکھتے ہیں :-

"ابوہریرہؓ کے جو نام بتائے جاتے ہیں ان میں تحریف و تصحیف واقع ہو گئی ہے - اس کی ذمہ داری بعض راویوں پر عائد ہوتی ہے - مثلاً ابوہریرہ کا نام مسکن و سکین، اور سعد و سعید بھی بتایا گیا ہے - دراصل یہ ایک ہی نام ہے - راویوں نے بگاڑ کر اس کو دو بنا دیا"

حافظ ابن حجرؒ مزید فرماتے ہیں :-

"غور و فکر کے بعد ابوہریرہ کے نام کے بارے میں صرف دس اقوال ملتے ہیں - اور اگر اس میں مزید تحقیق سے کام لیا جائے تو صرف تین نام باقی رہ جاتے ہیں - یعنی عُمَیر، عبداللہ و عبدالرحمٰن - (الاصابہ - ج ۴ - ص ۲۰۴)

گویا حقیقی اختلاف صرف مذکورہ صدر تین ناموں میں پایا جاتا ہے - حالانکہ دسیوں صحابہ ایسے تھے جن کے ناموں کے بارے میں چار چار پانچ پانچ بلکہ چھ چھ اقوال تک پائے جاتے ہیں - پھر ابوہریرہؓ کے نام کو اس قدر اچھالنے کی کیا ضرورت تھی ؟ مگر جب نیت ہی خراب ہو اور انسان اس بات پر تلا بیٹھا ہو کہ کسی کی مذمت ہی کرنا ہے تو اس کا کیا علاج ؟

ابوہریرہؓ کا حسب و نسب اور بچپن :

ابوریہ اپنی کتاب کے ص۱۵۲ پر لکھتا ہے -

"جس طرح صحابہ ابوہریرہؓ کے نام کے بارے میں مختلف الرائے ہیں اسی طرح وہ ان کے بچپن اور تاریخ قبل از اسلام سے بھی آگاہ نہیں - بجز اس کے جو ابوہریرہؓ نے خود بتایا کہ میں ایک چھوٹی سی بلی کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور اس وقت میں نہایت تنگ دست تھا اور روٹی کے عوض لوگوں کی خدمت کیا کرتا تھا - ابوہریرہ کے حسب و نسب کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ سلیم بن فہم آزدی کے کنبہ سے تعلق رکھتے تھے قبیلہ اَزد مشہور قبیلہ دَوس کی ایک شاخ تھا"

ہم نہیں سمجھتے کہ ایک شخص جو اپنے آپ کو قابل عزت سمجھتا اور علم و معرفت کا مدعی ہو اتنی پست

سطح تک اتر سکتا ہے کہ وہ ایک ایسے صحابی کو نقد و جرح کی آماج گاہ بنائے جو اپنے معاصرین میں جانی پہچانی شخصیت ہو اور اگلی نسلیں بھی بخوبی اس سے آگاہ و آشنا ہوں۔ خصوصاً جب کہ ابو ہریرہ خود کہتے ہیں کہ وہ عرب کے مشہور قبیلہ دَوس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ قبیلہ عربی قبائل میں بہت معروف تھا اور اس کو بڑی عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مزید برآں صحابہ میں خاصی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے عہدِ جاہلیت کے حالات بالکل معلوم نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دورِ جاہلیت میں عرب گمنامی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اپنے جزیرہ میں محصور اور باہر کی دنیا سے یکسر بے بہرہ تھے۔ بیرونی دنیا کو بھی عربوں کے حالات سے کچھ دلچسپی نہ تھی البتہ تجارتی قافلے عرب کی سرزمین سے گزرتے تھے۔ جب اسلام کا آفتاب عالم تاب طلوع ہوا اور سرزمین عرب رسالت و نبوت کی شعاعوں سے جگمگا اٹھی۔ تو عربوں کے حالات تاریخ کے اوراق میں قلمبند کیے جانے لگے۔ راوی ان کے کوائف و احوال کی ٹوہ میں رہنے لگے۔ طالبانِ علم ان سے علم و ہدایت کی باتیں روایت کرنے لگے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ابو ہریرہؓ اس ضمن میں دیگر صحابہ سے مختلف تھے؟ نیز یہ کہ دورِ جاہلیت کے حالات معلوم نہ ہونے سے دَورِ اسلام میں ان کی قدر و منزلت کیونکر کم ہو سکتی ہے؟ آخر ابوریّہ نے قرآن کی کس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جس شخص کی تاریخ قبل از اسلام معلوم نہ ہو اسے حقیر و ذلیل انسان تصور کرنا چاہیے؟ نیز یہ کہ اس کی روایت کردہ احادیث کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔
سُبۡحَانَكَ هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ۔

ہم ابوریّہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان ہزاروں صحابہ کی تاریخ بیان کریں جنہوں نے حجۃ الوداع کے موقع پر آپ کے ساتھ شرکت کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس میں ذرّہ برابر مبالغہ نہیں کہ ان میں بمشکل دس بیس صحابہ ایسے نکلیں گے جن کی تاریخ قبل از اسلام معلوم ہے۔ اور وہ بھی صرف اس قدر جو ایک یا دو سطروں میں لکھی جا سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا باقی تمام صحابہ ابوریّہ کے نزدیک ناقابلِ اعتماد اور بے وقعت ہو گئے؟ کیا یہی علمی تحقیق ہے جس کا ڈھنڈورہ ابوریّہ پیٹتے رہتے ہیں اور اس کو عدیم المثال قرار دیتے ہیں؟

ابو ہریرہ ناخواندہ تھے | ابوریّہ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۵۳ پر لکھتے ہیں:

"ابوہریرہ ناخواندہ شخص تھے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے"

اسلامی عصر و عہد میں یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ صرف ناخواندہ ہونے کی وجہ سے کسی صحابی کی صداقت و عدالت کو مشکوک قرار دیا گیا ہو۔ یہ صرف ابوریّہ کے دماغ کی اپج ہے کہ ان پڑھ ہونے کی بنا پر بھی ایک صحابی قابل اعتماد نہیں رہتا۔

حالاں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جن عربوں میں مبعوث کیا گیا تھا وہ عام طور سے ناخواندہ تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضورؐ کی بعثت کے وقت مکہ میں صرف چند لکھے پڑھے آدمی موجود تھے اس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ جن ایک لاکھ چودہ ہزار صحابہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ کے ساتھ حجۃ الوداع میں شرکت کی تھی وہ سب ناخواندہ تھے۔ پھر خصوصی طور سے ابوہریرہ کو ان پڑھ قرار دینے کا کیا مطلب؟ آخر اس کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے۔ کہ ان کی مرویات کو صرف اس لیے مشکوک قرار دیا جائے کہ وہ حافظہ کی مدد سے حدیثیں روایت کرتے تھے اور لکھتے نہ تھے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص کو چھوڑ کر عام صحابہ حدیثیں لکھا نہیں کرتے تھے۔ تو کیا ابوریّہ جمیع صحابہ کی مرویات کو اس اساس پر مطعون و مشکوک بنا دینا چاہتے ہیں کہ وہ اُمّی تھے۔ اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ کیا یہی ہے ابوریّہ کی علمی تحقیق جس کو وہ عدیم النظیر قرار دیتے ہیں؟

ابوہُریرہ کی تنگدستی :-

ابوریّہ اپنی کتاب کے اکثر و بیشتر مقامات پر اس بات کے بڑے حریص نظر آتے ہیں کہ ابوہریرہؓ کو صرف اس لیے نفرت و حقارت کے مستحق ٹھہرائیں کہ وہ تنگ دست اور فقیر بے نوا تھے۔ وہ سایہ کی طرح سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے تھے کہ آپ کی کوئی حدیث ان سے رہ نہ جائے شکم سیری کے سوا انہیں کسی بات کی فکر دامن گیر نہ تھی۔ ابوریّہ نے یہ بات بار بار دہرائی ہے کہ ابوہُریرہ اپنے قبیلہ میں باعزت نہ تھے اور ان کا شمار عرب کے اشراف و رؤسا میں نہیں ہوتا تھا۔ یہ ہیں وہ وجوہ و اسباب جن کی بناء پر ابوہریرہ ابوریّہ کے نزدیک ذلّت و احتقار کے مستحق تھے۔

ابھی تک ہم یہی جانتے تھے کہ اصحابِ ثروت و جاہ فقراء و مساکین کو چشمِ حقارت سے دیکھا کرتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء کے دشمن اور ان کی دعوت کے مخالف قوم نوح کی طرح اسی طرح کہتے چلے آتے ہیں کہ :-

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ	صرف وہی لوگ آپ کی پیروی کرتے ہیں جو
هُمْ اَرَاذِلُنَا۔	ہم میں گھٹیا ہیں۔

(سورۂ ھود - ۲۷)

ہمارا یہ تصور رہا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے نزدیک دنیوی جاہ و ثروت ہی عظمت و فضیلت کا اصلی معیار و مدار ہے۔ ہمارا زاویۂ نگاہ یہی رہا ہے کہ دولت و ثروت کے پجاری اور سرمایہ دار فقراء و مساکین کی ہمیشہ تحقیر کرتے رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے مگر ابورّیہ جیسے شخص سے ہمیں اس بات کی توقع نہ تھی۔ آخر ابوریہ نے حضرت ابوہریرہؓ کے فقر و افلاس سے جو بحث کی ہے اس میں کس کا طرز و انداز اختیار کیا ہے؟ آیا یہ ان لوگوں کا طے کردہ معیار ہے جو رُسل و انبیاء کی تکذیب کرتے رہے ہیں؟ اگر ابوریہ اللہ تعالیٰ اس کے انبیاء اور اس کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں تو اس نے حضرت نوحؑ سے متعلق بیان کیا ہے کہ جو لوگ ان کے تنگدست اور با ایمان اتباع کو بچشم حقارت دیکھتے تھے آپ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:۔

وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اور میں ایمان داروں کو چھوڑنے والا نہیں
اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ	ہوں وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں مگر
قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ (سورۂ ھود - ۲۹)	میں تمہیں ایک جاہل قوم سمجھتا ہوں۔

مزید فرمایا:

وَلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ	اور جن لوگوں کو تم چشم حقارت سے دیکھتے
لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا۔ اَللّٰهُ	ہو میں انہیں یہ نہیں کہتا کہ اللہ انہیں بھلائی
اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ اِنِّيْٓ	نہیں دے گا ان کے جی میں جو کچھ ہے
اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔	خدا ہی اسے بہتر جانتا ہے میں اس وقت
	ظالموں میں سے ہوں گا۔

(سورۂ ھود - ۳۱)

اور اگر ابورّیہ مسلمانوں میں رہتے ہوئے سرمایہ داروں کی سی باتیں کرتا ہے تو اسے بخوبی معلوم ہونا چاہیئے کہ دین اسلام نے عزّ و وقار کے تمام مادّی سانچوں اور پیمانوں کو بے کار قرار دیا ہے۔

اسلام نے عظمت و فضیلت کا صرف ایک ہی معیار مقرر کیا ہے اور وہ تقویٰ ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ — تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ (الحجرات - ۱۳)

اور اگر ابوریہ سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کی طرز پر سوچتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری نوخیز جمہوریہ عربیہ میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ہم ایک ایسے عصر و عہد میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں کام کی ضرورت ہے بے کار نظریات کی نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ابوریہ نے جو رسوا کن نظریہ اختیار کیا اور ابوہریرہ کے فقر و فاقہ اور تنگدست ہونے کو جس طرح اچھالا ہے اس کے لیے مجھے کوئی وجہ جواز نظر نہیں آئی۔ فتح مکہ کے دن موذن رسول حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بیت اللہ کی چھت پر چڑھ کر رؤسائے قریش کے سامنے اعلاء کلمۃ اللہ کیا تھا۔ (حالانکہ آپ ایک حبشی غلام تھے۔) خلافت فاروقی کے زمانہ میں جب سرداران قریش بارگاہ خلافت میں حاضر ہونے کے لیے اذن طلب کرتے تو حضرت عمرؓ حضرت صہیبؓ اور بلالؓ کو پہلے طلب فرمایا کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ آغاز اسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ان میں سے اکثر مالی لحاظ سے پسماندہ اور غلام تھے چند سالوں تک یہی حالت رہی۔ یہ امر قابل غور ہے کہ کیا بارگاہ رسالت میں اس بناء پر ان کے مرتبہ و مقام میں کوئی کمی پیدا ہوئی؟ اور کیا اسلامی دعوت کی تاریخ میں ان کو مناسب مقام نہیں دیا گیا؟ کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ کفار قریش اور ابوریہ جیسے لوگوں کی نگاہ میں جو لوگ ذلیل و حقیر تھے۔ اسلامی تاریخ کے اوراق نے ان کو زندگی جاوید عطا کی۔ اور ان کے نام کو تابندگی و درخشندگی بخشی؟ پھر وہ لوگ ان کے مرتبہ کو کیوں کر پا سکتے ہیں جن کو کفار قریش اور ابوریہ کے ہمنوا اغنیاء شرفاء اور ارباب دولت و ثروت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مزید یہ کہ ابوہریرہ کو جانچنے پرکھنے کے لیے ابوریہ نے جو مقیاس و معیار مقرر کیا ہے دوسرے شخص کو حق حاصل ہے کہ اسی پیمانہ سے وہ خود ابوریہ کو جانچے پرکھے اور اس کو اس لیے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھے ———— کہ ہمارے علم کی حد تک ———— ابوریہ ایک مفلس آدمی ہے اور دولت مندوں میں شمار نہیں ہوتا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اسے اپنی قوم میں بھی کوئی نمایاں مرتبہ و

مقام حاصل نہیں۔

ابوہریرہ کا اسلام لانا اور آنحضورؐ کی صحبت و رفاقت:

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ ۷ھ میں جس سال خیبر فتح ہوا مشرف باسلام ہوئے۔ بخلاف ازیں اب ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ وہ اس سے بہت پہلے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ مگر ہجرتِ مدینہ کا شرف انہیں بتاخیر ۷ھ میں حاصل ہوا۔ اس کی دو دلیلیں ہیں:

پہلی دلیل:

حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں طُفیل بن عمرو دَوسی کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ ہجرت سے قبل اسلام لائے۔ پھر واپس آکر اپنی قوم کو دعوت اسلام دی۔ مگر ان کے والد اور ابوہریرہ کے سوا کسی اور نے اسے قبول نہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ابوہریرہ نے ۷ھ میں ہجرت کی تاہم وہ اس سے بہت پہلے اسلام لا چکے تھے۔

دوسری دلیل:

اس کی دوسری دلیل بخاری و مسلم کی وہ روایت ہے جس میں ابوہریرہ اور ابان بن سعید بن العاص کی باہمی تکرار کا ذکر ہے۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ خیبر کی فتح کے بعد ابان بن سعید نے آنحضورؐ سے مال غنیمت کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔ یہ سن کر ابوہریرہؓ نے کہا "حضور اسے حصہ نہ دیجئے کیونکہ اس نے نعمان بن مالک بن ثعلبہ کو قتل کیا تھا جو ابن قوقل کے نام سے معروف تھے"۔ ابن قوقل کے قتل کا واقعہ غزوہ اُحد میں پیش آیا تھا۔ جب کہ ابان بن سعید ہنوز کافر تھے اور اس نے ابن قوقل کو قتل کیا تھا۔

(فتح الباری، ج ۷۔ ص ۳۹۰)

یہ واقعہ اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ ابوہریرہؓ جب ۷ھ میں مدینہ وارد ہوئے۔ اس وقت جدید الاسلام نہ تھے۔ بلکہ وہ بہت سے غزوات و واقعات میں شرکت کر چکے تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ابان بن سعید نے غزوۂ اُحد میں ابن قوقل کو قتل کیا تھا۔ حافظ ابن حجر کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے

(فتح الباری، ج ۸۔ ص ۸۳)

مقام افسوس ہے کہ ابوریہ نے حسب عادت اس واقعہ کو غلط سمجھا اور بگاڑ کر پیش کیا ہے۔ اس کا یہ رویہ کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں ہے۔ بہر کیف اس میں شبہ نہیں کہ ابوہریرہ دیگر صحابہ کی طرح

پورے خلوص سے اسلام لائے تھے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اپنے قبیلہ کے طفیل بن عمرو سے اسلام کا نام سنا اور پھر اس کے بعد ان کے ذوق و شوق میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ غزوہ خیبر میں آنحضور ﷺ اور صحابہ کی صحبت و رفاقت سے مشرف ہوئے۔ اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوہریرہؓ خیبر پہنچے تو آنحضور ﷺ لڑائی سے فارغ ہو چکے تھے اور مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے۔ صحیح ترین اور قابل اعتماد روایت سے مستفاد ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ مال غنیمت میں سے ابوہریرہ کو بھی حصہ دیں۔

پھر اس کے بعد ابوہریرہؓ سرور کائنات ﷺ کے وابستۂ دامن ہو گئے۔ دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی بجز اس کے کہ آنحضور ﷺ کی حدیثیں سنیں اور آپ کے بعد ان کو مسلمانوں تک پہنچائیں۔ آپ کا صفہ نشین ہونا ایک فطری بات تھی۔ صُفہ مسجد نبوی میں ایک جگہ تھی اس میں وہی لوگ بود و باش رکھتے تھے جو فقیر بے نوا تھے اور علمی خدمت اور جہاد کے سوا کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ صفہ میں جلیل القدر صحابہ کی ایک جماعت سکونت گزین تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بہت احترام کرتے تھے اور لوگوں کو ان کے اکرام و احترام کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔

جب تک سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بقید حیات رہے۔ ابوہریرہ آپ کے وابستۂ فتراک رہے اور ۷ھ سے تا ۱۱ھ سفر و حضر میں کبھی آپ سے الگ نہ ہوئے۔ قلب و ذہن پر یہ دُھن ہر وقت سوار رہتی تھی کہ سابق الاسلام صحابہ اور امہات المومنین سے حدیثیں سُنیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوہریرہ کے پاس احادیث نبویہ کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو گیا جو دیگر صحابہ کے پاس نہ تھا۔ اس لیے کہ وہ ابوہریرہ کی طرح اپنا پورا وقت حدیثیں سننے اور آنحضور ﷺ کی صحبت و رفاقت میں رہنے کے لیے صرف نہ کر سکتے تھے۔

یہ ہے ابوہریرہؓ کے مشرف باسلام ہونے کا واقعہ! اسی طرح امام بخاری اور محدث الدولابی متوفی ۳۱۰ھ نے ابوہریرہ کے اپنے قبیلہ دوس سے پہلے مدینہ اور پھر خیبر ہجرت کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ سفر ہجرت کے دوران مندرجہ ذیل شعر ورد زبان تھا۔ ؎

یَا لَیْلَةً مِنْ طُوْلِهَا وَعَنَائِهَا
عَلٰی اَنَّهَا مِنْ دَارَةِ الْكُفْرِ نَجَّتِ

(ہائے یہ رات کتنی طویل اور تکلیف دہ ہے مگر اس نے مجھے کفر گڑھ سے نجات دلادی ہے)۔

راستہ میں ابوہریرہ کا غلام بھاگ گیا۔ جب ابوہریرہ نے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر آپ کی بیعت کی تو غلام سامنے آیا۔ رسول کریمؐ نے فرمایا "ابوہریرہ! یہ آپ کا غلام ہے" ابوہریرہ نے کہا "یہ خدا کے لیے آزاد ہے" ابوہریرہ آنحضورؐ کی بیعت کر کے اور آپ سے مل کر اس قدر خوش ہوئے کہ غلام کو آزاد کر دیا۔

(فتح الباری، ج ۸۔ ص ۸۳ نیز کتاب الکنیٰ والاسماء، ج ۱۔ ص ۶۱)

حضرت ابوہریرہؓ کے اسلام لانے کا واقعہ اس امر کی منہ بولتی تصویر ہے کہ ابوہریرہ سچے عاشق رسول اور پیکر صدق و اخلاص تھے۔ رسول کریمؐ سے مل کر احسانات خداوندی کا شکر ادا کیا جب آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے تو بارگاہِ ایزدی میں غلام کو آزاد کر کے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ حالانکہ خدمت کے لیے اور غلام موجود نہ تھا۔ نجدایہ ابوہریرہ کے صدق و اخلاص کی وہ سچی تصویر ہے جس سے ایک مومن صادق کا دل یقین و اطمینان سے بھر جاتا ہے۔

مگر اس کا کیا علاج کہ ابوریہ اس شعر کا مصداق بنا ہوا ہے ؎

آنکھ والا تیری قدرت کا تماشا دیکھے
چشم کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے!

ابوریہ کے قلب و ذہن پر ابوہریرہ کا بغض و عناد سوار ہے۔ اس لیے ابوہریرہ کے اسلام لانے کے واقعہ میں بھی اس کو یہ تصویر نظر آتی ہے کہ ایک بھوکا شخص شکم سیری کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر کو نقل مکانی کر رہا ہے۔ رسول کریم کی صحبت و رفاقت کی حالت میں ابوہریرہ کو وہ یوں دیکھتا ہے کہ ایک لالچی آدمی ہے جس کو شکم سیری کے سوا کوئی کام نہیں کیا ابوریہ اپنے لیے اس تصویر کو پسند کرتا ہے؟ کیا ابوریہ کے بچے یا کسی دوست کی سیرت و کردار کی تصویر اگر اس انداز میں کھینچی جائے تو وہ اسے پسند کرے گا؟ مقام حیرت ہے کہ پھر آنحضور کے صحابہ میں سے کسی صحابی کی یہ تصویر ابوریہ کو کس لیے پسند ہے؟ خصوصاً جب کہ جمہور علماء عصر تابعین سے لے کر تا امروز ابوہریرہ کو رسول کریم کی علمی امانت و دیانت کا زندہ مجسمہ مانتے چلے آئے ہیں۔

قصہ ابوہریرہؓ کی بھوک اور رفاقتِ نبوی کا:

ابوریہ حضرت ابوہریرہ کے فقر و فاقہ کی داستان مزے لے لے کر بیان کرتا اور کہتا ہے کہ:
ابوہریرہ نے اسی لیے صُفّہ کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ سُکّانِ صُفّہ میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی اور بعد میں آپ ان کے نگران مقرر کیے گئے تھے۔ (ابوریہ کی کتاب، ص ۱۵۴)

اس ضمن میں چند گزارشات پیشِ خدمت ہیں:

(۱)۔ حیرت ہے کہ یہ بات کہتے ہوئے ابوریہ نہ خدا سے شرماتا ہے اور نہ لوگوں سے۔ اس لیے کہ نہ فقر و افلاس کسی شخص کے عیوب و نقائص میں شمار ہوتا ہے اور نہ صفہ کی سکونت و بود و باش جن لوگوں نے اعمالِ صالحہ اور صفاتِ حسنہ کے زیرِ سایہ تربیت پائی ہے وہ غریب آدمی کو ہرگز ذلیل و حقیر تصور نہیں کرتے۔ البتہ ذلیل طبع کمینے لوگ جن کے نزدیک صرف مال و جاہ ہی عزت و عظمت کا واحد معیار ہے۔ ایسے لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ قرآن کریم نے اصحابِ دولت و ثروت کے فسق و فجور اور انبیاء و علماء و داعیانِ حق کی مخاصمت و منازعت پر جو تنقید کی ہے وہ ابوریہ کی تردید کے لیے کافی ہے۔ اس لیے اس ضمن میں ہم مزید کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

(۲)۔ ابوریہ لکھتا ہے:

> "ابوہریرہ نے بذاتِ خود اس راز سے پردہ اُٹھا دیا ہے کہ اس نے آنحضورؐ کی صحبت و رفاقت کس لیے اختیار کی۔ اسی طرح ابوہریرہ نے یہ بھی بتایا کہ ان کی ابتدائی نشو و نما کن حالات میں ہوئی تھی۔"

اس سے ابوریہ نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ ابوہریرہ نے یتیمی کی حالت میں تربیت پائی تھی۔ گویا یتیم ہونا ابوریہ کے نزدیک ایک عیب شمار ہوتا ہے۔ یہ کس قدر شرمناک بات ہے کہ یتیمی کو معائب میں شمار کیا جائے۔ ابوریہ نے یہ نہیں کہا کہ ابوہریرہ نے آنحضورؐ کی الفت و محبت اور طلبِ ہدایت کے لیے آپ کی صحبت اختیار کی تھی۔ جس طرح دیگر اہل اسلام کرتے تھے۔ بخلاف ازیں ابوریہ کا کہنا یہ ہے کہ ابوہریرہ نے آپ کی رفاقت صرف شکم سیری کے لیے اختیار کی تھی۔
ظاہر ہے کہ ایک سینہ پُر از کینہ ہی سے ایسی بات صادر ہو سکتی ہے۔ مزید یہ کہ ابوھریرہؓ

کے الفاظ سے یہ مطلب وہی شخص اخذ کرسکتا ہے جس کی عقل میں خلل یا سینہ میں دجل و دغل (حسد و بغض) ہو۔ ورنہ ایک دانش مند آدمی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ جن بلاد و دیار میں ابوہریرہ نے پرورش پائی تھی اور جس کنبہ و قبیلہ میں آپ پروان چڑھے تھے۔ یہ سب کچھ انہوں نے اس لیے تج دیا کہ رسول کریم کی خدمت میں حاضر ہو کر خوب کھائیں پئیں گے۔

کیا اپنے قبیلہ میں رہ کر ابوہریرہ کھا پی نہ سکتے تھے؟ کیا دوس جیسے معزز قبیلہ کی سرزمین بنجر اور ویران تھی کہ وہ ابوہریرہ سے تنگ آ گئی اور ان کے لیے سامان خورد و نوش مہیا نہ کر سکی؟ پھر ابوہریرہ مدینہ کیوں آئے؟ کیا وہ تجارت پیشہ حضرات اور کسانوں کی طرح تجارت و زراعت سے روزی نہیں کما سکتے تھے؟ اور کیا پیشہ ور گداگروں کے سوا کوئی اپنے وطن کو چھوڑ کر محض اس لیے دور دراز ممالک میں جاتا ہے کہ وہاں خوب کھائے پیے گا؟ بلکہ یہ لوگ تو صرف کھانے پینے کے لیے ہی نہیں جاتے، بلکہ مال بھی جمع کرتے ہیں۔ مگر ابوریّہ یہ نہیں کہتا کہ ابوہریرہؓ نے آنحضور کی صحبت مال جمع کرنے کے لیے اختیار کی تھی۔ تو کیا ابوہریرہؓ ابوریّہ کی نگاہ میں ان پیشہ ور گداگروں سے کم درجہ نہیں ہے؟ سچ ہے کور نگاہی اور کینہ پروری انسان کو اسی درجہ تک پہنچا کر چھوڑتی ہے جہاں ابوریّہ پہنچ چکا ہے۔

(۳)۔ مزید برآں آنحضورؐ کی صحبت و رفاقت اختیار کرنے کے سلسلہ میں ابوریّہ نے جو دوسری روایت پیش کی ہے وہ اس طرح نہیں جیسے اس نے بیان کی ہے۔ بخلاف ازیں، صحیح بخاری کتاب البیوع کے الفاظ یہ ہیں:

وَكُنْتُ أَلْزَمُ رَسُولَ اللّٰهِ عَلٰى مِلْءِ بَطْنِي۔	میں پیٹ بھر کر آنحضور کی رفاقت میں رہا کرتا تھا۔

ابوھریرہ نے یہ الفاظ اپنی کثرتِ روایت کی وضاحت کرتے ہوئے کہے تھے۔

صحیح مسلم باب فضائل الصحابۃ میں حضرت ابوھریرہ کے الفاظ اس طرح نقل کیے گئے ہیں:

"میں ایک مسکین آدمی تھا اور صرف پیٹ بھر کر آنحضورؐ کی خدمت کرنے کے سوا مجھے کوئی کام نہ تھا۔"

ابوھریرہؓ نے ان الفاظ میں یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے آنحضورؐ کی صحبت کیوں اختیار کی جیسا کہ

ابوریہ کا خیال ہے ۔ بلکہ آپ کے ساتھ رہنے اور خدمت کرنے کا ذکر کیا ہے ۔ اور یہ بھی اس ضمن میں کہ وہ صحابہ کثیر الروایۃ کیونکر بن گئے ۔ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ مہاجرین بازار میں خرید و فروخت کیا کرتے تھے ۔ انصار مدینہ کھیتی باڑی میں لگے رہتے ۔ ادھر میری یہ حالت تھی کہ آنحضورؐ کے ساتھ ساتھ رہتا اور جہاں جاتے آپ کی خدمت کرتا ۔ پھر ابوریہ کا یہ دعویٰ کیوں کر درست ہے کہ ابوھریرہؓ نے آنحضورؐ کی صحبت میں رہنے کا راز خود بیان کر دیا تھا ۔

(۴) ۔ ابوریہ نے ان الفاظ میں صرف تحریف کا ارتکاب ہی نہیں کیا ۔ بلکہ یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ ابوھریرہ کے قول "عَلیٰ مَلَأِ بَطْنِیْ" میں لفظ "عَلیٰ" تعلیل یعنی بیان علت کے لیے ہے ۔ جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ "عَلیٰ" کلام عرب میں علت بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے ۔ مثلاً آیت کریمہ "عَلیٰ مَاهَدَاکُمْ" میں ہے ۔

(تصنیف ابی ریہ ۔ ص ۱۵۴ ۔ حاشیہ نمبر ۵)

ابوریہ کا یہ تازہ جھوٹ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ وہ حق معلوم کرنے کے درپے نہیں ، بلکہ اس کا واحد مقصد ابوھریرہ کی تحقیر و تذلیل ہے ۔ حالانکہ ابن ہشام نے صرف یہ بات کہی ہے کہ لفظ "علیٰ" عربی میں ۹ معانی کے لیے مستعمل ہے ان میں سے ایک معنی تعلیل بھی ہیں ۔ پھر اس سے یہ کیوں کر ثابت ہو گیا ہے کہ ابوھریرہ کے الفاظ میں یہ لفظ متعین طور پر صرف تعلیل کے لیے استعمال کیا گیا ہے ۔ باوجودیکہ ابوہریرہ کے الفاظ میں لفظ "علیٰ" سے متعدد معانی مراد لیے جا سکتے ہیں ۔ اور یہی معانی علماء نے ان کے قول سے سمجھے بھی ہیں ۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کا باطن اصحاب رسولؐ کے بغض و عناد سے پاک تھا ۔

امام نووی ابوہریرہ کے مذکورہ صدر الفاظ کی شرح و توضیح میں فرماتے ہیں :

"یعنی میں آپ کی صحبت میں رہتا اور صرف قوت لایموت پر قناعت کیا کرتا تھا ۔ میرا مقصد نہ مال جمع کرنا تھا اور نہ کچھ اور ۔ ابوہریرہ کا مقصد یہ تھا کہ میں صرف حلال ذرائع سے اپنی شکم سیری کا سامان کیا کرتا تھا ۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ کی خدمت کر کے معاوضہ وصول کرتا تھا" (شرح مسلم ۱۶ - ۵۳)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں :-

"یعنی قوت لایموت پر قانع رہنا اور آنحضور کی خدمت سے کبھی غیر حاضر نہ ہونا۔"

(فتح الباری، ج ۴-ص ۲۳۱)

علامہ عینی لکھتے ہیں:

"یعنی صرف قوت لایموت پر قناعت کیا کرتا تھا۔" (عمدۃ القاری، ج ۵-ص ۳۹۴)

خلاصہ یہ کہ ابوریّہ نے حضرت ابوھریرہؓ کے مشرف باسلام ہونے اور آنحضورؐ کی صحبت و رفاقت اختیار کرنے کے واقعہ کو توڑ مروڑ کر اس لیے پیش کیا ہے کہ آپ کی صداقت و اخلاص کو مشکوک ثابت کرے۔ مگر اس سے ابوہریرہ کا اخلاص تو کیا مشتبہ ہوتا البتہ ابوریہ کی اپنی حقیقت کھل کر ضرور سامنے آگئی ہے۔ اس لیے کہ ابوہریرہ کا یہی واقعہ ان کے عظیم مفاخر و مناقب میں شمار کیے جانے کے قابل ہے اور اس بات کی قوی دلیل ہے کہ ابوہریرہ میں اللہ و رسول کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور ان میں دنیوی مال و متاع کی محبت یا حرص منصب و جاہ کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ آپ نے دنیا کو تو اسی وقت پس پشت ڈال دیا تھا۔ جب یہ عزم باندھا کہ مدینہ میں نہ تجارت کریں گے نہ کھیتی باڑی بلکہ ان کے سامنے مقصدِ وحید یہ ہوگا کہ رسول کریم کے وابستۂ دامن رہیں ان سے حدیثیں سنیں اور پھر اس امانت کو آگے مسلمانوں تک پہنچائیں۔

مشہور مفسر و مورخ حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابوہریرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے اہل حق کے قلب و ذہن میں ان کا مرتبہ و مقام بہت بلند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مورخ موصوف نے اپنی سند کے ساتھ جو سعید بن ھند تک پہنچتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا "آپ کے اصحاب و رفقاء نے مجھ سے مال غنیمت میں سے حصہ طلب کیا ہے مگر آپ نے نہیں کیا" میں نے عرض کیا:

"میں آپ سے صرف یہ سوال کرتا ہوں کہ خدا نے جو علم آپ کو عطا کیا ہے وہ مجھے سکھلا دیں۔" (البدایہ والنہایہ، ج ۸-ص ۱۱۱)

اب بتائیے اخلاص اور حسن نیت کی مثال اس سے بہتر اور کیا ملے گی؟

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ایک روز ابوہریرہ کی بیٹی نے عرض کیا:

"ابا جان! لڑکیاں مجھے طعن دیتی ہیں کہ تمہارے والد تمہیں زیور کیوں نہیں پہناتے۔"

ابوہریرہ نے کہا:

"پیاری بیٹی! ان سے کہیں کہ میرے ابا ڈرتے ہیں کہ زیور کے عوض مجھے آتش جہنم میں نہ جانا پڑے۔" (حوالہ مذکور)

طلب جاہ و منصب کے سلسلہ میں صرف یہی بات کافی ہے کہ جو شخص اپنے وطن مالوف سے مدینہ کی جانب ہجرت کرتے ہوئے ایک مہاجر قافلے کی خدمت کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھتا ہو۔ اور صفہ میں ان بے خان ومان لوگوں کے پاس مقیم ہو جائے جن کا کوئی گھر بار نہیں ہوتا اور جو طلب علم کی خاطر بھوک پیاس تک گوارا کرتا ہو وہ جاہ منصب کا طالب نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابوھریرہ کی شان بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے آپ کو بحرین کا عامل مقرر کیا اور آپ وہاں سے کچھ مال لے کر بارگاہ خلافت میں حاضر ہوئے تو حضرت عمر نے ان کا محاسبہ کیا۔ حساب ٹھیک نکلا تاہم آپ نے بار دیگر یہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا:

"میں ڈرتا ہوں کہ بلا دلیل کوئی بات کہوں یا علم و حوصلہ کے بغیر کوئی فیصلہ صادر کروں۔"

(البدایہ والنہایہ، ج ۸ ۔ ص ۱۱۳)

یہ ہے ابوہریرہ کا اسلام و اخلاص اور رفاقت نبوی کی حقیقی تصویر! اب سوال یہ ہے کہ ابوریّہ کو حقائق کے تبدیل کرنے تاریخی واقعات کو مسخ کرنے اور ایک پاک دامن کو ملوث کرنے کی اجازت کس نے دی؟ حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق جھوٹوں پر خدا کی پھٹکار ہوتی ہے۔ خواہ وہ دروغ کا ارتکاب شعوری طور پر کریں یا غیر شعوری طور پر۔

(۵) ۔ ابوریّہ لکھتا ہے:

"ابوھریرہ بہت پیٹو اور بسیار خور شخص تھے۔ روزانہ آنحضورؐ یا کسی صحابی کے گھر میں کھانا کھانے جایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ صحابہ ان سے نفرت کرنے لگے۔"

یہ ایک اور تاریخی جھوٹ اور حق و صداقت کو بگاڑنے کی زبردست مثال ہے۔

جہاں تک ابوہریرہ کی بسیار خوری کا تعلق ہے یہ کسی قابل اعتماد روایت سے ثابت نہیں۔ بالفرض و المحال کسی روایت سے ثابت ہو بھی تو اس سے ابوہریرہ کی عدالت و ثقاہت اور مقام و مرتبہ میں کچھ فرق

نہیں آتا۔ دنیا کا کوئی مذہب یہ بات نہیں کہتا کہ زیادہ کھانے سے آدمی ساقط العدالت ہو جاتا ہے اور اس پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ ابوریّہ نے یہ بہتان صرف اپنے جذبۂ بغض و عناد کی تسکین کے لیے باندھا ہے ورنہ ایک صحابی کی شان میں گستاخی کرنے کا اور کوئی مقصد نہ تھا۔

باقی رہی یہ بات کہ ابوہُریرہ روزانہ آنحضور یا کسی صحابی کے گھر میں کھانا کھایا کرتے تھے تو ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ ابوہریرہ کو اپنا پیٹ بھر کر آنحضور کی رفاقت میں رہنے اور ان سے حدیثیں سننے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ سے جب کسی نے ابوہریرہؓ کی کثرتِ احادیث کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

> ”ہم اس میں ذرہ بھر شک نہیں رکھتے کہ ابوہُریرہ نے آپ سے وہ کچھ سُنا جو ہم نے نہیں سُنا۔ اور وہ کچھ سیکھا جو ہم نے نہیں سیکھا۔ ہم دولت مند لوگ تھے اور گھر بار رکھتے تھے۔ ہم صبح و شام آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور لوٹ جایا کرتے تھے۔ ابوہُریرہ ایک مسکین شخص تھا۔ نہ اس کا کنبہ تھا نہ قبیلہ۔ وہ آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دیے گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اس لیے اس نے آپ سے وہ کچھ سُنا اور سیکھا جو ہم لوگ نہ سیکھ سکے۔“

(البدایہ والنہایہ، ج ۸۔ ص ۱۰۹ نیز فتح الباری، ج ۷۔ ص ۶۱)

اس ضمن میں سچی بات تو یہ ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ابوریّہ کی نادر اور عدیم المثال علمی تحقیق اس بات کو ابوھریرہ کے لیے موجبِ تنقیص بنانے کے حق میں ہے۔ ابوریّہ نے ابوہُریرہ کی جو تصویر کھینچی ہے۔ وہ اس انداز کی ہے کہ وہ ایک پیشہ ور گداگر ہے جس کا کام ہر کس و ناکس کے دروازوں پر صدا دینا ہے۔ کوئی شخص اس کو کچھ دے دیتا ہے اور کوئی نہیں دیتا لعنۃ اللہ علی الکاذبین

بقولِ ابوریّہ رسول کریمؐ نے ابوہریرہ سے کہا تھا کہ ”ایک دن کا ناغہ کر کے میری ملاقات کے لیے آیا کرو اس سے محبت بڑھے گی“ ابوریّہ کی رائے میں آنحضور کا مطلب یہ تھا کہ ابوہُریرہ روزانہ لوگوں کے دروازہ پر نہ جایا کریں۔ یہ بدترین قسم کا جھوٹ ہے۔ ابوریّہ نے خود لکھا ہے کہ رسول کریمؐ نے ابوہُریرہ سے پوچھا ”کل تم کہاں تھے؟“ ابوہُریرہ نے عرض کیا ”میں اپنے گھر والوں کی ملاقات کے لیے گیا تھا۔“ اس کے جواب میں آنحضورؐ نے ارشاد فرمایا ”کہ ناغہ کر کے میری زیارت کیلئے

آیا کرو" دوسری جانب ابوریّہ یہ کہتا ہے کہ آپ نے ابوہریرہ کو یہ حکم اس لیے دیا تھا کہ روزانہ لوگوں کے گھروں پر نہ جایا کریں۔ اب بتائیے ابوریّہ کی کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط؟ مزید برآں "زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا" کے الفاظ کسی صحیح السند حدیث میں وارد ہوئے؟

حافظ سخاوی فرماتے ہیں :۔

"محدث عقیلی فرماتے ہیں یہ حدیث طلحہ سے منقول ہے۔ جن راویانِ حدیث نے اس کی تائید کی ہے وہ بھی طلحہ ہی کی طرح ضعیف ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ عبید بن عمیر کا قول ہے۔ محدث ابن حبان نے اپنی صحیح میں عطاء سے روایت کیا ہے کہ میں اور عُبَید بن عُمیر دونوں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے عُبَید کو مخاطب کر کے کہا "تمہاری ملاقات کے لیے مناسب وقت آگیا ہے" عُبَید نے کہا والدہ محترمہ! میں آپ کی خدمت میں وہی عرض کروں گا جو پہلے نے کہا کہ زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا فرمانے لگیں "اس جھوٹ سے ہمیں معاف رکھیے"۔"

سخاوی کہتے ہیں یہ حدیث حضرت انس و جابر و حبیب بن مسلمہ و ابن عباس و ابن عمر و علی و معاویہ بن حَیدہ و ابوالدّرداء و ابوذر و عائشہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ابن طاہر کا قول ہے کہ ابن عدی نے اپنی کتاب کامل کے چودہ[۱۴] مقامات پر یہ حدیث نقل کی ہے۔ مگر ان طُرق میں سے ایک بھی صحیح نہیں سب معلول ہیں۔ البتہ متعدد طُرق کے ملنے سے حدیث کو تقویت حاصل ہو جائے گی۔ بزار فرماتے ہیں کہ یہ حدیث کسی صحیح سند کے ساتھ مروی نہیں ہے۔ اس سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے کہ اگرچہ اس کے سب طرق ضعیف ہیں مگر ان سے بحیثیت مجموعی حدیث کو تقویت بہم پہنچ جاتی ہے۔" (المقاصد الحسنہ للسخاوی، ص ۲۳۲)

مذکورہ صدر تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حدیث محلِ نظر ہے۔ اور اگر اس کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ آپ نے خاص طور پر ابوہرُیرہ کو مخاطب کر کے کہے تھے۔ بخلاف ازیں اس حدیث کے راوی دس[۱۰] سے بھی زیادہ صحابہ ہیں۔ ابوریّہ یہ جسارت نہیں کر سکتا کہ وہ سب بھیک مانگنے لوگوں کے گھروں پر جایا کرتے تھے اور آپ نے ان کو اس حرکت سے باز رکھا تھا۔

باقی رہا ابوریّہ کا یہ دعویٰ کہ بعض صحابہ ابوہرُیرہ سے نفرت کرتے تھے تو یہ صریح جھوٹ ہے جو

اس نے دانستہ وضع کیا ہے۔ ہم ابوریہ کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کسی ایک ہی صحیح روایت سے اُس کو ثابت کرے۔ بخلاف ازیں ابوھُریرہ سب اہل اسلام کے محبوب تھے۔ خداوند کریم نے آپ کے بارے میں نبی کریم کی وہ دعا قبول فرمائی تھی جو صحیح بخاری اور دیگر کتب حدیث میں منقول ہے۔

(۶)۔ ابوریہ لکھتا ہے:۔

"ابوھُریرہ کو ایک قرآنی آیت یاد ہوتی اور وہ دانستہ کسی صحابی سے پوچھتے تاکہ وہ اُن کی جانب متوجہ ہو اور ان کو کھانا کھلا دے۔ جعفر بن ابی طالب کے ساتھ ابوہُریرہ یہی سلوک کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابوہُریرہ حضرت جعفر کو ابوبکر و عمر و عثمان و علی و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل قرار دیتے ہیں" (دیکھئے ابوریہ کی کتاب ص ۱۵۵)۔

ابوریہ نے مذکورہ صدر عبارت میں کئی طرح کے کذب و افترا اور تضلیل سے کام لیا ہے۔ ابوریہ کا یہ قول کہ "ابوہُریرہ کسی صحابی سے آیت دریافت کرتے حالانکہ وہ انہیں یاد ہوتی تھی"۔ اس ضمن میں صحیح بخاری میں ابوہُریرہ کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں:۔

إِنِّي لَأَسْتَقْرِئُ الرَّجُلَ۔ میں ایک شخص سے مہمانی طلب کرتا۔

ابوہُریرہ کا مقصد ان الفاظ سے یہی ہوتا تھا۔ مگر دوسرا شخص اس سے یہ مفہوم مراد لے سکتا ہے کہ "میں اس آدمی سے آیت کی قرأت دریافت کرتا" حالانکہ ابوہُریرہ یہ نہیں کہنا چاہتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے ابوہریرہ کے الفاظ کا یہی مطلب بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محدث ابونعیم نے اپنی کتاب الحلیہ میں ابوھُریرہ سے جو روایت نقل کی ہے۔ اس سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ واقعہ یوں ہُوا کہ ابوھُریرہ نے ایک مرتبہ حضرت عمر سے کہا "اِقْرِنِي" (مجھے مہمان ٹھہرائیے) حضرت عمر نے اس لفظ کو قرأت سے ماخوذ سمجھا اور ابوھُریرہ کو قرآن سنانا شروع کر دیا اور ان کو کھانا نہ کھلایا۔ ابوھُریرہ نے یہ سن کر کہا کہ "میرا مقصد تو کھانا طلب کرنا تھا" (فتح الباری، ج ۷، ص ۶۱)

جہاں تک ابوھُریرہ کے حضرت جعفر کی مدح و ستائش کرنے کا تعلق ہے ابوھُریرہ خود فرماتے ہیں کہ:۔

"جعفر ہمیں اپنے گھر لے جاتے اور ما حضر پیش کر دیا کرتے تھے یہاں تک کہ وہ گھی کا

برتن بھی پیش کر دیتے جو خالی ہوتا اور جو کچھ اس میں ہوتا ہم چاٹ لیتے۔" (صحیح بخاری)
اسی لیے ابوھُریرہ کہا کرتے تھے کہ جعفر مساکین کے حق میں سب سے بہتر ہیں۔ اور یہ بھی بات ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں۔ حضرت جعفر کا جود و سخا ایک مُسلّمہ حقیقت ہے جس سے رسول کریمؐ و صحابہ عام طور سے آگاہ و آشنا تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جعفر کو ابوالمساکین کی کنیت سے پکارا کرتے تھے۔

(فتح الباری، ج ۷۔ص ۶۲)

جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جعفرؓ کو ابوالمساکین کے نام سے یاد کرتے تھے تو ان کی مدح و توصیف پر ابوھُریرہ کو کس لیے ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے؟ حضرت ابوھُریرہ نے اسی بات کو ان الفاظ میں ادا کیا تھا کہ :-

"کسی شخص نے رسول کریمؐ کے بعد جوتا نہیں پہنا، نہ زمین کو روندا اور نہ سواری کی جو جعفر بن ابی طالب سے افضل ہو۔"

یہ حقیقت ہے کہ حضرت جعفر کا شمار ان لوگوں کے زُمرہ میں ہوتا تھا جو فقراء و مساکین پر جان چھڑکتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابوہُریرہ حضرت جعفر کو تمام صحابہ سے افضل تصوّر کرتے تھے اور اس طرح صحابہ کے مابین تفریق کا ارتکاب کرتے تھے تاکہ ابوریّہ کا یہ قول درست ہو کہ ابوھُریرہ حضرت جعفر کو خلفاء راشدین سے بھی افضل قرار دیتے تھے۔ مزید یہ کہ ابوریّہ صحابہ کے اس حد تک قدر دان کب سے بن گئے کہ اُن کو اس تفریق مدارج سے گھن آتی ہے۔ صحابہ کو جس قدر بُرا بھلا کہا جائے ان کو اسی قدر اس سے خوش ہونا چاہیئے۔ وہ تو خود کسی صحابی پر غفلت کا الزام عائد کرتے ہیں۔ کسی کو کذب و دروغ سے متہم کرتے ہیں اور کسی کو باطل پرست ٹھہراتے ہیں۔

ایک اور دلیل سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ابوہُریرہ حضرت جعفر کو جملہ صحابہ سے افضل نہیں سمجھتے تھے وہ دلیل یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے حضرت جعفر سے متعلق ابوھُریرہ کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

"حضرت جعفر مساکین و فقراء کا سب لوگوں سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ حضرت ابوھُریرہ نے علی الاطلاق جعفر کی جو فضیلت بیان کی ہے وہ بھی اسی (حبِ مساکین) دائرہ میں محدود ہے۔" (فتح الباری، ج ۷۔ص ۶۲)

(۷) ابوریّہ نے ثعالبی اور بدیع الزمان ہمدانی سے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ ایک خاص قسم کے کھانے کو بہت پسند کیا کرتے تھے جس کو "مضیرہ" کہتے تھے۔ ابوہریرہ اس ضمن میں اس قدر شہرت رکھتے تھے کہ ان کو "شیخ المضیرہ" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس کی دلیل میں انہوں نے عبدالحسین شرف الدین کے قول سے استشہاد کیا ہے کہ "حضرت علیؓ سب سے بڑے عالم تھے۔ حضرت معاویہؓ مرغن کھانوں کے دلدادہ تھے۔ اور امن وسکون کو پسند کرتے تھے۔" (ابوریہ، ص ۱۵۶-۱۵۷)

کتاب وسنت اور شرعی قواعد واحکام میں یہ بات کہیں مذکور نہیں کہ کسی خاص قسم کے کھانے کو پسند کرنا ممنوع ہے۔ بخلاف ازیں کتب حدیث میں مذکور ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کدو کو بہت پسند فرماتے تھے۔ اسی طرح آپ پنڈلی کا گوشت اور ثرید (شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹی) بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے۔ حالانکہ آپ سید الرسل سب سے بڑے زاہد اور عظیم ترین رہنما وپیشوا تھے۔ درحقیقت دین اسلام میں شکم اور شرمگاہ کی رہبانیت کا تصور ہی موجود نہیں۔ بنابریں اگر ابوہریرہ کسی خاص قسم کے کھانے کو پسند کرتے ہوں تو اس سے ان کی دین داری اور ثقاہت وعدالت میں کیا فرق پڑ جائے گا۔

باقی رہی یہ بات کہ ابوھریرہ حضرت معاویہ کے یہاں ایک خاص قسم کا لذیذ کھانا کھانے اور حضرت علی کی اقتداء میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ تو یہ ایک ایسی روایت ہے جو یا تو شیعہ کی کتب میں نقل کی گئی ہے اور یا ادب عربی کی ان کتب میں مرقوم ہے جن کے مصنفین اخبار و واقعات کی صحت یا عدم صحت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے مثلاً ثعالبی و بدیع الزمان ہمدانی نے اپنی تصانیف میں اس قسم کی روایات جمع کی ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ابوھریرہؓ نے حضرت علیؓ و معاویہؓ کے باہمی مجادلات میں حصہ نہیں لیا تھا۔ حضرت ابوھریرہ کی تلوار اور اُن کی تاریخ کے صفحات اس فتنہ کی آلودگی سے اسی طرح پاک ہیں جس طرح دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا دامن اس سے آلودہ نہیں ہوا۔ اس آلودگی کے ساتھ ابوہریرہ کو وہی لوگ ملوث کرتے ہیں۔ جن کے سینہ میں تعصب کی آگ بھڑک رہی ہو۔ جب ابوریّہ اپنے آپ کو شیعہ ظاہر نہیں کرتا تو پھر ابوھریرہ کو وہ کس لیے ہدفِ طعن بناتا ہے صرف شیعہ کا فرقہ حضرت ابوہریرہ کو مطعون کرتا ہے اور بس۔

بہرکیف ایک جلیل القدر صحابی کو ان قصّے کہانیوں کی اساس پر جرح و نقد کی آماجگاہ بنانا جو کتب ادب میں تمسخر و مذاق کے لیے نقل کی گئی ہیں اہل علم و انصاف کا شیوہ نہیں ہے۔ البتہ اس بات کا امکان ہے کہ یہ ابوریّہ کی نادر علمی تحقیق کا نمونہ ہو جو اپنے باب میں عدیم المثال ہے اور جس کی نظیر اس کائنات پر موجود ہی نہیں۔

(۸) ۔ ابوریّہ نے محدث ابونُعیم کی کتاب الحلیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ بیت اللہ کا طواف کرتے وقت کہا کرتے تھے:

"میرے پیٹ کو خدا غارت کرے میں جب اسے سیر کرتا ہوں تو مجھے تنگ کرتا ہے اور اگر بھوکا رکھتا ہوں تو مجھے گالیاں دیتا ہے یا کمزور کر دیتا ہے۔" (ابوریّہ، ص ۱۵۱)

اس میں شبہ نہیں کہ ابونُعیم بہت بڑے حافظ حدیث ہیں۔ مگر انھوں نے اپنی کتاب حلیۃ الاولیاء میں روایاتِ صحیحہ کا التزام نہیں کیا۔ علماء نے اس میں ذکر کردہ بکثرت احادیث کو موضوع و ضعیف ٹھہرایا ہے۔ ابوھُریرہ کا مذکورہ صدر قول بھی انہی ضعیف روایات میں شامل ہے۔ اس قول کا راوی فَرقَد سَبخی ضعیف ہے اور اس نے ابوہُریرہ کا زمانہ نہیں پایا۔

اگر ابوہُریرہ کے سابق الذکر قول کو صحیح قرار دیا جائے تو بھی اس میں کوئی قابل اعتراض بات موجود نہیں۔ ابوہُریرہ نے جو بات کہی ہے وہ ہر شکم پر صادق آتی ہے۔ پیٹ کی یہ خاصیت ہے کہ جب بھرا ہُوا ہو تو انسان کبر و غرور کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اگر خالی ہو تو آدمی کمزوری محسوس کرتا ہے۔ کیا ابوریّہ کے شکم پر یہ بات صادق نہیں آتی؟ کیا ابوریّہ اس زعم باطل کا شکار ہے کہ اس کا پیٹ بھوک اور سیری دونوں حالتوں میں صابر و شاکر اور پُراز اطمینان و سکون رہتا ہے۔

(۹) ۔ ابوریّہ نے کتاب الحلیہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ابوہُریرہ سفر میں تھے۔ ان کے رفقاء نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا اور کھانے کے لیے دسترخوان بچھایا۔ ابوھُریرہ کو بلایا وہ نماز پڑھ رہے تھے نماز سے فارغ ہو کر کہا کہ میں روزہ سے ہوں۔ جب کھانا کھا کر فارغ ہوئے تو ابوھُریرہ بھی آگئے اور کھانا کھانے لگے۔ لوگوں نے قاصد کو گھُور گھُور کر دیکھنا شروع کیا۔ اس نے پوچھا آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ بخدا ابوہُریرہ نے مجھے کہا تھا کہ میں روزہ سے ہُوں۔ ابوہُریرہ کہنے لگے یہ سچ کہتا ہے۔ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا آپ فرماتے تھے کہ ماہ رمضان کے روزے اور اس کے ساتھ ساتھ

ہر ماہ میں تین دن کے روزے ہمیشہ روزے رکھنے کے برابر ہیں۔ میں نے اس ماہ کے آغاز میں تین دن کے روزے رکھ لیے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سہولت کے پیشِ نظر میں روزہ سے نہیں۔ البتہ اجر و ثواب کے اعتبار سے روزہ دار ہوں۔

(ابوریہ بحوالہ البدایہ والنہایہ، ج ۸ - ص ۱۱۲)

ابوریہ نے حضرت ابوہریرہ کے نقائص و عیوب کی طلب و تلاش کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس کی حد یہ ہے کہ اُس نے ابوہریرہ کے مزاح و ظرافت کو بھی ان کے عیوب میں شمار کیا ہے۔ مذکورہ صدر واقعہ سے واضح ہوتا ہے کہ ابوہریرہ ایک زندہ دل اور خوش طبع انسان تھے اور اسی چیز نے ان کو لوگوں میں مقبول و محبوب بنا دیا تھا۔

اب غور کیجئے مذکورہ صدر واقعہ سے ابوہریرہ کی عدالت و ثقاہت کیسے مجروح ہو گئی؟ آخر اس واقعہ میں ابوہریرہ سے کون سا گناہ صادر ہوا جس کی پاداش میں ابوریہ ان کو تنقید شدید کا نشانہ بنا رہا ہے؟ غالباً اندریں واقعہ ابوہریرہ سے زیادہ سے زیادہ جو جرم سرزد ہوا وہ یہ ہے کہ وہ شیریں کلام اور خوش مزاج تھے جب کہ ابوریہ کو ان کی یہ خوش مزاجی پسند نہیں۔ سچ ہے ؎

وَلِلنَّاسِ فِيمَا يَعْشِقُونَ مَذَاهِبُ

امام احمد بن حنبل نے مسند میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو بھی اس قسم کا واقعہ پیش آیا تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ ابوریہ کو کہیں اس واقعہ کا پتہ نہ چل جائے اور وہ ابوہریرہ کی طرح جناب ابوذر غفاری پر گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دے۔

(۱۰) - ابوریہ نے علامہ ثعالبی کی تصنیف "خاص الخاص" کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہؓ نے کہا:

"میں نے روٹی کی خوشبو سے بہتر کبھی کوئی خوشبو نہیں سونگھی اور کھجوروں پر لگائے گئے مکھن سے بہتر کبھی کوئی سوار نہیں دیکھا۔" (ابوریہ ص ۱۵۸)

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ ثعالبی نے جو کچھ کہا ہے وہ قابلِ تسلیم ہے اور جس سند سے موصوف نے یہ واقعہ نقل کیا ہے وہ بھی صحیح ہے۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ اس سے ابوہریرہ پر کیا جرح وارد ہو سکتی ہے؟ نیز یہ کہ اس واقعہ سے اصحابِ دانش و بینش کے نزدیک ان کی عزت و عظمت میں کیا فرق

آسکتا ہے؟ یہ تو صرف اس خوش مزاجی اور ظرافت کا ایک نمونہ ہے جس کے ابوہریرہ خوگر تھے۔ بخدا میں تو کسی بڑے سے بڑے آدمی سے بھی ایسی بات سنوں گا تو اُسے خراج تحسین پیش کروں گا اور اُسے داد دیئے بغیر نہ رہوں گا۔ خداوند کریم نے اگر کسی انسان کو عقل و دانش خوش طبعی اور ظرافت کا تحفہ دے رکھا ہو تو اس سے ابوریّہ جیسا زود رنج اور چڑچڑا شخص چین بجبین کیوں ہونے لگے؟

(۱۱)۔ بعد ازاں ابوریّہ نے حدیث "زُرْ غِبًّا تَزْدَدْ حُبًّا" کے سلسلہ میں علامہ عسجدی کے ریمارکس حضرت ابوہریرہ کے بارے میں نقل کیے ہیں۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ عسجدی کون ہوتا ہے کہ اس کے قول کی اساس پر ابوہریرہ پر حجت قائم کی جائے اور ان کے خلاف عسجدی کی شہادت مسموع ہو۔

حضرت ابوہریرہ کی ظرافت و مزاح:

ابوریّہ نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ باجماع مورخین ابوہریرہ تمسخر و مذاق کے عادی اور ایک یاوہ گو شخص تھے۔ وہ کثیر الکلام تھے اور معیار سے گری ہوئی گفتگو کیا کرتے تھے۔

جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ ابوہریرہ کی بیہودہ گوئی پر علماء کا اجماع منعقد ہو چکا ہے تو یہ ایک ایسا سفید جھوٹ ہے جو اللہ تعالیٰ ابوہریرہ تاریخ اسلام اور مورخین کے خلاف گھڑا گیا ہے کسی شخص نے آج تک ابوہریرہ کو بیہودہ گو قرار نہیں دیا۔ ہم ابوریّہ کو چیلنج کرتے ہیں کہ اس کے اثبات میں وہ ایک صحیح روایت بھی پیش نہیں کر سکتا۔

باقی رہا ابوریّہ کا یہ دعویٰ کہ حضرت عائشہ نے ابوہریرہ کو یاوہ گو کہا تھا تو ہم احمد امین کے تذکرہ میں اس پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضرت عائشہ نے ابوہریرہؓ کی تردید کے سلسلہ میں سرے سے کچھ کہا ہی نہیں۔ چہ جائیکہ حضرت عائشہ انہیں یاوہ گو کہہ کر پکاریں بخلاف ازیں حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب و تلامذہ میں سے قیس اشجعی نے ابوہریرہ پر بلاشبہ تنقید کی تھی مگر انہیں بیہودہ گو نہیں کہا تھا۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ حضرت عائشہ نے ابوہریرہ کی شان میں یہ الفاظ کہے تھے ——— حالانکہ ہم ابوریّہ کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ یہ بات ثابت نہیں کر سکتا ——— تو حضرت عائشہ اس ضمن میں صرف ایک شاہد ہیں ان کے ساتھ دوسرا کوئی گواہ شامل نہیں۔ پھر ابوریّہ کا یہ دعویٰ کیوں کر درست ہے کہ مورخین ابوہریرہ کی بیہودہ گوئی کے بارے میں یک زبان ہیں۔ کیا حضرت عائشہ کی

حیثیت ایک مورخ کی ہے؟ اور کیا تنہا ان کی ذات میں سب مورخین جمع ہو گئے ہیں؟ اس ضمن میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ "لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ"۔

ہم ابوریہ کو ہمیشہ چیلنج کرتے رہیں گے کہ وہ کسی ایک صحابی یا تابعی یا کسی ثقہ مورخ کا نام بتائے جس نے ابوہریرہ کو بیہودہ گو کہا ہو۔ اور اگر وہ ایسا کرنے سے قاصر ہے تو اس کے دروغ گو ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

جہاں تک ابوہریرہ کی ظرافت و مزاح کا تعلق ہے تو وہ ایک ایسی بات ہے جس میں وہ مشہور تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تحفہ بھی خدا کا عطا کردہ ہے اور یہی چیز ابوہریرہ کے مقبول عام ہونے کا باعث تھی۔ ظاہر ہے کہ ظرافت و مزاح کو دین اسلام میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ اگر خوش مزاقی اور زندہ دلی اسلام میں ممنوع ہوتی تو زود رنجی، چڑچڑے پن اور درشتی طبع کو اسلام کی نگاہ میں پسندیدہ ہونا چاہیے تھا۔ (حالانکہ ایسا نہیں ہے) قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ	اگر آپ درشت طبع اور سنگ دل ہوتے
لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۔	تو لوگ آپ سے بدک جاتے۔

(آل عمران - ۱۵۹)

شرفاء کے نزدیک کبھی بھی مزاح و ظرافت کو عیب شمار نہیں کیا گیا۔ رسول کریمؐ صحابہ سے مذاق کیا کرتے تھے۔ صحابہ آپس میں ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے۔ بعض صحابہ شرعی حدود کے اندر رہ کر دوسروں کے ساتھ خوش طبعی کیا کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک ابوہریرہ بھی تھے۔ جن دنوں ابوہریرہ مروان کی نیابت میں مدینہ کے امیر مقرر ہوئے وہ گدھے پر سوار ہوتے اور لوگوں سے کہتے جاتے تھے "امیر کے لیے راستہ چھوڑ دو" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوہریرہ بے حد شیریں کلام اور خوش مذاق واقع ہوئے تھے۔ گاہے لکڑیوں کا گٹھا اُٹھائے بازار میں داخل ہوتے اور کہتے "امیر کے لیے راستہ خالی کر دو"، غور کیجئے ان کے اس عجز و انکسار میں کس قدر عظمت پائی جاتی ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ عقل کے اندھے حاسدوں کو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

جب کھانے کے لیے مدعو کیا جاتا تو کہتے میں روزہ سے ہوں۔ جب لوگ کھانا شروع کرتے تو ابوہریرہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے اور کہتے کہ میں اجر و ثواب کے لحاظ سے روزہ دار ہوں

مگر خدا نے جو سہولت دے رکھی ہے اس کے پیش نظر یہ روزہ نہیں ہے۔ یہ کتنا اچھا مذاق ہے؟
اور ابوہریرہ کس قدر شیریں کلام اور زندہ دل واقع ہوئے تھے! ابوہریرہ بعض دفعہ کسی کو رات کے کھانے پر بلاتے اور اس سے کہتے "ہڈی امیر کے لیے چھوڑ دو" مہمان سمجھتا کہ ابوہریرہ گوشت کا سالن پیش کریں گے۔ مگر اس کی توقعات کے عین برخلاف وہ شوربے میں روٹی بھگو کر پیش کرتے اور اس میں زیتون کا تیل ڈال دیتے۔

ایک نوجوان ابوہریرہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا آج صبح میں روزہ سے تھا میں اپنے والد کے یہاں گیا تو اس نے روٹی اور گوشت پیش کیا جو میں نے بھول کر کھا لیا۔ ابوہریرہ نے کہا تجھے خدا نے کھلایا۔ اس لیے کوئی حرج نہیں۔ نوجوان نے کہا پھر میں کسی عزیز کے یہاں گیا تو اس نے دودھ پیش کیا جو بھول کر میں نے پی لیا۔ ابوہریرہ نے کہا "کچھ حرج نہیں" نوجوان بولا "پھر اس کے بعد میں سو گیا جب بیدار ہوا تو بھول کر پانی پی لیا اور بیوی سے مجامعت کا بھی مرتکب ہوا"۔ ابوہریرہ نے کہا "میرے بھتیجے معاف رکھیے آپ روزہ کے عادی نہیں ہیں"!

اب بتائیے مذکورہ صدر مزاح و ظرافت میں دوسرے کی تذلیل کا کون سا عنصر شامل ہے؟ البتہ کوئی چڑچڑا اور سنگدل آدمی ایسا سمجھتا ہو تو الگ بات ہے۔

یہ ہے ابوہریرہ کی ظرافتِ طبع جس پر بقول ابوریہ مورخین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ مگر ابوریہ نے ایک بات میں سب مورخین کی مخالفت کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جہاں مورخین نے ابوہریرہ کی زندہ دلی اور خوش مزاجی پر اجماع قائم کیا ہے۔ وہاں بقول ابن کثیر وہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ ابوہریرہ صادق القول زبردست حافظ حدیث نہایت دین دار اور عابد و زاہد انسان تھے (البدایہ والنہایہ، ج ۸۔ ص ۱۱۰)

اب سوال یہ ہے کہ ابوریہ نے اس ضمن میں مورخین کے اجماع کو کیوں نظر انداز کر دیا؟ کیا وہ اس آیت کا مصداق بننا چاہتا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ	اور جو ہدایت کے واضح ہونے کے بعد رسول کی
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ	مخالفت کرے اور اہل ایمان کو چھوڑ کر دوسرں
غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ	کے راستہ پہ چلے تو جدھر کو وہ مڑتا ہے ہم
مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ	اسی طرف موڑ دیتے ہیں اور ہم اسے جہنم میں

وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۔ داخل کریں گے اور وہ بہت بُری لوٹنے کی جگہ ہے۔

امام بخاری نے اپنی کتاب "الادب المفرد" میں بکر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ باہم مذاق ...... کرتے اور ایک دوسرے کی طرف تربوز پھینکا کرتے تھے۔ اگر ابوھریرہ اس امر کے مرتکب ہو گئے تو ابوریہ اس سے کیوں بگڑنے لگے؟ اسی طرح امام بخاری نے اپنی مذکورہ صدر کتاب میں عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام اپنی مجالس میں شعر پڑھا کرتے اور دَورِ جاہلیت کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۸ - ص ۱۴۶)

امام بخاری نے الادب المفرد میں عبدالرحمٰن بن زیاد سے روایت کیا ہے۔ میرے والد نے بتایا کہ حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں ہم نے ایک بحری جنگ میں شرکت کی۔ ہماری سواری حضرت ابوایوب انصاری کی سواری کے پاس سے گزری۔ جب صبح کا کھانا لایا گیا تو ہم نے ابوایوب انصاری کو بلایا۔ وہ تشریف لائے اور کہا آپ نے مجھے کھانے کی دعوت دی میں روزہ سے تھا۔ تاہم میں نے حاضر ہونا ضروری خیال کیا۔ اس لیے کہ میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سُنی ہے۔ آپ نے فرمایا ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔ ان میں سے اگر ایک حق بھی ترک کر دیا تو ایک ضروری حق کے چھوڑنے کا مرتکب ہوا۔ وہ حقوق یہ ہیں کہ جب اُسے[۱] ملے تو سلام کہے۔ جب کھانے پر بلائے تو اس کی دعوت[۲] قبول کرے۔ جب[۳] چھینک کر الحمد للہ کہے تو اُس کا جواب دے۔ جب[۴] بیمار پڑے تو اُس کی بیمار پرسی کرے۔ جب[۵] فوت ہو تو اُس کے جنازہ میں شرکت کرے۔ جب[۶] مشورہ طلب کرے تو اُسے نیک مشورہ دے۔

ہمارے ساتھ ایک مسخرا آدمی بھی تھا اس نے کھانے میں شرکت کرنے والے ایک شخص سے کہا "جَزَاكَ اللهُ خَيْرًا"۔ وہ شخص سخت ناراض ہُوا۔ مذاق کرنے والے نے ابوایوب سے کہا اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ میں نے اُسے "جَزَاكَ اللهُ خَيْرًا" کہا تو اُس نے ناراض ہو کر مجھے گالیاں دینی شروع کیں۔ ابوایوب بولے ہم کہا کرتے تھے کہ جس کی اصلاح خیر سے نہ ہو اس کے حق میں شر مفید ثابت ہوتی ہے۔ آپ بھی یونہی کریں۔ چنانچہ اس شخص نے کہا: جَزَاكَ اللهُ شَرًّا وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا "تم مذاق سے باز نہیں آتے" اس شخص نے کہا خدا ابوایوب انصاری کو جزائے خیر دے۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۸ - ص ۲۲۷، ۲۲۸)

صحابہ اسی طرح ایک دوسرے سے مذاق کیا کرتے تھے۔ بنابریں جو شخص اس کی مذمت کرتا ہے وہ دین کے ایک مباح کام پر تنقید کا مرتکب ہوتا ہے اور ایک ایسے خلق کو ناپسند کرتا ہے جو شرع کی نگاہ میں ہمیشہ پسندیدہ رہا ہے۔

صحابہ ابوہریرہ کا مذاق اڑایا کرتے تھے:

ابوریہ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۶۱ پر لکھتا ہے کہ لوگ ابوہریرہ کی کثرتِ روایت اور ان کی مرویات کی گوناگونی کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چنانچہ ابورافع کا بیان ہے کہ قبیلہ قریش کا ایک آدمی ابوہریرہ کے یہاں آیا۔ اس نے ایک سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اور اس میں بڑے ناز و انداز کے ساتھ چل رہا تھا اُس نے ابوہریرہ کو مخاطب کر کے کہا آپ بہت حدیثیں روایت کرتے ہیں، کیا آپ نے میرے سوٹ کے بارے میں بھی کوئی حدیث سُنی ہے؟ ابوہریرہ نے کہا میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنا فرماتے تھے "پہلی اُمتوں میں ایک شخص تھا اس نے سوٹ پہنا ہوا تھا اور مٹک مٹک کر چل رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین میں گھسیڑ دیا اور وہ قیامت تک اسی طرح زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں وہ شخص کہیں تمہارے ہی قبیلہ کا نہ ہو۔ ابوریہ نے اس کو ابن کثیر کی طرف منسوب کیا ہے

ابوریہ کہتا ہے اس شخص کے سوال سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابوہریرہ سے پوچھ نہیں رہا تھا۔ بلکہ ان کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس لیے کہ اس نے ابوہریرہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ بہت سی احادیث کے حافظ ہیں۔ بخلاف ازیں اس نے یہ کہا تھا کہ آپ حدیثیں بہت روایت کرتے ہیں۔ سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد ابوہریرہ کا مذاق اڑانا تھا۔

یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

(۱) ۔ پہلی بات یہ ہے کہ سائل نہ تو صحابہ میں سے تھا اور نہ ان تابعین میں سے جنہوں نے صحابہ کرام سے شریعت کے احکام و آداب سیکھے تھے۔ بخلاف ازیں وہ ایک آوارہ مزاج قریشی نوجوان تھا۔ ایسے شخص سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ابوہریرہ جیسے جلیل القدر صحابی کے علم و فضل کا قدردان ہو سکے گا۔

(۲) ۔ وہ ایک عیش پسند اور لاپرواہ نوجوان تھا جو ایک قیمتی سوٹ زیب تن کیے ناز و انداز سے چل رہا تھا۔ اسی آوارگی کے عالم میں اس نے ابوہریرہ سے دریافت کیا کہ کیا اُس کے

سوٹ کے بارے میں ان کو کوئی حدیث یاد ہے؟ اس کے جواب میں ابوھریرہ نے وہ حدیث بیان کردی۔ سنن دارمی جلد ۱، ص ۱۱۶ پر مرقوم ہے کہ اس نوجوان نے ابوھریرہ سے کہا کہ کیا وہ نوجوان (جس کا واقعہ انہوں نے بیان کیا) اس طرح چلتا تھا۔ یہ کہہ کر اس نے ایک خاص انداز سے چل کر دکھایا۔ اسی دوران اسے ایسی ٹھوکر لگی کہ پاؤں ٹوٹنے لگا۔ ابوھریرہ نے کہا "اس طرح منہ اور نتھنوں کے بل گرد" پھر یہ آیت تلاوت فرمائی :

إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ — مذاق کرنے والوں سے ہم نے آپ کو بچایا

یہ حضرت ابوھریرہ کی کرامت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مذاق اڑانے والے آوارہ مزاج شخص کو اس طرح سزا دی۔

(۳) - اس میں شک نہیں کہ بدکار لوگ ہمیشہ سے علماء صلحاء انبیاء اور اصحاب علم و فضل کا مذاق اُڑاتے چلے آئے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کے بکثرت مقامات میں مذکور ہے۔ آج تک کسی شخص نے یہ نہیں کہا کہ کم عقل لوگوں کے اس فعل سے ان کی عزت و عظمت میں کچھ فرق آگیا تھا۔

(۴) یہ اپنی نوعیت کا صرف ایک ہی واقعہ ہے جو ابوھریرہ کو پیش آیا۔ اگر اس قسم کا کوئی اور واقعہ ابوریہ کو مل سکتا تو وہ اُسے ذکر کیے بغیر نہ چھوڑتا۔ پھر ابوریہ کا یہ قول کیوں کر درست ہے کہ "لوگ ابوھریرہ کا مذاق اُڑایا کرتے تھے" ابوریہ کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ایسے واقعات ابوھریرہ کو بڑی کثرت سے پیش آیا کرتے تھے۔ حالانکہ ایسا کوئی دوسرا حادثہ ابوھریرہ کو پیش ہی نہیں آیا۔ پھر اس ایک واقعہ سے یہ کیسے ثابت ہوگیا کہ ابوھریرہ کے عصر و عہد میں جو صحابہ و تابعین علم و فضل کے حامل تھے وہ ابوھریرہ کی مرویات کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔

ابوریہ کے بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ وہ ایک صاحب غرض شخص ہے جس کا واحد مقصد یہ ہے کہ ابوھریرہ میں کوئی عیب تلاش کرے اور اس سے اپنے باطل کو تقویت بہم پہنچائے۔ وہ ایک محقق نہیں جو حقیقت کی طلب و تلاش میں پورے اخلاص کے ساتھ مصروف سعی و جہد ہو۔ ہر شخص اپنی منزل کا تعین خود ہی کرتا ہے۔ ابوریہ کی تحقیقات نادرہ کا مقصد صرف ایک

ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ دروغ گو اور افتراء پردازوں کے زمرہ میں شامل ہو۔ جہاں تک حضرت ابوھُریرہ کا تعلق ہے ان کا دامن اس آلودگی سے پاک ہے اور خداوند کریم نے ان کو اس نام نہاد محقق کے الزامات و اتہامات سے بری الذمہ کر دیا ہے۔

ابوھُریرہ کی کثرت روایت:

ابوریّہ نے ابوھُریرہ کو کثرتِ روایت کی بناء پر مطعون کیا ہے۔ بقی بن مخلد کی مسند سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوھُریرہ سے ۵۳۷۴ احادیث روایت کی گئی ہیں۔ حالانکہ محدثین کے نزدیک ان سب احادیث کے طرق و اسانید محلِ نظر ہیں۔ ابوریّہ اس پر اظہارِ حیرت کرتا ہُوا کہتا ہے کہ ابوھُریرہ صرف تین سال آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مشرف رہے پھر اس قدر احادیث انہوں نے کیونکر آپ سے سن لیں؟

ہم قبل ازیں اس سوال کا جواب دے چکے ہیں کہ ابوھُریرہ نے اس قدر قلیل مدت میں اتنی زیادہ احادیث کیوں کر روایت کیں۔ مزید براں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ مفسر ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت حسن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب دفن کرنے کے سلسلہ میں مروان بن حکم اور ابوھُریرہ کے مابین اختلاف پیدا ہوا تو مروان نے ناراض ہو کر کہا "لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے رسول کریمؐ سے بہت حدیثیں روایت کیں۔ حالانکہ آنحضور کی وفات سے بہت تھوڑا عرصہ پہلے آپ مدینہ میں آئے تھے۔"

حضرت ابوھُریرہؓ نے فرمایا:

"یہ درست ہے کہ میں ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے موقع پر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہُوا تھا۔ اس وقت میری عمر تیس (۳۰) سال سے زیادہ تھی۔ بعد ازاں میں آپ کی وفات تک آپ سے وابستہ رہا۔ میں آپ کے ہمراہ ازواج مطہرات کے گھروں میں جا کر آپ کی خدمت بجالاتا رہا۔ میں ان دنوں تنگدست تھا۔ میں آپ کی اقتداء میں نماز پڑھتا آپ کے ہمراہ حج اور غزوات کے لیے جاتا۔ خدا جانتا ہے کہ میں حدیثوں کا سب سے بڑا عالم تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے مہاجرین و انصار ہجرت و صحبت میں مجھ پر فوقیت رکھتے تھے۔ وہ آنحضورؐ کے ساتھ میری وابستگی سے آگاہ و آشنا تھے

اس لیے وہ مجھ سے حدیثیں پوچھا کرتے تھے۔ حضرت عمر و عثمان و علی و طلحہ و زُبیر رضی اللہ عنھم کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ بخدا مدینہ میں آنحضور کی جو حدیث بھی تھی مجھ سے پوشیدہ نہ تھی۔ اسی طرح میں ان صحابہ سے بخوبی واقف تھا جن کو آنحضورؐ کے یہاں تقرب حاصل تھا۔ حضرت ابو بکرؓ آنحضورؐ کے غار کے ساتھی تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے نکال دیا تھا۔ (یہ مروان بن حکم کی جانب اشارہ تھا) مروان جو چاہے مجھ سے دریافت کرے وہ میرے پاس معلومات کا خاصا ذخیرہ پائے گا۔ ابو ھُریرہ کہتے ہیں اس کے بعد مروان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ مجھ سے ترساں و لرزاں رہا کرتا تھا۔"

ایک روایت میں یوں ہے کہ ابو ھُریرہ نے مروان کو مخاطب کر کے کہا :۔

"میں اپنی مرضی سے اسلام لایا اور ہجرت کی۔ مجھے آنحضورؐ کے ساتھ والہانہ محبت تھی۔ بخلاف ازیں تم گھر کے مالک تھے اور اس جگہ پیدا ہوئے تھے جہاں سے دعوت کا آغاز ہُوا۔ تم نے داعی (نبی کریمؐ) کو ان کے گھر بار سے نکال دیا۔ تم نے آنحضورؐ اور آپ کے رفقاء کو ستایا۔ تم ناپسندیدہ وقت میں میرے بعد اسلام لائے۔" مروان یہ سُن کر سخت نادم ہُوا کہ اس نے ابو ھُریرہ کے ساتھ یہ موضوع کیوں چھیڑا۔"

(البدایہ والنہایہ، ج ۸ - ص ۱۰۸)

یہ بات کسی شک و شبہ سے بالا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو کسی چیز کے لیے وقف کر دے اور اس کے حصُول کے لیے ہر ممکن جہد و سعی کرے وہ تھوڑی مدت میں اس چیز کا اتنا ذخیرہ جمع کر لیتا ہے جو دوسروں کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ بعض تلامذہ کا تعلق اپنے استاد کے ساتھ پیچھے استوار ہوتا ہے اور وہ بہت تھوڑی مدت اس کی صحبت میں گزارتے ہیں۔ مگر بایں ہمہ وہ اپنے استاد کے چھوٹے بڑے احوال و کوائف کے بارے میں ایک قابل اعتماد مصدر و مآخذ سمجھے جاتے ہیں۔ بخلاف ازیں بڑے اور قدیم تلامذہ ان کوائف سے نا آشنا ہوتے ہیں اور وہ پچھلے شاگرد کے بیان کردہ حقائق پر پوری طرح اعتماد کرتے ہیں۔

پھر ابو ھُریرہؓ کے قابل اعتماد ہونے کے بارے میں کیا شبہ باقی رہا؟ ضرورت صرف صداقت

بیانی کی تھی اور صحابہ کرام اور ان کے معاصر تابعین ان کو ہمیشہ صادق القول تصوّر کرتے آئے ہیں ۔ یہ ہے صحیح اور سچی تاریخ کا فیصلہ ابوھُریرہ کے بارے میں ! ابوریّہ نے اس ضمن میں جو کچھ ذکر کیا ہے کہ صحابہ ابوھُریرہ کو جھٹلاتے تھے یا ان کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کرتے تھے سفید جھوٹ ہے جو ایسے مصادر و مآخذ سے اخذ کیا گیا ہے جن کو "علمی مصادر" قرار دیتے ہوئے ایک طالب علم کا سر ندامت سے جھک جاتا ہے ۔ مگر ابوریّہ کی جسارت ملاحظہ فرمائیے کہ اس کے نزدیک ان مصادر میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ۔

اب ہم مختصراً ابوریّہ کے مزعومات باطلہ کا پردہ فاش کرتے ہیں[1] ۔

(ا) ۔ ابوریّہ نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عمر نے ابوھُریرہ کو درّہ سے مارا اور کہا تھا :

" تو نے بہت حدیثیں روایت کی ہیں ۔ گمان غالب یہ ہے کہ تو نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھا ہے "

ہم ابوریّہ کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کسی قابل اعتماد مستند کتاب میں یہ عبارت ہمیں دکھائے ۔ البتہ عربی ادب کی وہ کتب ہمارے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہیں جو ہر قسم کے رطب و یابس واقعات پر مشتمل ہیں ۔ اسی طرح شیعہ فرقہ کی کتب بھی ابوھُریرہ کے بغض و عداوت اور افتراء پردازی کے واقعات سے معمور ہیں ۔ اصحاب علم و فضل کے نزدیک ایسی کتب کو کوئی وقعت و اہمیت حاصل نہیں ۔ ابوریّہ مختلف کتب سے اقتباسات نقل کرنے کا عادی ہے ۔ اگرچہ اس کی کتاب کا مطالعہ کرنے والے پر یہ حقیقت بخوبی عیاں ہے کہ وہ اقتباسات میں تصرّف کر دیا کرتا ہے ۔ مگر بایں ہمہ اس نے اس واقعہ کے اثبات میں کسی کتاب کا نام نہیں لیا ۔ اب سوال یہ ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا ؟ البتہ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ ، ج ۱ ۔ ص ۳۶۰ میں الاسکافی کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے ۔ ابوریّہ کے نزدیک یہ دونوں مصادر قابل اعتماد ہیں ۔

---

[1] جن دنوں یہ بحث زیر قلم تھی میں شدید بیماری میں مبتلا ہو گیا ۔ دوسری جانب ناشر تقاضا کر رہا تھا کہ کتاب طبع کرنے کے لیے یہ بحث جلد ارسال کی جائے ۔ لہٰذا مجھے انتہائی اختصار سے کام لینا پڑا ۔ خیال یہ تھا کہ ابوھُریرہ کے بارے میں ایک جداگانہ مستقل کتاب تحریر کروں گا اور منکرین حدیث کے لایعنی اور بیکار اعتراضات کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر کر رکھ دوں گا ۔ اس عزم کے پیش نظر اس ضمن میں اختصار سے کام لے رہا ہوں ۔ (مصنّف)

(۲) - ابوریہ نے ابن کثیر اور ابن عساکر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابوھریرہ کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے اسی طرح حدیثیں روایت کرنے کا سلسلہ جاری رکھا تو میں تمہیں تمہارے علاقہ کی طرف جلاوطن کر دوں گا۔

جہاں تک حدیثیں روایت کرنے سے منع کرنے کا تعلق ہے، اس میں ابوھریرہ کی کوئی تخصیص نہیں۔ باقی رہی جلاوطن کرنے کی دھمکی تو یہ کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ ہم آغاز کتاب میں ذکر کر چکے ہیں کہ حدیث کی نقل و کتابت کے بارے میں حضرت عمر کی کیا رائے تھی حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ کہ میں تجھے جلاوطن کر دوں گا ابوریہ کے ساختہ پرداختہ ہیں۔ اس ضمن میں ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں:

"حضرت عمرؓ نے کعب الاحبار سے کہا کہ بنی اسرائیل کے واقعات بیان کرنا چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں جلاوطن کر دوں گا۔" (البدایہ والنہایہ، ج ۸ - ص ۱۰۸)

یہ دھمکی آپ نے کعب الاحبار کو اس لئے دی تھی کہ وہ اسرائیلی روایات ذکر کرنا چھوڑ دیں ابوھریرہ کا اس سے کچھ تعلق نہیں۔

ابن کثیر نے جہاں یہ واقعہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر نے ابوھریرہ کو حدیثیں روایت کرنے سے روکا تھا وہاں لکھا ہے کہ حضرت عمر کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ بعض لوگ احادیث کو بے محل استعمال کرتے ہیں اور ان میں جو رخصت مذکور ہوتی ہے اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نیز اس لیے کہ جو شخص زیادہ حدیثیں روایت کرتا ہو اس سے غلطی اور خطاء کے صدور کا احتمال ہوتا ہے۔ لوگ اس سے سن کر اس حدیث کو آگے پہنچا دیتے ہیں اور اس طرح دوسرے لوگوں کو غلطی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہ بھی مذکور ہے کہ بعد ازاں حضرت عمر نے ابوھریرہ کو حدیثیں روایت کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ابن کثیر نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ یہ ہے حضرت عمر کا اصلی موقف روایت حدیث کے بارے میں! نہ کہ وہ جو ابوریہ جیسے عظیم محقق نے بیان کیا۔

(۳) - ابوریہ نے دعویٰ کیا ہے کہ صحابہ نے ابوھریرہ کو جھوٹ سے متہم کیا اور ان کو مطعون کیا تھا۔ ابوھریرہ کو ہدف تنقید بنانے والوں میں حضرت عائشہ ابوبکر و عمر و عثمان و علی جیسے اکابر صحابہ شامل ہیں۔ ابوریہ نے دعویٰ کیا ہے کہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث ص۴۸"

پر یہ بات تحریر کی ہے۔

ابوریہ نے اس قول کو ابن قتیبہ کی جانب منسوب کر کے ایک خطرناک جھوٹ باندھا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ابن قتیبہ نے یہ قول نظام اور دیگر معتزلہ سے نقل کیا اور پھر اس کی زبردست تردید کر کے ابوھریرہ کا دفاع کیا ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ابن قتیبہ کی کتاب "تاویل الحدیث" کا صرف ایک ہی نسخہ نہیں جو ابوریہ کے قبضہ میں ہو اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ اس بات کو ابن قتیبہ کی جانب منسوب کر سکے جو اس نے معتزلہ سے نقل کی ہے۔ بخلاف ازیں مذکورہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے اور علماء اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ یہ انتہائی جسارت اور بے باکی ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو اہل علم کے زمرہ میں شمار کرتا ہو اور پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایسا رسوائے عالم جھوٹ بولے اور اس کو ایک نادر علمی تحقیق قرار دے۔ حق بات تو یہ ہے کہ ابوریہ دروغ گوئی اور عبارتوں کی کتر بیونت اور تحریف میں مستشرقین سے بھی گوئے سبقت لے گیا ہے۔

ہم ابوریہ اور ابوھریرہ کے خلاف بیہودہ گوئی کرنے والے اس کے ہمنواؤں کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ایک ہی قابل اعتماد تاریخی شہادت پیش کریں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ حضرات ابوبکر و عمر و عثمان و علی و عائشہ رضی اللہ عنہم یا کسی اور صحابی نے ابوھریرہ کی جانب حدیث رسول میں دروغ گوئی کو منسوب کیا ہو۔ ان شاء اللہ العزیز ابوھریرہ کے خلاف کینہ رکھنے والوں کی گردنیں تلاش کرتے کرتے ٹوٹ جائیں گی۔ مگر حسب مدعا وہ ایک تاریخی شہادت کے تلاش کرنے میں بھی کامیاب نہ ہوں گے۔ البتہ ابوریہ اور اس کے ہمنوا اگر کوئی عبارت عیون الاخبار یا بدائع الزھور جیسی غیر مستند کتب یا ابن ابی الحدید الاسکافی اور نظام معتزلی وغیرھم جیسے غیر ثقہ راویوں سے نقل کریں تو ہم اس پر اعتماد نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ اس قسم کی کتب اور ایسے غیر ثقہ راوی علم اور علماء کے میدان میں کسی وقعت و اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔

یہ درست ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا گاہے ابوھریرہ کی مرویات کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کیا کرتی تھیں۔ اس کے جواب میں ابوھریرہ کہتے کہ آپ گھر کی چار دیواری میں محصور زیب و زینت میں مشغول رہتی ہیں۔ اور ادھر میری یہ حالت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ گھومتا پھرتا، اور آپ سے حدیثیں سنتا رہتا ہوں۔ یہ سن کر حضرت عائشہؓ اعتراف کرتیں اور فرماتیں کہ ابوھریرہ ٹھیک کہتے ہیں۔ ام المومنین کی جانب سے یہ حق و صداقت کا اعتراف ہے، جس سے ابوریّہ اور اس کے ہم خیال منکرین حدیث محروم ہیں۔

ہم نے قبل ازیں ابوھریرہ پر حضرت عائشہ کے جس اعتراض کا ذکر کیا ہے وہ دراصل اصحاب عبداللہ بن مسعود میں سے قیس اشجعی نامی شخص نے کیا تھا۔ جنبی شخص کے روزہ کے بارے میں حضرت عائشہ نے ابوھریرہ پر جو اعتراض وارد کیا تھا اس کے جواب میں ابوھریرہ نے اعتراف کیا تھا کہ گھریلو حالات و کوائف کے بارے میں حضرت عائشہ کا بیان صحیح تر ہے۔ اس سے ابوھریرہ کی فضیلت کا پہلو نکلتا ہے کہ آپ نے کس جرأت سے حق و صداقت کا اعتراف کیا۔ بخلاف ازیں ابوریّہ جرأتِ حق گوئی سے یکسر محروم ہے۔ مزید برآں ابوھریرہ نے بتا دیا تھا کہ انھوں نے یہ حدیث کسی دوسرے صحابی سے سُنی تھی۔ براہ راست آنحضورؐ سے نہیں سُنی۔ ہم قبل ازیں اس پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ اس ضمن میں متعدد تابعین و مجتہدین نے ابوھریرہ کا مسلک اختیار کیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مخالفت کی ہے۔

(۴)۔ ابوریّہ نے ابن کثیر سے نقل کیا ہے کہ حضرت زُبیر نے جب ابوھریرہ کی روایت کردہ حدیثیں سُنی تو فرمایا: "صَدَقَ كَذَبَ" (اس نے سچ بولا اور جھوٹ کہا)

ابوریّہ نے اس قول کے نقل کرنے میں اہل کتاب کا رویّہ اختیار کیا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

يُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ — کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لاتے ہیں اور
يَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ — دوسرے سے انکار کرتے ہیں۔

ابن کثیر نے حضرت زُبیر کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ عُروہ نے اپنے والد زُبیر سے کہا "ابا جان! اس بات کا کیا مطلب کہ "صَدَقَ كَذَبَ"۔ حضرت زُبیر نے کہا "میرے پیارے بیٹے! اس میں شک نہیں کہ ابوھریرہ نے یہ حدیثیں رسول کریمؐ سے ضرور سُنی ہیں۔ مگر ابوھریرہ بعض حدیثوں کو برمحل اور بعض کو بے محل استعمال کرتے ہیں۔"

(البدایہ والنہایہ۔ ج ۸۔ ص ۱۰۹)

اب یہ غور کرنے کی بات ہے کہ آیا زُبیر ابوھریرہ کو جھٹلا رہے ہیں یا ان کی راست گوئی کا اعتراف

کر رہے ہیں ؟ باقی رہا حضرت زُبیر کا یہ قول کہ ابو ھُریرہ حدیث کو بے موقع استعمال کرتے ہیں اور صحیح طور سے اسے سمجھ نہیں پاتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث میں جو وجوب اباحت یا استحباب مذکور ہوتا ہے، ابو ھُریرہ کما حقہٗ اس کے فہم وادراک سے قاصر رہتے ہیں یہ ایک ایسی بات ہے جس سے ابو ھُریرہ کا دامن داغدار نہیں ہوتا، اور اس سے ان کی صداقت وامانت متاثر نہیں ہوتی۔

(۵) ابوریّہ نے نقل کیا ہے کہ جب ابو ھریرہ نے یہ حدیث سنائی کہ " جو شخص میت کو غسل دے وہ غسل کرے اور جو جنازہ اٹھائے وہ دوبارہ وضو کرے " تو عبداللہ بن مسعود نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ابو ھریرہ کو سخت سُست کہا اور فرمایا ارے لوگو اتم میّت کو ہاتھ لگانے سے نجس نہیں ہو جاتے۔ ابوریّہ نے اس کے اثبات میں ابن عبدالبرّ کی جامع بیان العلم کا حوالہ دیا ہے۔

ابوریّہ کے مذکورہ صدر بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ علمی امانت ودیانت سے عاری ہے۔ اس کا مقصد وحید لوگوں کو گمراہ کرنا قارئین کو دھوکہ دینا اور علمی حقائق کو الٹ پلٹ کر کے پیش کرنا ہے۔

ابن عبدالبرّ نے اپنی کتاب جامع بیان العلم کی ایک فصل میں علماء کے ایسے اقوال و فتاویٰ کا تذکرہ کیا ہے، جن میں انہوں نے ایک دوسرے کی تردید کی اور اس کے فتویٰ کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ ابن عبدالبرّ اس میں لکھتے ہیں کہ مرتدین کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کے سلسلہ میں جب صحابہ نے حضرت ابو بکر سے اختلاف کیا تو ابو بکر نے ان کی تردید کی۔ جب عبداللہ بن عمر نے یہ حدیث سنائی کہ " میّت پر نوحہ گری کرنے سے اس کو عذاب دیا جاتا ہے " تو حضرت عائشہ نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ عبداللہ نے اس میں غلطی لگائی ہے یا وہ بھول گئے ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے عمرے کئے ان کی تعداد کے بارے میں بھی حضرت عائشہ نے جناب عبداللہ بن عمر سے اختلاف کیا تھا۔ اسی طرح تقسیم وراثت کے ایک مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود نے حضرت ابو موسیٰ اور سلمان بن ربیعہ سے اختلاف کیا تھا۔ اسی ضمن میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جب ابو ھریرہ نے یہ حدیث بیان کی کہ " جو شخص میّت کو غسل دے وہ غسل کرے اور جو اسے اٹھائے وہ وضو کرے " تو ابن مسعود نے اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

مذکورہ صدر بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ابو ھریرہ نے اس ضمن میں فتویٰ دیا اور

ابن مسعود نے ان کے فتویٰ کی تردید کی تھی۔ ابن مسعود نے ابوھریرہ کی روایت کردہ حدیث کو جھٹلایا نہ تھا۔ پھر یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ حضرت ابن مسعود نے روایت حدیث میں ابوھریرہ کی تکذیب کی تھی؟ مزید براں کثیر فقہاء نے غسل میت کے سلسلہ میں ابوھریرہ کے فتویٰ پر عمل کیا۔ بلکہ بعض نے غسل کو واجب اور بعض نے مستحب قرار دیا ہے۔

(۶) ابوریہ نے اپنی "نادر اور بے نظیر علمی تحقیقات" کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے کہ

> "صحابہ نے جس طرح ابوہریرہ کو ہدف تنقید بنایا اور اس کی مرویات کے بارے میں جن شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا کتاب کی تنگ دامانی کی وجہ سے میں اس کی تفصیلات بیان کرنے سے قاصر ہوں۔"

یہ صاف کذب وبہتان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابوھریرہ کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا تھا ابوریہ نے وہ سب کچھ اگل دیا ہے اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اس کی حد یہ ہے کہ ابوریہ بہت دُور کی کوڑی لایا ہے اور ان ادبی کتب سے بھی اس نے ابوہُریرہؓ سے متعلق مواد فراہم کیا ہے جن کو کوئی علمی اہمیت حاصل نہیں۔ پھر ابوھریرہ کے عیوب ونقائص کی طلب وتلاش میں اس نے کون سا دقیقہ فروگزاشت کیا؟

یہ ٹھیک ہے کہ بعض صحابہ نے ابوہُریرہ کے قول کو ردّ کر دیا تھا۔ اس ضمن میں ہم ایک مختصر بات کہنا چاہتے ہیں اور وہ ہے کہ ابوہُریرہ حدیث نبوی کا جو ظاہری مفہوم بلا تاویل سمجھتے تھے اس کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ بخلاف ازیں بعض صحابہ ان کی تردید کرتے اور ان کے فتویٰ کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ البتہ وہ روایت کردہ حدیث کی تکذیب وتردید کے مرتکب نہیں ہوتے تھے۔ صحابہ کے مابین ایسے اختلافات رُونما ہوتے رہتے تھے۔ بارہا اس قسم کا نزاع واختلاف حضرات عمر وعلی وابن مسعود وابن عمر و ابوموسیٰ اشعری وعائشہ ومعاذ اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مابین بھی اٹھا۔ ان کے اخبار واحوال معلوم کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔ ابن عبد البر نے اپنی کتاب "جامع بیان العلم" میں ایک خاص فصل منعقد کر کے اس قسم کے اختلافات ذکر کئے ہیں۔ اہل علم شروع ہی سے ایسے مسائل میں ایک دوسرے کی تردید کرتے چلے آئے ہیں۔ مگر کسی نے بھی اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا کہ انہوں نے دوسرے علماء کی صداقت وثقاہت اور علمی امانت ودیانت کو تنقید کی آماجگاہ بنایا تھا۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے اِعْلَامُ الْمُوَقِّعِین اور اپنی دیگر تصانیف میں بیان کیا ہے کہ حضرت

ابوہریرہ فتویٰ دینے والے صحابہ کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے۔ بعض علماء نے ایک مستقل کتاب میں ابوہریرہ کے فتاویٰ کو جمع کر دیا ہے۔

(۷) ابوریّہ نے کچھ من گھڑت واقعات ذکر کرکے یہ تاثر دینے کی سعی ناکام کی ہے کہ صحابہ کرام ابوہریرہ کی مرویات کو تسلیم نہیں کیا کرتے تھے۔ ابوریّہ نے امام ابوحنیفہؒ کی جانب ایک جھوٹی روایت منسوب کی ہے کہ وہ ابوہریرہ کی مرویات سے استناد نہیں کیا کرتے تھے۔

ہم پورے جزم و وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس روایت کی نسبت جناب امام کی طرف درست نہیں۔ حنفی فقہ ایسے احکام و مسائل سے بھرپور و معمور ہے جو صرف ابوہریرہ کی مرویات پر مبنی ہیں، اور دوسری کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ باقی رہا ابوریّہ کا یہ قول کہ فقہائے حنفیہ ابوہریرہ کو فقیہ قرار نہیں دیتے تو یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو راسخ فی العلم نہ ہو۔ مشہور منکر حدیث احمد امین کی تردید کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ حنفی فقہاء ابوہریرہ کی فقہ دانی پر متفق ہیں۔ البتہ ابن ابان اور ان کے ہم نوا اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ شمس الائمہ سَرَخسی نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ائمۂ احناف ابوہریرہ کا بے حد اکرام و احترام کرتے ہیں اور ان کی عدالت و ثقاہت اور حفظ و ضبط کے معترف ہیں۔

(۸) ابوریّہ نے دعویٰ کیا ہے کہ دیگر صحابہ مثلاً انس و معاذ و عبداللہ بن عمر کی طرح ابوہریرہ رض اصاغر صحابہ سے روایت کرتے اور پھر اس کو رسول کریم کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔ اسی کا نام تدلیس ہے۔ پھر ابوریّہ نے تدلیس اور مُدَلِّسین کے بارے میں محدثین کے اقوال نقل کئے ہیں۔

ابوریّہ نے یہاں سخت دھوکہ دیا اور بذاتِ خود تَدلیس (فریب دہی) کا ارتکاب کیا ہے۔ جب ایک صحابی دوسرے صحابی سے حدیث روایت کرے اور اس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دے تو اس کو تَدلیس نہیں بلکہ ارسال کہتے ہیں۔ اس بات پر محدثین کا اجماع منعقد ہو چکا ہے، کہ مَراسیلِ صحابہ قابل قبول ہیں۔ اس لئے کہ ایک صحابی دوسرے صحابی ہی سے روایت کرتا ہے اور صحابہ سب عدول ہیں۔ باقی رہا یہ احتمال کہ ایک صحابی تابعین سے بھی حدیث روایت کر سکتا ہے تو یہ بہت کمزور اور غیر معقول احتمال ہے۔ اسی لئے صحابہ کی مرسل روایات اجماعاً مقبول ہیں۔

نظر بریں ابوریّہ کا اس کو تدلیس قرار دینا اور پھر تدلیس و مُدَلِّسین کے بارے میں محدثین کے

اقوال نقل کرنا صحیح معنی میں تدلیس (دھوکہ بازی) ہے۔ اگرچہ علم حدیث میں تدلیس کے مرتکب کو عدالت وثقاہت کے مرتبہ سے ساقط قرار نہیں دیا جاتا، اس لئے کہ کبار ائمہ حدیث سے تدلیس (بمعنی اصطلاحی) کا فعل سرزد ہوتا رہا ہے۔ مگر ابوریہ نے جس تدلیس (بمعنی لغوی یعنی فریب دہی) کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کی اساس پر وہ علمائے محققین کے مقام پر فائز ہونے کا اہل نہیں رہا۔ لہذا نہ اس کے فہم ادراک پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ علمی امانت و دیانت پر۔ ٹھیک ہے باطل کے پرستار اسی طرح مقام رفیع سے نیچے گرا کرتے اور ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے رہتے ہیں۔

ابوریہ نے مشہور محدث شعبہ کے جو الفاظ نقل کئے ہیں وہ طباعتی تحریف کا بدترین نمونہ ہیں اور ان کی صحت کی کوئی وجہ نہیں۔ کسی محدث سے ایسے الفاظ منقول نہیں ہیں۔ ایسے الفاظ تو ایک مبتدی طالب علم سے بھی صادر نہیں ہوسکتے، چہ جائیکہ شعبہ جیسا عظیم محدث ایسی بات کہے۔

(۹) ابوریہ نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جھوٹی حدیثیں گھڑنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ وضع کردہ حدیث سے کسی حلال چیز کی تحریم یا کسی حرام چیز کی تحلیل نہ ہوتی ہو۔ اس کے اثبات میں ابوریہ نے متعدد احادیث سے استشہاد کیا ہے جو ابوہریرہ رضہ سے مروی ہیں، اور ان کی نسبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کی گئی ہے۔ مثلاً یہ حدیث کہ "جب تم کسی حلال چیز کو حرام نہ ٹھہراؤ اور نہ کسی حرام چیز کو حلال قرار دو تو اس کو آپ کی جانب منسوب کرنے میں کچھ حرج نہیں۔" نیز یہ حدیث کہ "جس نے رضائے الٰہی کے لئے کوئی حدیث بیان کی تو وہ میں نے بیان کی ہے، اگرچہ وہ میں نے بذاتِ خود نہ ذکر کی ہو۔"

ائمہ حدیث نے ایسی احادیث کو چن چن کر موضوعات میں جمع کر دیا ہے اور ان کے واضعین اور ضعیف راویوں کی نشان دہی کی ہے، جنہوں نے ایسی حدیثیں گھڑ کر ان کو ابوہریرہ کی طرف منسوب کر دیا تھا۔ حالانکہ ان میں سے کسی حدیث کی نسبت بھی ابوہریرہ کی جانب درست نہیں۔ اس میں ابوہریرہ کا کیا قصور ہے؟ جب کوئی حدیث گھڑ کر جھوٹ موٹ کسی شخص کی جانب منسوب کر دی گئی ہو تو یہ کہاں کی علمی تحقیق ہے کہ اس شخص کو بلا وجہ بدنام کیا جائے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اسی قسم کی ایک حدیث کو کتاب الاحکام ابن حزم کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ ابن حزم نے اس کو موضوع کہا اور اس کے واضع کی مذمت کی ہے۔ ہم قبل ازیں اس پر روشنی

ڈال چکے ہیں۔ آخر ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ابوریہ نے فنِ حدیث سے بے بہرہ قارئین کو گمراہ کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔ اس لئے کہ جو شخص فنِ حدیث سے نابلد ہو، اس کے دھوکہ کھا جانے کا احتمال ہوتا ہے وہ بہت بڑا ادیب ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۰) ابوریہ کا قول ہے کہ ابوھریرہ کعب الاحبار سے حدیثیں سنتے اور پھر ان کو نبی کریمؐ کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔ یہ ایک ایسا بے بنیاد دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل ابوریہ کے پاس موجود ہی نہیں البتہ ابوریہ نے حسب عادت اس کے اثبات میں ظن و تخمین سے کام لیا اور علماء کی عبارتیں توڑ مروڑ کر پیش کی ہیں۔ ابوریہ نے ذکر کیا ہے کہ محدثین نے اکابر کی اصاغر سے روایتِ حدیث کے سلسلہ میں ابوہریرہ عبادلہ اربعہ معاویہ انس اور دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم کے نام ذکر کئے ہیں کہ یہ لوگ کعب الاحبار سے روایت کیا کرتے تھے۔ ابوریہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صدر صحابہ کعب الاحبار سے نبی کریمؐ کی حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔ یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے، اس لئے کہ کعب الاحبار نے آنحضورؐ کا زمانہ نہیں پایا۔ پھر صحابہ ایک ایسے شخص سے کیوں کر حدیثیں روایت کر سکتے تھے جس نے آپ کا زمانہ ہی نہیں پایا۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ صحابہ کرام کعب الاحبار اور دیگر نومسلم اہل کتاب علماء سے اقوام سابقہ کے اخبار و واقعات روایت کیا کرتے تھے۔

احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"اہل کتاب کی نہ تکذیب کرو اور نہ تصدیق"

اقوام سابقہ کے اخبار و واقعات اہل کتاب سے عبرت پذیری کے نقطۂ خیال سے روایت کئے جاتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ ان واقعات کو قرآنی احکام کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے، اس میں شک نہیں کہ ترجیح کے قابل قرآن کریم ہی کے مندرجات ہیں۔

ابوریہ نے ذکر کیا ہے کہ کعب الاحبار ابوہریرہ کی تعریف کیا کرتے تھے کہ وہ تورات کے مضامین و مطالب سے آگاہ ہیں حالانکہ وہ تورات کو پڑھ نہیں سکتے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ قول درست ہے، تاہم اس میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں۔ اس لئے کہ بکثرت لوگ مجلس میں سن کر بہت سی باتوں کو یاد کر لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ براہِ راست کتابوں سے ان واقعات کو اخذ نہیں کرتے۔ اسی طرح ابوریہ اپنے نام نہاد "علمی دلائل و براہین" پیش کرتا اور قاری کو یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ ابوہریرہ کعب الاحبار سے

حدیثیں سنا کرتے تھے اور پھر ان کو رسول کریم کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔ حالانکہ ایک بتدی بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ یہ بات سراسر بے بنیاد ہے اور اس کی کوئی وجہ جواز نہیں۔

ابوریہ نے ایک دوسرے موقع پر جو عجیب و غریب دلائل پیش کئے ہیں ان میں سے ایک وہ روایت ہے جس کو مسلم بن حجاج نے بشیر بن سعد سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "خدا سے ڈرو اور حدیثوں کو خوب یاد رکھو، خدا کی قسم مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم ابوہریرہ کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ وہ ہمیں رسول کریم سے سنی ہوئی حدیثیں سنایا کرتے تھے اور وہ بھی جو انہوں نے کعب الاحبار سے سن رکھی تھیں، جب ہم ان سے یہ حدیثیں سن کر فارغ ہوتے تو ہم میں سے بعض رسول کریم کی بیان کردہ حدیثوں کو کعب کی طرف منسوب کر دیتے اور کعب کی حدیثوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقولہ قرار دیتے۔ اس لئے خدا سے ڈرو اور حدیثوں کو خوب یاد رکھو۔

عربی زبان کا ابجد خوان جو اس عبارت کے سمجھنے پر قادر ہے یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں ابوہریرہ پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ کعب الاحبار سے حدیثیں سن کر ان کو رسول کریم کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔ اس اثر کا راوی بشیر بن سعد بیان کرتا ہے کہ ابوہریرہ کے اصحاب و تلامذہ ان سے حدیثیں سنا کرتے تھے اور بعد میں ان کو ملا جلا دیتے۔ جو حدیثیں رسول کریم سے منقول ہیں انکو کعب الاحبار کی طرف اور اس کے برعکس کعب الاحبار سے منقول احادیث کو رسول کریم کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کعب سے منقول احادیث کو رسول کریم کی جانب منسوب کرنے والے ابوہریرہ کے تلامذہ تھے نہ کہ وہ خود۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ابوریہ جیسا "عظیم محقق" بزعم خویش جس کی تحقیقات نادرہ کی کوئی مثال موجود نہیں، اس واقعہ کو ابوہریرہ کے کاذب ہونے کی دلیل کے طور سے پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ کعب الاحبار سے حدیثیں سُن کر ان کو رسول کریمؐ کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ اس کو ابوریہ کی جہالت و حماقت پر محمول کیا جائے کہ وہ یہ عبارت سمجھنے سے قاصر رہا۔ یا یہ کہا جائے کہ اس کی وجہ ابوریہ کی بے دینی، بے شرمی، تاریخ سے ناواقفیت اور اپنے ذہین و فطین قارئین سے لاپروائی اور بے اعتنائی ہے۔

ابوریہ نے اس ضمن میں جس دجل و تلبیس سے کام لیا ہے، اس کی ایک دلیل وہ روایت ہے جو اس نے بروایت ابوہریرہ صحیح مسلم سے مرفوعاً روایت کی ہے اور جس میں آسمان و زمین کی

تخلیق کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس حدیث کے شروع میں ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ نے میرا ہاتھ پکڑا۔ اس کے آگے ابوریّہ بخاری اور ابن کثیر سے نقل کرتا ہے کہ یہ حدیث ابوہریرہ نے کعب الاحبار سے اخذ کی تھی۔ ابوریّہ بزعم خویش سمجھتا ہے کہ ابوہریرہ رضؓ کے کاذب ہونے پر اسے ایک زبردست دلیل مل گئی ہے، اور اب وہ ابوھریرہ کے ساتھ عقیدت رکھنے والوں کو ایک عجیب ورطۂ حیرت میں ڈال سکے گا۔ اگر ابوریّہ کو فن حدیث میں معمولی دسترس بھی حاصل ہوتی اور وہ عربی عبارت سمجھنے پر قادر ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ امام بخاری و ابن کثیر ابوھُریرہ کو کاذب قرار نہیں دے سکتے تھے کہ اس نے کعب کی حدیث کو دانستہ رسول کریمؐ کی جانب منسوب کر دیا تھا۔ یہ دونوں بزرگ ایسی جسارت نہیں کر سکتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ امام بخاری اور ابن کثیر بے دینی کی اس سطح تک اتر آتے، جہاں ابوریّہ پہنچ چکا ہے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ یہ دونوں اکابر ابوہریرہ کی مدح و ستائش میں رطب اللسان تھے اور ان کی علمی و دینی امانت و دیانت اور ورع و تقویٰ کے معترف تھے۔

دراصل امام بخاری اور ابن کثیر نے مسلم کی ذکر کردہ روایت پر اعتراض کیا ہے کہ یہ حدیث بروایت ابوہُریرہ مرفوع نہیں ہے۔ اس کو مرفوع قرار دینے کی غلطی دیگر راویوں سے سرزد ہوئی ہے ابوہریرہ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ امام بخاری نے اپنی تاریخ اور ابن کثیر نے تفسیر میں اسی طرح تحریر کیا ہے۔ علاّمہ معلمی یمانی نے اپنی کتاب "الانوار الکاشفہ" میں اس پر ایسا سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جس سے ایک محقق کو شرح صدر نصیب ہوتا ہے اور ابوریّہ جیسے مُعاندین اس سے جَل بھُن جاتے ہیں : (الانوار الکاشفہ ص ۱۸۸-۱۹۲)۔

ابوہُریرہ بنوامیہ کے حامی تھے:

ابوریّہ نے اس بحث میں وہ تمام گالیاں یکجا کر دی ہیں جو شیعہ نے اپنی کتب میں ابوہریرہ کو دی ہیں۔ ابوریّہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کی تحقیقاتِ نادرہ اپنے باب میں فقید المثال ہیں اور آج تک اسلاف میں سے کسی شخص نے ایسی تحقیق کا بیڑا نہیں اٹھایا۔ چونکہ ابوریّہ کے قلب و ذہن پر ابوہریرہ کا بُغض و عناد چھایا ہوا ہے، اس لئے وہ بڑے شوق سے وہ گالیاں نقل کرتا چلا آیا ہے جو شیعہ نے کبار صحابہ کو دی ہیں۔ اور امیر معاویہ رضؓ کی خوشنودی کے لئے انہوں نے رسول کریمؐ پر جو جھوٹ باندھے۔ بدیں وجہ ابوریّہ کی کتاب بدبودار جھوٹ کا ایک پلندہ بن کر رہ گئی ہے۔

ہم جس عصر و عہد میں بود و باش رکھتے ہیں اس میں پرانے مُردوں کو اکھاڑنے کے لئے کوئی وجہ جواز موجود نہیں۔ عصر حاضر میں جو شخص صحابہ کے باہمی نزاعات و مجادلات کو ہوا دیتا ہے، ہم اس کو فتنہ پرداز اور شرارتی آدمی قرار دیتے ہیں، جو مسلمانوں کے شیرازہ کو بکھیرنا چاہتا ہے، اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ حالانکہ دورِ حاضر میں افتراق و نزاع کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

ابوریّہ نے اپنی کتاب کو شیعہ کے یہاں مقبول بنانے کے لئے شیعی افکار و عقائد کی پشت پناہی کی اور ان تمام صحابہ و تابعین کو متّہم کیا ہے، جن سے شیعہ بُغض و عناد رکھتے ہیں۔ ابوریّہ کو کُھلی چُھٹی ہے کہ اپنی کتاب کو مقبول بنانے کے لئے جو حربہ چاہے اختیار کرے۔ مگر اس کا یہ دعویٰ درست نہیں کہ اس کی تحقیقات نادرہ علمی تحقیق کے اصول و قواعد پر مبنی ہیں، اور اپنے باب میں عدیم النظیر ہیں۔

صحابہ کرام کے خلاف دروغ گوئی اور دشنام طرازی کرنا ان کے باہمی نزاعات کو اجاگر کرنا۔ اور ایسی کتابوں پر بھروسہ کرنا جن کے مصنفین صداقت و امانت سے بہرہ ور نہ تھے یا ابوہریرہ کے ساتھ بغض و عداوت میں معروف تھے اگر اسی کا نام بے نظیر علمی تحقیق ہے تو یہ ابوریّہ کو مبارک ہو۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ہمارے دانشمند شیعہ بھائی ابوریّہ جیسے شخص کو حق و صداقت کا معاون اور اہل سنت کے خلاف شیعہ کی پشت پناہی کرنے والا تصور کریں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک جاہل کم عقل اور فریب خوردہ شخص اپنی ذات اور اپنے احباب کے لئے لاتعداد مصائب و آلام کا موجب بنتا ہے۔ ایسے شخص سے خدا کی پناہ طلب کرنا چاہیئے۔ یہ ایک ایسی شر ہے جس سے دانشمند اور نیک لوگ کنارہ کش رہتے ہیں۔ ایک قدیم قول میں کہا گیا ہے کہ "منافق نہ خدا کے نزدیک قابل احترام ہوتا ہے اور نہ عقلاء کی نظر میں"

ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ابوہریرہ محبّ اہل بیت تھے۔ آپ نے حضرت حسن رض و حسین رض کی عظمت و فضیلت میں متعدد احادیث روایت کی ہیں۔ جب مسلمانوں نے حضرت حسن کو ان کے نانا کے پہلو میں دفن کرنا چاہا تو ابوہریرہ حاکم وقت مروان بن حکم سے اُلجھ گئے۔ آپ ان لوگوں میں شامل تھے، جنہوں نے محاصرہ کے دوران حضرت عثمان کی حمایت کی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ حدیث

نبوی اور علم دین کی نشر و اشاعت میں منہمک رہتے تھے۔ حضرت علی و معاویہ کے مابین جب فتنہ بپا ہوا تو دیگر کبار صحابہ کی طرح ابوھریرہ نے اس میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ یہ خطرہ دامنگیر تھا کہ مسلمانوں کا خون نہ بہنے پائے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ فریقین سے لاتعلق خدا کو زیادہ خوش کرنے والی اور دامن کو پاک رکھنے والی ہے۔ ابوہریرہ کا اصلی زاویہ نگاہ یہ تھا۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی کہا گیا ہے۔ وہ سب کذب و افتراء اور تعصب کی کرشمہ سازی ہے، جس کے موجب اس دور میں نفسانی جذبات و احساسات تھے۔ اور آج کل اس کا باعث و محرک نفاق و شقاق جہالت اور بدعقیدگی ہے

ابوہریرہؓ کے بارے میں چند کلمات

ہم نے گزشتہ فصل میں ائمہ حدیث اور معتمد مؤرخین سے نقل کر کے حضرت ابوہریرہ سے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

(۱) اس میں شک نہیں کہ ابوہریرہ نے سب صحابہ سے زیادہ حدیثیں روایت کی ہیں۔ آپ جب سے مشرف باسلام ہوئے اور آپ کی صحبت و رفاقت سے بہرہ ور ہوئے حدیثیں یاد کرنے اور آنحضور کے کوائف و احوال کی طلب و تلاش میں مشغول رہے۔ آپ اپنے معاصر صحابہ سے سن کر حدیثیں یاد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس احادیث نبویہ کا اس قدر ذخیرہ جمع ہو گیا جو کسی صحابی کے پاس نہ تھا۔ اگرچہ بعض صحابہ نے آپ کی مرویات پر اس کے اظہار حیرت کیا تھا کہ وہ ان سے آگاہ و آشنا نہ تھے تاہم آخر کار انہوں نے اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ ابوہریرہ سب سے بڑے حافظ حدیث اور کثیر الروایۃ صحابی ہیں۔ صحابہ نے نہ کبھی ابوہریرہ کی صداقت پر شک و شبہ کا اظہار کیا اور نہ ان کی روایت کردہ احادیث کو بھا۔ ہم مثال کے طور پر دو واقعات بیان کرتے ہیں جو ان کی مرویات پر اظہار حیرت کرنے والے صحابہ کے ساتھ پیش آئے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ ابوھریرہ نے اس ضمن میں حضرت عائشہ کو ایسا جواب دیا تھا جس سے وہ مطمئن ہو گئی تھیں۔

پہلا واقعہ:

ابن سعد نے طبقات میں ولید بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے کہ ابوہریرہ نے حدیث بیان کی کہ جو شخص جنازہ میں حاضر ہو اس کو ایک قیراط (ایک خاص پیمانہ) ثواب ملے گا۔" عبداللہؓ

بن عمرؓ نے یہ سُن کر کہا۔" ابوہریرہ! ذرا دیکھئے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ زیادہ حدیثیں روایت کرنے کے عادی ہیں" یہ سن کر ابوہریرہ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور حضرت عائشہ کے پاس لے گئے، اور کہا جس طرح آپ نے آنحضورؐ سے سنا ہے بیان کیجئے۔ حضرت عائشہؓ نے ابوہریرہ کی تائید کی، ابوہریرہ نے کہا" خدا کی قسم مجھے آنحضورؐ کی حدیثیں سننے سے نہ کھیتی باڑی روکتی اور نہ بازاروں کا شور و غل عبداللہ بن عمرؓ کہنے لگے۔ ابوہریرہ! آپ آنحضور کو ہم سب سے زیادہ جاننے والے اور ان کی احادیث کے سب سے بڑے حافظ ہیں۔

(طبقات ابن سعد ج ۷، ص ۳۶۳)

دوسرا واقعہ:

ابن کثیر نے البدایہ میں ابوانیس بن ابی عامر سے روایت کیا ہے کہ میں طلحہ بن عبیداللہ کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک شخص نے آکر کہا" ابومحمد! مجھے معلوم نہیں کہ یہ یمنی (ابوہریرہ) تم سے بڑا عالم حدیث ہے یا رسول خدا کی جانب ایسی حدیثوں کو منسوب کر دیتا ہے جو نہ اس نے سنیں اور نہ آپ نے ارشاد فرمائیں" طلحہ نے کہا" اس میں شک نہیں کہ ابوہریرہ نے آپ سے جو کچھ سنا وہ ہم نے نہیں سنا اور جو علم حاصل کیا وہ ہم نے نہیں کیا۔ ہم دولت مند اور گھر بار والے لوگ تھے۔ صبح و شام بارگاہِ اقدس میں حاضری دیتے اور لوٹ جاتے۔ ابوہریرہ ایک مسکین آدمی تھا نہ اس کا گھر تھا نہ مال۔ آنحضورؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دئے، جہاں آپ جاتے ان کے ساتھ گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اس لئے ہمیں اس میں ذرا بھر شک نہیں ہے کہ اس نے جو علم حاصل کیا وہ ہم نہ کر سکے اور اس نے جو کچھ سنا وہ ہم نہ سن پائے" ابن کثیر کہتے ہیں کہ ترمذی نے یہ واقعہ اسی طرح روایت کیا ہے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۰۹)۔

مذکورہ صدر دونوں واقعات جو ثقہ راویوں سے منقول ہیں ان لوگوں کو خاموش کر دیتے ہیں جو معتزلہ کے عصر و عہد سے لے کر ابوریہ کے زمانہ تک اپنی زبانوں کو ابوہریرہ پر بہتان طرازی سے آلودہ کرتے چلے آئے ہیں۔

(۲) حضرت ابوہریرہ نے تادم وفات روایتِ حدیث کا مبارک کام جاری رکھا۔ آپ نے

باختلاف روایات ۵۸ھ یا ۵۹ھ یا ۶۰ھ میں وفات پائی۔ ابو ہریرہ کے زمانہ میں بہت سے صحابہؓ بقید حیات تھے۔ مسلمان خوابِ غفلت سے ہوشیار اور بیدار ہو چکے تھے۔ اسلامی حکومت اوجِ شباب پر تھی۔ مسلم علماء اس جلیل القدر صحابی (ابو ہریرہ) کے گرد جمع ہو جاتے اور ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار تصور کرتے تھے۔ اس کی حد یہ ہے کہ اس دور کے مسلّم سید التابعین سعید بن مسیّب کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضرت ابو ہریرہ کی بیٹی کے ساتھ نکاح باندھا اور تادمِ زیست آپ کے وابستۂ دامن رہے۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں امام بخاری سے نقل کر چکے ہیں، حضرت ابو ہریرہ کے اصحاب و تلامذہ کی تعداد آٹھ صد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ صحابہ اور تابعین میں سے تھے۔

بخلاف ازیں دیگر صحابہ کے تلامذہ ان کے عشر عشیر کو بھی نہ پہنچ سکے۔ جو لوگ حق و صداقت کے طالب ہیں اور اپنے ضمیر کی آواز سے غافل نہیں ہیں، ان کے لئے اس واقعہ میں سکون و اطمینان کا سامان موجود ہے۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ابو ہریرہ جن صحابہ و تابعین کے درمیان رہ کر زندگی کے ایام بسر کر رہے تھے، ان میں آپ صداقت و امانت کی بلند ترین چوٹی پر فائز تھے۔ آپ کو معاصرین میں وہ مقام بلند حاصل تھا، جہاں شک و ریب اور جھوٹی خبریں پھیلانے والوں کے ظنون و توہمات کا گزر تک نہیں ہو سکتا۔

جو شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ صحابہ و تابعین کو صداقت بیانی، نصرتِ حق، ابطالِ باطل انکارِ منکر، تحریف و بدعت کا ارتکاب کرنے والوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونے اور سنت سے برگشتہ ہونے والوں پر سختی کرنے کے سلسلہ میں کس قدر بلند مقام حاصل تھا وہ پورے جزم و وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ اگر ابو ہریرہ کی صداقت میں ان کو معمولی شک و شبہ بھی ہوتا تو وہ ہرگز خاموش رہنے والے نہ تھے۔ خصوصاً جب کہ ابو ہریرہ کے پاس نہ قوت و شوکت تھی نہ جاہ و منصب۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ابو ہریرہ کی راست گوئی صحابہ کے نزدیک محلِ نظر تھی تو انہوں نے ابو ہریرہ کو حدیثیں روایت کرنے سے منع کیوں نہ کیا؟ آخر اس میں کون سی چیز مانع تھی؟ حالانکہ صحابہ کی بے باکی کا یہ عالم تھا کہ وہ خلفاء و امراء کے سامنے بھی کلمۂ حق کہنے سے گریز نہ کرتے تھے۔

(۳) آپ دیکھ چکے ہیں کہ جب مدینہ کے والی مروان بن حکم نے حضرت حسنؓ کو ان کے

نانا کے پہلو میں دفن کرنے سے روکا تھا تو ابوہریرہ اس سے الجھ گئے تھے۔ حالانکہ مروان حاکم وقت تھا اور ان دنوں بنو امیہ کا طوطی بول رہا تھا۔ اس کے باوصف ابوہریرہ اس بات کو ضبط نہ کر سکے کہ مروان حضرت حسن کی تدفین میں حائل ہو۔ ابوہریرہ نے واشگاف الفاظ میں مروان سے کہہ دیا تھا کہ "آپ کا اس سے کچھ تعلق نہیں"۔ جب مروان نے ابوہریرہ کی کثرتِ روایت کو بہانہ بنا کر آپ کو خاموش کرانا چاہا تو ابوہریرہ نے اس کو بہت کھرا اور سخت جواب دیا تھا۔ کیا رسولِ خدا پر جھوٹ باندھنے والا شخص ایسا جواب دے سکتا ہے؟ اور کیا دین اسلام سے برگشتہ شخص جو بقول ابوریہ بنو امیہ کا طرف دار بھی ہو، اس قدر جری اور بے باک ہو سکتا ہے؟ بخلاف ازیں ایسی جسارت وہی شخص کر سکتا ہے جو سچا دین دار ہو اور اس نے محض رضائے الٰہی کی خاطر دین اسلام کو قبول کیا اور اپنے وطنِ مالوف کو خیرباد کہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مروان نے اس پر ندامت کا اظہار کیا کرتا تھا کہ اس نے ابوہریرہ کو کس لئے ناراض کیا۔

(۴) حضرت ابوہریرہ علم و فضل اور حدیث رسول کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ بہت بڑے عابد و زاہد بھی تھے۔ آپ ذکر الٰہی نماز اور تسبیحات میں مشغول رہا کرتے تھے۔ ابن کثیر نے البدایہ میں ابوعثمان نہدی سے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ ایک تہائی رات تک قیام کرتے۔ ان کی بیوی ایک تہائی رات قیام کرتی اور پھر ان کا لڑکا ایک تہائی رات حالتِ قیام میں گزارتا۔ جب ایک سو جاتا تو وہ دوسرے کو بیدار کر دیتا، اسی طرح پوری رات گزر جاتی۔ ابن کثیر نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ میں رات کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ ایک حصہ تلاوتِ قرآن کے لئے، ایک سونے کے لئے اور ایک احادیث نبویہ یاد کرنے کے لئے۔ اسی طرح ابن کثیر نے ابوایوب سے روایت کیا ہے کہ ابوہریرہ نے ایک مسجد اپنے گودام میں ایک گھر میں ایک اپنے حجرہ میں اور ایک گھر کے دروازہ پر بنا رکھی تھی۔ جب نکلتے تو ان سب مساجد میں نماز پڑھتے اور جب داخل ہوتے تو ان سب میں نماز پڑھتے۔

ابن کثیر نے حضرت عکرمہؓ سے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہ ہر رات بارہ ہزار تسبیحات پڑھا کرتے اور فرماتے تھے کہ میں اپنے گناہوں کے مطابق تسبیحات پڑھتا ہوں۔ یہ انتہائی ذکر و عبادت ہے اس سے زیادہ کا امکان ہی نہیں۔ میمون بن میسرہ بیان کرتے ہیں کہ ابوہریرہ ہر روز

دو چیخیں مارا کرتے تھے۔ ایک چیخ صبح کے وقت اس میں کہتے "رات چلی گئی اور دن آگیا۔ آل فرعون کو عذاب کے سامنے پیش کیا گیا"۔ پچھلے پہر یوں کہتے "دن رخصت ہوا، اور اب رات کی آمد آمد ہے۔ آل فرعون کو عذاب کے سامنے پیش کیا گیا۔ جو شخص بھی ان کی چیخیں سنتا عذاب خداوندی سے پناہ طلب کرتا۔ ابوہریرہ کہا کرتے تھے "بدکار آدمی کی خوشحالی پر رشک نہ کرو، اس لئے کہ جہنم اس کی تلاش میں ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۱۰-۱۱۴)۔

متعدد راویوں نے ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ وہ سجدہ میں گر کر بدکاری، چوری، کفر اور کبائر کے ارتکاب سے خدا کی پناہ مانگا کرتے تھے۔ ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ کہیں ان کے مرتکب نہ ہو جائیں؟ فرمایا جب ابلیس زندہ ہے اور دلوں کا پھیرنے والا ہر وقت دل کو پھیر سکتا ہے تو مجھے خطرہ کیوں نہ ہو۔

ابو عثمان نہدی نے ابوہریرہ سے پوچھا آپ روزے کیسے رکھتے ہیں؟ فرمایا میں ہر ماہ کے آغاز میں روزے رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ اگر کوئی حادثہ پیش آجائے اور میں روزے نہ رکھ سکوں تو مجھے مہینہ بھر کے روزوں کا اجر و ثواب مل جائے۔

حضرت ابوہریرہ کی ایک حبشی لونڈی تھی جو آپ کو بہت ستاتی۔ ایک دن چابک ہاتھ میں پکڑ کر کہا اگر روزِ قیامت قصاص کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہیں مار مار کر زمین پر بچھا دیتا۔ لیکن میں تجھے ایسے شخص کے پاس فروخت کرتا ہوں جو مجھے اس وقت پوری قیمت ادا کرے گا جب مجھے اس کی بہت ضرورت ہوگی جاؤ تم خدا کے لئے آزاد ہو۔

حضرت ابوہریرہ کو صحابہ میں تقویٰ و طہارت کے اعتبار سے جو مقام حاصل تھا، اس کے اثبات کے لئے یہی دلیل کافی ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے وفات پائی تو ابوہریرہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت ام سلمہؓ کا جنازہ بھی آپ ہی نے پڑھایا تھا۔ جب ابوہریرہ کا آخری وقت قریب آیا تو رونے لگے۔ جب وجہ پوچھی گئی تو بتایا کہ میں دنیوی ساز و سامان کے لئے نہیں روتا۔ بلکہ میرے رونے کی وجہ یہ ہے کہ سفر لمبا ہے اور زادِ راہ کم ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرا انجام کیا ہوگا۔ آیا جنت میں جاؤں گا یا جہنم میں؟

بتائیے جس شخص کی عبادت نماز تسبیح وعظ و نصیحت، غلام آزاد کرنے، رونے اور خدا سے ڈرنے کا یہ حال ہو وہ رسول کریم پر افتراپردازی جیسے اکبر الکبائر کا ارتکاب کیسے کر سکتا ہے؟۔ سبحانک ہذا بہتانٌ عظیمٌ۔

(۵) بایں ہمہ ابوہریرہ مال و دولت کے حریص نہ تھے۔ جو مال ہاتھ لگتا اسے راہ خدا میں بانٹ دیتے۔ مروان کے کاتب کا بیان ہے کہ اس نے ایک سو دینار کسی کے ہاتھ ابوہریرہ کو بھجوائے۔ اگلے روز ایک شخص کو ابوہریرہ کی خدمت میں بھیجا کہ یہ دینار میں نے غلطی سے آپ کو دے دیئے تھے دراصل یہ کسی اور شخص کو دینے تھے۔ ابوہریرہ نے کہا میں نے وہ تقسیم کر دیئے۔ آپ میری تنخواہ سے اتنے دینار وصول کر لیں۔ مروان نے یہ دینار ابوہریرہ کو آزمانے کے لئے بھجوائے تھے۔ (البدایہ والنہایہ)

ابوریہ کا کہنا ہے کہ ابوہریرہ نے کئی محل تعمیر کر رکھے تھے۔ ایک محل عقیق میں اور ایک فلاں جگہ۔ ابوریہ نے یہاں کھل کر تحریف کا ارتکاب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خدا کا خوف بالکل نہیں ہے۔ دراصل ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں کہ "ابوہریرہ کی وفات اپنے مکان میں ہوئی جو مقام عقیق میں واقع تھا۔" یہاں "دار" کا لفظ ہے۔ دار کے لفظ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ ابوہریرہ دولت مند شخص تھے اور وہ مکان ایک عالی شان محل کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اکثر بلکہ تمام صحابہ اپنا سکونتی مکان رکھتے تھے۔ ان کے خلاف کسی نے یہ کہنے کی جرأت نہ کی کہ وہ عالی شان محلات کے مالک تھے۔ ہم الفاظ کی تحریف سے خدا کی پناہ طلب کرتے ہیں۔

(۶) ہنوز صحابہ اور کبار تابعین کا عصر و عہد گزرنے نہ پایا تھا کہ محدثین نے ابوہریرہ کی مرویات کو خصوصی توجہ کا مرکز و محور قرار دیا اور ان پر نقد و جرح کرنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے احادیث صحیحہ و سقیمہ کو باہم ممیز و ممتاز کر دیا۔ جس حدیث میں کوئی ضعف یا سقم دیکھا اس کو بیان کیا۔ ابوہریرہ کی روایت کردہ احادیث صحیحہ کو کتب حدیث میں محفوظ کر لیا گیا۔ نظام اور دیگر معتزلہ کے آنے سے پہلے اس سے کسی نے اختلاف نہ کیا۔ اسی طرح الاسکافی اور دیگر شیعہ علماء نے بھی ان کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا۔

(۷) ابوہریرہ سے جو احادیث صحیحہ منقول تھیں، آگے چل کر مختلف اسلامی بلاد و دیار میں فقہاء

اور مجتہدین نے اس سے خاص اعتناء کیا۔ جب صحیح حدیث مل جاتی تو کسی کو اس میں اختلاف کی گنجائش نہ ہوتی۔ البتہ ابراہیم نخعی اور بعض علمائے کوفہ نے جو اصحاب الرائے کے مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اخبارِ آحاد کو قبول کرنے کے لئے چند شرائط مقرر کئے تھے۔ دیگر تمام فقہاء اس ضمن میں ان کے خلاف تھے۔ یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ جو عراقی مکتبِ فکر کے سرخیل تھے وہ بھی نخعی سے متفق نہ تھے بخلاف ازیں ان کا زاویۂ نگاہ یہ تھا کہ جو حدیث شرائطِ صحت کی حامل ہو اس پر بہر حال عمل کرنا چاہیئے ان شرائط کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کے سوا دیگر رُواۃ و رجال کے بارے میں حزم و احتیاط سے کام لیا جائے۔ جو شخص اس کے سوا کسی اور بات کا دعویٰ کرے وہ مفتری و کذاب ہے اور امام ابوحنیفہ کا مسلک ہی اس کی تردید و تکذیب کے لئے کافی ہے۔

(۸) نظام اور دیگر معتزلہ نے سب سے پہلے حضرت ابوہریرہ کو نقد و طعن کی آماجگاہ بنایا صرف ابوہریرہؓ ہی نہیں بلکہ اکثر صحابہ کے بارے میں معتزلہ کا ایک جداگانہ موقف تھا۔ اسی طرح حدیث کے بارے میں بھی وہ ایک خاص نظریہ رکھتے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ جو احادیث جمہور کے نزدیک صحیح اور ثابت ہیں، معتزلہ ان کو رد کر دیتے تھے۔ یونانی فلسفہ ان کے قلب و ذہن پر بہت بری طرح چھایا ہوا تھا۔ وہ اسی پیمانہ سے دین کے احکام و مسائل کو جانچتے پرکھتے تھے۔ اگر جمہور اہل اسلام کا ڈر نہ ہوتا تو وہ قرآن کو بھی تنقید شدید کے تیروں سے گھائل کر دیتے۔ اس لئے کہ حدیث کی طرح قرآن میں بھی ایسی باتیں موجود ہیں جو ان کی یونانی عقلوں کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔ معتزلہ نے قرآنی مضامین کو توڑ مروڑ کر اپنے نظریات کے سانچہ میں ڈھال لیا تھا۔ وہ اس زعم باطل میں مبتلا تھے کہ یونانی فلسفہ حق و صداقت کا حامل ہے، اور اس میں باطل کی کوئی آمیزش نہیں۔ دورِ حاضر میں ہائی سکول کا ایک ادنیٰ طالب علم فلسفہ یونانی کی اس مدح و ستائش پر معتزلہ کا مذاق اڑائے گا۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ابوریہ معتزلہ کو "اصحاب عقول راجحہ" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ گویا معتزلہ اسی طرح اعلیٰ درجہ کے اصحابِ دانش و بینش ہیں جیسا کہ خود ابوریہ۔

جہاں تک شیعہ کا تعلق ہے انہوں نے یہ نقطۂ نگاہ صرف ابوہریرہ ہی کے متعلق اختیار نہیں کیا بلکہ معدودے چند صحابہ کو چھوڑ کر وہ سب کو بغض و عداوت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ان کے اکثر فرقے جمہور صحابہ کی تکفیر کرتے ہیں، جن میں ابوبکر و عمر و سعد و خالد اور دیگر

وہ صحابہ کبار شامل ہیں جن کے ذریعہ خداوند کریم نے انسانیت کو اسلامی ہدایت جیسی نعمتِ عظمیٰ سے مالا مال کیا۔

شیعہ نے صحابہ کے بغض و عناد کے سلسلہ میں جو موقف اختیار کیا ہے وہ ان کے اس قاعدہ پر مبنی ہے کہ جو شخص بھی رسول کریم کے بعد حضرت علی کو امیر المومنین تسلیم نہیں کرتا اس سے دشمنی رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب صحابہ نے بالاتفاق حضرت ابو بکر رضؓ کو خلیفہ تسلیم کر لیا تو شیعہ ان سب سے ناراض ہو گئے اور کہنے لگے کہ انہوں نے رسول کریمؐ کی وصیت کے خلاف سازش کی ہے۔ شیعہ کا دعویٰ ہے کہ رسول کریمؐ نے حضرت علی کو اپنے بعد خلافت کی وصیت کی تھی۔ یہ موضوع سر دست زیر بحث نہیں، اس لئے ہم اس کو مزید طوالت نہیں دینا چاہتے۔

ہم ابوریّہ سے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ابوہریرہ کے بارے میں وہ شیعہ کا ہمنوا بنے تو شیعہ تنہا ابوہریرہ ہی کو یہ سزا نہیں دیتے بلکہ وہ ابوبکر و عمر کو اس سے بڑی سزا کا مستحق گردانتے ہیں اور ان کے بارے میں ایسی کہانیاں سناتے ہیں جو ابوہریرہؓ کے واقعات سے کہیں زیادہ بدتر ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ابوریّہ ان کو قابل اعتماد اور مستند علمی ذریعہ تصور کرتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حضرات صحابہ کے بارے میں کتبِ شیعہ میں جو کچھ بھی تحریر کیا گیا ہے وہ سب کچھ ابوریّہ کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ آئے دنوں ہم جن احوال و ظروف سے دوچار ہیں ان کا تقاضا یہ تھا کہ ایسے موضوع کو چھیڑا نہ جاتا۔ مگر ابوریّہ کے گمراہ کن خیالات کی تردید و ابطال کے لئے مجبوراً یہ مبحث ہمیں چھیڑنا پڑا۔ یہ امر مزید حیرت و استعجاب کا موجب ہے کہ ابوریّہ اس کو "نادر تحقیقات علمیہ" قرار دیتا ہے۔

یہ حضرت ابوہریرہ رضؓ سے متعلق ایک مختصر بیان ہے جو ان کی زندگی کے حقائق اور اُن کے بلند پایہ علمی منصب و مقام پر مشتمل ہے جو صحابہ و تابعین محدثین اور علمائے اسلام کے یہاں اُن کو حاصل تھا۔ ہم اس کو محقق شہیر علامہ شیخ احمد شاکر مرحوم کے بیان پر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ مرحوم نے مسند احمد جلد ۱۲ صفحہ ۸۴ پر جہاں ابوہریرہ رضؓ کی مرویات نقل کی ہے، وہاں تحریر کیا ہے۔

ابوہریرہؓ سے متعلق علامہ احمد شاکر کا بیان:

"عصر حاضر کے منکرین حدیث جو دراصل منکرین اسلام ہیں، حضرت ابوہریرہ کو ہدفِ طعن بنانے کے بے حد مشتاق نظر آتے ہیں۔ ان کا مقصدِ وحید ابوہریرہ کی صداقت بیانی اور ان کی مرویات کو مشکوک و مشتبہ بنانا ہے۔ ان کی دلی آرزو یہ ہے کہ مستشرقین کی طرح لوگوں کی نگاہ میں اسلام کو مشکوک بنا کر رکھ دیا جائے۔ بظاہر وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن سے استدلال کرتے ہیں اور یا ان احادیث سے جو ہماری رائے میں صحیح ہیں۔ وہ صرف انہی احادیث کو صحیح قرار دیتے ہیں جو ان کی خواہشات اور ان کے یورپین آداب و اطوار سے ہم رنگ و ہم آہنگ ہوں۔ وہ اس انداز سے قرآن کی تاویل کرتے ہیں، جس سے لفظ اپنے اصلی معنی سے ہٹ جاتا ہے۔ اس کھینچا تانی سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ قرآن کو اپنی ذاتی اغراض کے تابع بنایا جائے۔

منکرینِ حدیث نے اسلام کی مخالفت میں پہل نہیں کی تھی بلکہ خواہشات کے پجاری شروع ہی سے چلے آئے ہیں۔ ایسے لوگ چیختے چلّاتے رہے مگر اسلام ان کی پرواہ کئے بغیر سیدھی راہ پر گامزن رہا۔ دین اسلام یا تو ان کا نوٹس لئے بغیر ان سے آگے بڑھ جاتا یا ان کو تباہ و برباد کر دیتا۔ یہ عجیب بات ہے کہ عصر حاضر کے منکرین حدیث وہی بات کہتے ہیں جو ان کے پیش رو کہہ گئے ہیں مگر دونوں میں ایک نمایاں فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کے پیش رو صراط مستقیم سے منحرف ہوں یا ملحدین میں سے وہ باخبر اور عالم تھے۔ مگر علم کے ہوتے ہوئے وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے تھے۔ بخلاف ازیں دورِ حاضر کے منکرین جاہل مقلدین ہیں اور انہی کے الفاظ کو چبا رہے ہیں۔ تاہم جو شخص ان کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے اس کے مقابلہ میں کبر و غرور کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

مشہور محدِث امام حاکم متوفی ۴۰۵ھ نے اپنی کتاب المستدرک ج ۳ ص ۵۱۳ میں اپنے شیخ الشیوخ ابن خزیمہ متوفی ۳۱۱ھ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ موصوف نے ابوہریرہ پر اعتراض کرنے والوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ من وعن دورِ حاضر کے منکرین حدیث پر صادق آتا ہے

محدّث ابن خزیمہ فرماتے ہیں

(الف) "ابوہریرہ کی مرویات کو ردّ کرنے کی سعی لاحاصل وہی لوگ کریں گے جن کے دلوں کو خدا نے اندھا کر دیا ہو، اور وہ احادیث کے معانی و مطالب کے فہم و ادراک سے قاصر ہوں۔

(ب) جہمیہ و معطلہ کے فرقہ سے تعلق رکھنے والا جب اپنے کافرانہ عقائد کے خلاف ابوہریرہ کی مرویات سنے گا تو وہ بے ہا کانہ ان کو گالیاں دینے لگے گا اور ایسے اتہامات باندھے گا، جن سے ان کا دامن پاک ہے۔ وہ برملا کہے گا کہ ابوہریرہ کی روایات قابل احتجاج نہیں ہیں۔

(ج) ایک خارجی شخص جو امتِ محمدیہ کو واجب القتل تصور کرتا ہو اور کسی امام و خلیفہ کی اطاعت کو ضروری نہ سمجھتا ہو، جب اپنے عقیدہ کے خلاف ابوہریرہ کی روایت کردہ احادیث سنے گا تو اس کا آخری چارۂ کار یہ ہوگا کہ ابوہریرہ پر تنقید کرنے لگے گا۔

(د) تقدیر خداوندی کا منکر اور قدریہ فرقے کا ایک فرد جو اہل اسلام سے الگ ہو چکا ہو اور تقدیر کے قائل مسلمانوں کی تکفیر کرتا ہو، جب ابوہُریرہ کی روایت کردہ احادیث مطالعہ کرے گا جو انہوں نے تقدیر کے اثبات میں بیان کی ہیں تو اپنے کفریہ عقائد کی تائید میں اس کے سوا کوئی دلیل و برہان نہ پائے گا کہ ابوہریرہ کی مرویات ناقابل احتجاج ہیں

(س) ایک جاہل شخص جو کسی خاص فقہی مکتب خیال سے وابستہ ہو اور غلط جگہوں سے اسے تلاش کرتا ہو، جب اپنے مخصوص فقہی مسلک کے خلاف ابوہریرہ کی مرویات دیکھے گا تو ابوہریرہ پر تنقید کرنے لگے گا اور ان احادیث کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا جو اس کے ملک کے خلاف ہیں۔ بخلاف ازیں جب ابوہریرہ کی روایت کردہ احادیث اس کے مسلک کے موافق ہوں گی تو وہ ان سے اپنے مخالفین کے خلاف احتجاج کرے گا۔

(ص) اسی قسم کے فرقہ جات سے وابستہ بعض لوگوں نے ابوہریرہ کی متعدد مرویات کو ماننے سے صرف اس لئے انکار کر دیا کہ وہ ان کا معنی و مطلب سمجھنے سے قاصر رہے، میں اس قسم کی بعض احادیث ذکر کروں گا۔ پھر ابن خزیمہ نے ابوہریرہ کی روایت کردہ چند ایسی احادیث کو ذکر کیا ہے جن کو مشکل قرار دیا گیا تھا اور وارد کردہ اعتراضات کا جواب دیا ہے۔"

یہ ہے سچی بات ابوہریرہ اور ان کی روایت کردہ احادیث کے بارے میں! ائمۂ ہدایت علماء و فضلاء اور کبار فقہاء نے یہی شیوہ اختیار کیا ہے۔ دلیل و برہان اور تاریخ صحیح سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ علمائے حق کا شیوہ یہی ہے کہ وہ نقد و بحث کے دوران عالمانہ پرسکون اور سنجیدہ طرز و انداز اختیار کرتے ہیں۔

کچھ ابوریہ اور اس کی کتاب کے بارے میں

جب میں نے کتاب ہذا کا مقدمہ تحریر کیا اور ابوریہ کے بارے میں مندرجہ صدر حقائق بیان کئے، اس وقت میں نے ابوریہ کی کتاب پر سرسری نگاہ ڈالی تھی۔ ان حالات میں جو کچھ میں تحریر کر سکتا تھا وہ کیا۔ ابوریہ نے حضرت ابوہریرہ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، جب میں نے اس پر غور کیا اور اس کے ذکر کردہ براہین و دلائل کو جانچا پرکھا تو میں نے پورے جزم و وثوق کے ساتھ مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے۔

اوّل۔ ابوریہ نے جو عبارتیں نقل کی ہیں وہ قابل اعتماد نہیں۔ بسا اوقات وہ جو عبارت نقل کرتا ہے، اس میں ایک لفظ کا اضافہ کر دیتا ہے، جس سے مفہوم بدل جاتا ہے۔ اس طرح عبارت سے ابوریہ کا منشا پورا ہو جاتا ہے مگر جس مقصد کے لئے وہ عبارت تحریر کی گئی تھی وہ پورا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ابوریہ ایک لفظ کم کر دیتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فریب دہی اور ملمع سازی کے لئے ایک قول کو اس کے قائل کے علاوہ کسی اور شخص کی جانب منسوب کر دیتا ہے۔ اس قسم کی متعدد مثالیں ہماری نگاہ سے گزر چکی ہیں۔ اب ہم قارئین کرام کے سامنے اس قسم کی بعض مثالیں پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ابوریہ کی امانت و دیانت اور اس کی "علمی تحقیقات" کھل کر سامنے آجائیں۔ اب نمبروار یہ مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ابوریہ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۶۲ حاشیہ نمبر ۳ پر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کے بارے میں لکھتا ہے۔

"عبداللہ بن عمرو کے پاس اہل کتاب کی مذہبی کتابوں کے دو تھیلے تھے وہ ان میں سے لوگوں کو روایتیں سناتے اور ان کو آنحضور ؐ کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔"

ابوریہ نے یہاں حافظ ابن حجر کی فتح الباری جلد ۱ ص ۱۶۶ کا حوالہ دیا ہے۔

حالانکہ فتح الباری میں جو عبارت مذکور ہے اس میں "آنحضور کی طرف منسوب کرنے" کے الفاظ موجود ہی نہیں۔ ابوریہ نے یہ الفاظ از خود بڑھا دئے، اور ان کو فتح الباری کی طرف منسوب کر دیا تاکہ قاری صحابہ کی مرویات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اہل کتاب

میں سے جو لوگ مشرف باسلام ہو گئے تھے، صحابہ ان کے پاس بیٹھتے، اور ان سے گزشتہ اقوام کے حالات سنتے تھے۔ بعض صحابہ ان سے سنے ہوئے واقعات کو اس حیثیت سے بیان کر دیا کرتے تھے کہ وہ اقوام سابقہ کے احوال و کوائف پر مشتمل ہیں۔ مگر ابوریہ صحابہ پر بہتان باندھتا ہے کہ وہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔ پھر اسی بہتان پر بس نہیں کی بلکہ ان کو حافظ ابن حجر کی طرف منسوب کر دیا۔ حالانکہ ابن حجر نے یہ بات نہیں کہی بلکہ کوئی مسلم جو اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ تاریخ انسانیت میں صحابہ کا گروہ صداقت بیانی دینی استقامت اور امتثال اوامر و نواہی میں اپنی مثال آپ تھا۔ ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ صحابہ جانتے تھے کہ جھوٹ بولنے والے خدا کے نزدیک ملعون و مبغوض ہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ابوریہ جیسے اعداء دین دوسروں کو بلاوجہ متہم کرنے ہی سے سکونِ اطمینان محسوس کرتے ہیں۔

(۲) ابوریہ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۱۵ پر البدایہ والنہایہ جلد ۸ ص ۲۰۶ سے نقل کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے کعب الاحبار سے کہا "حدیث رسول" کو روایت کرنا چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں جلاوطن کر دوں گا۔

حالانکہ البدایہ میں "اَلْحَدِیْثَ عَنِ الْاُوَلِ" (اقوام گزشتہ کے واقعات) کے الفاظ ہیں، "عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ" کے الفاظ نہیں ہیں۔ مگر ابوریہ کی علمی امانت و دیانت نے اس کو اس تحریف کی اجازت دے دی تاکہ وہ اپنے اس دعوے کو ثابت کر سکے کہ کعب الاحبار رسول کریمؐ سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے اور صحابہ ان سے حدیثیں اخذ کیا کرتے تھے دراصل ایسے جھوٹ گولڈزیہر جیسے یہودی مستشرقین نے وضع کئے تھے تاکہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ یہودیت کس حد تک دین اسلام پر اثر انداز ہوئی ہے۔ یہود سے یہ سبق ابوریہ جیسے "عظیم محقق" نے سیکھا اور از رہِ مکر و فریب اس کے دلائل بھی ڈھونڈھ نکالے۔

(۳) ابوریہ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۶۳ پر ابن کثیر کی البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۰۶ سے نقل کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابوہریرہؓ کو ڈانٹا تھا کہ حدیثیں روایت کرنا چھوڑ دو، ورنہ میں تمہیں تمہارے قبیلہ کی سرزمین کی طرف جلاوطن کر دوں گا۔

یہ اضافہ ابوریہ کی افترا پردازی کی نمایاں دلیل ہے۔ حالانکہ بات صرف یہ تھی کہ حضرت عمرؓ

نے کعب الاحبار کو گزشتہ اقوام کے واقعات بیان کرنے سے روکا تھا۔ ابن کثیر نے یہی نقل کیا ہے۔ مگر ابوریّہ نے یہاں ابوہریرہ کا نام بلاوجہ شامل کر دیا۔

(۴) ابوریّہ نے اپنی کتاب کے متعدد مقامات پر لکھا ہے کہ حضرات عمرو عثمان و علی وعائشہ و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ابوہریرہ کی تکذیب کرتے تھے۔ پھر اس کے اثبات میں ابن قُتیبہ کی "تاویل مختلف الحدیث" کا حوالہ دیا ہے۔ ابوریّہ اپنی کتاب کے حاشیہ پر لکھتا ہے کہ زور کلام اور قوت استدلال کے اعتبار سے اہل سنت میں ابن قُتَیبہ کو وہی مرتبہ ومقام حاصل ہے جو جاحظ کو معتزلہ کے نزدیک۔ اس سے ابوریّہ کا مقصد قاری کو یہ تاثر دینا ہے کہ جب ابن قُتَیبہ جیسا بلند پایہ شخص ابوہریرہ پر نقد وجرح کر رہا ہے تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابوہُریرہ رسول کریم کی احادیث روایت کرنے میں جھوٹا ہے۔

حالانکہ ابن قُتَیبہ نے مذکورہ صدر کتاب ان لوگوں کی تردید میں لکھی ہے، جنہوں نے عصر صحابہ سے لے کر مصنف کے عصر وعہد تک محدثین کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ محدثین پر نقد وجرح کرنے والے نظّام اور اس کے ہمنوا معتزلہ تھے۔ ابن قُتیبہ نے ان گالیوں کی تفصیل بیان کی ہے جو نظّام معتزلی نے ابوبکر وعمرو عثمان و علی وابن مسعود وابوہُریرہ و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو دی ہیں، پھر صحابہ کا دفاع کیا اور نظّام کے قول کا بُطلان ثابت کیا ہے عجیب ستم ظریفی یہ ہے کہ نظّام نے ابوہریرہ کے بارے میں جو کچھ کہا ابوریّہ نے اس کو ذکر کیا اور اس کو ابن قُتَیبہ کی طرف منسوب کر دیا اور یہ بات تحریر نہ کی کہ ابن قتیبہ نے نظّام کی تردید کی، اور اس کے قول کا ابطال کیا ہے۔ ٹھیک ہے ابوریّہ جیسے محققین کے نزدیک علمی امانت ودیانت اسی کو کہتے ہیں۔

(۵) ابوریّہ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۹۵ پر سید رشید رضا مرحوم کا کلام کعب اور وَھب بن مُنبّہ کے بارے میں نقل کیا اور لکھا ہے کہ "تمام روایات یا صرف موقوف روایات ان دونوں سے منقول ہیں" یہاں ابوریّہ نے "تلک" کا لفظ حذف کر دیا ہے، جس سے سید رشید رضاء مرحوم نے کعب ووہب کی ان مرویات کی جانب اشارہ کیا تھا جو وہ اہل کتاب سے نقل کرتے تھے۔ ابوریّہ نے یہ لفظ اس لئے حذف کیا تاکہ اس سے یہ مفہوم پیدا ہو کہ صحابہ کی تمام مرویات ان دونوں

سے ماخوذ ہیں۔ اب ذرا ابوریہ کی اس توڑ مروڑ اور کھینچا تانی کا اندازہ لگائیے جو صرف اس لئے کی گئی ہے کہ عبارت کو اپنے مقصد کے مطابق ڈھالا جا سکے۔

یہ ایسی مثالیں ہیں جن میں اختلاف و نزاع کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ ان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ابوریہ عبارت میں کس قدر تصرف کرتا ہے اور ان کو قائلین کے علاوہ دوسرے لوگوں کی جانب منسوب کر دیتا ہے۔ میری نگاہ میں انتہائی متعصب مستشرق بھی عبارتوں میں اس قسم کی تحریف کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ یہ ابوریہ جیسے محقق ہی کا دل گردہ ہے۔ اب ایسے محقق علامہ اور صاحب امانت و دیانت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

دوم: ابوریہ نے جمہور علماء کے خلاف جو نظریہ اختیار کیا ہے، اس کی تائید و تثبیت میں وہ علماء کے ایسے اقوال نقل کرتا ہے، جو موضوع زیر بحث سے متعلق نہیں، بلکہ دوسرے مواقع پر کہے گئے ہیں۔ ابوریہ کا مقصد قاری کو یہ تاثر دینا ہے کہ وہ اپنے زاویۂ نگاہ کو علمائے متقدمین کے اقوال سے ثابت کر رہا ہے۔

ہم اس کی مثال میں ابوریہ کا یہ دعویٰ ذکر کرتے ہیں کہ ابو ہریرہ مُدَلِّس ہے۔ حالانکہ ابوہریرہ جب کوئی حدیث کسی صحابی سے سنتے ہیں اور اس کو نبی کریم کی جانب منسوب کر دیتے ہیں تو سب علماء اس کو اِرسال کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جملہ محدثین کے نزدیک ارسال جائز اور درست ہے اور ابوہریرہ کے علاوہ متعدد صحابہ مُرسَل روایات بیان کیا کرتے تھے۔ مگر ابوریہ سب علماء کے برعکس اس کو تدلیس قرار دیتا ہے، اور مُدَلِّسِین کی جرح و نقد اور اس کو ناقابلِ اعتماد قرار دینے کے سلسلہ میں علماء کے اقوال ذکر کرتا ہے۔ تاکہ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہو کہ علماء کے وضع کردہ قواعد کے مطابق ابوہُریرہ کی روایت کردہ احادیث ناقابل احتجاج ہیں۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ابوریہ حضرت ابوہُریرہ پر دروغ گوئی کا الزام عائد کرتا ہے پھر علماء کے اقوال ذکر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ بھی رسول کریمؐ پر جھوٹ باندھے اس کی مرویات ناقابل احتجاج ہیں۔ بلکہ بعض علماء اس کی تکفیر کرتے ہیں۔ ابوریہ کا مقصد ابوہریرہ کو اس کا مصداق ٹھہرانا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابوریہ ایک غلط مقدمہ کو صغریٰ بناتا اور اس کے ساتھ ایک مسلّمہ مقدمہ کو کُبریٰ کے طور پر لاتا ہے اور پھر اس سے حسب خواہش

نتیجہ نکال لیتا ہے۔ گویا وہ حریف مقابل پر ایسا الزام عائد کرتا ہے، جس سے اس کو مجال انکار نہ ہو۔

ابوریہ آغاز بحث میں لکھتا ہے کہ اَخبارِ آحاد سے ظنّی علم حاصل ہوتا ہے۔ اور ظنّ سے حق ثابت نہیں ہوتا۔ اس سے نتیجہ نکالتا ہے کہ اخبار آحاد سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا صُغریٰ کو ثابت کرنے کے لئے ابوریہ نے علماء کے اقوال نقل کئے ہیں لہٰذا صغریٰ درست ہے مگر کبریٰ ناقابلِ تسلیم ہے۔ اس لئے نتیجہ بھی صحیح نہیں۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ منطقی قیاس اسی صورت میں درست ہوتا ہے جب دونوں مقدمات مسلّمہ ہوں۔

تمام مباحث میں ابوریہ نے یہی اسلوب و انداز اختیار کیا ہے۔ وہ مستند اور قابل اعتماد علمی کتب کے حوالے بکثرت دیتا ہے۔ حالانکہ وہ اس کے رجحانات و میلانات سے یک رنگ و ہم آہنگ نہیں ہوتے بلکہ اس کے برخلاف ہوتے ہیں۔ اس سے اس کا مقصد ان سادہ دل قارئین کو دھوکہ دینا ہے جو ان علمی مباحث سے بے بہرہ ہیں۔

سوم: ابوریہ دانستہ عبارتوں کا مطلب و مفہوم غلط سمجھتا ہے۔ وہ ان کے فہم و ادراک میں سینہ زوری سے کام لیتا ہے اور ان سے حسب خواہش مفہوم مراد لیتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رض کے قول "ملأ بطنی" کو اس نے غلط معنی پہنائے ہیں ہم قبل ازیں اس پر بحث کر چکے ہیں۔ اسی طرح ابوریہ نے بشیر بن سعد کے قول کو جو ابوہریرہ کے اصحاب و تلامذہ کے بارے میں ہے غلط معنی پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ جو روایات کعب سے نقل کرتے ہیں وہ ان کو رسول کریم کی احادیث قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ابوہریرہ کی رسول کریم سے اخذ کردہ احادیث کو کعب کی مرویات قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم قبل ازیں اس پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ متعصب مستشرقین کا طرز و انداز یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باانصاف علمائے محققین جو ان کے بعد پیدا ہوئے ہیں اُن کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان پر اعتماد نہیں کرتے۔

چہارم: ابوریہ کے قلب و ذہن پر جو نظریہ مسلّط ہو چکا ہے، اس کی تاکید و تائید کے پیش نظر وہ ایسے دلائل کو ٹھکرا دیتا ہے، علماء نے جن کی صحت پر اجماع منعقد کیا ہے۔ بخلاف ازیں وہ ان جھوٹی روایات کو سند کا درجہ دیتا ہے علماء نے بالاتفاق جن کو باطل قرار دیا ہے۔ ابوریہ کے

نزدیک وہ من گھڑت قصے قابل اعتماد ہیں جو ادبی مجالس میں بیان کئے جاتے ہیں اور جو ایسے مصادر سے ماخوذ ہیں، علماء کے نزدیک جن کو کوئی وقعت حاصل نہیں اور جن کی نہ سند مذکور ہے اور نہ ان کے قائل کا کچھ پتہ ہے۔

بنابریں ابوریہ پوری بے باکی اور شانِ بے نیازی سے ان روایات کو ٹھکرا دیتا ہے جو احادیث صحیحہ پر مشتمل کتب مثلاً بخاری و مسلم و سنن اربعہ و دیگر کتب میں ابوہریرہ کی چادر پھیلانے کے سلسلہ میں مذکور ہیں۔ اس روایت کی تکذیب میں وہ مذاق اور استہزاء کی پست سطح تک اتر آتا ہے۔ اس کے عین برعکس الدمیری کی کتاب الحیوان شرح ابن ابی الحدید عیون الاخبار اور مقامات بدیع الزمان ہمدانی کے مندرجات اس کی رائے میں نہایت معتمد ہیں۔

متعصب مستشرقین کا یہی شیوہ رہا ہے جیسا کہ ہم قبل ازیں اس کی طرف ارشارہ کر چکے ہیں۔ ابوریہ بھی اسی ڈگر پر گامزن ہے اور اس کا رویہ کسی طرح بھی مستشرقین سے مختلف نہیں ہے

پنجم:- ابوریہ نے ابوہریرہ کو بُرا بھلا کہنے ان کی تکذیب کرنے اور حدیث و راویان حدیث کو مشکوک قرار دینے کے سلسلہ میں گولڈزیہر اسپرنگر اور وان کریمر جیسے متعصب مستشرقین اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا پر اعتماد کیا ہے۔ ابوریہ اس پر سر دھنتا اور اظہار فخر و مباہات کرتا ہے کہ وہ ان لوگوں سے اخذ و استفادہ کرتا ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابہ کو گالیاں دینے کے سلسلہ میں ان سے سبق لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابوریہ مستشرقین کے مقابلہ میں زیادہ دریدہ دہن گستاخ زبان دراز اور شوخ چشم واقع ہوا ہے۔ جرمنی کے ڈاکٹر اسپرنگر کو دیکھئے وہ ابوہریرہ کے بارے میں کہتا ہے۔

"ابوہریرہ ورع و تقویٰ کے پیش نظر وضع حدیث سے کنارہ کش رہتے تھے۔"

ڈاکٹر اسپرنگر نے اگرچہ ابوہریرہ کی جانب کذب کو منسوب کیا ہے مگر ابوریہ نے حضرت ابوہریرہ کو جس طرح سب و شتم اور بدترین ہجو کا نشانہ بنایا ہے، اس کے پیش نظر اسپرنگر کے الفاظ تسبیح معلوم ہوتے ہیں۔ اسپرنگر نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ بکثرت احادیث جن کو راوی ابوہریرہ کی جانب منسوب کرتے ہیں، پچھلے تاریخی ادوار میں وضع کی گئی تھیں۔ گویا اسپرنگر حضرت ابوہریرہؓ کو ان احادیث کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا۔ بخلاف ازیں ابوریہ کو ان تمام جھوٹی احادیث کا ذمہ دار قرار دیتا

ہے اور ان سے ایسے نتائج اخذ کرتا ہے جو حق و صدق سے نہایت بعید ہیں۔

ہم قبل ازیں ابوریہ کا یہ دعویٰ ذکر کر چکے ہیں کہ ابوہریرہ آنحضورؐ پر جھوٹ باندھنے کو جائز قرار دیتے تھے۔ بشرطیکہ اس سے کسی حلال چیز کی تحریم اور حرام چیز کی تحلیل نہ ہوتی ہو، پھر ابوریہ چند احادیث سے استشہاد کرتا ہے جو ابوہریرہ سے مروی ہیں۔ حالانکہ ائمہ حدیث نے صراحۃً کہا ہے کہ ان احادیث کو وضع کر کے حضرت ابوہریرہ کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ اسی طرح مستشرقین کا تلمیذ رشید ابوریہ اپنے اساتذہ سے گوئے سبقت لے جاتا ہے۔ مگر ابوریہ یہ برتری ذکاوت و فطانت میں حاصل نہیں کرتا اور نہ ہی بحث و ادب کے سلیقہ و اسلوب کے اعتبار سے بخلاف ازیں وہ ایک اور ہی چیز میں ان پر فوقیت حاصل کرتا ہے۔

ششم - ابوریہ کا دامن ادب و شائستگی سے عاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تحریر و تقریر کے دوران ایسے شوقیانہ اور گھٹیا الفاظ استعمال کرتا ہے جو کتابوں میں لکھے نہیں جاتے، بلکہ کمینے لوگوں کی مجالس اور بازاریں بولے جاتے ہیں۔

ابوریہ آغاز بحث میں لکھتا ہے کہ کذب کے معنی یہ ہیں کہ خبر واقعہ کے مطابق نہ ہو، خواہ دانستہ ہو یا نادانستہ۔ پھر کہتا ہے "لعنۃ اللہِ علی الکاذبین متعمدین أو غیر متعمدین" (جھوٹوں پر خدا کی لعنت خواہ وہ دانستہ جھوٹ بولیں یا نادانستہ) حالانکہ ابوریہ اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ کبار صحابہ محدثین فقہاء اور علماء سے روایت کرنے اور فتویٰ دینے میں خطاء اور وہم کا صدور ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ سب لوگ ابوریہ کے نزدیک خدا کی لعنت کے مورد ہیں، یہ عدل خداوندی کی کرشمہ سازی ہے کہ ہم نے متعدد مقامات پر ابوریہ کے کذب عمد کی نشان دہی کی ہے۔ (اور اس طرح وہ خود ہی خداوندی لعنت کا مستوجب قرار پایا)۔

ذرا ابوریہ کے وہ ناشائستہ الفاظ ملاحظہ فرمائیے جو اس نے حضرت معاویہؓ، ابوہریرہؓ اور ان لوگوں کے بارے میں کہے ہیں جو اس کی نادر علمی تحقیقات سے متفق نہیں ہیں۔ ابوریہ نے ان کو فحش گالیاں دی ہیں اور ان کے حق میں بدترین الفاظ استعمال کئے ہیں۔ میں یہ پڑھ کر محوِ حیرت و استعجاب تھا کہ ایک باعزت شخص کی زبان و قلم سے ایسے نازیبا کلمات کیونکر صادر ہو سکتے ہیں۔ میری حیرانی تب دور ہوئی جب ابوریہ کو ذاتی طور پر جاننے والے ایک شخص نے مجھے

بتایا کہ وہ کس افتادِ طبع کا انسان ہے۔ یہ مثل کس قدر صحیح ہے کہ کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْہِ" (برتن سے وہی چیز ٹپکتی ہے جو اس میں ہوتی ہے)۔

ہفتم :۔ ابوریۃ نے اپنی کتاب کے ہر صفحہ پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ ایک نادرۂ روزگار (عبقری) شخصیت ہے۔ جس نے ایسے حقائق کی نشان دہی کی ہے جو آج تک کسی کو معلوم نہ ہو سکے۔ ابوہریرہ کے بارے میں جن معلومات کا سراغ اس نے لگایا ہے، وہ ان آٹھ صد صحابہ و تابعین سے پوشیدہ رہے، جنہوں نے ابوہریرہ سے اخذ و استفادہ کیا تھا۔ ابوریۃ کے نزدیک حضرات صحابہ بشمول فاروق اعظمؓ بڑے غفلت پیشہ اور سادہ لوح واقع ہوئے تھے۔ ان کی سادگی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ محض اس لئے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے کہ اس کی تعلیمات میں باطل کی آمیزش کردیں وہ ان کے سامنے رسول کریمؐ پر جھوٹ باندھتے اور اس کو لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ مگر ان میں ابوریۃ کی سی ذہانت نہ تھی جس سے وہ بھانپ جاتے کہ یہ لوگ فریب خوردہ اور فریب دہندہ ہیں۔ بخلاف ازیں صحابہ نو مسلم اہل کتاب کے دام فریب میں آگئے، ان سے حدیثیں روایت کرتے رہے اور اُن کو دین میں باطل کی آمیزش کرنے کی کھلی چھٹی دے دی۔ چنانچہ یہ لوگ آزادانہ طور پر مسلمانوں کے عقائد بگاڑتے رہتے، ہر طرف دندناتے رہے اور صحابہ و تابعین ان کو عزت و عظمت اور تقدس و طہارت کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔

عصر صحابہ و تابعین کے بعد جو تاریخی ادوار آئے اور جن میں ہزاروں علماء فقہا، مجتہدین اور محدثین پیدا ہوئے، ابوریۃ ان سب کو غفلت اور سادہ لوحی کے ساتھ متہم کرتا اور کہتا ہے کہ جس بات کا احساس مجھے ہوا ان میں سے کسی کو بھی نہ ہوا۔ جو حقائق میں نے اس کتاب میں ودیعت کئے ہیں وہ ان سے غافل رہے، اور ایسی کتاب تصنیف نہ کر سکے۔ حالانکہ ایسی کتاب آج سے ایک ہزار سال پہلے لکھی جانی چاہیئے تھی۔ افسوس کہ متقدمین یہ اہم کام انجام نہ دے سکے اور اس کا بیڑا میں نے اٹھایا، جس کے بعد علوم اسلامیہ کا طرز و انداز ہی بدل گیا ہے۔

ابوریۃ نے زبان سے یہ بات کہی اور اپنے قلم سے تحریر کی۔ اس کی کتاب کا کوئی صفحہ اس سے خالی نہیں ہے۔ ابوریۃ کا یہ سب کبر و غرور اور اظہار فرحت و مسرت ایک بات کی بولتی

تصویر ہے۔ اور وہ یہ کہ اس سے اس کی دانائی و فرزانگی کا پتہ چلتا ہے۔ خداوند کریم نے جس طرح انسانوں کو رزق تقسیم کیا ہے، اسی طرح عقل و ادراک بھی بانٹا ہے۔

ہشتم۔ ابوریہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس کتاب میں اس نے ایسے براہینِ قاطعہ و دلائل ساطعہ ذکر کئے ہیں، جن میں شک و ریب اور ضعف کی کچھ گنجائش ہی نہیں، ابوریہ کے اس دعویٰ کی تحقیق ان مصادر و مآخذ سے کی جا سکتی ہے، جس سے اس نے جمہور اہل اسلام کے خلاف یہ مواد نقل کیا ہے۔ ابوریہ نے جن مصادر سے استفادہ کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حیاۃ الحیوان دمیری
۲۔ العمدہ ابن رشیق
۳۔ المعارف ابن قتیبہ
۴۔ نہایۃ الارب نویری
۵۔ البیان والتبیین جاحظ
۶۔ الحیوان جاحظ
۷۔ عیون الاخبار ابن قتیبہ
۸۔ رحلۃ ابن جُبیر
۹۔ الخطط مقریزی
۱۰۔ الفخری ابن طباطبا
۱۱۔ معجم الادباء یاقوت
۱۲۔ تاریخ بغداد خطیب بغدادی
۱۳۔ تاریخ ابن عساکر
۱۴۔ تاریخ ابوالفداء
۱۵۔ النجوم الزاہرہ
۱۶۔ معجم الحیوان معلوف پاشا
۱۷۔ ابوہریرہ عبدالحسین
۱۸۔ خزانۃ الادب بغدادی
۱۹۔ خاص الخاص ثعالبی
۲۰۔ ثمار القلوب ثعالبی
۲۱۔ الصداقۃ والصدیق توحیدی
۲۲۔ نکت الہمیان صفدی
۲۳۔ شرح لامیۃ العجم الطوانی
۲۴۔ تاریخ التمدن الاسلامی جُرجی زیدان
۲۵۔ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان
۲۶۔ دائرۃ المعارف الاسلامیۃ
۲۷۔ الحضارۃ الاسلامیۃ کریمر
۲۸۔ السیادۃ العربیۃ فولتین
۲۹۔ حضارۃ الاسلام ابراہیم بازجی
۳۰۔ تاریخ العرب فلپ ہٹی
۳۱۔ تاریخ الشعوب الاسلامیۃ بردکلمان
۳۲۔ المسیحیۃ فی الاسلام لوقا
۳۳۔ العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام گولڈزیہر

یہ ہیں وہ مصادر جن کی فہرست ابوریّہ نے اپنی کتاب کے آخر میں دی ہے اور جن کے بارے میں یہ بلند بانگ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ایسے دلائل ہیں جن میں شک و ضعف کا کوئی احتمال موجود نہیں ہے۔ بخلاف ازیں جو دلائل بخاری و مسلم و مسند احمد و مؤطا و نسائی و ترمذی و دیگر معتمد کتب حدیث سے ماخوذ ہیں، ان میں سے جس کو چاہا ردّ کر دیا۔ اس لئے کہ ان دلائل میں شک و شبہ اور اور ضعف کا احتمال ہے۔

ذرا غور فرمایئے کہ:۔

۱۔ بخاری کے مندرجات مشکوک ہیں مگر الاسکافی کی بیان کردہ حکایات قابل اعتماد ہیں۔

۲۔ مسلم کی روایات ضعیف ہیں، البتہ ثعالبی کی صداقت شک و شبہ سے بالا ہے۔

۳۔ احمد بن حنبل جھوٹی روایتیں بیان کرتے ہیں، مگر ابن ابی الحدید کی ہر روایت سچی ہے۔

ایسی باتیں کہنے والے کے بارے میں مَیں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ مگر جس عظیم ادیب نے ابوریّہ کی کتاب پر تقریظ لکھی، اس پر تحسین و توصیف کے پھول نچھاور کئے ہیں، اور ہمارے دیار و بلاد میں علمی طرز و انداز کی طرح ڈالی ہے، میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ایسی کتاب لکھنے والے شخص کا شمار علماء طلباء یا ان لوگوں کے زمرہ میں ہو سکتا ہے جو جانتے ہوں کہ "علم" کیا چیز ہوتی ہے؟

نہم = ابوریّہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اپنی کتاب کو علمی تحقیق کے قواعد و اصول پر مرتب کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب کے لئے کونسا طرز و منہاج وضع کیا ہے؟ اس نے احادیث کی جانچ پرکھ کے لئے کون سا مقیاس و معیار مقرر کیا ہے؟ ہمارے پاس کتب حدیث کا جو ذخیرہ موجود ہے اس کو کیا کریں؟ کیا سب کو پھینک دیں؟ کیا سب کو تسلیم کریں یا بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں؟ اس کے اصول و قواعد کیا ہیں؟ اگر حدیثوں کے جانچنے پرکھنے کا معیار عقل ہے تو سوال یہ ہے کہ کس کی عقل؟ کیا ابوریّہ کی عقل جس نے احادیث صحیحہ کو ٹھکرا دیا ہے اور جھوٹی کہانیوں کی تصدیق کی ہے؟ جس نے بخاری کی روایات کو ردّ کر دیا مگر الاسکافی کی کہانیوں کو درست قرار دیا۔ نیز یہ کہ ہم ابوہریرہ کی مرویات کو کیا کریں؟ کیا یہ سب جھوٹ کا پلندہ ہیں یا بعض جھوٹی ہیں یا بعض سچی؟ پھر یہ کہ احادیث صحیحہ و ضعیفہ کو جانچنے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟

ابوریہ نے اپنی انفرادیت و عبقریت جتانے کے لئے بتایا ہے کہ علمائے سابقین خواب غفلت میں گرفتار تھے یہی وجہ ہے کہ وہ حدیث کی چھان پھٹک کے لئے قواعد صحیحہ وضع نہ کر سکے۔ یہ اہم کام صرف وہی انجام دے سکا ہے۔ حالانکہ ابوریہ نے جو کام کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ حدیث نبوی اور اس کے رواۃ و رجال از صحابہ تا تابعین کو مشکوک ثابت کرنے کے لئے جو کچھ کیا جا سکتا تھا ابوریہ نے اس سے گریز نہیں کیا۔ ابوریہ کی رائے میں یہ حدیث نبوی ؐ کی عظیم خدمت ہے۔

کیا اسی کو علمی و تحقیقی طرز و منہاج کہتے ہیں؟ کیا یہی وہ درس و مطالعہ ہے، جو علمی تحقیقات کے قواعد و اصول پر مبنی ہے اور جس کی نظیر آج تک دیکھنے میں نہیں آئی؟

میں شہادت دیتا ہوں کہ واقعی تاہنوز کسی شخص نے جو آپ اپنی عزت کرنے کا عادی ہو اور جو اپنی اور اپنے قارئین کی عقل کو وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہو ایسی کتاب تحریر نہیں کی۔ ابوریہ کے لئے یہ شرف کافی ہے۔ اس سے بڑھ کر جو بات اس کے لئے سرمایۂ فخر و مباہات ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اپنی کتاب کی تصنیف پر تیس سال سے بھی زیادہ عرصہ تک سعی و کاوش انجام دی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ (الکہف: ۱۰۳، ۱۰۴)	آپ فرما دیں کیا ہم بتائیں کہ گھٹیا اعمال والے کون ہیں؟ وہ لوگ جن کی کوشش دنیوی زندگی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اچھے کام کرتے ہیں۔

سابقہ بیانات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ ابوریہ کی تصنیف دو وجوہات کی بناء پر کسی علمی قدر و قیمت کی حامل نہیں ہے۔

(۱) کتاب کا طرز تحریر علمی و ادبی نہیں ہے۔

(۲) اس کا مصنف علمی امانت و دیانت سے بے بہرہ ہے۔

وَاللّٰهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ ۝ (الاحزاب: ۴)

فصل ہفتم

حدیث نبوی اور مستشرقین

صلیبی لشکر دو اسباب کے پیش نظر اسلامی دیار و بلاد پر حملہ آور ہوئے تھے۔

اوّل: اس کی ایک وجہ وہ اندھا مذہبی تعصب تھا جو ارباب کلیسا نے یورپین اقوام میں پیدا کر دیا تھا۔ پادریوں نے مسلمانوں پر بدترین قسم کے الزامات عائد کر کے عیسائیوں کو اس بات پر آمادہ کر دیا تھا کہ مسیح کی ولادت گاہ کو ان کفار (اہل اسلام) کے ہاتھوں سے چھڑایا جائے۔ چنانچہ صلیبی فوجوں میں ایسے لوگوں کی اکثریت تھی جو نیک نیتی سے مذہبی تعصب کے پیش نظر اپنی جانیں قربان کرنے اور گھربار کو چھوڑنے کے لئے چل کھڑے ہوئے تھے۔ صلیبی فوجیں مسلمانوں پر پیہم اور مسلسل حملے کرتی رہیں۔

دوم: صلیبی جنگوں کا دوسرا بڑا محرک سیاسی و سامراجی غایات و مقاصد تھے۔ یورپ کے بادشاہوں نے سن رکھا تھا کہ اسلامی دیار و امصار عموماً و سرزمین شام خصوصاً تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے۔ اس میں دولت و ثروت کی ریل پیل ہے۔ یہاں کی اراضی زرخیز و شاداب ہے اور ہر جگہ سکون و طمانیت کا دَور دورہ ہے۔ اسی حرص و آز کی کرشمہ سازی تھی کہ وہ مسیحؑ کے نام پر کشاں کشاں اپنی فوجوں کو لئے اسلامی ممالک پر حملہ آور ہو گئے۔ ان کا مقصد وحید حرص استعمار کی تسکین شاندار کامیابی اور مسلمانوں کی دولت و ثروت کی لوٹ کھسوٹ تھی۔

ادھر خدا کو یہ منظور تھا کہ صلیبیوں کے دو صد سالہ حملوں کو ناکام و نامراد بنا دے اور ان کو مایوس لوٹا دے۔ چنانچہ جو علاقے انہوں نے فتح کئے تھے، مسلمانوں نے ان سے واپس لے لئے اور وہ دلوں میں حسرتوں اور امنگوں کو لئے یورپ لوٹ گئے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ صلیبی جاتے وقت اپنے ہمراہ اسلام کی روشن شعاعیں اور مسلم تہذیب و حضارت لیتے گئے، جن سے ان کے بلاد و دیار محروم تھے۔ اس میں شک نہیں کہ صلیبی فوجیں محروم غنیمت یورپ لوٹ گئیں، مگر اُن

کے اُمراء و حکام اس عزم صمیم کو سینہ میں لئے واپس گئے کہ کتنی ہی مدت کیوں نہ گزر جائے وہ ایک نہ ایک دن اسلامی ممالک کو فتح کر کے رہیں گے۔

فوجی غلبہ سے محرومی کے بعد اہل یورپ نے منصوبہ بنایا کہ اسلامی افکار و عقائد کا مطالعہ کیا جائے اور مسلمانوں کے خلاف فکری و ثقافتی جنگ لڑی جائے۔ اس طرح مستشرقین کی انجمنوں کی داغ بیل پڑ گئی، جو آج تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ اس قسم کی انجمنیں قریب زمانہ تک یہود و نصاریٰ کے مذہبی اشخاص سے تشکیل پذیر ہوتی رہیں۔ یہ لوگ اپنے دل میں اسلام کے خلاف بے حد بغض و نفرت رکھتے تھے۔ اگرچہ اسلام پسند یورپین علماء کا ایک گروہ ان متعصب مشتریوں کے خلاف نبرد آزما رہا ہے۔ وہ عدل و انصاف کے دائرہ میں رہ کر اسلامی علوم و فنون پر کام کرتے تھے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی اکثریت نہایت متعصب اہل علم پر مشتمل رہی ہے، جن کا کام اسلام کو بگاڑ کر غلط انداز میں پیش کرنا اور اس کے حسن و جمال کو مسخ کرنا تھا۔ مستشرقین میں، ایسے لوگ بھی شامل رہے ہیں جو سامراجی عزائم رکھتے تھے اور اسلامی تہذیب و حضارت کو غلط رنگ دے کر مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔

مستشرقین کے افکار و آراء کی خصوصیات حسب ذیل تھیں :-

(۱) اسلام کے اغراض و مقاصد کے بارے میں بدگمانی پیدا کرنا۔

(۲) لوگوں کو مُسلم علماء و عُظماء سے بدظن کرنا۔

(۳) مختلف عصور و ازمنہ خصوصاً عصرِ اول کے مسلم معاشرہ کی تصویر اس رنگ میں کھینچنا جس سے واضح ہو کہ اس میں انتشار و خلفشار کی فراوانی تھی اور مسلمانوں کے اکابر انانیت کے مرض میں گرفتار تھے۔

(۴) اسلامی تہذیب و حضارت کی تحقیر و تذلیل کے نقطۂ خیال سے خلافِ واقعہ بھیانک انداز میں اس کی صورت گری کرنا۔

(۵) اسلامی معاشرہ کی حقیقی خصوصیات سے نابلد ہونے کے باوجود صرف ظنّ و تخمین کی اساس پر مسلمانوں کے اخلاق و عادات کی نشان دہی کرنا۔

(۶) اپنے ذاتی مفروضات کے پیشِ نظر نصوصِ کتاب وسنت کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اور حسبِ مرضی ان کو ردّ کرنا اور قبول کرنا۔

(۷) بسا اوقات حسبِ مرضی نصوصِ کتاب وسنت کی تحریف کرنا اور جب تحریف کا امکان نہ ہو، اس وقت عبارت کا غلط مفہوم سمجھنا۔

(۸) جن مصادر و مآخذ سے وہ نقل کرتے ہیں، ان میں سینہ زوری سے کام لینا۔ مثلاً وہ کتبِ ادب سے اقتباس لے کر اس کی اساس پر تاریخِ حدیث کے بارے میں فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ اسی طرح کتبِ تاریخ سے حوالہ لے کر اس کی بنیاد پر تاریخِ فقہ کے بارے میں فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ دمیری نے حیٰوۃ الحیوان میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس کو مانتے ہیں اور مؤطا امام مالک کی روایت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ خواہشات کی پیروی اور حق وصداقت سے اعراض وانحراف کی خاطر عمل میں لایا جاتا ہے۔

مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تاریخ فقہ تفسیر حدیث ادب اور تہذیب وثقافت سے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے، اس میں یہ رُوح صاف جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی حکومتیں اس ضمن میں ان کی پشت پناہی اور حوصلہ افزائی کرتی رہیں۔ مصادر و مآخذ کی کمی نہ تھی۔ وہ فکرِ معاش سے بے نیاز پورا وقت اس کام پر صرف کرتے تھے، وہ اسلامی علوم وفنون میں سے کسی ایک کو اپنے لئے مخصوص کر لیتے، اور اسی کے لئے اپنی تمام تر مساعی وقف کر دیا کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے نتائج افکار علمی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ ان کے پاس علمی کتب کا اس قدر ذخیرہ تھا جو آج ہمارے علماء کو میسّر ہی نہیں، ہمارے علماء ایک ایسے معاشرہ میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں، جس میں سیاسی ہلچل بپا رہتی ہے۔ معاشی فارغ البالی نصیب نہیں۔ مستشرقین کو جو فراغت نصیب ہے۔ اس کا عشر عشیر بھی یہاں موجود نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے دیار و بلاد میں جو لوگ مغربی تہذیب کے دلدادہ اور بیرونی زبانوں سے واجبی سی واقفیت رکھتے تھے، مستشرقین کے نظریات و افکار اور ان کی تصانیف پر لٹو ہو گئے۔ ہمارا یہ نام نہاد مہذب طبقہ مستشرقین کے دامِ فریب میں آ گیا اور ان کی علمی قابلیت اور

اخلاص کا لوہا ماننے لگا۔ یہ لوگ مستشرقین کے افکار کو من وعن نقل کرنے لگے۔ بعض لوگ مستشرقین سے اخذ و استفادہ کو اپنے لئے سرمایۂ فخر و مباہات تصور کرنے لگے۔ بعض لوگ اس کو جدید اسلامی رنگ دیتے۔ میں مثالیں ذکر کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ استاذ احمد امین نے "فجر الاسلام" میں اور ابوریہ نے "اضواء علی السنۃ المحمدیہ" میں جو رویۃ اختیار کیا ہے، وہ یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے مستشرقین کی شاگردی کا فخر حاصل کیا ان کا طرز و انداز کیسا تھا۔

حدیث نبوی کے بارے میں مستشرقین کا موقف:

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم بتائیں گے کہ مستشرقین نے حدیث نبوی سے متعلق کیا موقف اختیار کیا تھا؟ انہوں نے حدیث کے بارے میں کن شبہات کا اظہار کیا اور مسلم مصنفین ان سے کس حد تک متاثر ہوئے؟ غالباً مستشرقین میں سب سے زیادہ اہم وسیع العلم اور اس میدان میں سب سے زیادہ خطرناک اور مفسد شخصیت یہودی مستشرق گولڈ زیہر (GOLDZEHR) کی ہے۔ کچھ یوں معلوم دیتا ہے کہ یہ مستشرق عربی مصادر و مآخذ سے پوری واقفیت رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کو شیخ المستشرقین کے لقب سے نوازا گیا ہے۔ عصر حاضر کے مستشرقین کے یہاں اس کی تصنیفات اور مضامین ایک اہم اور مستند ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ استاذ احمد امین نے اپنی کتاب فجر الاسلام اور ضحی الاسلام میں تاریخ حدیث کے موضوع سے متعلق نام لئے بغیر اس کے بہت سے افکار و نظریات نقل کئے ہیں۔ بعض جگہ اس کا نام لے کر بھی بعض افکار کو اس کی جانب منسوب کیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے اپنی کتاب "نظرۃٌ عامۃٌ فی تاریخ الفقہ الاسلامی" میں تاریخ حدیث کے بارے میں اس یہودی مستشرق کے شکوک و شبہات بیان کئے ہیں۔ یہ نظریات گولڈ زیہر کی کتاب "العقیدہ والشریعۃ فی الاسلام" میں پوری تفصیلات کے ساتھ ملتے ہیں۔ استاذ محمد یوسف موسیٰ، عبدالعزیز، عبدالحق اور ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے اس کتاب کو عربی کا جامہ پہنایا ہے۔

میں گولڈ زیہر کے افکار و آراء پر نقد و تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میں اس کے ہر ہر لفظ پر تنقید کرنے سے قاصر ہوں۔ اس کے لئے ایک جداگانہ مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت ہے

گولڈ زیہر کے تحریر کردہ مباحث اس قدر طویل الذیل ہیں کہ اس مختصر کتاب میں فرداً فرداً ان کو سمونے کی گنجائش نہیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں اس کے عمومی رجحانات اور اس کے تحریر کردہ اہم مباحث کی جانب اشارہ کر دوں۔ اور تفصیلی تردید کسی دوسری فرصت کے لیے اٹھا رکھوں۔ خداوند رحیم و کریم سے عمر میں اتنی وسعت چاہتا ہوں کہ یہ ضروری کام انجام دے سکوں۔

ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر اپنی کتاب "نظرۃ عامۃ فی الفقہ"، صفحہ ۱۲۶ پر لکھتے ہیں:۔

"ایک نہایت اہم مسئلہ در پیش ہے جس پر ہم تفصیلی بحث کرنا چاہتے ہیں۔ وہ عصر حاضر میں وضع حدیث کا مسئلہ ہے۔ تھوڑا عرصہ پہلے مستشرقین کے یہاں یہ رائے غالب رہی ہے کہ اکثر احادیث نبویہ آغاز اسلام کے عہد کی دستاویز نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ان مساعی و جہود کا نتیجہ ہیں، جو مسلمانوں نے پچھلے تاریخی ادوار میں انجام دیں۔ ڈاکٹر عبدالقادر نے اشارہ کیا ہے کہ اس رائے کا اظہار گولڈ زیہر نے اپنی کتاب "دراسات اسلامیہ"، میں کیا ہے۔"

اس رائے کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ اسلام کے عصر اوّل میں بنو اُمیہ اور علمائے اسلام کے مابین خصومت و نزاع نے نہایت خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ علماء احادیث نبویہ کی جمع و تدوین میں لگ گئے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے پاس جو احادیث موجود ہیں ان سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا تو انہوں نے حسب مرضی حدیثیں وضع کرنے کا آغاز کیا۔ وضع کردہ احادیث روح اسلام کے منافی نہیں ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے وہ اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کرتے تھے کہ ہم الحاد و دہریت اور سنت رسول سے انحراف کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ حدیثیں وضع کر رہے ہیں۔ چونکہ وہ علماء بنو امیہ کے اعداء و خصوم میں شمار ہوتے ہیں اور ان کو علوی سمجھا جاتا تھا اس لیے آغاز کار ہی سے وہ مدح اہل بیت کے سلسلہ میں حدیثیں وضع کیا کرتے تھے۔ گویا بالواسطہ یہ بنو اُمیہ پر نکتہ چینی کرنے اور ان پر حملہ آور ہونے کا ایک ذریعہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ قرن اوّل میں حدیث نبوی فقہی و قانونی احادیث کی خلاف ورزی کرنے والوں کے برخلاف خاموش معارضہ کی راہ پر گامزن رہی۔ معاملہ اس پر ختم نہیں ہوا۔ حکومت وقت زیادہ دیر تک خاموش تماشائی نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ جب کسی رائے کی تشہیر مقصود ہوتی یا علماء کو

خاموشش کرانا ہوتا تو حکومت بھی حسب منشا احادیث کا سہارا لیتی - چنانچہ حکومت بھی اسی ڈگر پر گامزن ہوگئی، جس پر اس کے خصوم و اعداء چل رہے تھے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت وقت نے بھی حدیثیں گھڑنے کا بیڑا اٹھایا - اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کوئی اختلافی سیاسی اور اعتقادی مسئلہ ایسا نہیں جس کی بنیاد کسی نہ کسی قوی الاسناد حدیث پر نہ رکھی گئی ہو۔

نظریں وضع حدیث کی داغ بیل بہت پہلے پڑ گئی تھی - بنو امیہ کا طریق کار وہی تھا، جیسے حضرت معاویہؓ نے مغیرہؓ بن شعبہ سے کہا تھا :-

"علی کو گالیاں دینے اور عثمان کے لیے رحمت طلب کرنے میں سستی سے کام نہ لیجیے - علی کو برا بھلا کہو اور ان کی مؤید احادیث کو دبائے رکھو - بخلاف ازیں عثمان و آل عثمان کی تعریف کریں اور ان کا تقرب حاصل کریں "

بنو امیہ کی روایت کردہ احادیث حضرت علی کے خلاف اسی اساس پر مبنی تھیں - بنو امیہ اور ان کے اتباع ایسے پاکیزہ خصال نہ تھے کہ صرف رسول کریمؐ پر دروغ بافی کے ڈر سے وہ اپنے نظریات سے ہم آہنگ جھوٹی احادیث کی نقل و روایت سے احتراز کرتے ۔

بنو امیہ نے وضع حدیث کے سلسلہ میں ہوشیاری سے کام لے کر امام زہری جیسے لوگوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا - مستشرق گولڈ زیہر نے جو اتہام امام زُہری پر باندھا ہے اس کو یہاں ڈاکٹر علی حسن عبد القادر نے مختصراً بیان کیا ہے - میں ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ واقعہ اسی طرح قلمبند کروں جس طرح ہمارے استاذ محترم ڈاکٹر علی حسن عبد القادر نے ہماری کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے ہمیں لکھوایا تھا - ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے وہ حسب ذیل ہے

"عبداللہ بن زبیر کے فتنہ کے ایام میں عبد الملک بن مروان نے لوگوں کو حج سے، روک دیا تھا - اس نے مسجد اقصیٰ میں قُبۃ الصخرہ تعمیر کیا تاکہ لوگ اس کا حج اور طواف کیا کریں اور خانہ کعبہ کا حج ترک کردیں - پھر اس نے چاہا کہ دینی عقائد کے پیش نظر لوگوں میں اس کے حج کا ذوق و شوق پیدا کیا جائے - امام زُہری کے علم و فضل کا ان دنوں بڑا چرچا تھا - عبد الملک نے محسوس کیا کہ زُہری اس سلسلہ میں حدیثیں وضع کرنے کے لیے تیار ہیں - چنانچہ امام زہری نے چند احادیث وضع کر ڈالیں۔

جن میں مندرجہ ذیل احادیث بھی شامل ہیں :-

(۱) - "سفر کا اہتمام صرف تین مساجد کے لیے کیا جائے - (۱) میری یہ مسجد (۲) مسجد حرام۔ (۳) مسجد اقصیٰ "

(۲) "مسجد اقصیٰ میں ایک نماز دوسری جگہ کی ہزار نماز کے مساوی ہے"۔

اور اس قسم کی دیگر احادیث۔

باقی رہی یہ بات کہ یہ احادیث امام زُھری کی ساختہ پرداختہ ہیں تو وہ یہ ہے کہ زُھری عبدالملک کے گھرے دوست تھے اور اس کے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ بیت المقدس کی مدح و ستائش میں وارد شدہ احادیث صرف بطریق زھری مروی و منقول ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بنو اُمیّہ نے اپنی عنانِ توجہ اس جانب کیسے منعطف کی کہ وہ اپنے نظریات سے ہم آہنگ احادیث کی نشر و اشاعت کریں؟ مزید برآں یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے امام زُھری جیسے نیک آدمی کو اپنے دام تزویر میں کیسے پھنسالیا؟ حالاں کہ اس میں کوئی مادی فائدہ نہیں اُٹھایا گیا تھا بلکہ یہ ایک طرح کی چالاکی اور خوش تدبیری تھی۔

اس سوال کا جواب ہم کو ان واقعات سے ملتا ہے جن کو خطیب بغدادی نے ہمیشہ کیلئے محفوظ کر لیا ہے۔ ان سے یہاں فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس میں اخبار و واقعات کو مختلف طُرق سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک سند بطریق عبدالرزاق بن ہمام متوفی ۲۱۱ھ از معمر بن راشد متوفی ۱۵۲ھ[۱] منقول ہے۔ معمر امام زُہری سے حدیثیں روایت کیا کرتے تھے۔

معمر کا بیان ہے کہ ولید بن ابراہیم اموی ایک رسالہ لے کر امام زھری کی خدمت میں حاضر ہُوا اور اس کو ان کے آگے رکھ کر کہنے لگا کہ اس میں جو احادیث مندرج ہیں ان کو اس حیثیت سے نقل و روایت کرنے کی اجازت دیجیے کہ میں نے یہ آپ سے سُنی ہیں۔ امام زھری نے بِلا لیت و لعل اجازت دے دی اور کہا "میرے سوا آپ کو یہ حدیثیں کون سنا سکتا ہے؟"

اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ان احادیث کو امام زھری کی مرویات کی حیثیت سے نقل و روایت کیا جانے لگا۔ قبل ازیں ذکر کیا جا چکا ہے کہ زُھری حکام وقت کی خوشنودی حاصل کر لیا کرتے تھے یہ واقعہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ بعض اوقات ان کا ورع و تقویٰ اس سے

مانع ہوتا تھا۔ تاہم وہ ہمیشہ ارباب اثر و اقتدار کے رعب داب سے بچ نہیں سکتے تھے۔ معمر نے زھری سے ایک نہایت اہم فقرہ نقل کیا ہے اور وہ یہ کہ :

"اُمراء نے ہمیں حدیثیں لکھنے پر مجبور کیا۔"

یہ واقعہ اس بات کی آئینہ داری کرتا ہے کہ زھری ارباب حکومت کی خواہشات کی تکمیل کر دیا کرتے تھے۔ اور ان کا نام امتِ اسلامیہ میں خاصی شہرت کا حامل تھا۔ زُھری ان لوگوں میں سے نہ تھے جن کے ساتھ مصالحت کا کوئی امکان ہی نہیں ہوتا۔ بخلاف ازیں وہ حکومت کے ساتھ مل کر کام کیا کرتے تھے شاہی محل میں حاضری سے بھی انہیں انکار نہ تھا۔ اکثر اوقات وہ سلطان کے حاشیہ نشینوں میں شامل ہوا کرتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حج کے موقع پر وہ حجاج بن یوسف کے رفیق سفر تھے۔ حالانکہ حجاج ایک ناپسندیدہ شخص تھا۔ خلیفہ ہشام نے امام زھری کو اپنے ولی عہد کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ یزید ثانی کے عہد خلافت میں آپ منصبِ قضاء پر فائز ہوئے تھے۔

ایسے حالات میں زھری چشم پوشی کے خوگر تھے اور ان لوگوں میں سے نہ تھے جو جور و استبداد کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ یہ صُلحاء اور اتقیاء کا شیوہ ہے۔ گولڈزیہر نے تفصیلاً بیان کیا ہے کہ ظالم سلاطین کی صحبت و زیارت میں کس قدر خطرات کا سامنا ہوتا ہے۔ جو شخص قضاء کے منصب کو قبول کرتا تھا علماء اس کو غیر ثقہ قرار دیتے تھے۔ امام شعبی صرف اس لیے رنگین لباس پہنتے اور نوجوانوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے کہ کہیں ان کو قاضی نہ بنا دیا جائے۔ امام شعبی نے ابن الاشعث کے ساتھ شامل ہو کر حجاج کے ساتھ جنگ لڑی تھی۔ علماء کے یہاں یہ طے شدہ بات ہے کہ جس کو قاضی بنا دیا گیا اس کو اُلٹی چھری سے ذبح کیا گیا۔

امام زُھری کو متہم کرنے کے بعد گولڈزیہر لکھتا ہے۔

"صرف سیاسی امور اور رنو امیہ کی حمایت کے سلسلہ ہی میں حدیثیں وضع نہیں کی گئیں بلکہ عبادات سے متعلق ان امور کے بارے میں بھی حدیثیں وضع کرنیکا آغاز ہوا جن سے اہل مدینہ متفق نہ تھے۔ مثلاً یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ جمعہ کے دو خطبے ہُوا کرتے تھے اور خلفاء کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ

عید کا خطبہ نماز کے بعد دیا جاتا تھا۔ مگر اموی خلفاء نے اس کو تبدیل کر دیا۔ چنانچہ خلیفہ بیٹھ کر خطبہ دیا کرتا تھا۔ وہ اس کی دلیل یہ بیان کرتے تھے کہ رجاء بن حیوۃ نے روایت کیا ہے کہ رسول کریمؐ اور خلفاء بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ بخلاف ازیں جابر بن سمرہ نے کہا جو تمہیں بتائے کہ رسول کریم بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے اس نے جھوٹ بولا۔"

اس کی مثال میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے منبر کی سیڑھیاں بڑھادی تھیں اور مسجد کے پاس ایک حجرہ بنالیا تھا۔ جس کو خلفائے عباسیہ نے مسمار کر دیا۔ جس طرح اپنے افکار و نظریات سے ہم آہنگ احادیث کی نشر و اشاعت کی جاتی تھی۔ اسی طرح ناموافق احادیث کو چھپالیا جاتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ بنو اُمیہ کے مصالح سے متعلق احادیث بنو عباس کے زمانہ میں پوشیدہ ہوگئی تھیں۔ اپنے قول کی تائید میں بعض اوقات ایسی احادیث نقل کی جاتی تھیں جن پر علماء نے نقد و جرح کی ہے۔

ابو عاصم النبیل کا قول ہے:۔

"میں نے کسی صالح آدمی کو نہیں دیکھا کہ وہ حدیث کے سوا کسی بات میں زیادہ جھوٹ بولتا ہو"

یحییٰ بن سعید القطان متوفی ۱۹۲ھ کا قول بھی یہی ہے۔ وکیع زیاد بن عبداللہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ عزو شرف کے باوجود روایت حدیث میں جھوٹ بولا کرتے تھے۔

یزید بن ہارون فرماتے ہیں:۔

"میرے زمانہ میں کوفہ کے رواۃ حدیث ایک کے سوا سب مدلس تھے۔ حتیٰ کہ سفیانؒ ثوری اور سفیان بن عیینہ کو بھی مدلسین کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ، ج ۱۔ ص ۳۴۳)

دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے محسوس کر لیا تھا کہ حدیثیں صرف ظاہری اعتبار سے صحیح ہوسکتی ہیں حقیقۃً نہیں۔ نیز یہ کہ اسانید صحیحہ پر مشتمل احادیث میں بکثرت موضوع حدیثیں موجود ہیں اس بات کی تائید و حمایت مندرجہ ذیل حدیث سے ہوتی ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مجھ سے بکثرت حدیثیں روایت کی جائیں گی۔ جو شخص حدیث روایت کرے اس کو خدا کی کتاب پر پرکھ کر دیکھ لیا کرو۔ جو اس کے مطابق ہو اسے میری جانب سے خیال کرو وہ میں نے کہی ہو یا نہ کہی ہو۔"

اس امر کا عمومی ظہور و شیوع اس وقت ہوا جب وضع حدیث کا عام چرچا ہو گیا۔ اس کی ایک جھلک معتمد احادیث میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً صحیح مسلم کی یہ روایت کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتوں کے قتل کرنے کا حکم دیا مگر شکاری کتے یا مویشیوں کی حفاظت کے لیے کتا رکھنے کی اجازت دی۔ عبداللہ بن عمر کو پتہ چلا کہ ابوہریرہ اس حدیث میں کھیتی کی حفاظت کے لیے کتا رکھنے کی اجازت کا اضافہ کرتے ہیں۔ وہ یہ سن کر کہنے لگے کہ ابوہریرہ کھیتی کاشت کیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن عمر کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ راویانِ حدیث بعض اوقات ذاتی غرض کیلیے حدیث میں بعض الفاظ بڑھا لیا کرتے تھے۔

فقہی قواعد کی تائید و حمایت کے لیے زبانی روایات کے علاوہ ایک اور طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ وہ طریقہ یہ تھا کہ ایسے رسالے مرتب کیے گئے تھے جن سے رسول کریمؐ کے ارشادات و فرمودات کا پتہ چلتا تھا۔ جب اس قسم کے کسی رسالہ کے بارے میں بات چیت چلتی تو یہ نہیں پوچھا جاتا تھا کہ یہ کہاں سے نقل کیا گیا ہے اور اس کی صحت کا کیا حال ہے؟ ایک واقعہ واضعین حدیث کی جسارت اور بے باکی کی غمازی کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بنو امیہ کے عصر و عہد میں بعض لوگوں نے شمالی و جنوبی عربوں کے مابین مصالحت کرانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ تبع بن معدیکرب کے زمانہ میں یمنی اور ربیعی عربوں نے باہم ایک حلف اٹھایا تھا۔ حمیری امیر کی اولاد کے یہاں یہ حلف نامہ محفوظ تھا۔ جو لوگ اس قسم کے نوشتوں کو قبول کر لیں کچھ بعید نہیں کہ قریب زمانہ کی تحریریں ان کے نزدیک مقبول ہوں۔ ہماری مراد اس سے بڑی چھوٹی گایوں سے متعلق صدقہ کی تعریف ہے۔

اس ضمن میں مختلف احادیث وارد ہوئی ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔ اگر اس مسئلہ کے بارے میں کوئی صحیح حدیث مل جاتی تو جامعین حدیث اس کی روشنی میں زکوٰۃ کی ادائگی کا ایک مفصّل نظام مرتب کر لیتے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ مجبوراً علماء نے ایسی دستاویزوں کی

جانب رجوع کیا جو زکوٰۃ کے بارے میں رسول کریمؐ نے مختلف بلاد عربیہ کی جانب بھیجے گئے عمال کو لکھ کر دی تھیں۔ مثلاً وہ وصیت جو آنحضورؐ نے معاذ بن جبلؓ کو لکھ کر دی تھی۔ اسی قسم کا ایک خط آپ نے عمرو بن حزم کے نام لکھا تھا۔ رُواۃِ حدیث نے ان کے مندرجات کی تفصیل بیان کی ہے چنانچہ لوگوں نے ان رسالوں پر اکتفاء نہیں کیا تھا جو اصلی نسخہ سے نقل کیے گئے تھے بلکہ ان قدیم نوشتوں کو بھی ڈھونڈھ نکالا تھا۔ اس قسم کی ایک تحریر عبداللہ بن عمر کے پاس محفوظ تھی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حکم دیا تھا کہ اس کو ایک رسالہ کی صورت میں نقل کر لیا جائے۔ ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ امام زُھری اس منقول نسخہ کو صحیح قرار دیتے تھے۔ اسی طرح ابوداؤد نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریر کا ذکر کیا ہے جس پر آپ کی مُہر ثبت تھی۔ حماد بن اسامہ نے ثمامہ بن عبداللہ بن انس کی روایت سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ جب انس بن مالک زکوٰۃ کا مال جمع کرنے کے لیے گئے تو حضرت ابوبکر نے یہ نوشتہ اُن کی جانب بھیجا تھا۔

ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر اس کے بعد لکھتے ہیں :۔

> "یہ ہے وہ نظریہ جو زمانہ گزشتہ میں مستشرقین کے یہاں مشہور تھا! پھر ذکر کیا کہ دورِ حاضر میں مستشرقین میں ایک اور نظریہ مقبول ہوتا جا رہا ہے جو سابق الذکر زاویۂ نگاہ کے خلاف ہے مگر نتیجہ کے اعتبار سے اسلامی نظریات و افکار کے ساتھ ملتا جُلتا ہے۔ چنانچہ مصنف نے جدید نقطۂ نظر کا ذکر تو کر دیا مگر دونوں میں سے کسی پر بھی نقد و جرح نہ کی۔ قرآن کریم کا ارشاد بجا ہے کہ، وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ۔

سابقہ اعتراضات کے جوابات :۔

یہ امر کسی شک و شبہ سے بالا ہے کہ حضرات صحابہ تابعین اور ان کے اتباع حدیث رسول کو حفظ کرنے اور اس کی نشر و اشاعت کے بے حد حریص تھے۔ وہ دل سے اس بات کے متمنی تھے کہ احادیث کو جمع کیا جائے۔ ان کو تحریف و آمیزش سے پاک صاف کیا جائے۔ محدثین نے وضاعین و کذابین کا کھوج لگانے میں زبردست مساعی انجام دی تھیں اور ان کے رازہائے درونِ سینہ کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے جھوٹی احادیث کو ممیز و ممتاز کرنے میں نہایت جانفشانی سے کام لیا تھا۔ نقادِ حدیث نے خوب کھل کر ان پر بحث و تمحیص کی اور لوگوں سے ان کی

صحت تسلیم کروائی تھی۔

یہ سب باتیں ہم اپنی کتاب میں تفصیلاً بیان کر چکے ہیں۔ ان پر ایک غائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مستشرقین یقین وطمانیت سے عاری ہیں اور توہمات کی وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ یہ اپنی خواہشات کے غلام ہیں۔ اپنی حقائق کے ساتھ کھیلنا ان کے لیے معمولی بات ہے۔ یہ تعصب پر مبنی نظریات کے پیش نظر تاریخی حقائق تک کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

یہ ایک مختصر بیان ہے جس میں مستشرقین پر تفصیلی جرح ونقد کا کوئی امکان نہیں ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ منصف مزاج قاری کی نگاہ کو ان حقائق کی جانب منعطف کیا جائے جو اس کے سامنے بکھرے پڑے ہیں۔ تاکہ جب ہم ان متعصب لوگوں پر تنقید کریں تو یہ حقائق ان کی نگاہ سے اوجھل نہ ہوں اس کے بعد ہم ان لوگوں کے مزعومات کی تردید بڑے مختصر انداز میں کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ قبل ازیں ہم اس پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ جہاں ضرورت سمجھیں گے وہاں قدرے تفصیل سے کام لیں گے۔

کیا حدیث نبوی کا ظہور مسلمانوں کے مناقشات کے نتیجہ میں ہوا؟

گولڈزیہر کا قول ہے کہ حدیث نبوی کا ظہور وشیوع مسلمانوں کے ان دینی سیاسی اور اجتماعی منازعات کے نتیجہ میں ہوا جو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں رونما ہوئے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ گولڈزیہر نے ایسے عظیم دعویٰ کی جسارت کیوں کر کی جب کہ حقائق اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ حالانکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سفرِ آخرت اس وقت فرمایا جب آپ اسلام کے قصرِ رفیع کی بنیادوں کو مضبوط ومستحکم کر چکے تھے۔ اسلام کی اساس وہ اصول وقواعد ہیں جو خداوند کریم نے اپنی کتاب میں نازل فرمائے یا وہ سنن وشرائع ہیں جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائے۔ حضور نے اپنی وفات سے قبل ارشاد فرمایا تھا:

تركتُ فيكم امرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما كتاب الله وسُنّتي۔	میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک انہیں مضبوطی سے تھامے رکھو گے ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے

آپ نے فرمایا:۔

"میں نے تمہیں آسان دین حنیف پر چھوڑا ہے جس کی رات اور دن برابر ہیں۔"

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ کتابِ ربانی کی آخرت آخری آیت یہ ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ)

آج کے دن میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اپنی نعمت پوری کر دی اور اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔

جب سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم عالم آخرت کو تشریف لے گئے اس وقت اسلام کامل اور پختہ ہو چکا تھا۔ ناپختہ اور ناتمام نہ تھا جیسا کہ اس مستشرق کا دعویٰ ہے۔ البتہ اسلامی فتوحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل اسلام بعض ایسے حوادث سے دوچار ہوئے جن کا ذکر صراحۃً کتاب و سنت میں نہ تھا۔ مسلمانوں نے قیاس و استنباط کی مدد سے ان سے متعلق احکام وضع کر لیے اس کے باوصف وہ اسلام کے دائرہ اور اس کی تعلیمات کی حدود سے باہر نہ نکل سکے۔ عصر اول میں اسلام کی پختگی ثابت کرنے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں پر قابض ہو گئے۔ یہ دونوں ملک ان دنوں تہذیب و حضارت کی اوج کمال پر فائز تھے۔ آپ نے امور سلطنت کے انتظام و انصرام میں قیصر و کسریٰ سے بڑھ کر عدل و کمال کا مظاہرہ کیا۔ اگر اسلام ناپختہ ہوتا تو حضرت عمر اس عظیم ذمہ داری سے کیوں کر عہدہ برآ ہو سکتے۔ اور اتنی بڑی سلطنت کا نظم و نسق کیسے سنبھال سکتے تھے۔ حالانکہ آپ کے عہد خلافت میں یہ دونوں ملک اس قدر خوشحال اور فارغ البال تھے کہ ایسا امن و سکون ان کو قیصر و کسریٰ کے عہد میں بھی نصیب نہ ہوا تھا۔

ایک منصف مزاج مصنف اس صداقت کا اعتراف کرتا ہے کہ اہل اسلام کائناتِ ارضی کے جن دُور افتادہ گوشوں تک پہنچے تھے۔ ان کی عبادت کا رنگ ڈھنگ ایک ہی تھا۔ ان کے باہمی معاملات بھی یکساں نوعیت کے تھے۔ کنبہ و قبیلہ اور خاندان کی اساس و بنیاد بھی یکساں تھی خلاصہ یہ کہ عبادات معاملات اور عقائد و عادات میں ان کے یہاں کامل یگانگت پائی جاتی تھی۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا، جب جزیرہ نمائے عرب چھوڑنے سے پہلے ان کا نظام پختہ ہو چکا ہو۔ زندگی کے مختلف گوشوں کی بنیادیں مستحکم ہو چکی ہوں۔ اور اگر حدیث نبوی کی غالب اکثریت ابتدائی دو صدیوں کے خلفشار و انتشار کا نتیجہ ہوتی تو اس کا حتمی نتیجہ یہ ہوتا کہ شمالی افریقہ میں بود و باش

رکھنے والے مسلمان کی عبادت ایک مینی مسلمان سے قطعی مختلف ہوتی۔ اس لیے کہ دونوں کے آداب واطوار اور طرز بود ماند میں بین فرق پایا جاتا ہے۔ پھر وہ عبادت قانون اور زندگی کے آداب و اطوار میں یکساں کیوں کر ہو سکتے تھے؟ حالانکہ ان کے مابین جو بعد و تفاوت ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ پہلی صدی ہجری کے بعد مختلف و متعدد فقہی مذاہب و مسالک قائم ہو گئے تھے تو بلاشبہ یہ کتاب و سنت اور ان کے فہم و ادراک میں صحابہ کے مختلف مکتبہ ہائے فکر پر مبنی تھے۔ جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے وہ محفوظ و متواتر تھی۔ باقی رہی سنت تو دوسری اور تیسری صدی ہجری میں ائمہ مذاہب میں سے جس امام نے کسی بات کا اظہار کیا وہ قبل ازیں کسی صحابی یا تابعی سے صادر ہو چکا تھا۔ یہ انتشار کے ظہور و شیوع سے پہلے کی بات ہے جیسا کہ اس مستشرق نے کہا ہے اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ مستشرق مذکور نے جو بات کی ہے وہ کسی دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اس کے بعد گولڈ زیہر نے اپنے نظریہ کے اثبات میں جو دلائل و براہین پیش کیے ہیں وہ اس عمارت کی طرح ہیں جو ایک بودی اور ضعیف اساس پر قائم کی گئی ہو۔ آپ بچشم خود ملاحظہ کریں گے کہ اس کے دلائل کس طرح منہدم ہوتے جا رہے ہیں۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

(۱) بنو امیہ اور دین اسلام:

گولڈ زیہر نے حدیث کے بارے میں اپنے نظریات کی اساس، اس خلاف و نزاع پر قائم کی ہے جو بقول اس کے اموی خلفاء اور علمائے دین کے مابین بپا تھا۔ گولڈ زیہر بنو امیہ کی تصویر اس انداز میں کھینچتا ہے کہ وہ خالصتہً دنیادار لوگ تھے۔ ان کے سامنے صرف سامراجی عزائم تھے۔ بنو امیہ جاہل مطلق اور اسلامی تعلیمات و آداب سے یکسر بیگانہ تھے۔ یہ تاریخی حقائق پر عظیم افتراء ہے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ جن کتب تاریخ میں اموی دور کی تصویر کھینچی گئی ہے وہ سب کی سب خلافت عباسیہ میں تصنیف کی گئی ہے۔ خلفاء بنی عباس کا عصر و عہد بنو امیہ کی عداوت سے بھرپور تھا۔ مورخ اور واقعہ نویس عباسی دور میں من مانی کارروائیاں کرتے رہے تھے۔ عباسی عہد کے مورخین نے بنو امیہ کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا تھا، اس نے اسلامی تاریخ میں ایک خطرناک

پارٹ ادا کیا۔ تاریخی کتب کے ان مندرجات کو لوگ حقائق تصور کرنے لگے۔ حالانکہ ان کی حیثیت ان بے بنیاد واقعات سے زیادہ نہ تھی جو زبان زد عام ہوتے ہیں۔ یہ من گھڑت واقعات عباسیہ اور غالی شیعہ و روافض کے ساختہ پرداختہ تھے۔ لہٰذا بنو امیہ کے بارے میں نقد و تبصرہ کے بغیر کتب تاریخ و اخبار کے مندرجات کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ بنو امیہ کی تاریخ عباسی خلافت میں مرتب کی گئی تھی تاہم اس میں ابھی تک ایسے دلائل ملتے ہیں جن سے گولڈ زیہر کے ان اتہامات کی تکذیب ہوتی ہے جو اس نے اموی خلفاء پر عائد کیے ہیں۔ مثلاً اس کا یہ بہتان کہ خلفائے بنی امیہ اسلام سے منحرف ہو گئے تھے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے۔

ابن سعد نے طبقات میں عبدالملک کے زہد و تقوٰی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مسند آرائے خلافت ہونے سے قبل اس قدر عابد تھا کہ لوگ اس کو "مسجد کی کبوتری" کہا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ جب اصحاب رسول سب فوت ہو جائیں گے تو ہم دینی مسائل کس سے دریافت کریں؟ آپ نے عبدالملک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "اس نوجوان سے" امام زہری سے متعلق بحث میں آپ پڑھیں گے کہ عبدالملک علماء و طلباء کو تلقین کیا کرتے تھے کہ سنن و آثار کو تلاش کرتے رہا کریں۔ جن دنوں امام زہری نوجوان تھے۔ عبدالملک نے ان سے کہا "انصار کے یہاں جایئے وہاں آپ کو بہت علم ملے گا" جب لوگ عبدالملک کی بیعت خلافت کے لیے حاضر ہوئے اس وقت وہ دھندلی سی روشنی میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ ولید بن عبدالملک کا بھی یہی حال تھا۔ ولید کے عہد خلافت میں وہ شاندار مساجد تعمیر کی گئیں جو آج بھی موجود ہیں۔ اس کا عہد خلافت مسلمانوں کے لیے عرانی دور تھا۔ یزید بن معاویہؓ کو چھوڑ کر دیگر اموی خلفاء بھی اسی قسم کے تھے۔ البتہ یزید کے متعلق کچھ یوں دکھائی دیتا ہے۔ کہ وہ اپنی پرائیویٹ زندگی میں اسلامی اخلاق و آداب سے منحرف رہا کرتا تھا۔ بایں ہمہ بعض عباسی مصنفین اور شیعہ راویوں نے جو الزامات یزید پر لگائے ہیں۔ وہ تاریخ کی روشنی میں ثابت نہیں ہوتے۔ ولید پر بہتان باندھا گیا کہ اس نے قرآن کریم کو پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ ایک منصف مزاج شخص جب ایسے واقعات پڑھتا ہے تو وہ بول اٹھتا ہے کہ یہ صریح جھوٹ ہے

اسلامی فتوحات کے سلسلہ میں بنو اُمیہ کا نام تاریخ اسلام میں ہمیشہ تابندہ و درخشندہ رہے گا۔ اموی خلفاء نے اسلامی حکومت کو جس قدر وسعت بخشی تھی عباسی خلافت میں اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس کا سہرا اموی خلفاء کے سر ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ اور دین اسلام کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں بذات خود فوجوں میں شامل ہو کر اعداء دین سے لڑتے تھے۔ پھر ان سے عداوت کیوں رکھی جائے۔ نیز اس بہتان کی وجہ جواز کیا ہے کہ وہ دین اسلام کے فہم و ادراک پر قادر نہ تھے۔ اور اس کی راہ میں جان دینے کے جذبہ سے عاری تھے۔

مندرجہ صدر بیان اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ گولڈزیہر کا یہ قول کہ وضع حدیث کا سبب وہ بغض و عداوت ہے جو اموی خلفاء اور علمائے دین کے مابین پائی جاتی تھی بلکہ بے بنیاد اور صاف جھوٹ ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ اموی خلفاء خوارج اور علویہ کے سخت دشمن تھے اور ان کے درمیان شدید عداوت پائی جاتی تھی۔ مگر خوارج اور علویہ وہ لوگ تھے جنہوں نے حدیث نبوی کی جمع و تدوین اور اس کے نقد و نقل کے ضمن میں کوئی اہم خدمت انجام نہیں دی۔

حدیث نبوی کی خدمت کا سہرا مندرجہ ذیل علماء کے سر ہے۔

سعید[1] بن مسیب۔ ابوبکر[2] بن عبدالرحمٰن۔ عبید[3] اللہ بن عبداللہ بن عتبہ۔ سالم[4] مولیٰ عبداللہ بن عمر۔ نافع[5] مولیٰ ابن عمر۔ سلیمان[6] بن یسار۔ قاسم[7] بن محمد بن ابی بکر۔ امام[8] زہری۔ عطاء[9] نخعی۔ علقمہ[10] حسن[11] بصری۔ اور دیگر[12] ائمہ حدیث۔

یہ وہ لوگ ہیں جو بنو اُمیہ کے خلاف کبھی نبرد آزما ہوئے نہ انہوں نے کبھی بنو امیہ سے بغض و عداوت رکھی۔ البتہ سعید بن مسیب اور عبدالملک کے باہمی تعلقات دوستانہ نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عبدالملک نے ان سے اپنے بیٹے ولید اور اس کے بعد سلیمان کی بیعت خلافت کا تقاضا کیا تھا جو انہوں نے تسلیم نہ کیا۔ اور فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیک وقت دو شخصوں کی بیعت سے منع فرمایا تھا۔ اس واقعہ سے پہلے جناب سعید بن مسیب اور اموی خلفاء کے مابین کوئی مناقشہ نہ تھا۔ اسی طرح حجاج بن یوسف اور بعض علماء کے تعلقات بھی خراب ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حجاج بنو اُمیہ کے اعداء و خصوم پر

بڑی سختی کرتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ حجاج فاسق اور گمراہ تھا اور علماء اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بخلاف ازیں حجاج کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے قرآن کریم پر نقطے اور اعراب لگائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاج کو قرآن کریم کے ساتھ والہانہ شغف تھا اور یہ وصف اسی شخص میں پایا جا سکتا ہے جو نہایت دین دار ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر گولڈ زیہر کی مراد ان علماء سے جن کے ساتھ بنو اُمیہ کی دشمنی تھی خوارج اور علوی علماء ہیں تو یہ بات درست ہے۔ مگر ان علماء نے حدیث کی جمع و تدوین کے سلسلہ میں کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ حدیث کی نشر و اشاعت اور اس کی تہذیب و اصلاح کے سلسلہ میں کام کرنے والے دوسرے علماء تھے۔ اور اگر وہ علماء سے عطاء و نافع و حسن بصری و زہری و مکحول اور قتادہ مراد لیتا ہے تو یہ کذب و افترا ہے اور تاریخی حقائق اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

کیا علمائے مدینہ وضاع حدیث تھے؟

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ گولڈ زیہر اپنی دونوں تصانیف "دراسات اسلامیہ" اور "العقیدۃ والشریعۃ" میں بیان کرتا ہے کہ علمائے مدینہ اور بنو امیہ میں عداوت پائی جاتی ہے علمائے مدینہ نے سب سے پہلے بنو امیہ سے انتقام لینے کے لیے حدیثیں وضع کرنے کی طرح ڈالی۔ مثل مشہور ہے ؎

دروغ گو را حافظہ نباشد

اگر علمائے مدینہ نے وضع حدیث کا آغاز کیا تھا تو سوال یہ ہے کہ آیا اس وقت کچھ اور علماء بھی موجود تھے یا نہیں؟ کیا مکہ دمشق کوفہ بصرہ اور دیگر اسلامی بلاد و امصار میں صحابہ و علماء موجود نہ تھے۔؟ مکہ میں اس وقت ان صحابہ کو چھوڑ کر جو سب سے آخر میں فوت ہوئے عطاء طاؤس مجاہد عمرو بن دینار ابن جریج اور ابن عیینہ جیسے لوگ موجود تھے۔

بصرہ میں حسن بصری ابن سیرین مسلم بن یسار ابو الشعثاء ایوب سختیانی اور مطرف بن عبداللہ بقید حیات تھے۔ کوفہ میں علقمہ اسود عمرو بن شرحبیل مسروق عبیدہ سلمانی سوید بن غفلہ عبداللہ بن عتبہ بن مسعود عمرو بن میمون ابراہیم نخعی۔ عامر شعبی۔ سعید بن جبیر۔ قاسم بن عبدالرحمن

بن مسعود جیسے علما زندہ موجود تھے۔

شام میں ابوادریس خولانی قبیصہ بن ذویب سلیمان بن حبیب خالد بن معدان۔ عبدالرحمٰن بن غنم اشعری عبدالرحمٰن بن جبیر اور مکحول زندہ تھے۔ مصر میں یزید بن ابی حبیب بکیر بن عبداللہ عمرو بن حارث لیث بن سعد عبید اللہ بن جعفر اور یمن میں مطرف وغیرہم بقید حیات تھے۔

(اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۷)

یہ تھے اموی خلافت کے اکابر اہل علم! اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی وضع حدیث میں علمائے مدینہ کے ساتھ شامل تھے؟ ایسا کیوں کر ہوا اور کس مجلس میں جمع ہو کر انہوں نے وضع حدیث کی سازش تیار کی؟ اور اگر اہل مدینہ کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تو پھر یہ خاموش کیوں رہے اور اہل مدینہ کی روایت کردہ احادیث ان سے کیونکر اخذ کرتے رہے؟ تاریخ اسلام میں یہ کہاں لکھا ہے کہ انہوں نے اس فعل پر اہل مدینہ کو معتوب کیا تھا۔؟ بخلاف ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ علمائے امصار اہل حجاز کی روایات کو اصح واقویٰ تصور کیا کرتے تھے۔ عبدالملک اموی علمائے مدینہ کی روایت کردہ احادیث کو صحیح تر خیال کرتا تھا۔ اس نے امام زہری کو مشورہ دیا تھا کہ انصار مدینہ سے علم حدیث اخذ کرے جیسا کہ زہری کے بیان میں آگے آرہا ہے۔ اگر مدینہ کو وضع حدیث کی ٹکسال کی حیثیت حاصل تھی تو پھر ان کی مرویات کو صحیح کس طرح قرار دیا جاتا تھا۔؟ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک بے بنیاد دعویٰ ہے جو نقد وجرح کے سامنے ایک لمحہ بھی ٹھہر نہیں سکتا۔ مگر اس کا کیا کیا جائے۔ کہ غرض انسان کو اندھا بنا دیتی ہے۔

گولڈزیہر کے اس دعویٰ کے بے بنیاد ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے ابن مسیب کی عبدالملک کے ساتھ عداوت کو اس امر کا موجب قرار دیا ہے کہ اہل مدینہ سب کاذب اور حدیثیں وضع کرنے والے تھے۔ مگر گولڈزیہر یہ نہیں بتاتا کہ ابن مسیب نے اس میں کیا پارٹ ادا کیا؟ چاہیئے یہ تھا کہ وہ واضعین کے سرخیل ہوتے۔ پھر اس نے اس ضمن میں ابن مسیب کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ زہری کی طرح ابن مسیب کو بھی وضع حدیث سے متہم کرنا چاہتا تھا مگر اس کی جسارت نہ کر سکا؟ اس لیے کہ اس کو کوئی جھوٹی روایت بھی نہیں مل سکی جس کو گھڑنے کی نسبت وہ ابن مسیب کی طرف کر سکتا جس طرح زہری پر تہمت باندھی تھی سکیا گولڈزیہر ابن مسیب

کو وضع حدیث سے پاک تصور کرتا ہے؟ یہ کیوں کر ممکن ہے جبکہ ابن مسیب ان علماء کے سردار تھے جو بنو امیہ سے ناراض تھے اور بقول گولڈ زیہر کے وہ اس تحریک کے اولین بانی تھے! سچ یہ ہے کہ جھوٹا آدمی ایک دعوٰی پر قائم نہیں رہ سکتا بلکہ متعدد اور متضاد دعاوی کرتا رہتا ہے۔

ہمارے علماء نے وضاعین کا کھوج لگایا اور ان کو زندیق اور فاسق قرار دیا تھا۔ مگر گولڈ زیہر کو ان کا یہ لقب پسند نہیں۔ بخلاف ازیں وہ ان کو "متقی علماء" قرار دیتا ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ مدینہ کو ان کی جائے سکونت ٹھہراتا ہے۔ حالانکہ مدینہ میں عالم اور متقی لوگ بود و باش رکھتے تھے۔ یہاں علم و تقوٰی کا وہ مفہوم مراد ہے جو مسلمانوں کے یہاں معتبر ہے یعنی علم و تقوٰی سے خدا کے دین کی نشر و اشاعت کے لیے کوشش کرنا اور وضاعین حدیث کو کیفر کردار تک پہنچانا مراد لیتے ہیں۔ علم و تقوٰی کا وہ مفہوم مراد نہیں جو گولڈ زیہر سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک علم و تقوٰی کے معنی جھوٹی حدیثیں گھڑنا اور دین اسلام کے دفاع کے لیے سرور کائنات پر افترا پردازی کرنا ہے۔

۴۔ کیا دینی دفاع کے لیے دروغ گوئی جائز ہے؟

یہودی مستشرق گولڈ زیہر مزید لکھتا ہے:

> "علماء کے پاس جو احادیث تھیں چونکہ ان سے ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے انہوں نے ایسی حدیثیں وضع کرنا شروع کر دیں جن کو وہ پسند کرتے تھے۔ اور وہ اسلامی روح کے منافی بھی نہ تھیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیا کہ وہ دہریت و الحاد اور دینی احکام سے نفرت و بُعد کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ حدیثیں وضع کر رہے ہیں۔"

اس طرح گولڈ زیہر ہمارے علماء کے لیے وضع حدیث کی وجہ جواز پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بات کہنے والا شخص ہمارے علماء کے اخلاق جلیلہ کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ وہ کذب و افترا سے اس حد تک پاک ہو سکتا ہے جس حد تک ہمارے علماء حتی کہ پرائیویٹ زندگی میں بھی جھوٹ سے پاک تھے۔ اس شخص میں خشیتِ ایزدی بھی اس درجہ کی نہیں پائی جا سکتی جو ہمارے علماء کا طرۂ امتیاز تھا۔ ہمارے علماء رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا پرداز

کو جس نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کا شمہ بھی اس شخص میں موجود نہیں۔ بعض علماء نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آپ پر جھوٹ باندھنے والا کافر اور واجب القتل ہے اور اس کی توبہ بھی مقبول نہیں۔

یہ یہودی اگر ہمارے علماء کی خصوصیات سے آگاہ و آشنا نہ ہو تو اس کو معذور خیال کرنا چاہیئے۔ اس لیے کہ بذات خود اس میں ایسی صفات کی رمق بھی نہیں پائی جاتی۔ اس کا ماحول بھی ایسا پاکیزہ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ جو شخص جھوٹ کا عادی ہو چکا ہو۔ وہ دوسروں کو اپنے سے زیادہ جھوٹ بولنے والے خیال کرتا ہے۔ ایک چور کے نزدیک ساری دنیا چور ہے ورنہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ سعید بن مسیّب جیسا شخص مار کھانے اور ذلت و رسوائی کے لیے تیار ہو مگر بیک وقت دو شخصوں کی بیعت اس لیے نہ کرے کہ یہ خلاف سنت ہے۔ پھر اس کے بعد سنت رسول کے دفاع کے لیے دروغ بافی کو جائز قرار دے۔ جو لوگ اپنے ولاۃ و حکام کے احکام کی علانیہ خلاف ورزی صرف اس لیے کرتے تھے کہ ان کے فرامین خلافِ سنت تھے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ سنت میں ایسے احکام کا اضافہ کرنے کے لیے تیار ہوں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد نہ فرمائے ہوں۔ اے لوگو! کیا آپ عقل و شعور نہیں رکھتے جس کی روشنی میں آپ فیصلہ کر سکیں؟ کیا تم ان لوگوں کی ترجمانی کا حق ادا کر رہے ہو۔ جو فہم و ادراک سے بے بہرہ ہیں۔؟

۴۔ حدیث نبوی میں دروغ گوئی کا آغاز کب ہوا؟

گولڈ زیہر لکھتا ہے۔

"چونکہ علماء اپنی امیدیں بنو امیہ کے اعداء علویہ سے وابستہ رکھتے تھے اس لیے وضع حدیث کا دھارا مدح اہل بیت کے اردگرد بہتا رہا۔ بالواسطہ بنو امیہ پر حملہ آور ہونے کا یہ بھی ایک ذریعہ تھا۔ اس طرح حدیث پہلی صدی ہجری میں فقہی اور قانونی احادیث کی خلاف ورزی کرنے والے بنو امیہ کے خلاف ایک پرسکون معارضہ کی راہ پر گامزن رہی۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین کا دفاع کرنے کے لیے جو حدیثیں وضع کی جاتی تھیں اب وہ

بنو امیہ پر حملہ آور ہونے کے لیے گھڑی جانے لگیں۔ گولڈزیہر نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ "مسلم پاکباز" علماء ہی تھے جنہوں نے اہل بیت کی مدح و ستائش میں حدیثیں وضع کیں۔

علم حدیث میں بصیرت رکھنے والے حضرات پر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ خداوند کریم نے قرآن حکیم میں بعض صحابہ کی تعریف کی ہے۔ اسی طرح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر و عثمان و علی و طلحہ و عائشہ و زبیر و علاوہ ازیں کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح و ستائش کی تھی۔ بنا بریں اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ کبار صحابہ اور اہل بیت کی تعریف و توصیف میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں۔ مگر شیعہ نے اس پر اکتفا نہ کیا۔ انہوں نے بنو امیہ اور ان کے اعوان و انصار کو زک پہنچانے کے لیے اہل بیعت کے فضائل و مناقب میں حدیثیں وضع کرنا شروع کر دیں۔ محدثین نے ان کا مقابلہ کیا اور جو جھوٹی حدیثیں انہوں نے وضع کی تھیں اُن کی نشان دہی کی۔

مندرجہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ اہل بیعت کی مدح و ستائش میں علمائے مدینہ نے حدیثیں نہیں وضع کی تھیں۔ بلکہ ان علماء نے واضعین کا مقابلہ کیا اور وضع حدیث کی تحریک کے سامنے سینہ سپر ہو گئے تھے۔ حتیٰ کہ ابن سیرین کو یہ کہنا پڑا کہ:

> "لوگ پہلے حدیث کی سند کے بارے میں سوال نہیں کیا کرتے تھے جب فتنہ بپا ہوا تو کہنے لگے راویوں کے نام بتاؤ۔ چنانچہ اگر راوی اہل سنت ہوتے تو ان کی روایت لے لی جاتی اور اہل بدعت کی چھوڑ دی جاتی۔"

اور اگر گولڈزیہر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اہل سنت کی نگاہ میں بدعتی کون ہوتے ہیں تو اسے ان عربی کتب کی جانب رجوع کرنا چاہیئے جہاں سے اس نے اقتباسات لیے اور ان میں تحریف کی ہے۔ ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہو گی کہ اہل بدعت شیعہ خوارج اور ان کے ہمنوا ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ہمارے علماء اہل بیت کی شان میں حدیثیں وضع کرنے والوں کا مقابلہ کرتے اور پھر انہی لوگوں کی طرح اسی مقصد کے پیش نظر حدیثیں وضع کرتے۔
اگر علمائے مدینہ نے بذات خود فضائل اہل بیت میں حدیثیں وضع کی تھیں تو انہیں

شیعہ کے خلاف بر سرِ پیکار ہونے کے بجائے اُن کے ساتھ مل کر اسی راہ پر گامزن ہو جانا چاہیئے تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں نہ کیا؟ حیرت بالائے حیرت تو اس بات پر ہے کہ ابن ابی الحدید جیسا ممتاز شیعہ عالم تو یہ کہتا ہے کہ حدیث میں دروغ بافی میں پہل شیعہ نے کی اور اہل بیت کے فضائل میں حدیثیں وضع کیں۔ مگر یہودی مستشرق گولڈ زیہر یہ کہتا ہے کہ اس ضمن میں اولیت کا سہرا اہل سنت کے سر ہے جن کو گولڈ زیہر مدینہ کے متقی علماء قرار دیتا ہے۔ کیا یہ تاریخی حقائق کی مبالغہ آمیز تحریف نہیں ہے۔؟ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو حد سے تجاوز کر گیا ہو اور حد درجہ گناہگار ہو۔

۵ ۔ کیا اموی خلفاء نے وضع حدیث میں حصّہ لیا تھا؟

گولڈ زیہر لکھتا ہے:

"معاملہ انہی لوگوں پر ختم نہیں ہوا۔ حکومت یہ دیکھ کر ایک خاموش تماشائی نہ رہ سکی۔ جب کسی بات کو پھیلانا ہوتا تو حکومت ایسی احادیث کا سہارا لیتی جو اس کے نظریات سے ہم آہنگ ہوتیں۔ چنانچہ وہ اسی طرح کرتی جس طرح اس کے اعداء وخصوم کرتے تھے۔ اور وہ یہ کہ یا تو خود حدیثیں وضع کرتی یا ان کے وضع کرنے کی دعوت دیتی"۔

یہ ایک ایسا انوکھا دعویٰ ہے جس کا وجود کاتب کے حاشیۂ خیال کے سوا اور کہیں نہیں تاریخ اس بات کی شہادت نہیں دیتی کہ اموی خلافت نے اپنے کسی نظریہ کی تشہیر کے لیے حدیثیں وضع کی ہوں۔ ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ اموی خلفاء کی وضع کردہ احادیث کہاں گئیں؟ ہمارے علماء ہر حدیث کو نقل کرتے وقت اس کی سند بھی بیان کر دیتے ہیں۔ احادیث صحیحہ کی اسانید کتب حدیث میں محفوظ ہیں۔ ہزارہا احادیث میں سے کسی ایک حدیث کی سند میں بھی عبد الملک یا یزید یا ولید یا ان کے کسی عامل مثلاً حجاج خالد بن عبداللہ قسری یا کسی اور حاکم کا نام مذکور نہیں۔ اگر ایسی حدیثیں موجود تھیں تو وہ تاریخ کے اوراق میں کہاں گم ہو گئیں اور اگر اموی خلافت نے حدیثیں خود وضع نہیں کی تھیں بلکہ وضع کی دعوت دی تھی تو اس کی دلیل کیا ہے؟

۶ - حدیث میں اختلاف کے اسباب :

گولڈزیہر لکھتا ہے :

"کوئی اختلافی مسئلہ خواہ وہ سیاسی ہو یا اعتقادی ایسا نہیں جو کسی نہ کسی قوی الاسناد حدیث پر مبنی نہ ہو۔"

کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اموی خلافت بذات خود وضع حدیث کی داعی تھی؟ یوں کیوں نہ کہا جائے کہ اختلافی مسائل کے سلسلہ میں اصحاب مذاہب نے حدیثیں وضع کی تھیں؟ نیز یہ کہ وضع کے کچھ اور اسباب و محرکات بھی ہو سکتے ہیں۔ احادیث میں اختلاف کے علماء نے متعدد اسباب بیان کیے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں :

۱ - اختلاف کی ایک وجہ یہ ہے کہ صحابی نے جو فعل ذکر کیا ہے۔ وہ دو مواقع پر مختلف حالات کے تحت انجام دیا گیا ہو۔ ایک صحابی وہ فعل بیان کرتا ہے جو ایک خاص حالت میں وقوع پذیر ہوا۔ بخلاف ازیں دوسرا صحابی ایک ایسا فعل ذکر کرتا ہے۔ جو اس سے مختلف حالت میں رونما ہوا۔ مثلاً ایک حدیث میں فرمایا کہ شرمگاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور دوسری میں یوں ارشاد ہوا کہ یہ آپ کے جسم کا ایک ٹکڑا ہی تو ہے۔

۲ - حدیث میں اختلاف کی دوسری وجہ یہ ہے کہ بیانِ جواز کے لیے آنحضورؐ نے ایک ہی کام کو دو مختلف طریقوں سے انجام دیا ہو۔ ایک صحابی نے جو دیکھا وہ بیان کر دیا اور دوسرے نے اپنا مشاہدہ ذکر کر دیا۔ مثلاً وتر کی تعداد میں اختلاف ہے۔ بعض احادیث میں سات بعض میں نو اور بعض میں گیارہ رکعات مذکور ہیں۔

۳ - بعض اوقات حدیث میں اختلاف کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ صحابہ نے آپ کا حال دیکھ کر جو کچھ سمجھا ہوتا ہے۔ وہ بیان کر دیتے ہیں - مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کے بارے میں صحابہ کا اختلاف ہے۔ بعض صحابہ آپ کو مفرد بعض قارن اور بعض متمتع قرار دیتے تھے۔ اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ہر صحابی نے ذکر کر دیا۔ اس لیے کہ حج میں افراد قران یا تمتع کا پتہ نیت سے چلتا ہے جو ایک پوشیدہ چیز ہے

ہر شخص نے اپنے اندازہ کے مطابق بیان کیا۔

۴۔ حدیث میں اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک صحابی ایک حدیث کو وجوب پر محمول کرتا ہے۔ اور دوسرا استحباب پر۔

۵۔ حدیث میں اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک صحابی آنحضور ؐ سے ایک ایسا حکم سنتا ہے جو پہلے حکم کا ناسخ ہوتا ہے۔ بخلاف ازیں دوسرے صحابی کو ناسخ کا پتہ نہیں چلتا۔ اور وہ اسی طرح اس حکم کو بیان کرتا ہے جس طرح اس نے سنا تھا۔

مذکورہ صدر بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے علماء نے حدیث میں اختلاف پیدا ہونے کے اسباب ذکر کر دیئے تھے۔ جہاں اختلاف کا موجب و محرک وضع حدیث تھا وہ بیان کر دیا اور جہاں کوئی اور بات تھی وہ بھی ذکر کر دی۔ اس موضوع پر ہمارے علماء نے قابلِ قدر کتب تصنیف کی ہیں۔ مشہور مصنفین میں امام شافعی ابن قتیبہ طحاوی اور دیگر اکابر کے اسماء شامل ہیں نظر بریں اختلافات کی اساس پر احادیث کو موضوع قرار دینا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ بُری بات یہ ہے کہ اموی خلافت کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ اس نے حدیثیں وضع کیں یا ان کے وضع کرنے کی دعوت دی۔

۷۔ کیا وضع حدیث میں حضرت معاویہؓ نے حصہ لیا تھا؟

گولڈزیہر ایک اور دلیل پیش کرتا ہے کہ حضرت معاویہ نے مغیرہ بن شعبہ سے کہا:

> "علی کو گالیاں دینے میں سستی سے کام نہ لو۔ عثمان کے لیے خدا کی رحمت طلب کرو اور اصحاب علی کو برا بھلا کہو۔ ان کی احادیث کا مقابلہ کرو۔ اس کے برخلاف عثمان اور آل عثمان کی مدح کرو ان کا قرب حاصل کرو اور ان کی باتیں سنو۔"

بقول گولڈزیہر بنو امیہ کی روایت کردہ احادیث اسی اساس پر مبنی تھیں۔

گولڈزیہر کی ذکر کردہ دلیل پر غور کیجئے۔ حضرت معاویہ اپنے ایک عقیدت کیش یا عامل سے کہتے ہیں "اصحاب علی کو مرعوب کیجئے اور آل عثمان کو اپنا مقرب بنائیے۔ بھلا اس میں وضع حدیث کی کون سی دلیل ہے؟ اور حکومت اپنے احباب و انصار اور اعداء و خصوم کے ساتھ یہی سلوک کیا کرتی ہے۔ حضرت معاویہ نے مغیرہ کو یہ نہیں کہا تھا کہ حضرت علی کے خلاف اور حضرت عثمان

کے حق میں احادیث وضع کریں۔ اگر حضرت معاویہ یوں کہتے تو یہ گولڈ زیہر کے دعویٰ کی دلیل ہوتی مگر انہوں نے ایسا کہا نہیں۔ مذکورہ صدر عبارت سے بھی یہ مفہوم نہیں نکلتا۔

گولڈ زیہر نے حضرت معاویہ کا قول یوں نقل کیا ہے:

وان تسب اصحاب علی و	اصحاب علی کو گالیاں دو اور ان کی احادیث
تضطهد من احادیثهم	کی مخالفت کرو۔

جو شخص مستشرقین کی علمی امانت و دیانت پر بھروسہ کرتا ہے اس کے لیے یہاں عبرت کا مقام ہے۔ مورخ طبری نے اپنی تاریخ جلد ۲ صفحہ ۱۱۴ پر اصل عبارت یوں نقل کی ہے:

لا تحجم عن شتم علی و ذریته	علی اور ان کی اولاد کو خوب گالیاں دو
والترحم علی عثمان و الاستغفار	عثمان پر رحم کھاؤ اور ان کیلئے مغفرت مانگو
له والعیب علی اصحاب علی	اصحاب علی کے عیوب بیان کرو۔ ان کو
والاقصاء لهم وترك الاستماع	دور رکھو اور ان کی باتیں مت سنو اصحاب
منهم واطراء شیعة عثمان و	عثمان کی تعریف کرو اور ان کو قریب رکھو
الادناء لهم والاستماع منهم۔	اور ان کی باتیں سنو۔

گولڈ زیہر نے والاقصاء لهم کے بجائے وتضطهد من احادیثهم کے الفاظ تحریر کر دیئے۔ اصل عبارت میں احادیثهم کا لفظ موجود نہیں۔ یہ اس کی علمی امانت و دیانت ہے اور اگر بالفرض یہ لفظ موجود بھی ہو تو اس کے معنی بات چیت کے ہیں۔ نبی کریمؐ کی مصطلح احادیث اس سے مراد نہیں ہیں۔ یہ ہیں یہودی مستشرق کے دلائل ساطعہ جن پر اس نے اتنے بڑے دعویٰ کی بنیاد رکھی ہے کہ اموی خلافت حدیثیں وضع کرتی اور وضعِ حدیث کی دعوت دیتی تھی!

۸۔ کیا اُموی خلفاء نے امام زہری کو حدیثیں وضع کرنے کا حکم دیا تھا؟

گولڈ زیہر لکھتا ہے:

"اموی خلفاء اور ان کے اتباع حدیث میں جھوٹ بولنے کو چنداں اہمیت نہیں دیتے تھے بشرطیکہ وہ ان کے افکار و نظریات سے ہم آہنگ

ہو۔ بنو امیہ نے وضع حدیث کے سلسلہ میں ہوشیاری سے کام لے کر امام زہری جیسے لوگوں سے کام لیا تھا۔"

اب ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ اس یہودی مستشرق نے اپنے عصر و عہد کے عظیم امام سنت بلکہ تابعین میں سے اولین مدونِ احادیث کے خلاف جو ناپاک سازش کی ہے اس کی قلعی کھول کر رکھ دیں اور اس حقیقت کو الم نشرح کر دیں کہ یہ سازش کس قدر خباثت کمینہ پن اور تحریف پر مبنی ہے۔ اس مستشرق کی یہ عادت ہے کہ ایک ایک کر کے حدیث و سنت کے ستونوں پر حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ عظیم راوی حدیث صحابی حضرت ابوہریرہؓ کو تنقید کا نشانہ بنا چکا ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ احمد امین مصری نے "فجر الاسلام" میں جو اتہامات ان پر باندھے تھے ہم ان کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر چکے ہیں۔ احمد امین یہودی مستشرق گولڈ زیہر کے نقش قدم پر چلا۔ اور رضائے الٰہی کو نظر انداز کر کے دوسروں کی رضا کا طالب ہوا۔ جب بزعم خویش ابوہریرہ پر تنقید کر چکا ہے تو عصر تابعین میں حدیث کے عظیم ستون امام زہری پر نقد و جرح کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے حدیث پر دو طرفہ حملہ کیا۔ اور یہ سمجھ بیٹھا کہ حدیث کا عظیم قلعہ منہدم کر چکا ہے۔ اس نے ایک حملہ تو حدیث کے رواۃ دائمہ پر کیا اور دوسرا احادیث کو بحیثیت مجموعی مشکوک ثابت کرنے کے سلسلہ میں مگر خداوند کریم بحکم وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ اپنے نور کا اتمام ضرور کرے گا۔ حق باطل کو شکست دے کر رہے گا۔ باطل کتنے ہی حامیے اور سہارے کیوں نہ رکھتا ہو۔

تاریخ اسلام میں امام زہری کا مقام

اس سے قبل کہ میں امام زہریؒ سے متعلق یہودی مستشرق گولڈزیہر کے عائد کردہ اتہامات کا جواب دوں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی مختصر تاریخ اور علمائے اسلام کی آراء ان کے بارے میں ذکر کر دوں۔ تاکہ پتہ چلے کہ تاریخ اسلام میں ان کو کیا منصب و مقام حاصل ہے۔ نیز گولڈزیہر کے وارد کردہ اعتراضات کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے اصل حقیقت منظر عام پر آسکے۔

نام و نسب اور تاریخ:

آپ کا نام و نسب محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب بن عبداللہ بن حرث ابن زہرہ القرشی الزہری ہے۔ صحیح تر قول کے مطابق آپ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مسلم بن عبید اللہ بنو امیہ کے خلاف لڑی گئی جنگوں میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے دستِ راست تھے۔ جب آپ کے والد نے وفات پائی تو زہری ایک فقیر بے نوا نوجوان کی صورت میں تن تنہا رہ گئے مال و متاع سے خالی اور تنگدست یتیم تھے۔ کوئی سرپرست نہ تھا جو ان کو سہارا دے سکے صرف ایک بڑا بھائی تھا جس کے بارے میں تاریخ کلیۃً خاموش ہے۔

سب سے پہلے آپ حفظ قرآن کی جانب متوجہ ہوئے اور ان کے بھتیجے کے قول کے مطابق اسّی راتوں میں اس کی تکمیل کر لی۔ پھر عبداللہ بن ثعلب سے علم الانساب سیکھنے لگے۔ پھر حلال و حرام اور روایت حدیث کی جانب توجہ مبذول کی۔ چنانچہ جن صحابہ کی صحبت میسر آسکی ان سے ملے۔ اس وقت دس صحابہ بقیدِ حیات تھے۔ ان میں سے انسؓ ابن عمرؓ جابرؓ اور سہیلؓ

---

[1] ہم نے زہری کی تاریخ مختلف تاریخی مصادر سے اخذ کی ہے۔ ان میں سے اکثر غیر مطبوعہ ہیں اور لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ مثلاً تاریخ ابن عساکر الجرح والتعدیل ابن ابی حاتم تاریخ الاسلام امام ذہبی طبقات المحدثین سیوطی مطبوعہ کتب میں سے تذکرۃ الحفاظ ذہبی التہذیب ابن حجر تہذیب الاسماء واللغات نووی و دیگر کتب قابل ذکر ہیں۔

بن سعد بھی تھے۔ بعض کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پھر کبار تابعین کی صحبت اختیار کی۔ مثلاً سعید بن مسیب عروہ بن زبیر علبید اللہ بن علبید اللہ بن عتبہ ابو بکر بن عبد الرحمٰن وغیرہم۔ سب سے زیادہ استفادہ جلیل القدر امام حدیث سعید بن مسیب سے کیا۔ آٹھ سال مسلسل ان کی صحبت میں رہے۔ اکثر ملک شام کو جایا کرتے تھے۔ پہلی مرتبہ مروان کے زمانہ میں شام گئے۔ آپ اس وقت بالغ ہو چکے تھے۔ حضرت ابن زبیر کے قتل کے بعد عبد الملک کی صحبت اختیار کی۔ پھر دیگر اموی خلفاء ولید سلیمان عمر بن عبد العزیز یزید ثانی اور ہشام بن عبد الملک کے پاس آتے جاتے رہے۔ عراق اور مصر میں بھی آمد ورفت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ "اوامی" نامی جگہ میں جہاں ان کی اراضی تھی اور حجاز کی آخری سرحد اور فلسطین کے نزدیک واقع ہے وفات پائی۔ آپ کی وفات بقول صحیح تر ۱۲۴ھ میں ہوئی۔ آپ کی عمر اس وقت بہتر سال تھی۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ مجھے شاہراہ عام پر دفن کیا جائے تاکہ ہر گذرنے والا دعائے خیر سے یاد کرے۔

نمایاں اخلاق وصفات :

امام زہری پست قامت تھے۔ ڈاڑھی زیادہ گنجان نہ تھی۔ رخسار پتلے تھے۔ سر اور ڈاڑھی کو مہندی لگاتے تھے۔ بینائی کمزور تھی۔ آپ بڑے فصیح اللسان تھے۔ مثل مشہور ہے کہ فصحائے روزگار تین آدمی تھے۔ زہریؒ۔ عمر بن عبدالعزیزؒ اور طلحہ بن علبید اللہ۔ آپ بڑے سیر چشم اور فیاض تھے۔ لیث بن سعد کا بیان ہے کہ ابن شہاب زہری ان تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ جن کو میں نے دیکھا۔ جو بھی سوال کرنے آتا اس کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے۔ جب اپنے پاس کچھ نہ بچتا تو دوستوں سے قرض مانگتے جو آپ کو دے دیتے۔ بعض اوقات سائل آتا اور آپ کے پاس دینے کے لیے کوئی چیز نہ ہوتی تو آپ کا رنگ زرد پڑ جاتا اور فرماتے "فکر نہ کریں اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا"، چنانچہ اللہ تعالیٰ زہری کو ان کے صبر وتحمل کا ثمرہ دے دیتے۔ یا تو کوئی آدمی تحفہ لے کر آجاتا اور یا ان کے پاس کوئی چیز ادھار فروخت کر دیتا۔

امام زہری شارع عام پر لوگوں کے لیے شوربے میں بھگوئی ہوئی روٹی اور شہد پر مشتمل دستر خوان بچھاتے۔ ایک مرتبہ پانی کے ایک چشمہ پہ اترے۔ لوگوں نے شکایت کی کہ ان کے یہاں اٹھارہ بڑھیا عورتیں ہیں جن کے لیے کوئی خادم موجود نہیں۔ امام زہری کے

پاس اس وقت کچھ نہ تھا۔ آپ نے اٹھارہ ہزار درہم قرض لیے اور ہر بڑھیا کو ایک ایک خدمتگار لونڈی دے دی۔ جب حدیث کا کوئی طالب علم ان کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کرتا تو حلف اٹھاتے کہ دس روز آپ کو حدیث نہیں سناؤں گا۔ آپ طویل سفر طے کر کے دیہات میں جاتے اور بدؤں کو تعلیم دیتے۔ موسم سرما میں لوگوں کو شہد اور مکھن کھلاتے اور موسم گرما میں شہد اور گھی پیش کرتے۔ کثرتِ جود و کرم کے نتیجہ میں بار بار مقروض ہو جاتے۔ بعض اوقات اموی خلفاء یہ قرض ادا کرتے اور بعض دفعہ ان کے احباب و اعوان۔ آپ کے نمایاں ترین اوصاف جن کی وجہ سے ان کو شہرتِ عام اور اپنے امثال و اقران پر فوقیت حاصل ہوئی وہ تھے۔

۱۔ آپ حد درجہ کے محنتی طالب علم تھے۔ علماء سے ملاقات کے شائق تھے۔ جو کچھ علماء سے سنتے اسے محفوظ کر لیتے رات کو دیر تک جاگتے اور جو کچھ سنا ہوتا اس کو یاد کرتے۔ ان کے ہم عصر فضلاء کا بیان ملاحظہ فرمائیں۔

ابوالزناد فرماتے ہیں:

"ہم حلال و حرام سے متعلق احکام لکھا کرتے تھے۔ ابن شہاب زہری جو کچھ سنتے لکھ لیتے۔ جب ہمیں اُن کی ضرورت محسوس ہوئی تو پتہ چلا کہ آپ سب سے بڑے عالم ہیں۔"

ابراہیم بن سعد کا قول ہے میں نے اپنے والد سے کہا زہری تم سے کس وجہ سے سبقت لے گئے، وہ بولے:

"زہری ہر مجلس میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ جو نوجوان یا ادھیڑ عمر کا آدمی ملتا اس سے مسائل دریافت کرتے۔ پھر انصار کے گھروں میں جاتے جو نوجوان یا ادھیڑ عمر کا آدمی یا عورت ملتی اس سے مسائل پوچھتے۔ آپ پردہ نشین خواتین تک سے مسائل میں جھگڑا کرتے تھے۔

امام زہری علم کے اس قدر حریص تھے کہ عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود سے علمی استفادہ کی خاطر ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ان کے لیے پانی بھر کر لایا کرتے۔ اور دروازے پر کھڑے

رہتے۔ عبیداللہ اپنی لونڈی سے پوچھتے دروازے پر کون ہے؟ وہ کہتی آپ کا ضعیف البصر غلام ہے۔ (اس کی مراد تھی زہری۔ اس لیے کہ زہری کی بصارت کمزور تھی) چونکہ آپ دروازے پر کھڑے رہتے اور خدمت کرتے تھے۔ اس لیے لونڈی ان کو غلام سمجھتی تھی۔ زہری کے متعلق لوگوں کا بیان ہے کہ جب وہ گھر میں تنہا ہوتے تو اپنے ارد گرد کتابیں رکھ کر ان کے ساتھ اس قدر مشغول ہوتے کہ اور کسی بات کا خیال نہ رہتا۔ ان کی بیوی ان سے بڑی تنگ آگئی۔ ایک رات ان سے کہنے لگی: "خدا کی قسم یہ کتابیں تو میرے لیے تین سوکنوں سے زیادہ ضرر رساں ہیں۔"

امام زہری کی عادت تھی کہ جب کسی استاد سے حدیث سن کر گھر لوٹتے تو اپنی لونڈی کو جگاتے اور کہتے "سنئے! مجھے فلاں نے یوں حدیث سنائی اور فلاں نے یوں" وہ کہتی حدیث سے میرا کیا تعلق ہے؟ زہری فرماتے "مجھے معلوم ہے کہ تم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتیں میں نے ابھی یہ حدیث سنی تھی اس لیے چاہا کہ اس کو یاد کر لوں۔"

۲۔ آپ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ آپ اس میں نادرۂ روزگار تھے۔ ان کے بھتیجے کا بیان آپ پڑھ چکے ہیں کہ امام زہری نے اسّی راتوں میں قرآن یاد کیا تھا۔ لیث امام زہری سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں جو علم امانت رکھا اسے کبھی نہیں بھولا۔ عبدالرحمٰن بن اسحاق زہری سے روایت کرتے ہیں کہ "میں نے کبھی کسی حدیث کے اعادہ کا مطالبہ کیا اور نہ ایک کے سوا کسی حدیث میں کبھی شک کا اظہار کیا۔ مجھے ایک حدیث میں شک پیدا ہوا جب اپنے ساتھی سے پوچھی تو وہ ویسے ہی نکلی۔ جیسے مجھے یاد تھی۔

دیار شام کے عظیم مؤرخ ابن عساکر زہری کے حافظہ کے بارے میں اپنی تاریخ میں عبدالرحمٰن بن عمران سے روایت کرتے ہیں عبدالملک نے اہل مدینہ کے عتاب پر مشتمل ایک خط لکھا جو دو صحیفوں میں تھا۔ یہ خط منبر کے نزدیک لوگوں کو پڑھ کر سنایا گیا۔ جب فارغ ہوئے اور لوگ ادھر ادھر چلے گئے تو سعید بن مسیب کے ہم نشین ان کے پاس جمع ہوئے سعید نے پوچھا خط میں کیا لکھا تھا؟ اے کاش! کہ کوئی شخص ہمیں اس کے مندرجات سے آگاہ کرتا۔ ہم نشینوں میں سے ایک شخص کہنے لگا اس میں فلاں بات تحریر تھی دوسرا

کہتا اس میں فلاں بات تھی۔ مگر سعید مطمئن نہ ہوئے۔ ابن شہاب زہری کو پتہ چلا تو فرمایا "کیا آپ پورا خط سننا چاہتے ہیں؟" سعید نے کہا "ہاں" امام زہری نے پورا خط اپنے حافظہ کی مدد سے یوں پڑھ کر سنا دیا گویا خط ہاتھ میں لے کر پڑھ رہے ہوں۔

ایک مرتبہ خلیفہ ہشام بن عبد الملک نے امام زہری کے حافظہ کا امتحان لینا چاہا۔ زہری سے کہا کہ میرے ایک بچے کے لیے حدیثیں لکھوائیں۔ چنانچہ امام زہری نے ایک کاتب کو چار سو حدیثیں لکھوا دیں۔ ایک ماہ کے بعد ہشام نے کہا "وہ کتاب جس میں حدیثیں درج تھیں ضائع ہو گئی،" امام زہری نے ایک کاتب کو بلا کر وہ حدیثیں لکھوا دیں۔ جب ہشام نے پہلی کتاب کے ساتھ مقابلہ کیا تو اس میں ایک حرف کی بھی کمی نہ پائی۔ امام زہری کے بارے میں یہ عجیب بات منقول ہے کہ وہ شہد بہت پیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ اس سے حافظہ تیز ہوتا ہے۔ آپ سیب اور سرکہ کو پسند نہیں کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان دونوں سے نسیان کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔ امام زہری سے منقول ہے کہ آپ فرماتے تھے "جو حدیثیں یاد کرنا چاہتا ہو۔ وہ منقیٰ کھایا کرے۔"

امام زہری کی علمی شہرت:

امام زہری نے بچپن میں بہت محنت کی تھی۔ آپ اکثر راتوں کو بیدار رہتے اور سفر کرتے رہتے۔ اساتذہ کی خدمت آپ کا شیوہ تھا۔ آپ کی قوت حافظہ اور علمی صداقت و امانت کا لوگوں میں بہت چرچا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور دور تک آپ کی شہرت پہنچ گئی اور لوگ طلبِ علم کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"امام زہری جب مدینہ میں داخل ہوتے تو ان کی موجودگی میں علماء میں سے کوئی بھی حدیث روایت نہیں کرتا تھا۔ جب تک آپ مدینہ سے تشریف نہ لے جاتے میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ مدینہ میں ستر اور اسی سال کے شیوخ حدیث موجود تھے۔ جن سے روایت نہیں کی جاتی تھی۔ امام زہری ان سے عمر میں چھوٹے تھے مگر ان کے ہاں تلامذہ کی بھیڑ ہوتی تھی۔"

زہری کی علمی وسعت کے بارے میں علماء کی شہادت:

امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں اور حافظ ابن عساکر تاریخ میں لکھتے ہیں کہ لیث بن سعد نے کہا

"میں نے زہری سے بڑھ کر جامع عالم نہیں دیکھا۔ جب ترغیب و ترہیب کے بارے میں حدیثیں روایت کرتے تو ہم کہتے یہ صرف یہی جانتے ہیں اور اگر قرآن و سنت کے بارے میں کچھ فرماتے تو آپ کی بات بڑی جامع ہوتی"

امام مالک نے روایت کیا ہے کہ امام زہری مدینہ آئے تو ربیعہ کا ہاتھ پکڑا اور کمرہ میں داخل ہو گئے۔ جب عصر کا وقت ہوا تو زہری باہر نکلے اور وہ کہہ رہے تھے مدینہ میں ربیعہ جیسا کوئی شخص نہیں" اور ربیعہ نکلے اور وہ کہہ رہے تھے:

"میرے خیال میں زہری علم میں سب پر فوقیت لے گئے ہیں"

عمرو بن دینار زہری کے ساتھ بڑی دیر تک رہے پھر کہنے لگے "بخدا میں نے اس قریشی جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا"

حدیث میں امام زُہری کا مقام:

ابن ابی حاتم نے الجرح والتعدیل میں اور حافظ ابن عساکر اور دیگر علماء نے لکھا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک دن اپنے ہم نشینوں سے کہا "کیا تم ابن شہاب زہری کے یہاں جاتے ہو؟ انہوں نے کہا جی ہاں! عمر بن عبدالعزیز نے کہا اس کے یہاں ضرور جایا کرو ان سے بڑھ کر حدیث کا علم رکھنے والا آج اور کوئی موجود نہیں"

معمر کہتے ہیں جب عمر بن عبدالعزیز نے یہ بات فرمائی اس وقت حسن بصری اور ان کے ساتھی زندہ تھے۔

علی بن مدینی فرماتے ہیں:

"حدیث کے عظیم عالم حجاز میں زہری اور عمرو بن دینار ہیں۔ بصرہ میں قتادہ اور یحییٰ بن ابی کثیر کوفہ میں ابواسحاق اور اعمش"

ان کا مطلب یہ تھا کہ اکثر احادیث صحیحہ ان کو یاد ہیں۔ عمرو بن دینار فرمایا کرتے تھے۔

"میں نے زہری سے بڑھ کر حدیث کا علم رکھنے والا نہیں دیکھا"

یہ سُن کر سفیان نے کہا:

"لوگوں میں زہری سے بڑھ کر سنت کا علم رکھنے والا اور کوئی نہ تھا"

مکحول کا قول ہے:

"زمین کی سطح پر زہری سے بڑھ کر حدیث کا کوئی عالم زندہ موجود نہیں"

یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں:

"کسی شخص کے پاس علم کا اتنا ذخیرہ موجود نہیں جتنا زہری کے پاس ہے"

علیٰ ھذا القیاس اس ضمن میں علماء کے بے شمار اقوال موجود ہیں کہ زہری اپنے زمانہ میں حدیث کے یکتائے روزگار فاضل تھے۔ ابن عساکر کے قول کے مطابق اس کی وجہ خود زہری نے یہ بیان کی ہے کہ:

"میں نے پینتیس ۳۵ یا چھتیس ۳۶ سال کا عرصہ اہل شام کی حدیثیں اہل حجاز کی جانب اور اہل حجاز کی مرویات اہل شام کی طرف منتقل کرنے میں گزارا۔ چنانچہ کوئی شخص مجھے ایسی احادیث نہ سناتا جو میں نے خود نہ سنی ہوں"

امام زہری کی خدماتِ حدیث:

امام زہری نے حدیث کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ جن میں سے اہم ترین تین ہیں۔

۱۔ عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے امام زہری نے حدیثیں مدون کیں۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ امام زہری اولین شخص تھے جس نے عمر بن عبدالعزیز کے ایما پر حدیثیں جمع کی تھیں۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ کے عامل ابوبکر بن حزم اور دیگر عمال کو لکھا تھا کہ احادیث نبویہ جمع کریں۔ ابوبکر بن حزم بہت کم حدیثیں جمع کر سکے تھے۔ البتہ امام زہری نے اس سلسلہ میں نہایت اہم خدمت انجام دی تھی۔

حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے علم کی تدوین کا شرف امام زہری کو حاصل ہوا" ابونعیم بطریق محمد بن حسن از مالک روایت کرتے ہیں کہ:

"سب سے پہلے امام زہری نے علم کو مدون کیا"

حافظ ابن عساکر نے بھی تدوین حدیث کی نسبت امام زہری کی جانب کی ہے۔ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں اپنی سند کے ساتھ عبدالعزیز بن محمد دراوردی سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے علم کو ابن شہاب زہری نے مرتب کیا (جلد ا ص ۲۶)
مختلف روایات میں جمع و تطبیق کا یہی طریقہ ہے۔ امام زہری نے تدوین حدیث میں سبقت کا فخر حاصل کیا۔ پھر علماء نے مزید جہد و سعی سے کام لیا۔

۲۔ امام زہری نے بہت سی احادیث حفظ کی تھیں۔ اگر وہ ان کو محفوظ نہ کرتے تو وہ ضائع ہو جاتیں۔ ابن عساکر لیث سے روایت کرتے ہیں کہ:

سعید بن عبدالرحمن بن حنبل نے ان سے کہا اے ابوالحارث! اگر زہری نہ ہوتے تو بہت سی احادیث ضائع ہو جاتیں"۔

جمحی کہتے ہیں:

"اگر ابن شہاب زہری نہ ہوتے تو سنت کا کافی حصہ ضائع ہو جاتا"

امام مسلم اپنی صحیح کی کتاب الایمان والنذور میں امام زہری سے نوے ایسی روایات نقل کرتے ہیں جو معتبر سند کے ساتھ منقول ہیں۔ اور زہری کے سوا اور کسی نے روایت نہیں کیں

۳۔ زہری اولین شخص تھے جن کو حدیث کی سند کا احساس ہوا۔ قبل ازیں لوگ سند کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔

امام مالک فرماتے ہیں:

"سب سے پہلے زہری نے با اسناد حدیث روایت کرنا شروع کی۔ غالباً زہری نے ملک شام میں ایسا کیا"۔

ابن عساکر ولید بن مسلم سے روایت کرتے ہیں کہ امام زہری نے فرمایا:

"اہل شام! کیا بات ہے کہ تمہاری احادیث باگ ڈور اور لگام سے خالی ہیں؟"

اس روز سے ہمارے اصحاب نے حدیث کی سند کا اہتمام کرنا شروع کیا۔

امام زھری کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل کے نظریات:

الطبقات کے مصنف ابن سعد لکھتے ہیں:

"زہری بہت بڑے عالم حدیث کثیر الروایت فقیہ اور جامع عالم تھے"۔

امام نسائی فرماتے ہیں:۔

"بہترین اسانید جن کے ذریعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں روایت کی جاتی ہیں چار ہیں۔

(۱)۔ زہری از علی بن حسن وہ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے۔

(۲) زہری از عبید اللہ از ابن عباس۔ آپنے امام زہری کی دو سندیں اور ذکر کی ہیں"۔

امام احمد فرماتے ہیں:۔

"زہری حدیث روایت کرنے میں سب سے اچھے ہیں، ان کی اسناد سب سے اعلیٰ ہوتی ہے"۔

ابن ابی حاتم کا قول ہے:۔

"ابو زرعہ سے پوچھا گیا کون سی اسناد صحیح تر ہے؟ فرمایا چار ان میں سی پہلی زہری از سالم از والد خود ہے"

ابن حبان کتاب الثقات میں لکھتے ہیں:۔

"محمد بن مسلم بن شہاب زہری قرشی کی کنیت ابو بکر ہے۔ آپ نے دس صحابہ کو دیکھا آپ یگانۂ روزگار حافظ حدیث تھے۔ آپ حدیث کا متن سب سے بہتر بیان کرتے تھے۔ آپ بڑے فقیہ اور فاضل تھے۔ لوگ آپ سے حدیثیں روایت کیا کرتے"[۱۵]

صالح بن احمد روایت کرتے ہیں کہ میرے والد نے بتایا "زہری مدینہ کے رہنے والے ثقہ تابعی تھے"۔

امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "زہری بڑے جلیل القدر تھے اور آپکے اصحاب و تلامذہ بڑے زبردست حافظ حدیث تھے"۔

ذہبی کا قول ہے:۔

"زہری زبردست حافظ حدیث امام اور حجت تھے"۔

حافظ ابن حجر "تہذیب التہذیب" میں رقمطراز ہیں:

"زھری مدینہ کے رہنے والے جلیل القدر حافظ حدیث امام اور حجاز و شام کے ممتاز عالم تھے۔"

امام نووی "التقریب" میں لکھتے ہیں :

"زھری کی جلالت و ثقاہت اور قوت حافظہ مسلّمہ حیثیت رکھتی ہے۔"

اسی طرح ائمہ حدیث حفاظ اور علمائے جرح و تعدیل آپ کی امانت و جلالت اور توثیق کے بارے میں یک زبان ہیں۔

زھری کے اصحاب و تلامذہ :

لاتعداد لوگوں نے آپ سے استفادہ کیا۔ مشہور ترین تلامذہ حسب ذیل ہیں :

امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ (بحوالہ طبقات المحدثین سیوطی) عطاءؒ بن ابی رباح۔ عمرؒ بن عبدالعزیز۔ ابن عیینہؒ۔ لیثؒ بن سعد۔ اوزاعیؒ۔ ابن جریجؒ

مندرجہ ذیل محدثین نے اپنی کتاب میں امام زھری کی مرویات کو جگہ دی ہے :

بخاری۔ مسلم۔ سنن اربعہ۔ موطا امام مالک۔ مسند شافعی۔ مسند احمد۔

کسی محدث کی سند ایسی نہیں جس میں زھری کی روایت کردہ احادیث موجود نہ ہوں۔ اسی طرح حدیث کے ابواب میں سے کوئی باب ایسا نہیں جس سے متعلق امام زھری کی کوئی حدیث یا اثر و واثرے پائی نہ جاتی ہو۔

امام زھری پر وارد کردہ اعتراضات کا جوابات :

یہ ہے فن حدیث میں امام زھری کا منصب و مقام اور ان کے بارے میں علماء کے افکار و آراء ان میں سے کسی ایک عالم نے بھی زھری کو ناکردہ گناہ کا مجرم نہیں ٹھہرایا اور نہ ہی ان کی علمی امانت و دیانت کے بارے میں کسی شک و شبہ کا اظہار کیا۔ اس سے بڑھ کر ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ کوئی مستشرق گولڈزیہر سے پہلے دنیا کے کسی شخص نے حدیث نبوی میں امام زھری کی صداقت بیانی کو شک و شبہ کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔ گولڈزیہر نے امام زھری پر جو اعتراضات وارد کیے ہیں وہ آپ دیکھ چکے ہیں۔ اب ہم ایک ایک کر کے ان کا بطلان ثابت کریں گے۔

بنو امیہ کے ساتھ امام زھری کے روابط :۔ گولڈزیہر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ امام زھری اور بنو امیہ

کے مابین جو روابط و مراسم پائے جاتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے زہری کو مجبور کیا کہ وہ ان کے حسب خواہش حدیثیں وضع کریں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ امام زہری جیسے راست گفتار عالم باعمل کے تعلقات اموی خلفاء کے ساتھ ایسے نتائج کے موجب ہو سکتے ہیں۔ علماء کے تعلقات قدیم زمانہ ہی سے خلفاء و ملوک کے ساتھ رہے ہیں، مگر اس سے ان کی امانت و دیانت کبھی متاثر نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ امام زہری جیسا فاضل جب خلفاء سے ملے گا یا خلفاء ان کی زیارت سے مشرف ہوں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے ان کے دین، امانت یا ورع و تقویٰ پر کوئی اثر پڑے۔ البتہ اس سے مسلمانوں پر یہ خوش گوار اثر پڑے گا کہ ان کا ایک فاضل استاد علمی حلقہ سے اٹھ کر خلفاء کی مجلس کی زینت بنتا ہے۔ ان کو کوئی حدیث سناتا ہے، کسی علمی مسئلہ پر اظہار خیال کرتا ہے۔ کسی شرعی حکم کی توضیح کرتا ہے۔ ان کے بچے کو شرعی تعلیم دیتا ہے۔ ان کو بتاتا ہے کہ امت کے کون سے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے کون سے واجبات و فرائض ان پر واجب الادا ہیں۔

عقد الفرید میں لکھا ہے کہ امام زہری خلیفہ ولید بن عبدالملک کے یہاں گئے۔ ولید نے کہا وہ کیسی حدیث ہے جو اہل شام ہمیں سناتے ہیں؟ زہری نے کہا امیر المومنین وہ کیا ہے؟ ولید نے کہا اہل شام یہ حدیث سناتے ہیں کہ، اللہ تعالیٰ جب کسی شخص کو رعیت سپرد کرتے ہیں تو اس کی نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور برائیاں نہیں لکھی جاتیں۔ زہری نے کہا امیر المومنین! یہ جھوٹ ہے، کیا ایک خلیفہ جو نبی بھی ہو اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ باعزت ہے یا صرف خلیفہ جو نبی نہ ہو؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو مخاطب کر کے قرآن کریم میں فرمایا ہے :-

> "اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، آپ لوگوں میں حق کے مطابق فیصلہ کیجیے اور خواہش کی پیروی نہ کیجیے، وہ آپ کو خدا کے راستہ سے برگشتہ کر دے گی۔ جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ ان کے لیے سخت عذاب ہے اس لیے کہ وہ یوم حساب کو بھول گئے۔" (سورۂ ص)

ولید نے یہ سن کر کہا "لوگ کس طرح ہمیں دین سے منحرف کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

(عقد الفرید جلد اول، ص ۶۰)

غور فرمائیے کہ امام زھری اور خلیفہ ولید کی اس ملاقات سے امت کو کس قدر فائدہ پہنچا۔ پھر یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ آیا زھری خلیفہ ولید کے سامنے جھکے یا اس کے خیالات کو تسلیم کیا اور اس کی رضامندی کے لیے کوئی حدیث وضع کی؟ بخلاف ازیں امام زھری نے ایک نیک نیت عالم دین کا موقف اختیار کیا جو خدا کے دین اور مسلمانوں کی خیر خواہی چاہتا اور رسول کریم کی حدیث سے وضاعین حدیث کی دروغ گوئی کو دُور کرتا ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں کا خلیفہ رسول کریم پر افترا پردازی کرنے والوں کے دام فریب میں نہ آسکا اور اس طرح ظلم و باطل کا شکار ہونے سے نجات پائی۔

ابن عساکر اپنی سند کے ساتھ امام شافعی سے روایت کرتے ہیں کہ خلیفہ ہشام بن عبد الملک نے سلیمان بن یسار سے آیت قرآنی وَالَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ کی تفسیر کے بارے میں پوچھا کہ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ (جس نے بڑا کام انجام دیا) سے کون شخص مراد ہے؟ سلیمان نے کہا وہ عبداللہ بن اُبی بن سلول ہے۔ خلیفہ ہشام نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو۔ اس سے علی بن ابی طالب مراد ہیں۔ دراصل ہشام یہ بات سنجیدگی سے نہیں کہہ رہا تھا، وہ آزمانا چاہتا تھا کہ حق و صداقت سے ان کو کس قدر لگاؤ ہے۔ سلیمان بن یسار نے کہا امیر المومنین ٹھیک فرماتے ہیں اتنے میں زھری بھی پہنچ گئے۔ ہشام نے ان سے بھی یہی سوال کیا۔ زھری نے کہا اس سے عبداللہ بن ابی بن سلول (مشہور منافق) مراد ہے۔ ہشام نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو۔ اس سے علی بن ابی طالبؑ مراد ہیں۔ زھری نے غصہ میں بھر کر کہا تو کیا میں جھوٹ بولتا ہوں؟ اگر آسمان سے بھی یہ ندا آئے کہ میں نے جھوٹ کو حلال قرار دیا ہے تو بھی میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ مجھے فلاں فلاں شخص نے بتایا کہ اس سے عبداللہ بن اُبی مراد ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ لوگ ہشام کو زھری کے خلاف بھڑکاتے رہے یہاں تک کہ ہشام نے زھری سے کہا چلے جائیے خدا کی قسم تیرے جیسے انسان کا بوجھ ہمیں برداشت نہیں کرنا چاہیے تھا۔ زھری نے کہا یہ کیوں؟ کیا میں نے آپ کو ناراض کیا ہے یا آپ نے مجھے غصہ دلایا؟ ہشام نے کہا نہیں مگر آپ نے ایک بھاری رقم قرض لی ہے۔ زھری نے کہا "تجھے علم ہے اور قبل ازیں تیرے باپ کو بھی اس بات کا بخوبی علم تھا کہ میں نے یہ مال نہ تجھ سے قرض لیا اور نہ تیرے باپ سے" پھر غضب ناک

ہوکر زہری باہر نکل گئے۔ ہشام نے کہا "ہم نے شیخ کو ناراض کر دیا" پھر ان کا قرض ادا کرنے کا حکم دیا۔ امام زہری کو پتہ چلا تو فرمایا "خدا کا شکر ہے جس نے یہ احسانِ عظیم فرمایا۔"

یہ واقعہ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں آٹھ سو سال پہلے امام شافعی سے نقل کر کے تحریر کیا ہے۔ شافعی رحمہ اللہ حق و صداقت کے ایک عظیم امام ہوئے ہیں۔ حیرت ہے کہ عرصہ دراز کے بعد ایک شخص معرضِ وجود میں آتا ہے جو امام زہری کو دروغ گوئی کے ساتھ متہم کرتا ہے اور ان کی دین داری پر اس لیے بہتان باندھتا ہے کہ خلفاء سے ملتے جلتے تھے۔ کیا یہ واقعہ امام زہری کی امانت و دیانت کی غمازی نہیں کرتا؟ نیز یہ کہ امام زہری اور اموی خلفاء کے درمیان جو مراسم الفت و وداد پائے جاتے تھے وہ ان کی ایمانی قوت کو متاثر نہیں کر سکتے تھے۔ جو شخص خلیفہ کو "لَا اَبَا لَکَ" (تیرا باپ نہ رہے) سے خطاب کر سکتا ہو ——— حالانکہ ایک عام شخص دوسرے آدمی کو جس کو وہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہو ان الفاظ کے ساتھ مخاطب نہیں کر سکتا ——— اس کا ربط و تعلق خلیفہ کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا، جیسا ایک طاقتور شخص کا ایک کمزور کے ساتھ یا ایک فریب دہندہ کا تعلق فریب خوردہ کے ساتھ ہوتا ہے۔

بخلاف ازیں امام زہری کا تعلق خلفاء کے ساتھ اس شخص کا تعلق تھا جو اپنے دین کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا ہو۔ اپنے علم کی بناء پر باعزت ہو۔ اگر اس کی تکذیب ہو جائے تو غصہ سے بھر جائے۔ اگر صحابہ سے متعلق کسی تاریخی حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے تو وہ مخالف پر دھاوا بول دے۔ جو خلیفہ کے سامنے شیر کی طرح صرف اس لیے بپھر جائے کہ وہ ایک قرآنی آیت کی تفسیر جمیع مفسرین کے خلاف کرتا ہو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خلیفہ کی خواہشات کے آگے سر ڈال دے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جھوٹی حدیثیں وضع کرنے لگے۔ امام زہری نے فرمایا تھا:۔

> "تیرا باپ مرے کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ اگر آسمان سے بھی یہ ندا آئے کہ خدا نے جھوٹ کو حلال قرار دیا ہے۔ تو بھی میں ہرگز دروغ گوئی سے کام نہ لوں گا۔"

امام زہری تاریخ انسانیت کے وہ عظیم فرد تھے جن کی تربیت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی

تھی اور ان کو صداقت بیانی، بلند خیالی اور دروغ گوئی سے پاکیزگی کی ایک عظیم نشانی کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ امام زہری کو اموی خلفاء کی خواہشات کی پیروی کی ضرورت ہی کیا تھی؟ کیا وہ مال کے طلب گار تھے؟ یہودی مستشرق اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ زہری ایسے آدمی نہ تھے جن کو مال سے خریدا جاسکتا ہے۔ امام زہری کے بارے میں عمرو بن دینار کا قول نقل کیا ہے کہ:-

"کسی شخص کے یہاں درہم و دینار کی اس قدر ناقدری نہ تھی، جتنی زہری کے نزدیک وہ ان کو مینگنی سے زیادہ وقعت و اہمیت نہیں دیا کرتے تھے"

پھر کیا زہری جاہ و منصب کے خواہاں تھے؟ گولڈ زیہر اس امر میں ہمارے ساتھ متفق نظر آتا ہے کہ پوری ملت اسلامیہ زہری کو عزّ و وقار کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ پھر اس کے بعد انہیں کس منصب کی تلاش تھی؟ جب زہری جاہ و مال کے طلب گار نہ تھے اور وہ نہایت متشرع اور جری بھی تھے جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں تو پھر وہ ایسے غبی اور کم عقل کیسے ہوسکتے تھے کہ اپنا دین بنوامیّہ کے پاس فروخت کردیتے اور مسلمانوں میں جو اکرام و احترام انہیں حاصل تھا اس کو کھو دیتے۔

یہودی مستشرق گولڈ زیہر نے اموی خلافت کی جو صورت گری کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جبر و استبداد کا عہد تھا۔ مدینہ کے نیک نہاد علماء بنوامیہ کے خلاف نبرد آزما اور ان سے برگشتہ خاطر رہا کرتے تھے۔ ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ زہری مدینہ میں پروان چڑھے، اور وہاں کے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ تا وفات سعید بن مسیّب کے دابستہ دامن رہے۔ زہری جب بھی مدینہ آتے امام مالک رحمہ اللہ ان کے خرمن علم سے خوشہ چینی کرتے زہری خود فرماتے ہیں کہ وہ پینتیس سال تک مدینہ اور شام کے درمیان چکر کاٹتے رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر مدینہ کے علماء ان کے دشمن کیوں نہ بن گئے؟ اور اگر وہ بنوامیّہ کی خوشنودی کے لیے حدیثیں وضع کرتے تھے تو علمائے مدینہ نے ان کی تکذیب کیوں نہ کی؟ پھر زہری کے استاد سعید بن مسیّب نے ان سے اظہار براءت کیوں نہ کیا؟ حالاں کہ وہ عبدالملک تک کو

خاطر میں نہ لاتے تھے۔ کیا وہ اس لیے خاموش رہے کہ زھری سے خائف تھے؟

جب کہ رجال و رُواۃ کی تنقید کے سلسلہ میں وہ خلیفہ سے لے کر سوسائٹی کے ادنیٰ آدمی تک کسی سے ڈرتے نہ تھے۔ اور اگر وہ زھری سے ڈرتے تھے تو عباسی خلافت کے علماء نے ان پر تنقید کیوں نہ کی؟ بنو عباس کے اعوان و انصار نے ان پر کیوں نہ دھاوا بولا جس طرح وہ بنو اُمیہ کے خلفاء و امراء کو نقد شدید کا نشانہ بناتے تھے؟

علاوہ ازیں جرح و تعدیل کے علماء ان کے بارے میں کیوں کر خاموش رہے؛ خصوصاً جب کہ ان میں احمد بن حنبل یحیٰی بن معین بخاری مسلم ابن ابی حاتم اور اس قسم کے دیگر اکابر محدثین شامل تھے جو دینی امور میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ پھر وہ ایسے شخص کو کیوں کر معاف کر سکتے تھے جو اموی دَور کے سرکردہ اور مشہور لوگوں میں سے تھا۔ خلاصہ یہ کہ مدینہ کے شیوخ و اساتذہ جن کے سرخیل سعید مسیب تھے کے خاموش رہنے اور دُور دراز کے علماء کے زھری سے اخذ و استفادہ کرنے اور اموی خلفاء کے ساتھ تعلقات رکھنے کے باوجود عباسی خلافت کے علمائے جرح و تعدیل کے زھری کی توثیق و تائید کرنے میں اس بات کی زبردست دلیل موجود ہے کہ زھری شک و شبہ سے بالا اور کذب و وضع اور اہل ظلم کی جانب میلان و ریحان رکھنے سے پاک تھے۔

واقعۂ صخرہ اور حدیث لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ:

گولڈ زیہر نے دعویٰ کیا ہے کہ عبدالملک نے قبۃ الصخرہ تعمیر کر کے اہل شام و عراق کو خانہ کعبہ کے حج سے باز رکھنا چاہا تھا۔ عبدالملک نے صخرہ کی تعمیر کو دینی رنگ دینا چاہا۔ چنانچہ زھری نے اس کے لیے یہ حدیث وضع کر دی "لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ" گولڈ زیہر کی یہ بات زمانہ کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ افترا پردازی تحریف اور تاریخی حقائق کا مذاق اڑانے کی ایسی مثال دیکھنے میں نہیں آئی۔

اوّل:۔ معتبر مورخین کے یہاں اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ صخرہ کی تعمیر ولید کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ ابن عساکر طبری ابن اثیر ابن خلدون ابن کثیر اور دیگر مورخین نے اسی طرح لکھا ہے۔ انہوں نے ایک روایت بھی ایسی تحریر نہیں کی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ صخرہ

کی تعمیر کرنے والا عبدالملک تھا۔

صخرہ کی اس حیثیت سے تعمیر و تاسیس کردہ خانہ کعبہ کا بدل قرار پائے اور لوگ بیت اللہ کے بجائے اس کا حج کرنے کے لیے آئیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کا ایک عظیم المیہ ہے اس لیے یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا کہ مورخین اس کو نظر انداز کر دیتے۔ حالانکہ وہ اس سے بہت کم اہمیت والے واقعات کو بھی قلمبند کر لینے کے عادی ہیں۔ مثلاً وہ علماء کی تاریخ وفات اور قاضیوں کی تقرری کی تاریخ تک بیان کر دیتے ہیں۔ اگر عبدالملک نے صخرہ کو تعمیر کیا ہوتا تو وہ ہرگز اس کو نظر انداز نہ کرتے۔ البتہ انہوں نے صخرہ کو ولید کا تعمیر شدہ بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب مورخین تاریخ نویسی میں معتمد اور بھروسہ کے لائق تھے۔

البتہ علامہ دمیری کتاب الحیوان میں ابن خلکان سے نقل کرتے ہیں کہ صخرہ کو عبدالملک نے تعمیر کیا تھا۔ ان کا اصلی بیان ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:۔

"صخرہ کو عبدالملک نے تعمیر کیا تھا۔ لوگ عرفہ کے دن اس کے پاس ٹھہرا کرتے تھے"

صخرہ کی تعمیر کی نسبت عبدالملک کی جانب درست نہیں اور یہ مستند مورخین کے بیان کے خلاف ہے تاہم اس میں یہ مذکور نہیں کہ عبدالملک نے اس کو خانہ کعبہ کے بدل کی حیثیت سے تعمیر کیا تھا۔ بخلاف ازیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنی مرضی سے اس کے پاس ٹھہرتے تھے اس میں خانہ کعبہ کے بجائے اس کا حج کرنے کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ البتہ عرفہ کے دن اس کے پاس ٹھہرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسلامی شہروں میں یہ عادت عام طور سے پائی جاتی ہے فقہاء نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ کعبہ کے بجائے اس کا حج کرنے اور اس کے نزدیک اس طرح ٹھہرنے میں جیسا عرفات میں ٹھہرا جاتا ہے بیّن تفاوت پایا جاتا ہے تاکہ جو آدمی حج نہیں کر سکتا کسی حد تک وہ بھی حج کا اجر و ثواب پالے۔ اس میں صخرہ کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ ہر اسلامی شہر کے لوگ عرفہ کے دن شہر سے باہر نکل حاجیوں کی طرح ٹھہرا کرتے تھے۔

دوم:۔ صخرہ کا واقعہ جس طرح گولڈزیہر نے بیان کیا ہے بالکل باطل ہے۔ اس لیے کہ کوئی ایسی عمارت تعمیر کرنا جس کے حج کے لیے لوگ آئیں کفر ہے۔ پھر عبدالملک اس کی جسارت کیونکر کر سکتا تھا؟ عبدالملک اس قدر عبادت گزار تھا کہ لوگ اسے "حمامۃ المسجد" (مسجد کی کبوتری)

کہا کرتے تھے۔ عبدالملک کے اعداء و خصوم نے اس پر بہت طعن کیے ہیں، مگر اسے کافر نہیں کہا صخرہ کی تعمیر کی بناء پر بھی اس کو ملعون نہیں کیا۔ اور اگر یہ بات صحیح ہوتی تو اس کے اولین نقائص میں شمار ہوتی۔

سوم :- ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ زہری ۵۱ھ یا ۵۸ھ میں پیدا ہوئے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو ۷۳ھ میں قتل کیا گیا تھا۔ نظر بریں پہلی روایت کے مطابق زہری کی عمر عبداللہ بن زبیر کے قتل کے وقت بائیس ۲۲ سال اور دوسری روایت کے مطابق پندرہ ۱۵ سال ہو گی۔ یہ کس طرح صحیح ہے کہ اس قدر چھوٹی عمر میں زہری پوری امت اسلامیہ میں اس حد تک مشہور ہوں کہ ان کی صخرہ کا حج کرنے سے متعلق وضع کردہ حدیث کو عام طور سے قبول کر لیا جائے اور حج کعبہ کو ترک کر دیا جائے۔

چہارم :- تاریخی حقائق سے یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ ابن زبیر کے زمانہ میں زہری عبدالملک سے آگاہ ہی نہ تھے۔ ذہبی کے بیان کے مطابق زہری کی پہلی ملاقات عبدالملک کے ساتھ ۸۰ھ میں ہوئی ابن عساکر اس کو ۸۲ھ کا واقعہ قرار دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبدالملک کے ساتھ زہری کی جان پہچان ابن زبیرؓ کے قتل کے چند سال بعد ہوئی۔ زہری ان دنوں نوجوان تھے۔ عبدالملک نے آپ کا امتحان لیا اور یہ نصیحت کی کہ انصار کے گھروں میں جا کر علم حاصل کریں۔ پھر یہ بات کیوں کر درست ہو سکتی ہے کہ زہری نے اپنے دوست عبدالملک کی خوشنودی کے لیے حضرت ابن زبیر کے زمانہ میں یہ حدیث وضع کی کہ لوگ کعبہ کے بجائے صخرہ کا حج کیا کریں؟

پنجم :- حدیث نبوی "لا تشد الرحال" سب کتب حدیث میں موجود ہے۔ یہ زہری کے علاوہ دیگر متعدد طرق سے منقول ہے۔ امام بخاری نے اس حدیث کو ابوسعید خدریؓ سے روایت کیا ہے۔ اس سند میں زہری کا نام نہیں ہے۔ امام مسلم نے اس کو تین مختلف طرق و اسانید سے روایت کیا ہے۔ ایک سند میں امام زہری ہیں۔ دوسری دو سندوں میں سے ایک بطریق جریر از ابن عمیر از ابوسعید خدریؓ منقول ہے اور دوسری ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے۔ ان دونوں سندوں میں امام زہری شامل نہیں ہیں۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے

آتی ہے کہ زہری اس حدیث کی نقل و روایت میں منفرد نہیں ہیں جیسا کہ گولڈ زیہر نے دعویٰ کیا ہے بخلاف ازیں امام زہری کے ساتھ دوسرے راوی بھی شامل ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ زیارتِ قبور کو جائز خیال نہیں کرتے۔ آپ سے جب بیت المقدس کی زیارت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا بخاری و مسلم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ سواری کا اہتمام کرکے صرف تین مساجد کا سفر جائز ہے، پھر آپ نے مذکورہ صدر حدیث روایت فرمائی۔ بخاری و مسلم میں یہ حدیث ابو سعید خدری ابو ھریرہ اور دیگر طرق سے مروی ہے۔ یہ حدیث مشہور اور مقبولِ عام ہے۔ اہل علم نے اس کی صحت اور مقبولیت پر اجماع منعقد کیا ہے۔ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بیت المقدس میں عبادت کرنے کی نیت سے سفر کرنا مستحب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر بیت المقدس پہنچ کر نماز ادا کیا کرتے تھے۔

ششم :۔ یہ حدیث امام زہری نے اپنے شیخ سعید بن المسیب سے روایت کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر زہری نے یہ حدیث بنو امیہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کرکے سعید بن المسیّب کی جانب منسوب کی ہوتی تو سعید ہرگز خاموش رہنے والے نہ تھے۔ حالانکہ سعید بنو اُمیہ کے ستم رسیدہ تھے اور ان کو پیٹا بھی گیا تھا۔ سعید بن المسیب نے ۹۳ھ میں ابن زبیر کے قتل کے بیس سال بعد وفات پائی۔ حیرت ہے کہ سعید اس قدر طویل عرصہ تک کیسے خاموش رہ سکتے تھے؟ باوجودیکہ سعید حق و صداقت کے ایک کوہِ گراں تھے۔ اور کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔

ہفتم :۔ اگر ہم فرض بھی کرلیں کہ زہری نے یہ حدیث عبدالملک کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کی تھی تو اس میں قبۃ الصخرہ کی فضیلت کیوں نہ بیان کی جس کے حج کی طرف عبدالملک لوگوں کو راغب کرنا چاہتے تھے۔ مذکورہ صدر حدیث اور اس ضمن میں وارد شدہ دیگر احادیث صحیحہ میں صرف بیت المقدس میں نماز ادا کرنے اور اس کی زیارت کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس کے لیے کوئی وقت معین نہیں کیا گیا۔ یہ چیز اجمالاً قرآن نے بھی بیان کی ہے۔ پھر اس سے عبدالملک کا مقصد کیوں کر پورا ہوسکتا ہے جو ایامِ حج میں لوگوں کو اس

امر کی ترغیب دلانا چاہتا تھا کہ خانہ کعبہ کے بجائے صخرہ کا حج کیا کریں۔

ہشتم:۔ حدیث "لاتشد الرحال" کو علماء نے صحیح قرار دیا ہے۔ بیت المقدس اور صخرہ کے فضائل کے بارے میں وارد شدہ احادیث موضوعہ کا اس سے کچھ تعلق نہیں، یہ احادیث زھری سے منقول بھی نہیں ہیں۔ علماء نے ان پر شدید نقد و جرح کی اور کہا ہے کہ صخرہ سے متعلق تمام احادیث جھوٹی ہیں۔ علماء کا قول ہے کہ بیت المقدس کی فضیلت کے بارے میں صرف مندرجہ ذیل تین احادیث صحیح ہیں:۔

(۱)۔ حدیث "لاتشد الرحال"۔

(۲)۔ وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ زمین پر سب سے پہلے کون سا خانۂ خدا تعمیر کیا گیا تھا؟ آپ نے فرمایا "مسجد حرام" پوچھا گیا "اس کے بعد" آپ نے فرمایا "مسجد اقصیٰ"۔

(۳)۔ وہ حدیث جس میں آیا ہے کہ مسجد اقصیٰ میں ایک نماز سات سو نماز کے برابر ہے۔

ابراہیم بن ولید اموی کا واقعہ:۔

یہودی مستشرق گولڈزیہر نے دعویٰ کیا ہے "کہ ولید بن ابراہیم اموی زھری کے پاس ایک رسالہ لایا اور کہا "اس رسالہ میں احادیث مندرج ہے آپ مجھے ان کی نقل و روایت کی اس حیثیت سے اجازت دیں کہ یہ میں نے آپ سے سنی ہیں" زھری نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اجازت دے دی اور کہا "میرے سوا اور کون آپ کو یہ حدیثیں سنا سکتا ہے؟" چنانچہ ولید بن ابراہیم ان احادیث کو زھری کی مرویات کی حیثیت سے روایت کرتا رہا۔

گولڈزیہر نے اس بیان میں کئی طرح سے مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔

(۱) محدث ابن عساکر نے تصریح کی ہے کہ ابراہیم کا سماع زھری سے ثابت ہے۔ غالباً واقعہ یوں ہوا کہ ابراہیم نے ایک تحریر استاد کے سامنے پیش کی۔ قبل ازیں ابراہیم ان سے وہ احادیث سن چکا تھا۔ اس کو محدثین کی اصطلاح میں "عرض المناولۃ" کہتے ہیں۔

محدث ابن الصلاح مقدمہ میں لکھتے ہیں:۔

"اخذِ حدیث کی چوتھی قسم کو "المناولۃ" کہتے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ اجازت بھی شامل ہو

مثلاً اُستاد طالب علم کو ایک ایسی کتاب دے جو اس نے اپنے شیخ سے سُنی ہو
اور کہے یہ مجھ سے روایت کیجیے یا شاگرد ایک ایسی کتاب لائے جو اس نے شیخ
سے سُنی ہو۔ شیخ غور سے دیکھ کر کہے "اسے روایت کیجیے" تو اس کو "عرض
المناولۃ" کہتے ہیں۔"

محدث حاکم فرماتے ہیں:۔

"بہت سے متقدمین کے نزدیک یہ بھی سماع کی ایک قسم ہے۔ امام مالک زہری
ربیعہ یحییٰ بن سعید مجاہد اور سفیان سے اسی طرح منقول ہے"

(مقدمہ ابن الصلاح، ص ۹، واختصار علوم الحدیث ص ۱۲۶)

ایوب کہتے ہیں "ہم اپنے معلومات زہری کے سامنے پیش کیا کرتے تھے"۔

عبیداللہ بن عمر کا قول ہے:۔

"میں زہری کے پاس ایک کتاب لایا۔ نہایت غور سے دیکھ کر کہا "میں نے تجھے
اس کے روایت کرنے کی اجازت دی"۔

امام زہری کے اکثر تلامذہ کا بیان ہے کہ وہ ان سے حدیثیں سن کر بعد ازاں ان کو سنایا کرتے تھے۔
وہ غور سے سن کر ان کی تائید کیا کرتے تھے۔

ابراہیم بن ولید کی روایت کو اگر صحیح قرار دیا جائے تو وہ حتماً اسی قبیل سے ہے۔ اس کی
تائید مزید اس بات سے ہوتی ہے کہ ابن عساکر کی روایت میں "عرض" کا لفظ ہے۔ آپ جانتے
ہیں کہ عرض سے مراد یہ ہوتا ہے کہ شیخ کو کتاب دی جائے تاکہ وہ اسے بغور دیکھ کر اس کی روایت
کی اجازت دے دے۔

یا تو ابراہیم نے بذات خود کچھ حدیثیں جمع کی ہوں گی اور پھر زہری سے کہا کہ اپنی طرف سے
ان کے روایت کرنے کی اجازت دے دیں۔ اور امام زہری نے اس کو تسلیم کر لیا ہو۔ ایسی بات
زہری سے صادر نہیں ہو سکتی جو پوری امتِ اسلامیہ میں مشہور تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی شہرت
کی وجہ ان کی علمی امانت و دیانت اور ان کی زبردست قوت حافظہ ہی تھی۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ زہری کا قول "تجھے کون اس کی اجازت دے سکتا ہے؟

بقول ابن عساکر وہ اصل لیول ہے کہ "میرے سوا کون تجھے اس کی اجازت دے سکتا ہے ؟"
اور یہ بات درست بھی ہے۔ اس لیے کہ دوسرا کوئی شخص زھری کے تلامذہ کو وہ احادیث روایت
کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا جو انہوں نے اپنے شیخ کے سوا اور کسی سے نہیں سنیں
مزید براں یہ بھی حقیقت ہے کہ زھری اپنے زمانہ کے عظیم ترین حافظ حدیث تھے۔ ہم قبل ازیں
ائمہ حدیث کے اقوال نقل کر چکے ہیں کہ اگر زھری نہ ہوتے تو بہت سی حدیثیں ضائع ہو جاتیں۔
امام مسلم نے لکھا ہے کہ زھری ایسی نوے[۹۰] احادیث روایت کرتے تھے جو اور کسی کو یاد نہ تھیں
لہٰذا زھری نے ابراہیم کو جو بات کہی تھی اس کا مطلب یہ ہے کہ "میرے سوا اور کون شخص ان
حدیثوں سے آگاہ ہے جو تجھے ان کے روایت کرنے کی اجازت دے گا ؟" اس کے یہ معنی ہرگز
نہیں کہ میرے سوا ان کو وضع کرنے کی جرأت اور کون کر سکتا ہے ؟

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ کتب حدیث میں ابراہیم کی کوئی روایت مذکور نہیں۔ کتب جرح
وتعدیل میں اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ نہ اس کو ثقہ راویوں میں شمار کیا گیا ہے اور نہ ضعیف و متروک
رواۃ ورجال میں۔ اب سوال یہ ہے کہ زھری کی اجازت سے جو حدیثیں ابراہیم نے لوگوں میں پھیلائیں
تھیں وہ کہاں گئیں ؟ کن کتب حدیث میں مندرج ہیں اور کس کی روایت سے ہیں ؟ وہ رسالہ کہاں
چھپ گیا اور اس کو کتب حدیث میں جگہ کیوں نہ مل سکی ؟

امام زھری کا قول کہ ہمیں حدیثیں لکھنے پر مجبور کیا گیا تھا :۔

گولڈ زیہر کا دعویٰ ہے کہ بروایت معمر زھری نے خود اعتراف کیا تھا کہ "امراء نے ہمیں
حدیثیں لکھنے پر مجبور کیا تھا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زھری اپنی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے
حکومت وقت کی خواہشات کی تکمیل کیا کرتے تھے "

امام زھری کی صداقت و جرأت کے بیان میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ حکام کی خواہشات کا احترام
کرنے والے نہ تھے۔ ہم نے وہ واقعات بھی پیش کیے تھے جو زھری اور اموی خلفاء کے درمیان
وقوع پذیر ہوئے۔ یہ جملہ امور اس بات کی زندہ دلیل ہیں، کہ امام زھری کا دامن ایسی آلائشوں سے
پاک تھا۔

گولڈ زیہر نے جو عبارت نقل کی ہے وہ ایسی تحریف پر مشتمل ہے جس سے معنی و مفہوم یکسر بدل

جاتا ہے ابن عساکر اور ابن سعد کے مطابق اصل عبارت یوں تھی کہ زھری لوگوں کو حدیثیں لکھنے سے منع کیا کرتے تھے تاکہ وہ کتابوں کے بجائے اپنی قوت حافظہ پر بھروسہ کریں۔ جب ہشام نے باصرار زھری سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کے لڑکے کو حدیثیں لکھوائیں۔ زھری نے چار صد احادیث املاء کرا دیں اور بلند آواز یہ بات کہتے ہوئے بارگاہِ خلافت سے چل دیے کہ:

"لوگو! ہم تمہیں ایک بات سے منع کیا کرتے تھے اب وہی کام ہمیں ان لوگوں کے لیے کرنا پڑا۔ اُمراء نے ہمیں کتابتِ حدیث پر مجبور کر دیا ہے۔ اب آؤ میں تمہیں حدیثیں سناؤں۔ اس کے بعد چار صد احادیث لوگوں کو سُنا دیں"

یہ ہے امام زھری کے قول کی تاریخی نقل! خطیب نے اس کو بالفاظ دیگر روایت کیا ہے وہ الفاظ یہ ہیں:

"ہم علمی باتوں کے لکھنے کو ناپسند کیا کرتے تھے حتیٰ کہ ان امراء نے ہمیں اس پر مجبور کر دیا۔ اب ہم نے اسی میں مصلحت دیکھی کہ کسی مسلمان کو لکھنے سے منع نہ کریں" (تقیید العلم ص ۱۰۷)

اب غور فرمائیے کہ گولڈزیہر نے زھری کا جو قول نقل کیا ہے اس کے اور مورخین کے نقل کردہ الفاظ میں کس قدر بُعد و تفاوت پایا جاتا ہے۔ گولڈزیھر نے "کتابۃ احادیث" کا لفظ نقل کیا ہے۔ بخلاف ازیں مورخین نے "کتابۃ الاحادیث" اور خطیب نے "کتاب العلم" لکھا ہے۔ اب ذرا گولڈزیہر کی علمی امانت دیکھئے کہ "الاحادیث" سے "ال" حذف کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو بات زھری کی فضیلت پر مشتمل تھی وہ رذیلت ہو کر رہ گئی۔ اصلی عبارت سے زھری کی امانت و دیانت ظاہر ہوتی تھی۔ یعنی زھری کو یہ بات ناپسند تھی کہ امراء کے سامنے علم کی اشاعت کریں اور لوگوں سے اسے چھپائے رکھیں۔ یہودی مستشرق کی علمی امانت کا اندازہ لگائیے۔ وہ زھری کی جانب اس بات کو منسوب کرتا ہے کہ امراء نے ان کو حدیثیں وضع کرنے پر مجبور کیا تھا۔ دونوں عبارتوں میں بین تفاوت پایا جاتا ہے۔

زھری تملق پسند تھے:

گولڈزیہر لکھتا ہے:-

"زھری ان لوگوں میں سے نہ تھے جن کے ساتھ ساز باز ممکن نہیں ہوتی بخلاف ازیں وہ حکومت کے ساتھ مل جل کر رہنے کے حق میں تھے قصر خلافت میں جانے سے کوئی باک محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر سلطان کے آس پاس چلتے پھرتے نظر آیا کرتے تھے۔"

ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ علماء کے خلفاء و امراء کی مجالس میں آنے جانے سے ان کی امانت و دیانت متاثر نہیں ہوتی۔ اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ وہ خلفاء کی خواہشات کے غلام تھے۔ ہم نے یہ بھی بیان کیا تھا کہ امام زھری اور اموی خلفاء کے درمیان گہرے مراسم و روابط پائے جاتے تھے۔ مگر یہ ایک ایسے عالم کے تعلقات تھے جو اپنے علم اور اپنے منصب و مقام کے اعتبار سے قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو اور جب بھی اظہار حق و صداقت کی ضرورت محسوس کرے پوری بے باکی کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ اسے خلیفہ کے منہ پر کہہ سکتا ہو۔ قبل ازیں صحابہؓ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ تابعین اموی خلفاء کے دربار میں جایا کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ کی خلیفہ منصور کے یہاں آمد و رفت تھی۔

قاضی ابو یوسف ہمیشہ ہارون الرشید کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ مگر بایں ہمہ کسی نے نہ ان کو مطعون کیا اور نہ ان کی عدالت و ثقاہت میں فرق آیا۔

زھری اور حجاج:

گولڈ زیہر نے دعویٰ کیا ہے کہ امام زھری حج کے موقع پر حجاج کے ہم رکاب تھے۔ یہ دعویٰ زھری سے نفرت دلانے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ وہ بے دین تھے۔ یہ دعویٰ باطل اور بے بنیاد ہے۔ امام زھری حج کے موقع پر حجاج کے ساتھ ہرگز نہ تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ جب حضرت عبداللہ بن عمر حجاج سے ملے اس وقت زھری ان کے ساتھ تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اپنی کتاب تہذیب میں لکھتے ہیں:۔

"عبدالرزاق نے "مصنّف" میں زھری سے روایت کیا ہے کہ عبدالملک نے حجاج کو لکھا کہ احکام حج میں ابن عمر کی پیروی کریں۔ حجاج نے ابن عمر کو عرفہ کے

دن کہلا بھیجا کہ جب آپ کوچ کرنا چاہیں ہمیں آگاہ کر دیں۔ چنانچہ ابن عمر اور سالم
جب چلے تو میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ زہری کہتے ہیں کہ میں روزہ سے تھا
اور گرمی کی وجہ سے مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔"

اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جب عبداللہ بن عمر حجاج سے ملے تو زہری
ان کے ہمراہ تھے حجاج کے ساتھ نہ تھے۔

گولڈ زیہر نے دعویٰ کیا ہے کہ زہری پر یہ طعن بھی کیا جاتا ہے کہ خلیفہ ہشام نے ان کو اپنے ولی عہد کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ تاریخی اعتبار سے یہ بالکل غلط ہے۔ مزید براں ہشام کا ولی عہد اس کا بھتیجا ولید بن یزید تھا۔ اس کا بیٹا نہ تھا۔ ہشام کے بھائی یزید بن عبدالملک نے وصیت کی تھی کہ ہشام اپنے بعد میرے بیٹے ولید کو خلیفہ مقرر کرے۔ ولید آزاد منش آدمی تھا اور امام زہری کے ساتھ اسی طرح عداوت رکھتا تھا۔ جیسے نیک و بد لوگوں کے درمیان ہوتی ہے۔ البتہ زہری کو اس وقت ہشام کی اولاد کا اتالیق مقرر کیا گیا جب وہ ہشام کے ہمراہ ۱۰۶ھ میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ اگرچہ تاریخی اعتبار سے یہ غلط ہے تاہم یہ بات ہمارے لیے بالاتر از ادراک ہے کہ اولادِ ہشام کی تربیت سے زہری کس لیے ملعون ٹھہرے؟ کیا زہری کا اتالیق قرار دیا جانا اس سے بہتر نہیں کہ کسی غنڈے آوارہ مزاج اور دشمن خدا اور رسول کو یہ خدمت تفویض کی جاتی؟ تاریخ کے اوراق اس امر کے شاہد عدل ہیں کہ ہشام کی اولاد نے روم میں شاندار فتوحات حاصل کی تھیں۔ مختلف دیار و امصار میں انہوں نے اسلام کی دعوت و تبلیغ میں نمایاں حصہ لیا۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اولاد ہشام کے ان فضائل و اوصاف میں ان کے استاذ محترم زہری برابر کے شریک ہیں خصوصاً جب کہ مورخین بالاتفاق لکھتے ہیں کہ زہری ایک عظیم سپاہی تھے اور وہ جہاد میں شرکت کے لیے سرزمین شام میں حاضر ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ زہری فوجی لباس زیب تن کیا کرتے تھے

امام زہری اور منصب قضا:

گولڈ زیہر نے امام زہری پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "انہوں نے خلیفہ یزید ثانی کے عہد خلافت میں منصب قضا کو قبول کر لیا تھا۔ بقول گولڈ زیہر اگر زہری متقی ہوتے تو امام شعبی

اور دیگر صلحاء کی طرح اس منصب سے دُور بھاگتے ہ

سوال یہ ہے کہ یہ نقد و جرح کہاں تک درست ہے ؟ ہمیں معلوم نہیں کہ کسی شخص نے بھی منصب قضا کو نقد و طعن کا موجب ٹھہرایا ہو۔ خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب معاذ بن جبل معقل بن یسار اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کو قاضی مقرر کیا تھا۔ متعدد تابعین اموی خلافت میں منصب قضا پر مامور کیے گئے تھے۔ قاضی شریح ابوادریس خولانی۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ۔ قاسم بن عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن مسعود اور بکثرت دیگر تابعین اس منصب سے سرفراز ہوئے۔ بعض کو خود حجاج نے قاضی مقرر کیا۔ ہمارے علم کی حد تک کسی نے بھی ان کو صرف یہ منصب قبول کرنے کی وجہ سے مطعون نہ کیا۔

باقی رہی یہ بات کہ شعبی منصب قضاء سے نفرت کرتے تھے اور انہوں نے ابن الاشعث کے ساتھ مل کر حجاج کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ تو یہ بدترین قسم کا مغالطہ ہے۔ دراصل واقعہ یوں ہُوا کہ شعبی نے حجاج کے خلاف نبرد آزما ہونے کے بعد جب ابن الاشعث کا فتنہ فرو ہُوا تو یزید بن عبدالملک کے حکم سے حجاج کے عہد ہی میں قضاء کا منصب قبول کر لیا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ گولڈ زیہر نے یہ بات کیوں نہ بیان کی کہ شعبی نے اپنی زندگی کے آخری دَور میں یہ منصب قبول کیا تھا۔

گولڈ زیہر کا یہ دعویٰ کہ اہل تقویٰ قضاء کا منصب قبول کرنے سے احتراز کیا کرتے تھے اور جو شخص یہ عہدہ قبول کرتا اس کو ساقط العدالت قرار دیتے تھے۔ مزید براں اس حدیث سے استدلال کہ " جسے قاضی بنایا گیا اُسے الٹی چھُری کے ساتھ ذبح کیا گیا" تو یہ بات اگرچہ ہمارے ائمہ سے منقول ہے مگر واقعہ کے خلاف ہے۔

علماء نے تصریح کی ہے کہ ظالم حکام کے عہد امارت میں قضا کا منصب قبول کرنا روا ہے جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ قاضی فیصلہ کرنے میں احتیاط سے کام لے اور عدل و انصاف کے تقاضوں پر عمل کرے۔

شیخ الاسلام مرغینانی ھدایہ میں لکھتے ہیں :۔

"سلطان عادل ہو یا ظالم اس کے عطا کردہ منصب کو قبول کرنا جائز ہے۔ اس کی دلیل

یہ ہے کہ حضرات صحابہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دیے ہوئے عہدوں کو
قبول کیا تھا حالانکہ حضرت علی حق پر تھے۔ اسی طرح تابعین نے ظالم حجّاج کے عہدِ
امارت میں مناصب جلیلہ قبول کیے تھے۔ البتہ جب قاضی حق کے مطابق فیصلہ نہ
کر سکتا ہو تو وہ منصبِ قضا کو قبول کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔"

(فتح القدیر، ج ۶۔ ص ۳۶۴)

ابن العربی مالکی شرح ترمذی میں لکھتے ہیں :-

"منصب قضاء کو قبول کرنا فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے۔ اگر خلیفہ سب لوگوں
کو تعاون کی دعوت دے، اور وہ قبول نہ کریں تو گناہ گار ہوں گے۔ اور اگر بعض
لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں تو وہ اجر پائیں گے اور باقی لوگوں سے بھی یہ
فریضہ ساقط ہو جائے گا۔" (شرح ترمذی، ج ۱۔ ص ۹)

ابن فرحون تبصرۃ الحکام میں لکھتے ہیں :-

"جن احادیث میں منصب قضا قبول کرنے کے بارے میں وعید آئی ہے وہ
یا تو ان عالم قاضیوں کے بارے میں ہے جو ظالم ہوں۔ یا ان جاہل قضاۃ سے
متعلق ہے جو علم کے بغیر اس منصب پر فائز ہو گئے ہوں۔ وعید ان دونوں قسم
کے قاضیوں کے بارے میں وارد ہوتی ہے۔"

یہ بیانات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ منصب قضاء سے کسی شخص کی عدالت ساقط
نہیں ہو جاتی جیسے گولڈزیہر کا دعوٰی ہے۔ بخلاف ازیں یہ منصب عزت و عظمت کا موجب ہے۔
اور اگر اس منصب میں فضیلت کا پہلو صرف یہی ہو کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں قاضی رسول
کریم کا قائم مقام ہوتا ہے تو اس کی شرافت و فضیلت کے لیے یہی امر کافی ہے۔

البتہ یہ درست ہے کہ بہت سے علماء نے اس منصب کو ٹھکرایا بھی تھا۔ بعض علماء
اس کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے حوادث و آلام میں مبتلا کیے گئے۔ ان کے اس منصب کو ٹھکرانے
کی وجہ یہ نہ تھی کہ آدمی اس سے ساقط العدالت اور مجروح ہو جاتا ہے۔ بخلاف ازیں ورع و زہد
کے جذبات نے ان کو ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا مبادا وہ لوگوں کے حقوق اپنے سر پر لیے بارگاہ خداوندی

میں حاضر ہوں ۔

ابن العربی بعض صحابہ کے قضاء کو قبول نہ کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"آدمی جو نیک اعمال انجام دیتا ہے مناسب یہ ہے کہ ان میں ڈرتا رہے کہ مبادا اس سے کوتاہی سرزد ہوئی ہو۔ یا وہ اس لیے بارگاہِ ربانی میں بار نہ پا سکیں کہ ان میں متعدد غلطیاں شامل ہو گئی ہوں ۔ یہ ان عبادات کا حال ہے، جو انسان کی اپنی ذات تک محدود ہیں۔ پھر حقوق العباد کا کیا بنے گا جو انسان کے گلے کا ہار ہیں ؟ ظاہر ہے کہ ان سے زیادہ ڈرنا چاہیے اور مقابلۃً ان میں زیادہ احتراز و اجتناب لازم ہے ۔"

یہ تھی امام زھری پر وارد کردہ ان اتہامات کی تفصیل جو یہودی مستشرق گولڈزیہر نے ان پر عائد کیے تھے ۔ خدانخواستہ اگر ان کی صحت ثابت ہو جاتی تو اس عظیم امام اور ان کی مرویات پر اعتماد باقی نہ رہتا ۔ اور جب زھری ناقابل اعتماد ثابت ہو جاتے تو جملہ کتب حدیث پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ۔ اس لیے کہ زھری حدیث کے عظیم امام تھے ۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ۔ سب سے پہلے حدیثیں مدوّن کرنے کا شرف بھی انہی کو حاصل ہوا ۔ مگر ہم نے بحمداللہ تمام اباطیل کا راز طشت از بام کر دیا ہے ۔ اور اس امام حدیث پر جو حملے کیے گئے تھے ان کی حقیقت کھول کر رکھ دی ہے ۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے سچ فرمایا تھا کہ :

" زھری نے ستّر سال تک اسلام کی خدمت کا فریضہ انجام دیا ۔"

امام زھری فرمایا کرتے تھے :۔

"علم سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ۔ علم دین وہ ادب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو سکھایا ۔ یہ رسول کریم کی جانب خدا کی امانت تھی تاکہ اسے جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیں ۔ جو شخص کوئی علمی بات سنے اس کو اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجت بنا لے ۔ امام زھری فرمایا کرتے تھے ، علم کے چند خطرات بھی ہیں ۔ ایک خطرہ یہ ہے کہ عالم علم کو چھوڑ دے یہاں تک کہ علم

جاتا رہے۔ ایک خطرہ نسیان اور کذب کا بھی ہوتا ہے۔ جھوٹ سب سے بڑی ہلاکت ہے۔

امام زھری اپنی زندگی میں علم و ہدایت کے ایک عظیم پہاڑ تھے، اور ان شاء اللہ العزیز وہ اسی طرح رہیں گے۔ منکرین متعصب اور باطل پرست جو چاہیں کہتے رہیں۔

مستشرقین کے دیگر اعتراضات

دینی تحریف اور بنو اُمیّہ :-

گولڈ زیہر امام زہری پر افترا پردازی کے بعد لکھتا ہے :

"پھر معاملہ اسی پر ختم نہیں ہوا کہ سیاسی مقاصد اور بنو اُمیّہ کے مفاد کے لیے قدیثیں وضع کی گئیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ وبا عبادت سے متعلق ان امور تک پہنچ گئی جو اہل مدینہ کے افکار و آراء سے ہم آہنگ نہ تھے۔ مثلاً یہ کہ جمعہ کے دو خطبے ہوتے تھے اور خلفاء کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح عید کا خطبہ نماز کے بعد دیا جاتا تھا۔ بنو امیہ نے ان امور کو تبدیل کر دیا۔ چنانچہ خلیفہ دوسرا خطبہ بیٹھ کر دیا کرتا تھا۔ اموی خلفاء عید کا خطبہ نماز سے پہلے دیا کرتے تھے وہ رجاء بن حیوہ کی اس روایت سے استدلال کرتے تھے کہ رسول کریمؐ اور خلفاء راشدین بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ دوسری جانب جابرؓ بن سمرہ کہتے ہیں، جو شخص تمہیں بتائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے، اس نے جھوٹ بولا۔ نیز یہ کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کر دیا۔ اور مسجد کے پاس ایک حجرہ تعمیر کیا تھا جس کو خلفائے عباسیہ نے مسمار کر دیا تھا۔ کسی شک و شبہ کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ بعض احادیث جن سے بنو اُمیہ کا مفاد وابستہ تھا، عباسی خلافت کے زمانہ میں ناپید ہو گئی تھیں"

گولڈ زیہر کا طرز تکلم ہمارے لیے ہی اجنبی نہیں بلکہ پوری علمی دنیا اس سے ناآشنا ہے اس میں شک نہیں کہ لوگ شروع سے لے کر آج تک دیکھتے چلے آئے ہیں کہ ملوک و سلاطین اپنی زندگی کے تحفظ اور شان و شوکت کے اضافہ کے لیے یا اپنے بلاد و امصار اور عبادت گاہوں کی آرائش و زیبائش کے لیے کئی قسم کے نئے نئے کام کرتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لوگ بادشاہوں کے موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی۔ بایں ہمہ کسی شخص کے ذہن میں یہ بات

نہیں آتی کہ سلاطین کا یہ اقدام دین کے ساتھ مذاق ہے یا اس سے علماء کا اس کار ہونا لازم آتا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایسا ہوتا ہے اور ہم سے قبل بھی ایسا ہو چکا ہے۔ عصر صحابہ سے لے کر تا ہنوز ملوک و سلاطین کا یہی شیوہ رہا ہے۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی نے قرآن کریم کو جمع کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو نماز تراویح پر اکٹھا کیا۔ حضرت عثمان غنی نے جمعہ کے روز بیرونِ مسجد پہلی اذان کی طرح ڈالی۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے مسجد نبوی میں توسیع کی۔

ملوک و سلاطین مساجد کی تجدید کرتے رہے ہیں۔ گاہے ان میں کمی کرتے اور گاہے توسیع کرتے۔ نماز کے لیے مسجد کو جاتے وقت اس قسم کے حفاظتی اقدامات کرتے جس سے متوقع خطرہ ٹل جاتا۔ پھر ان کے عمل کو دین میں اضافہ اور تحریف پر کیوں نہ محمول کیا گیا؟ بخلاف ازیں جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ منبر کی سیڑھیاں بڑھا لیتے ہیں۔ یا مسجد کے پاس ایک حجرہ تعمیر کر لیتے ہیں تو ہم پکار اٹھتے ہیں کہ اموی حکام نے دینی احکام کو بدل دیا اور ان میں تحریف کے مرتکب ہوئے۔ منبر میں تبدیلی تو عہد رسالت ہی میں آ گئی تھی۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پہلے کھجور کے ایک تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ پھر آپ نے ایک منبر بنوا لیا جس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ اس لیے کہ لوگ مسجد میں زیادہ آنے لگے تھے اور ضرورت کا تقاضا یہ تھا کہ اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا جائے تاکہ دور و نزدیک کے سب لوگ سن سکیں۔

اب سوال یہ ہے کہ امیر معاویہ کے زمانہ میں جب کہ مسجد وسیع ہو گئی تھی اور لوگ عہد رسالت سے بھی زیادہ تعداد میں مسجد میں آنے لگے تھے تو منبر کی سیڑھیاں بڑھانے میں کیا حرج تھا؟ دین ہو یا شریعت تقویٰ ہو یا زہد و ورع کوئی بھی اس سے باز نہیں رکھتا۔ امیر معاویہ نے اسی ضرورت کے تحت منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کیا تھا مسجد کے قرب و جوار میں کمرہ تعمیر کرنے کا مقصد بھی یہ نہ تھا کہ حضرت معاویہ طرز بود و ماند کو تبدیل کرنے کے حق میں تھے۔ بلکہ حفاظت خود اختیاری کے پیش نظر آپ نے یہ اقدام کیا تھا ظاہر ہے کہ خوارج حضرت علیؓ و معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ تینوں کو قتل کرنے کی سازش کر رہے تھے۔ جب حضرت علی نے شہادت پائی، اور حضرت معاویہؓ و عمرو بن العاص بچ گئے تو حضرت معاویہؓ نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ لوگوں کے ساتھ مل کر نماز

پڑھنے کے بجائے مسجد سے متصل کمرہ میں نماز ادا کیا کریں۔ ابن خلدون نے واضح الفاظ میں یہ بات تحریر کی ہے۔ (مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۹۹)

جہاں تک جمعہ کے دوسرے خطبہ میں بیٹھنے کا تعلق ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ عبادت میں بگاڑ پیدا کرنے والی بات ہے۔ سب سے پہلے اس کام کا آغاز حضرت معاویہؓ نے کیا تھا۔ مگر دانستہ نہیں، بلکہ اس لیے کہ آپ کا جسم بھاری ہو گیا تھا اور آپ زیادہ دیر تک کھڑے ہونے سے معذور تھے۔ امام شعبی فرماتے ہیں:

"سب سے پہلے بیٹھ کر خطبہ حضرت معاویہؓ نے دیا تھا۔ یہ اس وقت ہوا جب آپ کا بدن بھاری ہو گیا اور پیٹ بڑھ گیا تھا۔" (تاریخ الخلفاء ص ۱۴۳)

بایں ہمہ علماء نے حضرت معاویہؓ پر تنقید کی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء حق کی بات کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے اور منکرات کی تردید میں سہل انگاری انہیں گوارا نہ تھی۔

بیہقی نے کعب بن عجرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ جمعہ کے روز مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ عبدالرحمٰن بن حکم (غالباً مروان بن حکم) بیٹھ کر خطبہ دے رہا تھا۔ کعب بولے دیکھو یہ خبیث بیٹھ کر خطبہ دے رہا ہے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے فرماتے ہیں:

وَتَرَكُوكَ قَائِمًا۔ اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔

مگر ابن حکم نے بیٹھ کر خطبہ دینے کے جواز میں کوئی حدیث پیش نہ کی اور نہ اس کے سنت ہونے کا دعویٰ کیا۔

باقی رہا گولڈزیہر کا یہ دعویٰ کہ رجاء بن حیوہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم اور خلفائے راشدین بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ یہ رجاء جیسے محدث پر افترا پردازی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ رجاء ایسے زمانہ میں یہ بات کہتے جس میں صحابہ اپنی جان پر کھیل کر سنتِ رسول کا تحفظ و دفاع کرتے تھے۔ حدیث کی کسی معتمد کتاب میں یہ روایت رجاء سے منقول نہیں ہے۔ غالباً یہ روایت گولڈزیہر نے "الف لیلہ" جیسی کسی کتاب میں دیکھی ہوگی۔ اس لیے کہ مستشرق مذکور نے اکثر علمی مباحث میں ایسی کتابوں پر اعتماد کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے علامہ دمیری کی "حیاۃ الحیوان" میں

یہ بات دیکھی ہو۔ وہ بھی گولڈزیہر کا ایک بہت بڑا ماخذ ہے۔

رجاء بن حیوہ ائمہ حدیث کے نزدیک عظیم حافظ حدیث تھے۔

امام ذہبی لکھتے ہیں:

"ابن سعد فرماتے ہیں رجاء بہت بڑے حافظ ثقہ اور کثیر العلم تھے۔ ابن عون کا قول ہے میں نے شام بھر میں رجاء جیسا شخص نہیں دیکھا۔ اور نہ عراق میں ابن سیرین جیسا اور نہ حجاز میں قاسم جیسا۔ ذہبی کہتے ہیں رجاء وہی شخص ہے جس نے سلیمان کو مشورہ دیا تھا کہ عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ بنائیں رجاء جیسے ثقہ حافظ حدیث کا جرم گولڈزیہر کی نگاہ میں یہ ہے کہ وہ شام میں بود و باش رکھتے تھے اور اموی خلفاء کے ساتھ ان کے مراسم تھے۔ امام زھری کا گناہ بھی یہی تھا۔"

حضرت جابرؓ بن سمرہ کا یہ قول کہ "جو شخص تمہیں بتائے کہ رسول کریمؐ بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے اس نے جھوٹ بولا۔ اس میں کسی موضوع حدیث کی تردید نہیں کی گئی۔ بخلافِ ازیں اس امر کا احتمال ہے کہ صحابہ کے ذہن میں بیٹھ کر خطبہ دینے کے جواز کا جو خیال آسکتا تھا حضرت جابر نے اس کی تردید کی اور قطعی طور سے بیان کر دیا کہ یہ سنت رسول کے منافی ہے۔

نماز عید سے قبل خطبہ دینے کا عذر مروان نے یہ بیان کیا تھا کہ اس نے مجبوراً ایسا کیا ہے اگر لوگ پہلے نماز پڑھ لیتے تو وہ خطبہ سننے کے لیے ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ مروان نے یہ نہیں کہا تھا کہ اس نے کسی حدیث کی بناء پر ایسا کیا یا اس کی تائید میں اپنے اتباع کو حدیث وضع کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے باوجود صحابہ و تابعین نے اس پر شدید تنقید کی تھی۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ جب امیر معاویہؓ کے عامل مروان نے نماز سے پہلے خطبہ دیا تو وہ اس پر معترض ہوئے اور اس کا کپڑا پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ مروان نے اپنی طرف کھینچا اور منبر پر چڑھ کر خطبہ دینے لگا۔ ابو سعید خدری نے کہا، بخدا تم نے دینی احکام کو بدل ڈالا۔ مروان بولا "ابو سعید! وہ پرانی باتیں جو تمہیں معلوم ہیں رخصت ہوئیں" ابو سعید نے کہا "خدا کی قسم جو باتیں مجھے معلوم ہیں وہ ان سے بہتر ہیں جو مجھے معلوم نہیں"

مروان نے کہا "اگر ہم نماز پہلے پڑھ لیتے تو لوگ خطبہ سننے کے لیے ہرگز نہ بیٹھتے۔"

صحیح مسلم کی روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مروان نے کسی حدیث سے استدلال نہیں کیا۔ اسی طرح حضرت معاویہؓ نے بیٹھ کر خطبہ دینے مسجد کے پاس حجرہ بنانے اور منبر کی سیڑھیوں میں اضافہ کرنے کے بارے میں بھی کسی حدیث سے استدلال نہیں کیا۔ ان واقعات کے رونما ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ہمیں جو کچھ بھی اختلاف ہے، وہ صرف اس بات سے ہے کہ یہ واقعات جو بنا بر اجتہاد ان کے اصحاب سے خاص احوال وظروف میں صادر ہوتے تھے۔ گولڈ زیہر نے ان کو اس بات کی دلیل میں پیش کیا ہے کہ اموی حکام زندگی کے آداب واطوار کو بدل دینا چاہتے تھے اور اسی لیے انہوں نے حدیثیں وضع کی تھیں۔ حالاں کہ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مستشرقین بلا دلیل ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور توہمات پر قطعی احکام کی بنیاد رکھتے ہیں پھر اپنے تخیلات کے حق میں دلیل بھی پیش نہیں کر سکتے۔

یہودی مستشرق کا یہ دعویٰ کہ بعض احادیث ایسی تھیں جن سے بنو اُمیّہ کا مفاد وابستہ تھا۔ جب عباسی برسر اقتدار آئے تو وہ چھپ گئیں۔ مستشرق مذکور اس پر یقین رکھتا ہے مگر ہماری نگاہ میں یہ بات مشکوک ہے۔ ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ حدیثیں کہاں پوشیدہ ہو گئیں؟ عباسی خلفاء نے ان کو کہاں چھپا دیا؟ کیا عباسیہ نے محدثین کو ان کی نقل وروایت سے روک دیا تھا؟ اور اگر بعض حدیثیں ایک خاص عصر وعہد میں چھپ گئیں اور دوسرے میں معرض ظہور میں آ گئیں۔ تو جھوٹ اور باطل کا یہی حال ہوتا ہے۔ جھوٹ جب رسوا ہونے لگتا ہے اور باطل جب شکست کھاتا ہے تو اس وقت چھپ جاتا ہے۔ مگر اس کے روپوش ہونے کے یہ معنی ہیں کہ کتب صحیحہ اور مسانید معتبرہ سے غائب ہو جاتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ احادیث بذات خود ان کے اصحاب ورُواۃ اور مدوّنین سے بالکل ہی چھپ جائیں تو ایسا کبھی نہیں ہوا اور تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ مستشرقین اس کی ایک ہی مثال پیش کریں۔

کذب صالحین وتدلیس محدثین :۔ گولڈ زیہر نے اپنے قول کی تائید وحمایت میں

ایسے اقوال پیش کیے ہیں جن میں بعض علماء پر نقد و جرح کی گئی ہے۔ مثلاً محدث ابوعاصم النبیل فرماتے ہیں :-

"میں نے کسی نیک آدمی کو اس قدر جھوٹ بولتے نہیں دیکھا جتنا جھوٹ وہ حدیث میں بولتے ہیں"

یحییٰ بن سعید القطان سے بھی اسی قسم کا قول منقول ہے۔ وکیع زیاد بن عبداللہ کے بارے میں فرماتے ہیں :-

"وہ عزّ و شرف کے باوجود حدیث میں جھوٹ بولا کرتا تھا"

یزید بن ہارون فرماتے ہیں :-

"میرے زمانہ میں کوفہ کے محدثین ایک کو چھوڑ کر سب کے سب مدلّس تھے۔ حتیٰ کہ سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ کا شمار بھی اہل تدلیس میں ہوتا ہے"

کتاب ھٰذا کے آغاز میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ علماء نے وضع حدیث اور وضاعین کے مقابلہ کے لیے کیا کیا مساعی جمیلہ انجام دی تھیں۔ ان جہود و مساعی کے مظاہر میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ راویوں پر سخت تنقید کی جاتی تھی۔ رواۃ حدیث کی درجہ بندی کر کے بعض کی مرویات کو قبول کیا جاتا۔ بعض کو رد کر دیا جاتا اور بعض کے قبول کرنے میں توقف سے کام لیا جاتا تھا۔ علمائے حدیث نے وضاعین کو چند گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ ان جاہل زاہدوں کا تھا جو جہالت کی وجہ سے حدیثیں گھڑ کر ان کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہمیں اس پر اجر و ثواب ملے گا۔ علماء نے ان کی قلعی کھول کر رکھ دی اور ان کی حقیقت آشکار کر دی تھی۔ تاکہ لوگ ان کے زہد و تقویٰ کے دام فریب میں آ کر دھوکہ نہ کھا جائیں۔

گولڈزیہر نے ابوعاصم النبیل کا جو قول ذکر کیا ہے وہ اسی قبیل سے ہے کہ "میں نے کسی نیک آدمی کو اتنا جھوٹ بولتے نہیں دیکھا جس قدر جھوٹ وہ حدیث میں بولتے ہیں" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نیک خصلت ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ درحقیقت صالح تھے جس طرح علماء ائمہ دین اور حفاظ حدیث ہوتے ہیں۔ بخلاف ازیں اس نیکی کے وہی معنی ہیں جو

ہم نے بیان کیے۔ ورنہ اس سے لازم آئے گا کہ سعید بن المسیب عُروہ شافعی مالک احمد ابوحنیفہ حسن بصری اور زھری رحمہم اللہ حدیث نبوی کی نقل درروایت میں اکذب الناس تھے۔ حالاں کہ کوئی شخص اس بات کا قائل نہیں ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان کا وہ قول جس کے بارے میں ہم نے کہا ہے کہ وہ ابوعاصم النبیل کے مقولہ کی مانند ہے، مقدمہ صحیح مسلم میں مذکور ہے۔ امام مسلم نے جہاں قبولِ احادیث میں احتیاط کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس راوی کی غلطیاں زیادہ ہوں جس کا عقیدہ خراب ہو اور غافل مزاج ہو اس کی مرویات کے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ وہاں یحییٰ کا قول بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے آگے امام مسلم فرماتے ہیں :۔

"یعنی جھوٹ نیک لوگوں کی زبان پر جاری ہوجاتا تھا اور وہ دانستہ اس کے مرتکب نہیں ہوتے تھے"

کوئی مسلم اس بات کی جسارت نہیں کرسکتا کہ صالحین سے حدیث کے آئمہ ثقات مراد لے اور ان کو کاذب ٹھہرائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امام بخاری، احمد، اوزاعی، زھری اور مسلم جیسے آئمہ حدیث صالحین کے زُمرہ سے نکل جائیں گے۔ ہم نے سابقہ بیان کے خلاف صالحین کی ایک اور تفسیر بھی سُنی ہے۔ امام شعرانی اپنی کتاب "العھود الکبریٰ" میں لکھتے ہیں :۔

"میں نے اپنے استاد شیخ الاسلام زکریا رحمہ اللہ سے سُنا فرماتے تھے کہ بعض محدثین نے کہا ہے کہ صالحین سب لوگوں سے زیادہ جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے باطن پر سلامت روی کا غلبہ ہوتا ہے۔ لہٰذا لوگوں کے بارے میں ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ وہ رسول کریمؐ پر جھوٹ نہیں باندھتے۔ صالحین سے ان کے نزدیک وہ عبادت گزار مراد ہیں جو علم بلاغت سے ناآشنا ہوتے ہیں اور نبی و غیر نبی کے کلام میں فرق و امتیاز نہیں کرسکتے۔ جب کہ دوسرے لوگ اس فرق سے آگاہ ہوتے ہیں۔" (قواعد التحدیث للقاسمی)

گولڈزیہر نے وکیع کا جو قول زیاد بن عبداللہ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ معزز ہونے کے باوجود احادیث میں دروغ گوئی سے کام لیا کرتے تھے"، یہ اس خبیث مستشرق کی تحریفات

میں سے ایک ہے ۔ امام بخاری کی تاریخ کبیر میں اصل عبارت یوں ہے :

"ابن عقبہ السدوسی وکیع سے نقل کرتے ہیں کہ زیاد بن عبداللہ کا مقام دروغ گوئی سے بلند تر ہے ۔" (تاریخ کبیر، ج ۲ - ص ۳۲۹)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ وکیع نے زیاد بن عبداللہ سے متعلق ہر قسم کے جھوٹ کی نفی کی اور بتایا ہے کہ ان کا مقام دروغ گوئی سے بلند تر تھا ۔ یہودی مستشرق نے اسی عبارت کو یوں تبدیل کر دیا کہ زیاد با عزت ہونے کے باوجود حدیثیں روایت کرنے میں دروغ گوئی سے کام لیا کرتے تھے ۔ کیا مستشرقین کی علمی امانت یہی ہے ؟

باقی رہا تدلیس کا معاملہ تو یہاں اس کے لغوی معنی (فریب دہی ملمع سازی) مراد نہیں ۔ بخلاف ازیں تدلیس محدثین کی ایک خاص اصطلاح ہے ۔ محدثین کے نزدیک تدلیس کی دو قسمیں ہیں محدث ابن الصلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"تدلیس کی دو قسمیں ہیں ۔

(۱) ۔ **تدلیس اسناد** :۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص جس سے مل چکا ہو اس سے ایسی حدیث روایت کرے جو اس سے سنی نہ ہو مگر دوسرے شخص کو یہ تاثر دے کہ اس نے یہ روایت اس سے سنی ہے ۔ یا ایسے معاصر سے روایت کرے جس سے ملا نہ ہو ۔ مگر دوسرا شخص اس وہم میں مبتلا ہو جائے گا کہ یہ شخص اس سے ملا بھی ہے اور اس نے یہ حدیث اس سے سنی بھی ہے ۔

(۲) ۔ **تدلیس شیوخ** :۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک راوی اپنے شیخ سے وہ حدیث روایت کرے جو اس سے سنی ہو ۔ مگر وہ اپنے شیخ کا نام یا کنیت یا کوئی نسب اور وصف ایسا بیان کرے جس سے وہ مشہور نہ ہو اور اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ شیخ پہچانا نہ جا سکے ۔

تدلیس کی پہلی قسم اکثر علماء کے نزدیک مکروہ و مذموم ہے ۔ مدلس کی روایت کے قبول و عدم قبول میں علماء کا اختلاف پایا جاتا ہے ۔ صحیح یہ ہے کہ اس میں تفصیل کی ضرورت ہے ۔ ایک مدلس راوی جب ایسے مبہم الفاظ استعمال کرے جن میں سماع و اتصال کی صراحت نہ ہو تو اس کا حکم حدیث مرسل کا سا ہو گا ۔ اور جس میں اتصال کی تصریح ہو مثلاً سمعتُ یا حدّثنا و اخبرنا یا اس

قسم کے دیگر الفاظ استعمال کرے تو وہ حدیث مقبول اور قابل احتجاج ہوگی۔ صحیحین اور دیگر معتمد کتب حدیث میں ایسی احادیث بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً قتادہ اعمش سفیان بن عیینہ، سفیان ثوری، ہشام بن بشیر وغیرھم مدلس راوی شمار ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تدلیس اور کذب میں فرق ہے۔ تدلیس میں صرف ایک طرح کا ابہام دُجال پایا جاتا ہے۔ جہاں تک تدلیس کی دوسری قسم کا تعلق ہے۔ اس کا معاملہ خفیف تر ہے۔" (مقدمہ ابن الصلاح)

محدث ابن الصلاح کی ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ صدر رُواۃ حدیث کی تدلیس جرح و قدح کی موجب نہیں ہے۔ اس لیے صرف تدلیس کا نام لے کر لوگوں کو ہراساں کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ علاوہ ازیں گولڈزیہر نے مدلسین کے زمرہ میں جن رواۃِ حدیث کے نام گنائے ہیں وہ سب ایک ہی شہر کوفہ کے رہنے والے تھے۔ پھر دیگر اسلامی بلاد و امصار کے راویوں پر یہ الزام کیسے عائد کیا جا سکتا ہے۔

محدث حاکم اپنی کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں فرماتے ہیں:

"ساکنانِ ارض حجاز و حرمین و مصر اہل خراسان، اصبہان بلاد فارس، خوزستان اور ماوراء النہران میں سے کسی کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ مدلس ہو۔ تدلیس کا نقص سب سے زیادہ اہل کوفہ اور قدرے اہل بصرہ میں پایا جاتا ہے، علاوہ ازیں محدثین نے سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ کی تدلیس کے بارے میں ایسے عذرات بیان کیے ہیں جو قابل قبول ہیں۔ سفیان بن عیینہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ثقہ راویوں سے روایت کیا کرتے تھے اس لیے ان کی تدلیس مقبول ہے جب مدلس روایت سے متعلق ان سے پوچھا جاتا تو وہ ابن جریج معمر اور اس قسم کے ثقہ راویوں کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ ابن حبان نے اسی کو ترجیح دی اور فرمایا ہے کہ ایسی تدلیس سے سفیان بن عیینہ پر کوئی قدح وارد نہیں ہوتی۔"

(معرفۃ علوم الحدیث و شرح الفیہ عراقی، ج ۱۔ ص ۸۴)

سفیان ثوری کی تدلیس کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ وہ نام کی جگہ کنیت اور برعکس ذکر کر دیا کرتے تھے۔ یہ تدلیس نہیں بلکہ راوی کے حق میں تزئین (آرائش و زیبائش) ہے۔

محدث بیہقی نے المدخل میں اس کو ابو عامر سے نقل کیا ہے۔

صحت حدیث کا فیصلہ مبنی بر ظاہر ہوتا ہے:

گولڈ زیہر لکھتا ہے:-

"دوسری صدی ہجری میں مسلمانوں کے اندر اس احساس نے کروٹ لی تھی کہ احادیث کی صحت کا فیصلہ صرف ظاہری شکل و صورت کی اساس پر کرنا چاہیے۔ نیز یہ کہ بکثرت احادیث جید الاسانید ہیں مگر اس کے باوجود ان میں بہت سی موضوع احادیث بھی ہیں۔ اس بات کی تائید میں وہ یہ حدیث پیش کرتے تھے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بکثرت حدیثیں میری جانب سے نقل کی جائیں گی۔ جو شخص تمہیں کوئی حدیث سنائے اسے کتاب اللہ پر منطبق کر کے دیکھ لیا کرو۔ جو اس سے لگا کھاتی ہو تسلیم کر لو۔ کہ وہ میری طرف سے ہے خواہ میں نے کہی ہو یا نہ کہی ہو"۔ جب موضوعات کا عام چرچا ہوا تو اس وقت اس ضابطہ پر عمل کیا جانے لگا۔"

مذکورہ صدر عبارت میں گولڈ زیہر نے علمائے اسلام پر دو جھوٹ تصنیف کیے ہیں۔

(۱)۔ یہودی مستشرق کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ صحتِ احادیث کا فیصلہ صرف ظاہری اساس پر کیا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ جید الاسانید احادیث کے اندر بھی بہت سی موضوعات ہوا کرتی ہیں۔ یہ علمائے اسلام پر سفید جھوٹ ہے۔ یہ بات انہوں نے ہرگز نہیں کہی۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جید السند حدیث موضوع بھی ہو؟

علماء نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ آیا خبر واحد سے قطعی و یقینی علم حاصل ہوتا ہے یا ظنی؟ بعض کے نزدیک خبر واحد مفید یقین ہے۔ مگر جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس سے ظنی علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خبر واحد اگر چہ شروط و قواعد کے لحاظ سے صحیح ہوتی ہے مگر اس میں عدم صحت کا احتمال باقی ہوتا ہے۔ مگر یہ بات خدا کے دین میں حزم و احتیاط کی اساس پر کہی جاتی ہے اور صرف یہ ایک عقلی احتمال ہے جس کا وقوع ضروری نہیں، اندازہ لگائیے کہ گولڈ زیہر نے جو کچھ کہا ہے اس کا اس بات سے کیا تعلق ہے؟

(۲) ۔ گولڈزیہر کا یہ دعویٰ کہ آگے چل کر مذکورہ صدر حدیث کو حدیث نبوی کی جانچ پرکھ کے سلسلہ میں ایک معیار و مقیاس کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی بالکل بے کار و بے دلیل ہے ۔ یہ ایک زبردست افتراء ہے ۔ اس لیے کہ ائمہ حدیث نے اس روایت کو من گھڑت قرار دیا ہے قبل ازیں حجیت حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے ہم اس حدیث کی تحقیق کر چکے ہیں اس حدیث سے متعلق ہم نے امام شافعی ابن حزم یحییٰ بن معین اور عبدالرحمٰن بن مہدی کے اقوال و آراء بھی ذکر کیے تھے حیرت ہے کہ ایک موضوع حدیث کو احادیث کی جانچ تول کے لیے معیار کیسے قرار دیا جا سکتا تھا؟

ابن عمر کی ابوہریرہ پر تنقید :

گولڈزیہر نے حدیث نبوی "کلب زرع" کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے ابوہریرہؓ پر نقد و جرح کی تھی ۔ استاذ احمد امین پر تنقید کرتے ہوئے ہم اس حدیث سے متعلق تفصیلی بحث کر چکے ہیں ۔ احمد امین نے یہ اعتراض گولڈزیہر سے مستعار لیا مگر اس کو مستشرق مذکور کا نام لیے بغیر اس لحاظ سے پیش کیا کہ یہ اس کے اپنے دماغ کی اپج ہے ۔ آفرین ہے ایسی علمی دیانت پر !

صحف مکتوبہ :

گولڈزیہر نے احادیث پر نقد و تبصرہ سے متعلق اپنی بحث کو اس بات پر ختم کیا ہے کہ علماء نے فقہی مسائل و قواعد کے اثبات کے سلسلہ میں صرف زبانی روایات ہی پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ چند مکتوبہ رسائل ایسے اختراع کر لیے تھے ۔ جن کے متعلق ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ان سے رسول کریمؐ کا منشأ ظاہر ہوتا ہے ۔ اس سے گولڈزیہر کی مراد وہ رسالہ ہے جس میں زکوٰۃ کے احکام مندرج تھے ۔ پھر وہ ایسی روایات ذکر کرتا ہے ، جن سے ایسے تحریر شدہ رسائل کا پتا چلتا ہے جن میں مکمل نظام زکوٰۃ پر روشنی ڈالی گئی تھی ۔ پھر اس نے یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ لوگ اس قسم کی دستاویزات پر اعتماد کر لیا کرتے ہیں اس حلف کا ذکر کیا ہے ۔ جس کا اعلان شمالی اور جنوبی عربوں کے نزاع و جدال کے وقت کیا گیا تھا ۔ یہ واقعہ تبع بن معدیکرب کے عصر و عہد میں پیش آیا تھا ۔ لوگوں نے اس قدر پرانا واقعہ ہونے کے باوجود اس کو تسلیم کر لیا تھا ۔ پھر وہ ایسی

دستاویزات کو کیوں کر قبول نہ کرتے جو مقابلۃً قریب زمانہ میں تیار کی گئی تھیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ یہ علمائے اسلام اور مسلمانوں پر ایک اور شدید حملہ ہے جس کی سند تاریخ میں موجود نہیں۔ یہ مکتوبہ صحیفے جو پہلی اور دوسری صدی ہجری میں نمودار ہوئے تھے علماء نے ان کو یونہی قبول نہیں کر لیا تھا۔ جیسا کہ گولڈزیہر نے دعویٰ کیا ہے۔ بخلاف ازیں علماء نے ان کو چھانا پھٹکا اور ان قواعد پر رکھ کر جانچا جو ہم قبل ازیں ذکر کر چکے ہیں۔ اسی کے پیش نظر علماء نے ابن مُدبہ، ہوینار اور راشح کے صحیفوں کو موضوع قرار دیا۔

جہاں تک ان صحیفوں کا تعلق ہے جن میں اونٹ، گائے، بکریوں اور دیگر اشیاء کی زکوٰۃ اور ان کے نصاب کی تفصیلات مذکور ہیں علماء نے ان کو اپنی خصوصی توجہ اور نقد و تبصرہ کا موضوع قرار دیا تھا اس بات پر علماء کا اجماع منعقد ہوا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو خط حضرت انسؓ کے نام لکھا تھا وہ صحیح ہے۔ امام بخاری، نسائی، ابوداؤد، دارقطنی، شافعی، حاکم اور بیہقی نے اُس کو نقل کیا ہے۔ اس قسم کے بعض خطوط کو بعض علماء نے صحیح اور بعض نے حسن قرار دیا ہے۔ ان میں سے بعض خطوط مرسل ہیں اور بعض منقطع۔

بہرکیف تحقیق و تجسس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء نے ان کو بلا نقد و جرح قبول نہیں کیا تھا مزید براں علماء نے صرف مکتوبہ عبارت پر ہی بھروسہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کے مندرجات کو باقاعدہ سند کے ساتھ روایت کیا تھا۔ اس لیے علماء نے دو مختلف طریقوں سے ان پر اعتماد کیا۔ ایک طریق تو وہ عبارت تھی جو ان میں مرقوم تھی۔ دوسرا طریق بالمشافہ روایت تھی، جس کا سلسلہ کہیں ٹوٹنے نہیں پایا تھا۔

خلاصہ یہ کہ ان مرقوم رسالوں کا وضع حدیث کے ساتھ کچھ تعلق نہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جو خط عہد رسالت میں تحریر کیا گیا ہو اس سے یہ کیوں کر ثابت ہوا کہ روایات کی عدم موجودگی میں جھوٹے خطوط بھی وضع کر لیا کرتے تھے۔ نیز یہ کہ جن لوگوں نے مختلف احکام سے متعلق حدیثیں وضع کر لی تھیں وہ زکوٰۃ کے بارے میں چند حدیثیں کیوں نہ وضع کر سکے؛ اور ان کو جعلی خطوط وضع کرنے کی ضرورت کیوں کر پیش آئی؟ اور اگر کسی مسئلہ کے بارے میں متعدد نصوص منقول ہوں اور ان میں سے کسی ایک نص کی صحت کے بارے میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کا یہ مطلب

کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ نص ہی موضوع اور بے بنیاد ہے۔

جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے کہ شمالی اور جنوبی عربوں کے مابین جدال و نزاع برپا ہوا تھا۔ اور انھوں نے اس دستاویز کی تائید کی تھی، جو تبع نامی حاکم کے زمانہ میں لکھی گئی تھی یہ ایک عجیب ترین بات ہے۔ لوگ عموماً سہل انگاری کے عادی ہوتے ہیں۔ البتہ جو چیز رسول کریمؐ کے ساتھ وابستہ اور ان کی طرف منسوب ہو اس کو دیکھ کر آنکھیں کھل جاتی ہیں اور طلب و تحقیق کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ ایک دینی کام ہے اور کوئی شخص خدا کے دین کو وہم و ظن اور ذاتی خواہش کی بناء پر قبول نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں جن لوگوں نے اس دستاویز کو قبول کیا تھا، جو شمالی اور جنوبی عربوں کے نزاع کے سلسلہ میں لکھی گئی تھی وہ محدث نہ تھے۔ پھر اس واقعہ کا موضوع زیر بحث کے ساتھ کیا تعلق؟

حق بات یہ ہے کہ گولڈزیہر علم و ادب کے معاملہ میں حد درجہ بے حیا واقع ہوا ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ وہ ایک جھوٹ تصنیف کرتا ہے۔ پھر اس کے لیے ایک اساس و بنیاد تعمیر کرتا ہے۔ پھر ادھر ادھر سے ایسے دلائل و شواہد ڈھونڈتا ہے جن سے یہ وہم پڑتا ہے کہ وہ اس کے دعویٰ کے مؤید ہیں۔ وہ پوری بے باکی اور ڈھیٹ پن کے ساتھ جھوٹی عبارتیں نقل کرتا ہے۔ ان کے فہم و ادراک میں مغالطہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ جو دلیل نہیں ہے، اس کو دلیل و برہان کے طور پر پیش کرتا ہے۔ قطعی دلیل جب اس کے منشا کے خلاف ہو اس سے اعراض کرتا ہے۔

مستشرق مذکور کے ضدی متعصب اور بعید از انصاف ہونے کی اس سے بڑھ کر دلیل کیا ہو گی کہ وہ نصوص قاطعہ کو جن کی صحت پر سب علماء متفق ہوتے ہیں رد کر دیتا ہے اور ایسے خود ساختہ دلائل و براہین پر عمل کرتا ہے۔ جو حیاۃ الحیوان دمیری الف لیلہ العقد الفرید الاغانی اور اس قسم کی کتب ادب سے ماخوذ ہوتے ہیں، جن میں ہر قسم کا رطب و یابس اور صحیح و سقیم مواد موجود ہوتا ہے۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو علم کیلئے وقف کر رکھا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کو احمد امین اور دیگر منکرین حدیث نے اپنا رہنما و پیشوا بنایا ہوا ہے اور تکذیب صحابہ، تذلیل تابعین اور نقد و جرح کے میدان میں ہمارے علماء پر حملہ آور ہونے

میں ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ تَهْدِي مَنْ تَشَآءُ وَتُضِلُّ مَنْ تَشَآءُ۔ فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَّهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُّضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا۔

(مشتمل بر فصول سہ گانہ)

فصل اوّل:

قرآن و حدیث کا باہم منصب و مقام

فصل دوم:

قرآن کریم حدیث پر کیوں کر مشتمل ہے؟

فصل سوم

نسخ السنۃ بالقرآن و نسخ القرآن بالسنۃ

فصل اوّل

قرآن و حدیث کا باہم منصب و مقام

خداوند کریم نے قرآنِ عزیز کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر اہل ایمان کی رہنمائی کے لیے ایک دستور و آئین بنا کر نازل کیا۔ یہ ان لوگوں کے لیے نسخۂ شفا ہے جن کی صحت مندی بارگاہ ایزدی میں مطلوب ہے۔ یہ طالبانِ فلاح و سعادت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ قرآن کریم انواع و اقسام کے غایات و مقاصد پر مشتمل ہے جن کے لیے انبیاء کو مبعوث کیا گیا تھا۔ اس میں احکام و شرائع بھی ہیں ترغیب و ترہیب بھی اور قصص و توحید بھی۔ اجمالاً و تفصیلاً اس کی صحت قطعی و حتمی ہے۔ جو شخص اس کی ایک آیت ایک کلمہ یا کسی ایک حرف کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ دین الٰہی کے احکام کا فہم و ادراک حاصل کرنے والے کی اولین و اساسی ضرورت یہ ہے کہ وہ احکام خداوندی کو جانے پہچانے اور جو قوانین و دساتیر اس نے اپنے بندوں کے لیے شروع کیے ہیں ان کا علم و ادراک حاصل کرے۔

عصرِ صحابہ میں مسلمانوں نے اس کو بالمشافہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا اور نقلِ متواتر کے ساتھ یہ اگلے تاریخی ادوار تک منتقل ہوتا رہا۔ قرآنِ حکیم کو لوگوں تک پہنچانے کے سوا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذمہ ایک فریضہ اور بھی تھا۔ اور وہ اس کتاب کی شرح و توضیح اس کی آیات کی تفسیر مجمل احکام کی تفصیل اور قواعدِ عامہ کی تشریح ہے۔

نظر بریں قرآن فہمی کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر صحابہ کرام سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توضیحات و تصریحات کے محتاج تھے۔ قرآن کریم کا فہم و ادراک آنحضور کی تشریح و تفسیر کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح قرآن حکیم کی آیاتِ احکام کا مقصد بھی آپ کی جانب رجوع کیے بغیر معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ کتابِ ربانی آپ پر نازل ہی اس لیے کی گئی تھی کہ آپ اس کے مطالب کو کھول کر بیان فرما دیں۔

یہی وجہ ہے کہ اہل اسلام گمراہ فرقوں کو چھوڑ کر شروع سے لے کر آج تک اس مسئلہ پر متفق رہے ہیں کہ حدیث رسولؐ قولی ہو یا عملی یا تقریری دین اسلام کے ان مصادر میں سے ہے جس سے حلال وحرام کی پہچان حاصل کرنے کے لیے کوئی دین دار آدمی بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ سابقہ فصول میں ہم قرآن وحدیث کے دلائل وبراہین سے اس حقیقت کو تم تشریح کر چکے ہیں اب ہم اس امر کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کے مقابلہ میں حدیث نبوی کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ کیا ان دونوں کی حیثیت بالکل مساوی ہے یا حدیث کا مرتبہ قرآن کریم کے بعد ہے؟

اس میں شک نہیں کہ قرآن کریم کے الفاظ قطعی الثبوت ہیں۔ البتہ اثباتِ احکام کے اعتبار سے قرآن کریم دو قسموں میں منقسم ہے۔ (۱) قطعی الدلالت (۲) ظنی الدلالت۔

جہاں تک حدیث کا تعلق ہے احادیث متواترہ قطعی الثبوت ہیں۔ اور غیر متواترہ ظنی الثبوت ان دونوں کی پھر دو دو قسمیں ہیں۔ قطعی الثبوت کی دو قسمیں ہیں (۱) قطعی الدلالت (۲)۔ ظنی الدلالت۔ اسی طرح ظنی الثبوت کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) قطعی الدلالت (۲) ظنی الدلات۔

یہ بھی درست ہے کہ قطعی الثبوت بہر دو صنف، ظنی الثبوت بہر دو نوع سے ہر حال میں مقدم ہے۔ اس سے یہ حقیقت روشن ہوئی کہ سنت کا مرتبہ قرآن حکیم کے بعد ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حدیث یا تو قرآن کریم کی تشریح پر مشتمل ہوگی یا اس پر کسی بات کا اضافہ کرے گی۔ مفسر قرآن ہونے کے اعتبار سے بھی حدیث کو دوسرا درجہ حاصل ہوگا۔ اس لیے کہ جس چیز کی وہ توضیح کر رہی ہے وہ اولیت کے درجہ کی حامل ہوگی۔ کیونکہ وہ اساس ہے جس پر تفسیر وتوضیح کی عمارت اٹھائی جا رہی ہے۔ اور اگر حدیث میں کوئی ایسی بات بیان کی گئی ہے، جو قرآن میں نہیں ہے تو یہ اسی صورت میں قابل تسلیم ہوگی جب قرآن میں موجود نہ ہو۔ اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ کتاب الٰہی حدیث کے مقابلہ میں مقدم ہے۔

تقدیم کتاب کے سلسلہ میں یہ عقلی دلیل ہے۔ متعدد اخبار وآثار سے بھی یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت معاذ بن جبل کی حدیث جس کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا تھا کہ جب کوئی نیا مسئلہ پیش

آئے گا تو اس کا فیصلہ کیوں کر کریں گے ؟ حضرت معاذ نے جواب دیا " کتاب خداوندی کی روشنی میں " فرمایا اگر اس میں نہ ملے تو ؟ معاذ نے عرض کیا " پھر سنتِ رسول کے مطابق فیصلہ کروں گا فرمایا ، اگر سنت میں بھی اس کا حل موجود نہ ہو تو پھر ؟ عرض کیا " اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا "

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک مکتوب بنام قاضی شُریح میں تحریر فرمایا تھا

" جب کوئی معاملہ پیش آئے تو کتاب خداوندی کی روشنی میں فیصلہ کیجئے ۔ اگر کتاب میں اس کا حل نہ ملے تو سنتِ رسول کے مطابق اس کا فیصلہ کیجیے ۔ ایک روایت کے مطابق یوں فرمایا کہ " جب کتاب اللہ میں اس کا حل مل جائے تو دوسری چیز کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیے نہ کسی سے دریافت کیجئے ۔ جو بات قرآن کریم میں نہ ملے اس ضمن میں سنتِ رسولؐ کی پیروی فرمایا کیجئے "

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ جب تم میں سے کسی کو کوئی نیا مسئلہ درپیش ہو تو کتابِ خداوندی کے مطابق فیصلہ صادر کرے ۔ اگر کتاب اللہ میں موجود نہ ہو اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں کچھ ارشاد فرمایا ہو تو اس پر عمل کرے "

ہم قبل ازیں اس پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا طریق کار یہ تھا کہ جب کوئی نیا واقعہ پیش آتا تو وہ قرآن کریم میں اس کا حل دیکھتے ۔ اگر اس میں نہ ملتا تو سنتِ رسول میں تلاش کرتے ۔ صحابہ تابعین اور ائمہ مجتہدین سے بکثرت تائیدی اقوال اس ضمن میں منقول ہیں ۔

تقدیم کتاب کے سلسلہ میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ان علماء کے نظریات سے متصادم ہے جو سنت کو قاضی علی الکتاب مانتے ہیں ۔ وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن میں جو احکام مجمل ہوتے ہیں ، سنت اُن کو کھول کر بیان کرتی ہے ۔ اسی طرح قرآن کے مطلق احکام کو مقید اور عام کی تخصیص کرتی ہے ۔ اس لیے ظواہر کتاب کو چھوڑ کر سنت کی جانب رجوع ناگزیر ہے ۔ گاہے نص قرآن میں دو باتوں کی گنجائش ہوتی ہے اور حدیث دونوں میں سے ایک کی تعیین کر دیتی ہے اندریں صورت آیت قرآنی کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کیا

جاتا ہے۔

اس کی مثال میں ہم آیت سرقہ پیش کر سکتے ہیں۔ اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ ہر چور کا ہاتھ کاٹ دینا چاہیے۔ مگر حدیث نے اس کی یوں تخصیص کر دی کہ چور کا ہاتھ اس صورت میں کاٹا جائے گا جب وہ محفوظ مال چرائے گا۔ مزید برآں اس آیت میں ہاتھ کاٹنے کا ذکر کیا گیا ہے اور ہاتھ کا اطلاق انگلیوں سے لے کر کہنیوں تک پر کیا جاتا ہے۔ حدیث نے واضح کیا کہ یہاں ہاتھ سے مراد وہ حصہ ہے جو انگلیوں سے لے کر کلائی کے شروع ہونے تک ہے۔ علیٰ ھٰذا القیاس جن آیات میں زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اس میں بلا استثناء مال کی سب قسمیں شامل ہیں۔ حدیث نبوی نے زکوٰۃ کے حکم کو مال کی چند قسموں کے ساتھ مخصوص کر دیا۔ قرآن حکیم نے "وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ"۔ (النساء) "کہ کر حرام رشتوں کے علاوہ باقی عورتوں سے نکاح کی اجازت دے دی۔ حدیث نے اس عموم کو محدود کر دیا اور بتایا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بیک وقت نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا۔

ان قرائن و امثلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث نبوی کتاب اللہ سے یا تو مقدم ہے ورنہ کم از کم مساوی ضرور ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امثلہ مذکورہ صدر میں حدیث نے منشاء خداوندی کو صرف واضح کیا ہے۔ آیت سرقہ کی توضیح میں بتایا کہ قطع ید سے کہنیوں تک ہاتھ کاٹنا مراد نہیں۔ نیز یہ کہ سارق سے مراد وہ چور ہے، جس نے محفوظ مال چرایا ہو۔ تو گویا حدیث نے کسی نئے حکم کو ثابت نہیں کیا، بلکہ قرآن میں جو حکم مجملاً وارد ہوا تھا اس کو کھول کر بیان کر دیا۔ حدیث کے قاضی علی الکتاب ہونے کے معنی بھی یہی ہیں۔ یہاں قاضی سے مراد توضیح و تشریح کرنے والی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ حدیث نبوی قرآن سے مقدم ہے۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت معاذ کی روایت پر جرح و قدح کی گئی ہے۔ امام ترمذی کہتے ہیں "یہ حدیث کسی دوسری سند کے ساتھ منقول نہیں۔ اس کی سند بھی متصل نہیں ہے"۔ جوزجانی کہتے ہیں "کہ یہ حدیث موضوع اور باطل ہے لہٰذا اس پر کسی دینی قاعدہ کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی"۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر و ابن مسعود و ابن عباس اور دیگر اکابر صحابہ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس روایت کو صحیح تصور کرتے ہیں اسی طرح علمائے سلف کا اس حدیث پر اعتماد

اس امر کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان کے نزدیک یہ روایت صحیح اور معمول بہا ہے۔

اس امر میں شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ چونکہ ثابت ہونے کے اعتبار سے اخبارِ آحاد کے راستہ میں بہت سے ظنون و توہمات حائل ہیں اس لیے من حیث الثبوت ان کا درجہ قرآنِ کریم کے بعد ہے۔ البتہ اگر اجتہاد اور فہم نصوص کو دیکھا جائے تو نصوص قرآنی پر عمل کرنے سے پہلے سنت کی طرف رجوع از بس ناگزیر ہے اس لیے کہ ہو سکتا ہے حدیث کسی آیت کی تخصیص و تقیید کرتی ہو یا کسی اور طریقہ سے نصِ قرآنی کی تشریح و توضیح کرتی ہو۔ اس پہلو کے پیش نظر احادیث قرآن کریم کے ساتھ مساوی درجہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ نصِ حدیث کا نصِ قرآنی کے ساتھ تقابل کیا جاتا ہے اور دونوں کے مابین جمع و تطبیق کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب آیت و حدیث میں باہم تعارض نظر آتا ہو۔ یہ ایسی بات ہے کہ حدیث کو حجت قرار دینے والا کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

کیا حدیث مستقل ماخذِ تشریع ہے؟

علماء کے یہاں یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ حدیث کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ احادیث جو قرآنی احکام کی مؤید اور اجمال و تفصیل میں ان کے موافق ہوں۔ مثلاً وہ احادیث جن سے نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ کی فرضیت معلوم ہوتی ہے مگر ان کے شرائط و ارکان سے بحث نہیں کرتیں۔ یہ احادیث ان آیات کے موافق و مطابق ہیں جن میں ارکان کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے یہ حدیث کہ اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے۔ نماز قائم کرنا۔ زکوٰۃ ادا کرنا۔ ماہ رمضان کے روزے۔ خانہ کعبہ کا حج اور اس بات کی شہادت کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ یہ حدیث آیاتِ قرآنی:

"وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" (البقرہ۔۸۳)

نیز "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" (البقرۃ۔۱۸۳) و آیت:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۝ (آل عمران۔۹۷) سے ہم آہنگ ہے۔

اسی طرح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم:

"ایک مسلم کا مال اسی صورت میں حلال ہے جب وہ بخوشی خاطر کسی کو عطا کرے۔"

مندرجہ ذیل آیتِ قرآنی کے مطابق ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا

(النساء - ١٩)

(٢) - دوسری قسم کی وہ احادیث ہیں جو قرآنی احکام کی وضاحت کرتی ہوں جن سے قرآن کے مطلق احکام کی تقیید مجمل کی تفصیل اور عام احکام کی تخصیص ہوتی ہے - مثلاً وہ احادیث جن میں نماز زکوٰۃ روزہ، حج، خرید و فروخت اور معاملات سے متعلق احکام کی تخصیص بیان کی گئی ہے - اکثر احادیث اسی قسم سے تعلق رکھتی ہیں -

(٣) - تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جو ایسے احکام پر دلالت کرتی ہوں، جن سے قرآن خاموش ہے اور نفیاً یا اثباتاً کسی طرح بھی ان کا ذکر نہیں کرتا - مثلاً وہ احادیث جن میں ذکر کیا گیا ہے کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی سے بہ یک وقت نکاح نہیں کیا جا سکتا - یا وہ احادیث جن میں شفعہ کے احکام مذکور ہیں - یا وہ احادیث جن سے شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے اور غیر شادی شدہ کو جلا وطن کرنے دادی کی وراثت اور اس قسم کے دیگر احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے -

حدیث کی پہلی دو قسموں کے مابین علماء کے یہاں کوئی نزاع نہیں پایا جاتا - بلاشبہ ایسی احادیث سے احکام کا اثبات ہوتا ہے اور ان کی تعداد دیگر احادیث کے مقابلہ میں زیادہ ہے - البتہ تیسری قسم کی احادیث جن سے ایسے احکام ثابت ہوتے ہیں جن کا نفیاً و اثباتاً قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے علماء کے یہاں متنازعہ فیہا ہیں - سوال یہ ہے کہ اس قسم کی احادیث سے احکام کا اثبات کیوں کر ہوتا ہے؟ کیا یہ احادیث بذاتِ خود مستقلاً جدید احکام کی مثبت ہیں؟ یا اس لیے کہ یہ احادیث نصوصِ قرآن کے تحت داخل ہیں اگرچہ بنا بر تاویل ہی کیوں نہ ہوں ؟

امام شاطبی مصنف "موافقات" اور دیگر علماء نے دوسرا پہلو اختیار کیا ہے - بخلاف ازیں جمہور پہلے مذہب کے قائل ہیں - ہم پہلے امام شافعی کی عبارت نقل کرتے ہیں - پھر اس اختلاف کی تشریح کریں گے -

امام شافعی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں :-

"اہل علم کے یہاں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ احادیث نبویہ کی تین قسمیں ہیں۔ دو قسموں کے بارے میں ان کے یہاں کامل اتفاق پایا جاتا ہے اور تیسری میں اختلاف ہے۔

(۱) قرآن مجید میں ایک حکم موجود ہو اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی مزید تائید وحمایت فرمادیں۔

(۲) قرآن کریم میں ایک حکم اجمالاً بیان کیا گیا ہو اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کھول کر بیان فرمادیں۔

حدیث کی مذکورہ بالا دونوں قسموں میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔

(۳) تیسری قسم کی وہ احادیث ہیں جن میں ایسا حکم بیان کیا گیا ہو جو قرآن میں سرے سے مذکور ہی نہیں۔

اس کے بارے میں علماء سے حسب ذیل اقوال منقول ہیں :

اوّل :- علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس لیے آپ ایسی باتوں کا حکم صادر فرما سکتے ہیں، جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔

دوم :- بعض علماء کا قول ہے کہ آپ اسی بات کا حکم دیتے ہیں جس کی اصل واساس کتاب الٰہی میں موجود ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ قرآن نے نماز کا حکم دیا اور آپ نے اس کی رکعات بتادیں اسی طرح قرآن نے آیت "وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ" (البقرۃ - ۲۷۵) میں بیع کا ذکر کیا اور رسول کریم نے بیع کی قسمیں بیان کر دیں۔

سوم :- بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ نے یہ احکام اللہ تعالیٰ کے ایک خصوصی پیغام کی بناء پر مقرر کیے تھے۔

چہارم :- علماء کی ایک جماعت کے نزدیک آپ نے القاءِ ربانی کی بناء پر یہ احکام صادر فرمائے تھے۔

تیسری قسم میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ اس بارے میں نہیں کہ آیا ایسی احادیث موجود بھی ہیں یا نہیں ؟ بخلاف ازیں نوعیتِ اختلاف یہ ہے کہ آیا احادیث مستقل ماخذِ تشریع ہیں جیسا کہ

قول اول و دوم رسوم کے قائلین کا خیال ہے ؟ یا نصوصِ قرآن کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے احکام کا اثبات کرتی ہیں ؟ دوسرے قول کے قائلین کا یہی نقطۂ نگاہ ہے ۔

حدیث کو مستقل ماخذِ تشریع قرار دینے والوں کے دلائل

پہلی دلیل :

چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم عن الخطاء تھے، اس لیے یہ بات عقلاً بالکل درست ہے کہ حدیث نبوی مستقل ماخذِ تشریع ہے ۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اس بات کا حکم دے سکتے ہیں کہ وہ لوگوں تک اس کے احکام پہنچا دیں خواہ وہ احکام کتاب میں مذکور ہوں یا نہ ہوں جب عقلاً اس میں کوئی استحالہ نہیں اور سب کے نزدیک واقعۃً آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے احکام اس طرح پہنچائے بھی تھے ۔ تو پھر ہم کیوں کر اس کے قائل نہ ہوں ؟

دوسری دلیل :

دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم کی جن آیات سے رسول کریم کے فرمودہ اوامر و نواہی کی اطاعت کا وجوب ثابت ہوتا ہے وہ عام ہیں اور ان میں ایسی کوئی تفصیل موجود نہیں کہ آپ کا قول آیت قرآنی کی وضاحت یا تائید کرتا ہو یا ایک ایسی چیز کے ذکر و بیان پر مشتمل ہو جو قرآن میں سرے سے مذکور ہی نہیں ۔ بلکہ بعض آیات سے مستفاد ہوتا ہے کہ آپ مستقل احکام بھی صادر فرما سکتے ہیں ۔ مثلاً یہ آیت کریمہ :

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ ۔ (النسآء ۔ ۵۹)	اے ایمان والو ! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے اصحاب امر کی اگر تمہارے یہاں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اُسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو ۔

اللہ کی طرف لوٹانے سے مراد اس کی کتاب کی طرف لوٹانا ہے ۔ اور رسول کی جانب رجوع کرنے کا مطلب آپ کی وفات کے بعد ان کی حدیث کی طرف رجوع کرنا ہے ۔

قرآن کریم میں فرمایا:

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ"	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی

(المائدہ - ۵۹)

قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی اطاعتِ رسول کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے وہاں اطاعتِ خداوندی سے وہ اوامر و نواہی مراد ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔ اسی طرح اطاعتِ رسول سے وہ مسائل و احکام مراد ہیں جو آنحضورؐ نے صادر فرمائے اور قرآن میں نہیں پائے جاتے۔ اس لیے کہ اگر وہ قرآن میں موجود ہوتے تو ان کی اطاعتِ خداوندی میں شمار کیا جاتا۔

قرآن عزیز میں فرمایا:

فَلْیَحْذَرِ الَّذِیْنَ یُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِہٖۤ اَنْ تُصِیْبَهُمْ فِتْنَةٌ۔	جو لوگ اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیے کہ کہیں وہ عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

(سورۃ النور ۶۳)

اس آیت میں رسول کریم کی خصوصی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے وہ سنت مراد ہے جو قرآن میں مذکور نہ ہو۔

قرآن میں فرمایا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔	جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے خدا کی اطاعت کی۔ (النساء - ۸۰)
وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔	رسول جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو اور جس بات سے منع کرے اس سے باز رہو۔

(الحشر - ۷)

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ۔ (النساء - ۶۵)	تیرے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تنازعات میں آپ کو حکم نہ بنائیں۔

یہ آیت کریمہ رسول کریمؐ کے ایک فیصلے کے بارے میں نازل ہوئی۔ آپ نے فیصلہ دیا "فرمایا تھا کہ حضرت زبیر جھگڑا کرنے والے انصاری سے پہلے اپنے کھیت کو سیراب کر لیں یہ فیصلہ قرآن کریم میں مذکور نہیں۔

قرآنی دلائل سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اوامر و نواہی قرآن کریم کے بیان کردہ احکام کے زمرہ میں شامل اور ان کے ساتھ ملحق ہیں۔ لہٰذا وہ قرآن سے زائد ہیں اور صراحتہً اس میں بیان نہیں کیے گئے۔

(الموافقات، ج ۴۔ ص ۱۳)

تیسری دلیل :

احادیث کثیرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شریعت دو مصادر سے ماخوذ ہے۔ (۱) کتاب (۲) سنت۔

ظاہر ہے کہ حدیث میں وہ احکام بھی ہوتے ہیں جو قرآن میں نہیں اور حدیث میں بیان کردہ احکام بھی اس طرح واجب التعمیل ہیں، جیسے قرآنی احکام و اوامر۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"عین ممکن ہے کہ ایک شخص تم میں سے کہے یہ خدا کی کتاب ہے۔ اس میں جس چیز کو حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جس کو حرام پاؤ اسے حرام تصوّر کرو جس شخص کو کوئی میری حدیث پہنچی اور اس نے اس کی تکذیب کی تو اس نے اللہ اور اس کے رسول اور حدیث کے راوی کو جھٹلایا" (طبرانی فی الاوسط)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حدیث میں ایسے احکام بھی مذکور ہوتے ہیں جو قرآن میں نہیں ہوتے،

چوتھی دلیل :

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے :

"ہمارے پاس کتاب اللہ کے سوا اور کچھ نہیں یا فہم و شعور ہے جو خدا کسی کو ودیعت کر دے یا جو کچھ میرے اس رسالہ میں ہے" (الموافقات، ج ۴۔ ص ۱۰)

حدیثِ معاذ میں ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا "آپ کیسے فیصلہ

کریں گے"؟ حضرت معاذ نے عرض کیا کتاب اللہ کی روشنی میں"۔ فرمایا" اگر اس میں موجود نہ ہو تو پھر"؟ عرض کیا "سنّت رسول کے مطابق"۔

یہ حدیث ببانگِ دہل پکار پکار کہہ رہی ہے کہ حدیث میں ایسے احکام بھی مندرج ہوتے ہیں جو قرآن میں نہیں ہوتے۔ بعض علماء کا مشہور مقولہ ہے:

"قرآن کریم نے حدیث کے لیے گنجائش باقی چھوڑی ہے اور حدیث نے قرآن عزیز کے لیے"۔ (الموافقات، ج ۴۔ ص ۱۶)

منکرین استقلال کے دلائل:

جن علماء کے نزدیک حدیث نبوی مستقل ماخذِ تشریع نہیں ہے۔ وہ امام شاطبی کے قول کے مطابق حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

سنت اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے راجع الی الکتاب ہے۔ اس لیے کہ حدیث مجملات قرآن کی تفصیل پیش کرتی ہے۔ اس کے مشکلات کی توضیح کرتی اور اس کے مختصرات کو کھول کر بیان کرتی ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (النحل۔۴۴) — اور ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا ہے تاکہ آپ اس چیز کی وضاحت کر دیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

مزید برآں جن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریعتِ اسلامیہ کا ضابطہ کلیہ اور سرچشمہ ہے ان سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ حدیث مستقل ماخذِ تشریع نہیں ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ — آپ عظیم اخلاق کے مالک ہیں۔

(القلم ۔ ۴)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آپ کے اخلاق و عادات قرآن پر مبنی تھے اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے اقوال و افعال اور تقریرات سب قرآن سے ماخوذ تھے۔ اس لئے کہ

خلق ان امور میں محصور و محدود ہے۔ نیز اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو "تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" فرمایا ہے۔ اس سے لازم آتا ہے کہ حدیث فی الجملہ قرآن میں شامل ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ہم نے کتاب میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

(الانعام - ۳۸)

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ آج کے دن میں نے تمہارا دین کامل کر دیا

(المائدہ - ۳)

خلاصہ یہ کہ سنّت دراصل قرآن کریم کی توضیح و تشریح پر مبنی ہے۔ سنت کے راجع الی الکتاب ہونے کے معنی یہی ہیں۔ استقراءِ تام سے بھی یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے۔

فریق ثانی نے فریق اول کے پیش کردہ دلائل و براہین کے جو جوابات دیئے ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(الف)۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث نبوی قرآن کی شارح و ترجمان ہے۔ جن آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اطاعتِ خداوندی کے ساتھ ساتھ اطاعتِ رسول بھی ضروری ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ رسول کریم نے قرآن کی جو شرح و توضیح کی ہے اسے تسلیم کیا جائے۔ جس شخص نے رسول کی پیش کردہ تفسیر پر عمل کیا اس نے مرادِ خداوندی کی پیروی کی۔ اور اس نے رسول کریم کی شرح و تفسیر پر بھی عمل کیا۔ اور اگر وہ شخص آپ کی تفسیر پر عمل نہ کرتا تو وہ خدا کی نافرمانی کا بھی مرتکب ہوتا۔ اس لیے کہ اس نے منشائے خداوندی کی خلاف ورزی کی۔ اور اس نے رسول کی نافرمانی اس اعتبار سے کی کہ آپ کی شرح و تفسیر کو ٹھکرا دیا۔ اطاعتِ خداوندی اور اطاعتِ رسول کو الگ الگ بیان کرنے کے یہ معنی نہیں کہ دونوں مطاع بہمہ وجوہ مستقل ہیں۔

(ب)۔ نظر بریں آیات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حدیث میں جو کچھ موجود ہے کتاب میں موجود نہیں۔ حضرت زبیرؓ کے بارے میں رسول کریم کے جس فیصلے کا ذکر انہوں نے کیا ہے، اس ضمن میں ان کا یہ دعویٰ بے بنیاد ہے کہ قرآن میں یہ فیصلہ مذکور نہیں۔ بخلاف ازیں یہ فیصلہ

قرآن کریم کے احکام و نصوص میں شامل تھے۔ جیسا کہ آگے چل کر ہم اس پر روشنی ڈالیں گے۔ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث میں کچھ احکام قرآن سے زائد بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان کے زائد ہونے کے یہ معنی نہیں کہ قرآن میں سرے سے ان کا ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ بایں معنی زائد ہے جیسے شرح مشروح سے زائد ہوتی ہے۔ اگر شرح اصل سے زائد نہ ہو تو اس کے شرح ہونے کا کوئی مطلب ہی نہیں۔ درحقیقت یہ اضافہ نہیں ہے۔ مقدامؓ بن معدیکرب کی مذکورہ صدر روایت کا جواب انہوں نے یہ دیا ہے کہ اس کی سند میں زید بن الحباب ضعیف راوی ہے امام احمد اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ زید راست گفتار ہے مگر کثیر الخطاء ہے۔ ابن حبانؒ بھی اسی طرح فرماتے ہیں۔ زید نے سفیان سے جو احادیث روایت کی ہیں۔ ابن حبان نے اس پر نقد و جرح کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بخاری و مسلم نے زید کی مرویات کو اپنی کتب میں جگہ نہیں دی۔

نزاعِ لفظی:

فریقین کے باہمی اختلاف کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں کے نزدیک حدیث میں ایسے احکام مذکور ہوتے ہیں جو قرآن میں صراحتہً مذکور نہیں۔ پہلا فریق کہتا ہے کہ مستقل ماخذ تشریع ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ حدیث سے ایسے احکام کا اثبات ہوتا ہے جو قرآن میں مذکور نہیں ہوتے دوسرا فریق تسلیم کرتا ہے کہ اگرچہ ایسے احکام صراحتہً و عبارۃً قرآن میں مذکور نہیں۔ تاہم وہ کسی نہ کسی طرح نصوصِ قرآن کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں۔ بنابریں وہ کہتے ہیں کہ کسی صحیح حدیث سے کوئی ایسا حکم ثابت نہیں ہوتا جو قرآن میں وارد نہ ہو۔ بخلاف ازیں وہ کسی نص یا قاعدہ کے تحت ضرور داخل ہوتا ہے۔ اگر کوئی حدیث ایسی مل جائے جو اس کے مطابق نہ ہو تو وہ ضعیف اور ناقابل احتجاج ہو گی۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ فریقین کے مابین اس مسئلہ میں صرف نزاعِ لفظی پایا جاتا ہے، دونوں فریق اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث میں بعض ایسے احکام بیان کیے جاتے ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہوتے۔ دونوں میں سے ایک فریق اس کا نام استقلال رکھتا ہے اور دوسرا اس کو مستقل ماخذ تصور نہیں کرتا۔ نتیجہ دونوں کا یکساں ہے۔

فصل دوم

قرآن حدیث پر کیسے مشتمل ہے؟

جب حدیث نبوی قرآن کی شارح و ترجمان ٹھہری اور قرآن بقول شاطبی حدیث میں بیان کردہ جملہ احکام و مسائل کو اجمالاً و تفصیلاً شامل ہے۔ جس کی دلیل یہ آیت ہے کہ:

"تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" نیز "مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ"۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے احکام قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔

اس کی شرح و توضیح میں علماء کے پانچ نظریات ہیں۔

پہلا نظریہ :-

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت پر عمل واجب ہے۔ بنابریں سنت کے مطابق جو عمل کیا جائے گا وہ عمل بالقرآن ہوگا، یہ درست طریقہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے بھی اسی کو اختیار کیا تھا۔ ایک دفعہ بنو اسد کی ایک عورت حضرت ابن مسعودؓ کے یہاں آئی اور کہنے لگی ابو عبدالرحمن! مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ ان عورتوں پر لعنت بھیجتے ہیں جو اپنے اعضاء کو گودکر ان میں رنگ بھرواتی ہیں اور دانتوں کو باریک کرواکر اپنی صورت کو تبدیل کر لیتی ہیں۔ کہنے لگے جس پر رسول کریمؐ نے لعنت بھیجی ہو میں اس پر کیسے لعنت نہ بھیجوں؟ اور یہ کتاب اللہ میں بھی مذکور ہے۔ اس عورت نے کہا میں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پورا قرآن پڑھا ہے مگر یہ بات مجھے کہیں نہیں ملی۔ حضرت ابن مسعودؓ نے کہا، اگر آپ سارا قرآن تلاوت کرتیں تو آپ کو یہ آیت قرآن میں مل جاتی کہ:

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا	خدا کا رسول جو چیز تمہیں دے وہ لے لو
نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔	اور جس سے باز رکھے اس سے رک جاؤ۔

(الموافقات، ج ۴-ص ۲۴ و جامع بیان العلم، ج ۲-ص ۱۸۹)

عبدالرحمٰن بن یزید نے ایک شخص کو حالتِ احرام میں کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو اُسے منع کیا۔ اس نے کہا کسی آیت میں کپڑے اتارنے کا حکم دکھائیے عبدالرحمٰن نے مذکورہ صدر آیت تلاوت کی۔ (جامع بیان العلم، ج ۲۔ ص

مشہور تابعی طاؤس نماز عصر کے بعد دو رکعت پڑھا کرتے تھے۔ ابن عباسؓ نے کہا ان کو چھوڑ دیجیے۔ طاؤس نے کہا ان کو عادت بنانے سے روکا گیا ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا رسول کریمؐ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ کو ان کے پڑھنے کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا یا اجر و ثواب ملے گا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا	کسی مومن مرد و عورت کا حق نہیں کہ جب اللہ
قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ	اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ صادر کر
لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ۔	دے تو ان کے لیے کوئی گنجائش باقی ہے

دوسرا نظریہ:

علماء کا مشہور نظریہ ہے کہ کتاب خداوندی مجمل ہے اور حدیث اس کی تفصیل پیش کرتی ہے۔ مثلاً وہ احادیث جن میں مجمل احکام کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ بعض احادیث میں اعمال کی کیفیات اسباب شروط موانع ملحقات یا اس سے ملتی جلتی ہوئی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح حدیث میں نمازوں کے اوقات رکوع سجود اور دیگر احکام ذکر کیے گئے ہیں۔ بعض احادیث میں زکوٰۃ کی مقادیر اوقات اور دیگر احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ روزہ کے ایسے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ جو قرآن میں صراحتہً مذکور نہیں۔ اسی طرح آپ نے مناسکِ حج، ذبیحہ نکاح خرید و فروخت اور قصاص کے احکام بیان فرمائے۔ اس قسم کے جملہ احکام آیتِ قرآنی "وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ" میں شامل ہیں۔

عمرانؓ بن حصین سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے کہا "تم احمق آدمی ہو۔ کیا خدا کی کتاب میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ ظہر کی چار رکعتیں ہیں اور ان میں قراءت جلند آواز سے نہیں کی جاتی۔ پھر نماز زکوٰۃ اور دیگر احکام کا ذکر کیا اور کہا کیا یہ احکام خدا کی کتاب میں تفصیلاً مذکور ہیں؟

یہ احکام خدا کی کتاب میں مجمل ہیں اور سنت ان کی تفصیل پیش کرتی ہے۔

(الموافقات، ج ۴-ص ۲۶ و جامع بیان العلم، ج ۲، ص ۱۹۱)

مُطَرِّف بن عبداللہ سے کسی شخص نے کہا "ہمیں صرف قرآن سنایا کرو" مُطرِّف نے یہ سُن کر کہا "ہم قرآن کے عوض کوئی اور چیز نہیں چاہتے مگر ہم اس ہستی کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں جو ہم سے قرآن کا زیادہ علم رکھتی تھی" (حوالہ مذکور)

امام اوزاعی فرماتے ہیں:

"جس قدر کتاب الٰہی کو سنت کی ضرورت ہے اس قدر سنت کو کتاب کی ضرورت نہیں" (جامع بیان العلم، ج ۲-ص ۱۹۱)

امام ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں یعنی سنّت قاضی علی الکتاب ہے اور اس کے معنی و مطلوب کو واضح کرتی ہے۔

امام احمد سے اس حدیث کے بارے میں دریافت کیا گیا جس میں آیا ہے کہ سنت قاضی علی الکتاب ہے۔ فرمایا میں تو اس طرح کہنے کی جرأت نہیں کرتا۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سنت قرآن کریم کی شرح و تفسیر پیش کرتی ہے۔

(جامع بیان العلم و الموافقات)

تیسرا نظریہ:

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ ان معانی کلیہ پر غور کیا جائے جو قرآنی تشریع کا مقصود ہیں اور اس کی مختلف آیات میں مذکور ہیں۔ نیز یہ کہ سنت میں جو احکام بیان کیے گئے ہیں وہ ان مقاصد و معانی سے آگے نہیں بڑھتے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کریم انسانیت کے لیے دنیوی و اخروی فلاح و سعادت کا پیغام لے کر آیا ہے۔ انسانی سعادت تین قسم کی اشیاء میں مضمر ہے۔

(۱) **ضروریات**:- ان سے دین نفس انسانی نسل مال اور عقل کی حفاظت مراد ہے۔

(۲) **حاجیات**:- یہ ہر وہ چیز ہے جس سے وسعت پیدا ہوتی ہے اور تنگی و حرج کا ازالہ ہوتا ہو۔ مثلاً سفر اور بیماری کی وجہ سے روزہ افطار کرنے کی اجازت۔

۳ - تحسینات :- یہ وہ احکام ہیں جو اخلاق و عادات سے متعلق ہوتے ہیں۔
امور سہ گانہ مذکورہ اور ان کے مکملات کو قرآن کریم نے ایسے اصول و قواعد کی حیثیت سے بیان کیا ہے کہ ان کے تحت جملہ احکام قرآنی آجاتے ہیں۔ سنت نے انہی احکام کو قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بنا بریں نصوص حدیث کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی اصول یہی تین ہیں۔ (الموافقات ج ۴۔ص ۲۷)

چوتھا نظریہ :

قرآن کریم بعض اوقات دو متقابل حکم صادر کرتا ہے اور ہر ایک میں شبہ کی گنجائش ہوتی ہے۔ حدیث نبوی اگر پیش آمدہ حادثہ کو دونوں میں سے ایک کے ساتھ ملحق کر دیتی ہے۔ یا اس کو ایک ایسا حکم قرار دیتی ہے جو دونوں قسم کے شبہات سے ملتا جلتا ہے۔ بعض اوقات قرآن کریم کسی علت کی بنا پر ایک حکم صادر کرتا ہے۔ رسول کریم کسی چیز میں اس علت کے پائے جانے کی وجہ سے اس چیز کو بھی بطریق قیاس اس کے ساتھ ملحق فرما دیتے ہیں۔

دو متقابل حکموں کی مثالیں :

(۱) - خداوند کریم نے "طیبات" کو حلال اور "خبائث" کو حرام قرار دیا۔ اب وہ اشیاء باقی رہیں جن کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہا نہیں جاسکتا کہ آیا وہ کس قسم میں شامل ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھل کر بتادیا کہ ایسی چیزیں دونوں میں سے ایک قسم کے ساتھ ملحق ہیں چنانچہ آپ نے ان درندوں کو حرام ٹھہرایا جو ڈاڑھوں میں پکڑ کر کھاتے ہیں۔ اسی طرح پنجہ میں پکڑ کر کھانے والے پرندوں کو بھی محرمات میں شامل فرمایا۔ پالتو گدھے کے گوشت کو حرام قرار دیا۔ گوہ، تیتر، بٹیر، خرگوش اور اس قسم کے جانوروں کو طیبات میں شامل کیا۔

(۲) سمندر کے شکار کو خداوند کریم نے طیبات میں شامل کیا اور مردار کو محرمات میں جگہ دی۔ اب اس مسئلہ میں دقت پیش آئی کہ سمندر میں جو جانور مر جائے اس کو کس قسم میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سمندر کا پانی پاک اور اس کا مردار حلال ہے"
(ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ)

آپ نے فرمایا "ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال ٹھہرائے گئے۔ دو مردار تو

مچھلی اور ٹڈی ہیں اور دو خون جگر اور تلی ہیں" (ابن ماجہ، حاکم، بیہقی)

(۳) ۔ خداوند کریم نے مردار کو حرام اور ذبیحہ کو حلال قرار دیا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ جو بچہ ذبیحہ کے پیٹ سے بوقت ذبح مردہ ہونے کی صورت میں نکلتا ہے اس کو حلال و حرام میں سے کس کے ساتھ ملحق کیا جائے؟ اس کا فیصلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ "ماں کو ذبح کرنا اس کے بچے کو ذبح کرنا ہے" یعنی ماں کو ذبح کرنے سے وہ بچہ بھی ذبیحہ کے حکم میں ہو جاتا ہے جو اس کے شکم میں ہوتا ہے۔

دو شبہات کے درمیان حکمِ خاص کی مثالیں:

(۱) ۔ خداوند کریم نے منکوحہ اور لونڈی کو حلال اور بدکاری کو حرام ٹھہرایا۔ مخالفِ شرع نکاح سے خاموشی اختیار کی۔ اس لیے کہ وہ نہ تو نکاح محض ہے اور نہ سفاح (بدکاری) محض۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"جو عورت ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے وہ باطل ہے۔ آپ نے تین مرتبہ یہ الفاظ دہرائے۔ اگر مرد اس کے ساتھ مجامعت کرے تو عورت کو مہر دینا ہوگا اس لیے کہ اس مرد نے اس کو اپنے لیے حلال کیا"

(ابوداؤد ۔ ترمذی)

(۲) ۔ اللہ تعالیٰ نے نفس کا بدل نفس کو قرار دیا۔ اعضائے جسمانی میں قصاص مقرر کیا۔ قتل خطائ میں پاداشس ادا کی جاتی ہے۔ اعضاء جب خطاءً کاٹے جائیں تو اس میں جو دیت ادا کی جاتی ہے وہ حدیث میں مذکور ہے۔ اب یہ مسئلہ باقی رہا کہ جب کوئی حاملہ عورت کو پیٹے اور اس کے پیٹ میں جو بچہ ہو وہ ساقط ہو جائے تو اس کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ اس میں دو پہلو ہیں۔ ایک اعتبار سے وہ بچہ اعضائے انسانی کی مانند ہے: دوسرے لحاظ سے وہ کامل انسان ہے۔

حدیث نے اس مسئلہ کو یوں واضح کیا کہ اس کی دیت ایک لونڈی یا غلام ہے۔ وہ دونوں قسموں میں سے کسی کے ساتھ بھی ملحق نہیں بلکہ اس کا اپنا جداگانہ حکم ہے۔

الحاق بطریق قیاس کی امثلہ: (۱) ۔ اللہ تعالیٰ نے ربا کو حرام قرار دیا۔ جاہلیت

کا رہا یہ تھا کہ قرض کی مہلت بڑھا کر اصل رقم میں اضافہ کر دیا کرتے تھے۔ قرض خواہ کہتا کہ یا تو رقم ادا کر دو۔ ورنہ رقم میں سود کو شامل کر لو۔ چونکہ اس کی حرمت کی علت یہ تھی کہ قرض کی رقم میں جو اضافہ کر دیا جاتا تھا وہ کسی چیز کے عوض میں نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے جس چیز میں بھی یہ علت پائی جاتی تھی۔ رسول کریمؐ نے اس کو ربا میں شامل کر دیا۔ آپ نے فرمایا:

"سونے کے عوض سونا چاندی کے عوض چاندی گندم کے بدلے گندم جَو کے بدلے جَو، کھجور کے عوض کھجور نمک کے عوض نمک، جنس کے عوض جنس برابر برابر اور دست بدست۔ جس نے زیادہ دیا یا لیا اس نے سود دیا۔ جب اجناس بدل جائیں تو جیسے چاہو فروخت کرو بشرطیکہ نقد بنقد ہو۔" (مسلم۔ ابوداؤد۔ احمد)

(۲) ۔ اللہ تعالیٰ نے دو بہنوں سے بہ یک وقت نکاح کرنے کو ممنوع قرار دیا۔ قرآن کریم میں فرمایا:

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ۔ — اور ان کے سوا جو رشتے ہیں وہ تمہارے لیے حلال ٹھہرائے گئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو بہ یک وقت نکاح میں لانے سے منع فرمایا۔ یہ بھی ایک قسم کا قیاس ہے۔ اس لیے کہ دو بہنوں کو بہ یک وقت نکاح میں لانے کے اندر جو علت تھی وہ یہاں بھی موجود ہے۔ حدیث میں اس علت کو یوں بیان فرمایا کہ:

"جب تم ایسا کرو گے تمہاری قرابت ٹوٹ جائے گی"

آپ کی بیان فرمودہ علت سے اس قیاس کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے رضاعی ماں اور بہن کو حرام ٹھہرایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کے باقی رشتوں کو نسب پر قیاس کر کے حرام قرار دیا۔ مثلاً پھوپھی خالہ، بھتیجی، بھانجی اور اس قسم کے دیگر رشتے۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے نسب کے جن رشتوں کو حرام ٹھہرایا تھا دودھ کے ان رشتوں کو بھی حرام قرار دیا۔

(مسلم، ترمذی، نسائی، امام شافعی)

پانچواں نظریہ :

پانچواں نظریہ یہ ہے کہ سنت میں جس قدر تفصیلی احکام پائے جاتے ہیں ان کو ایسے تفصیلی احکام کی جانب لوٹایا جائے جو قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں :

(۱) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی، رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت عمرؓ کو فرمایا کہ عبداللہؓ کو رجوع کرنے کا حکم دیں۔ حتیٰ کہ ان کی بیوی حیض سے پاک ہو جائے۔ پھر اس پر حالت حیض طاری ہو اور پھر پاک ہو جائے۔ پھر دو مرتبہ حیض سے پاک ہونے کے بعد اگر چاہے اس کو آباد کرے اور اگر چاہے مجامعت سے قبل طلاق دے دے۔ یہ وہ عدت ہے جس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے کہ اس میں عورتوں کو طلاق دی جائے۔ وہ آیت یہ ہے :

"يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ"

(صحاح ستہ بجز بخاری)

(۲) حضرت فاطمہؓ بنت قیس روایت کرتی ہیں کہ ان کے خاوند نے ان کو طلاق دے دی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مکان دلوایا اور نہ نفقہ۔ حالانکہ مطلقہ ثلاثہ کو سکونت مہیا کی جاتی ہے اگرچہ نفقہ نہیں دیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فاطمہ زبان دراز تھیں اور اپنے گھر والوں کو برا بھلا کہا کرتی تھیں۔ فاطمہ بنت قیس کی یہ روایت اس آیت کی تفسیر ہے جس میں ارشاد فرمایا :

"وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ" اور وہ گھر سے نہ نکلیں مگر یہ کہ ظاہر بے حیائی کا ارتکاب کریں۔

(۳) سُبَیعہ اسلمیہؓ کا خاوند فوت ہو گیا اس کے پندرہ روز بعد سُبَیعہ کے یہاں بچہ تولد ہوا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری عدت پوری ہو گئی۔ (صحاح ستہ سوا ابوداؤد)

اس حدیث کی روشنی میں واضح ہوا کہ جس آیت میں فوت شدہ خاوند والی عورت کی عدت چار ماہ دس دن بیان کی گئی ہے اس سے مراد وہ عورت ہے جو حاملہ نہ ہو۔ نیز یہ کہ آیت کریمہ :

وَأُوْلَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۔ — حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہے ۔

میں جملہ حاملہ عورتوں کی عدت بیان کی گئی ہے خواہ وہ مطلقہ ہوں یا کوئی اور ۔

ایسی احادیث بہت ہیں ۔ مگر قرآنی نصوص اس مقصد کو پورا نہیں کرتیں ۔ اس لیے کہ ان میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ حدیث میں بیان کردہ سب احکام کو سمیٹ سکیں ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نصوص میں دقّتِ بیان بھی موجود ہو اور قرآنی عبارت عربی اسلوب و انداز کے اعتبار سے بھی اس کی متحمل ہو ۔

امام شاطبی فرماتے ہیں :

" حدیث نبوی میں بیان کردہ جملہ احکام کے قرآن کریم میں نہ پائے جانے کی اہم دلیل یہ ہے کہ نماز، حج ، زکوٰۃ ، حیض و نفاس ، لقطہ ، مساقات اور اس قسم کے ان گنت مسائل ایسے ہیں ، جو قرآن میں تفصیلاً مذکور نہیں ۔ جو شخص اپنے آپ پر ان کو قرآن کریم میں ثابت کرنے کی ذمہ داری عائد کرتا ہے وہ کھینچا تانی کے سوا ایسا کرنے پر قادر نہیں ہے ۔ اسے ایسا تکلف کرنا پڑے گا جو عربی اسلوب بیان میں قابل برداشت نہیں ۔ مزید براں علمائے سلف اور علم میں پختہ کار لوگ بھی اس کو قبول نہیں کر سکتے ۔" (الموافقات ، ج ۴ - ص ۵۳)

یہ ہیں وہ اہم مسالک جن پر علماء یہ ثابت کرنے کے لیے رواں دواں رہے ہیں کہ قرآن کریم حدیث میں مندرج جملہ احکام کا حامل ہے ۔ بعض علماء نے ایسا عام مسلک اختیار کیا جس سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کریم سے حدیث کا واجب التعمیل ہونا ثابت ہوتا ہے ۔

اس ضمن میں اولیٰ یہ بات کہنا ہے کہ علماء کے اختیار کردہ مسالک ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں ۔ بحیثیت مجموعی ان سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حدیث میں مندرج احکام —— وہ جدید ہی کیوں نہ ہوں —— کو قرآنی نصوص کی جانب لوٹایا جائے ۔ اس طرح آیت قرآنی مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ کی تفسیر بطریق احسن پوری ہو جائے گی ۔

باقی رہیں وہ احادیث جن میں واقعات امثال اور مواعظ بیان کیے گئے ہیں تو ان میں سے

بعض قرآن کریم کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً جن احادیث میں :

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا" اور "فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا"

کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ بعض احادیث وہ ہیں جن میں قرآن کی تفسیر تو بیان نہیں کی گئی مگر ان میں کسی اعتقاد و عمل کی انجام دہی کے لیے مامور نہیں کیا گیا۔ اس لیے ضروری نہیں کہ قرآن میں اس کی اصل موجود ہو۔ اس کے باوجود عبرت پذیری کے نقطۂ خیال سے وہ قرآنی قصص و واقعات کی طرح ترغیب و ترہیب کے لیے مفید ہیں۔ لہٰذا وہ قسم اوّل میں شامل ہیں۔ مثلاً حدیث میں جو گنجے مبروص اور اندھے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے یا ان تین آدمیوں کا جو واقعہ احادیث میں مذکور ہے، جنہوں نے غار میں پناہ لی تھی۔

فصل سوم

نسخ السنۃ بالقرآن و بالعکس

علماء کے یہاں اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ ایک آیتِ قرآنی دوسری آیت کی ناسخ ہو سکتی ہے۔ البتہ ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ کتاب ھٰذا میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث نہیں کی جا سکتی۔

اسی طرح یہ مسئلہ بھی متفق علیہا ہے کہ ایک حدیث دوسری حدیث کو منسوخ کر سکتی ہے ایک متواتر حدیث کی ناسخ وہی حدیث ہو سکتی ہے جو متواتر ہو۔ ایک خبر واحد کو دوسری خبر واحد اور متواتر منسوخ کر سکتی ہے۔ اس کی مثال میں بکثرت احادیث پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً یہ حدیث کہ :

"میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا، اب ان کی زیارت کیجئے"

(مسلم - ابوداؤد - ترمذی - ابن ماجہ)

البتہ دو باتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے :

(۱) - کیا قرآن حدیث کو منسوخ کر سکتا ہے یا نہیں ؟

(۲) - کیا حدیث قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہے یا نہیں ؟

ہم مذکورہ صدر دونوں مسائل پر اجمالی تبصرہ کریں گے۔ تفصیلات کے لیے کتب اصول کی جانب مراجعت کرنا چاہیے۔

نسخ السنۃ بالکتاب :

(الف) - جمہور کے نزدیک قرآن حدیث کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں چند احادیث کو بطور امثلہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ

پہنچے تو چند ماہ تک بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے نماز ادا کرتے رہے۔ مگر قرآن کریم میں ایسی کوئی نص موجود نہیں جس میں بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا ہو۔ پھر اس کو آیتِ قرآنی:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ (البقرۃ) — اپنا رُخ مسجد حرام کی جانب موڑ دیجیے۔

نے منسوخ کر دیا۔

اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر طے پایا تھا کہ جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ پہنچے گا، اہل اسلام اس کو کفار کی طرف لوٹا دیں گے۔ پھر عورتوں کے بارے میں اس حکم کو منسوخ ٹھہرایا مبادا مشرکوں کے یہاں جا کر خواتین فتنہ میں مبتلا ہوں اور ان کی ناموس و آبرو داغدار ہو۔

قرآن میں فرمایا:

فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ (الممتحنۃ) — اگر تم ان کو مومن سمجھو تو ان کو کفار کی جانب مت لوٹاؤ۔

(ب)۔ بخلاف ازیں امام شافعی کے نزدیک قرآن حدیث کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ بعض لوگ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر قرآن حدیث کو منسوخ کر سکتا تو رسول کے دشمن یہ کہہ سکتے تھے کہ خدا نے رسول کے حکم کو پسند نہیں کیا اس لیے اس کو تبدیل کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ بات درست نہیں اور کسی مسلم کے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔

اس کی صحیح علت وہ ہے جو امام شافعی نے بذاتِ خود اپنی کتاب "الرسالۃ" میں ذکر کی ہے امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

"سنتِ رسولؐ کو صرف سنتِ رسول ہی منسوخ کر سکتی ہے۔ اگر رسول کریم کی کسی سنت کو تبدیل کرنا مقصود ہوتا تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول کریمؐ ہی کو اس بات سے آگاہ کرتے اور آپ بذاتِ خود بیان فرما دیتے کہ میری یہ سنت سابقہ سنت کی ناسخ ہے۔"

امام شافعی اس کی دلیل ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اگر یوں کہنا درست ہوتا کہ رسول کریم نے ایک سنت مقرر کی بعد ازاں قرآن

عزیز نے اس کو منسوخ ٹھہرایا۔ اور نبی کریمؐ سے اس کا منسوخ ہونا ثابت نہیں تو پھر اس طرح کہنا بھی درست ہوتا کہ آپ نے خرید و فروخت کی جن قسموں کو حرام قرار دیا تھا وہ آیت "اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ" (البقرہ) کے نزول سے قبل تھا اسی طرح آپ نے زانی کو سنگسار کرنے کا جو حکم صادر کیا تھا وہ آیت :
"فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا" (النور) سے منسوخ ٹھہرا۔ اسی طرح موزوں پر مسح کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ آیت وضو نے اس کو منسوخ کر دیا۔
اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ غیر محفوظ مال چرانے والے اور چوتھائی دینار سے کم چرانے والے کا ہاتھ بھی قطع کیا جائے گا۔ اور اس ضمن میں وارد شدہ حدیث کو منسوخ تصور کیا جائے گا۔ اس لیے کہ قرآن میں سارق کے لیے قطع ید کی سزا تجویز کی گئی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ غیر محفوظ مال اور چوتھائی دینار سے کم مال چرانے والا دونوں چور ہیں۔ اس لیے حدیث کی بنا پر وہ قرآنی سزا سے بچ نہیں سکتے۔

علیٰ ھٰذا القیاس جملہ احادیث کو یہ کہہ کر آسانی سے رد کیا جا سکتا ہے کہ یہ قرآن کی مانند نہیں ہیں۔ یہ دونوں عذر احادیث کو رد کرنے کے لیے کافی ہیں۔"
(الرسالہ تحقیق احمد محمد شاکر۔ ص ۱۰۸)

محققین شافعیہ اس مسئلہ میں جمہور کے ہمنوا ہیں۔ انھوں نے امام شافعی کی جانب سے مختلف عذرات پیش کیے ہیں۔

نسخ الکتاب بالسنتہ :

آیا حدیث کسی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں علماء کے دو مذہب ہیں:
(۱)۔ احناف کے نزدیک حدیث متواتر یا مشہور قرآن کریم کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے اور خبر واحد نہیں۔
وہ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ حدیث متواتر قرآن کی طرح قطعی الثبوت ہوتی ہے۔
حدیث مشہور اپنی شہرت کی بنا پر قوت حاصل کر لیتی ہے اور فقہاء کے یہاں معمول بہ ہوتی

ہے۔ اس لیے وہ حدیث متواتر کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ مزید براں حدیث متواتر و مشہور دونوں وحی غیر متلو ہیں۔ اس لیے یہ دونوں قرآن کی ناسخ ہو سکتی ہیں۔

احناف اس کی مثال یہ دیتے ہیں کہ موزوں کے مسح پر مشتمل حدیث مشہور نے اس آیت کو منسوخ کر دیا، جس میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا ہے۔

(اصول السرخسی، ج ۲۔ ص ۶۷)

اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۰ جس میں وصیت کا حکم دیا گیا ہے حدیث مشہور "لا وصیۃ لوارث" کی وجہ سے منسوخ قرار پائی۔ یہ حدیث جمہور علماء کے نزدیک معمول بہ ہے۔ حتیٰ کہ امام شافعی نے "الام" میں اس کے متواتر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

(۲) ۔ جمہور کا قول ہے کہ سنت قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی خواہ وہ متواتر ہو یا مشہور یا خبر واحد امام شافعی نے جمہور کی رائے کے اثبات میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا۔ — جس آیت کو منسوخ یا مؤخر کر دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں

(بقرہ - ۱۰۶)

اس آیت میں آیت منسوخہ کے عوض اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حدیث نہ قرآن کی مانند ہے اور نہ اس سے بہتر۔

امام شافعی دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن میں فرمایا:

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۔ — فرما دیں مجھے زیب نہیں دیتا کہ میں اپنی طرف سے اس کو تبدیل کر دوں۔

(سورہ یونس - ۱۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کریمؐ وحی الٰہی کی پیروی کرتے تھے اور اس کو تبدیل کرنے کے مجاز نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ نسخ ایک قسم کی تبدیلی ہی ہوتی ہے۔

تیسری دلیل یہ آیت کریمہ ہے:

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ — تاکہ لوگوں کے لیے اس چیز کو واضح کر دیں جو

اِلَیۡهِمۡ ۔ (النحل - ۴۴) ان کی طرف اتاری گئی ہے ۔

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے قرآن کریم کی شرح و تفسیر کرتے ہیں تاکہ لوگ اس پر عمل کریں ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے تو یہ حکم باقی نہیں رہے گا ۔ کیونکہ اندریں صورت ناسخ یعنی حدیث پر عمل کیا جائے گا اور منسوخ کو نظر انداز کر دیا جائے گا ۔

مزید برآں اگر یہ کہا جائے کہ حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی تو اس سے نبی اکرم اعداء دین کے طعنوں سے محفوظ رہیں گے ۔ یہ ایک متفق علیہ بات ہے کہ شرعی احکام کی تعبیر و بیان میں وہ انداز اختیار کرنا چاہیے جو طعن و تشنیع سے بعید تر ہو ۔ جب یوں کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کے خلاف اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں، جس سے قرآن کا منسوخ ہونا لازم آئے ۔ تو طعن دینے والا کہے گا کہ آپ نے خود ہی یہ بات کہی کہ قرآن مجید پر نازل ہوا اور سب سے پہلے خود ہی اس کی زبانی مخالفت کی اور اس کے خلاف عمل کیا ۔ پھر آپ کے قول پر بھروسہ کیوں کر کیا جائے ؟

جب آپ کی زبان مبارک سے ایک قول صادر ہو پھر آپ خود ہی اس کی تردید فرما دیں تو معترض کہے گا اس کے رب نے ہی اس کو جھٹلایا پھر ہم اس کی تصدیق کیسے کریں ؟

قرآن حکیم میں اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

وَاِذَا بَدَّلۡنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ ۔ (النحل - ۱۰۱) جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت لے آتے ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے جو چیز وہ نازل کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تو جھوٹ باندھنے والا ہے ۔

پھر یہ کہہ کر آپ سے اس طعن کو دور فرمایا کہ :

قُلۡ نَزَّلَهٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّكَ بِالۡحَقِّ ۔ (النحل - ۱۰۲) آپ کہہ دیں کہ اس کو پاکیزہ روح نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اُتارا ہے

اس آیت سے یہ بات روشن ہوئی کہ ایک آیت کو اگر دوسری آیت منسوخ کر دے تو آنحضور صلعم

مورد طعن نہیں ٹھہرتے۔ بخلاف ازیں اگر حدیث قرآن کی ناسخ ٹھہرے تو آپ مطعون قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا طعن و تشنیع کا سدِباب کرنے کے لیے یہ کہنا موزوں تر ہے کہ حدیث قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔ (اصول السرخسی، ج ۲۔ ص ۷۶ نیز الرسالۃ للشافعی، ص ۱۰۶-۱۰۸)

یہ امر شک و شبہ سے بالا ہے کہ جمہور کی رائے اقرب الی الحق ہے۔ بظاہر ہمیں ایسی کوئی حدیث نظر نہیں آتی جو کسی آیتِ قرآنی کی ناسخ ہو احناف نے موزوں پر مسح اور وارث کے لیے وصیت سے متعلق جو حدیثیں پیش کی ہیں وہ خارج از بحث ہیں۔ میری رائے کے مطابق یہ جدال و نزاع جواز عدم جواز کے بارے میں ہے وقوع و ظہور سے متعلق نہیں۔ حنفیہ نے اس کے وقوع کا جو دعویٰ کیا ہے وہ قابل تسلیم نہیں۔ احناف نے جو دلائل اس ضمن میں پیش کیے ہیں ان میں غور و فکر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں ردّ و قبول کی بڑی گنجائش ہے۔

لِلّٰہِ الحَمۡد کہ ہم نے حدیث نبوی کی جمع و تدوین اور احادیث صحیحہ و سقیمہ کے مابین فرق و امتیاز کے سلسلہ میں علماء کی مساعیِ جمیلہ کے ذکر و بیان کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ اتمام پذیر ہوا۔ حدیث رسول کو قدیماً و حدیثاً جن شبہات کی آماجگاہ بنایا گیا تھا خدا کا شکر ہے کہ ہم نے ان کا ازالہ کر دیا۔ ہم نے یہ حقیقت اجاگر کر دی کہ حدیث نبوی کو اسلامی قانون میں کیا مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ نیز یہ کہ قرآن و حدیث کے مابین کیا ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔

کتاب کے خاتمہ میں ہم مختصراً بیان کریں گے کہ حدیث نبوی کے بارے میں ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا موقف کیا تھا اور وہ اس میں کہاں تک مہارت و بصیرت رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں ہم اصحاب صحاح ستہ کے مختصر تراجم اور ہر کتاب کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

مترجم

غلام احمد حریری

رحمہ اللہ و غفر لہ

خاتمۃ الکتاب

ائمہ اربعہ واصحاب صحاح ستہ

۱۔۔۔ امام ابوحنیفہؒ

۲۔۔۔ امام مالکؒ

۳۔۔۔ امام شافعیؒ

۴۔۔۔ امام احمدؒ

۵۔۔۔ امام بخاریؒ

۶۔۔۔ امام مسلمؒ

۷۔۔۔ امام نسائیؒ

۸۔۔۔ امام ابوداؤدؒ

۹۔۔۔ امام ترمذیؒ

۱۰۔۔۔ امام ابن ماجہؒ

امام ابو حنیفہ

۸۰ ——————— ۱۵۰

نام و نسب :

آپ کا نام نامی نعمان بن ثابت اور کنیت ابو حنیفہ ہے۔ آپ آئمہ اربعہ میں سب سے پہلے پیدا ہوئے۔ اہل اسلام میں آپ کے پیروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ آپ کوفہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے سنِ ولادت کے بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق آپ ۶۳ھ میں پیدا ہوئے۔ دوسرے کے پیش نظر ۷۰ھ میں اور تیسرے قول کے مطابق ۸۰ھ میں۔ تیسرا قول مشہور تر ہے۔ اگرچہ بعض مصنفین نے چند وجوہات کے پیش نظر دوسرے قول کو راجح قرار دیا۔ (کتاب الضعفاء ابن حبان نیز تانیب الخطیب، ص ۱۹)

تعلیم و تربیت :

آپ کوفہ میں پلے بڑھے جو اُن دنوں عظیم ترین اسلامی شہر تھا۔ کوفہ ہر مکتبِ خیال کے علماء و فضلاء کا گہوارہ تھا۔ صرف و نحو اور ادب و لغت کے بڑے بڑے امام یہاں بود و باش رکھتے تھے۔ امام ابو حنیفہ نے علم الکلام پڑھا، اور اس میں ماہرانہ بصیرت حاصل کی۔ پھر حماد کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے جو ان دنوں فقہائے کوفہ کے سر خیل تھے۔ حماد کا سلسلہ تلمذ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مل جاتا ہے۔ اس لیے کہ حماد نے ابراہیم نخعی سے تعلیم پائی، جو علقمہ بن قیسؒ کے شاگرد تھے۔ علقمہ براہِ راست حضرت ابن مسعود کے ساختہ پرداختہ تھے۔

بعد ازاں آپ شیخ حماد کے وابستۂ دامن ہو گئے۔ حتیٰ کہ حماد نے ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ شیخ حماد کے تلامذہ نے امام ابو حنیفہ کو ان کا جانشین قرار دیا۔ چنانچہ کوفہ کے مکتبِ رائے و قیاس کی قیادت و سیادت آپ کی ذات پر ختم ہو گئی۔ اور آپ بلا اختلاف فقہائے عراق کے امام ٹھہرے۔ دور و نزدیک آپ کے علم و فضل کے چرچے ہوئے بصرہ مکہ اور مدینہ کے

مشہور ترین علماء سے ملے اور ان کے ساتھ بحث و مناظرہ کیا۔ ان سے استفادہ کیا اور ان کو اپنے علم و فضل سے مستفیض کیا۔ جب منصور نے بغداد تعمیر کیا تو وہاں تشریف لے گئے۔ آپ کے حلقۂ درس کی شہرت بڑھتی گئی یہاں تک کہ اس نے ایک عظیم اکیڈمی کی صورت اختیار کر لی جس میں عبداللہ بن مبارک حفص بن غیاث جیسے محدثین کبار اور ابو یوسف و محمد و زُفر و حسن بن زیاد جیسے فقہاء اور فُضیل بن عیاض اور داؤد طائی جیسے عبّاد و زھّاد حاضر ہُوا کرتے تھے۔ یہ مجلس علمی امانت و دیانت کی حامل تھی۔ اس میں حاضری دینے والے عبادت میں کوشاں معاملات میں صائب دنیوی مال و منال سے بے نیاز اور اسلام اور اہل اسلام کے خیر خواہ و ہمدرد تھے امام ابو حنیفہ زہد و عبادت کی اسی راہ پر گامزن رہے یہاں تک کہ خالق حقیقی سے جا ملے۔

فقہ حنفی کے اصول:

امام بیہقی نے یحییٰ بن ضریس سے روایت کیا ہے کہ میں سفیان کی خدمت میں حاضر تھا ایک شخص نے آکر کہا آپ ابو حنیفہ پر کیا تنقید کرتے ہیں؟ سفیان نے کہا "اسے کیا ہے؟ میں نے سنا کہ ابو حنیفہ کہہ رہے تھے، میں کتاب اللہ سے استدلال کرتا ہوں۔ اگر اس میں وہ مسئلہ نہ ملے تو سنتِ رسول سے دلیل لیتا ہوں۔ اگر دونوں میں نہ پاؤں تو جس صحابی کے قول سے چاہتا ہوں احتجاج کرتا ہوں اور جس کے قول کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، اور اُن کے قول کو چھوڑ کر کسی اور کا قول اختیار نہیں کرتا۔ جب معاملہ ابراہیم نخعی شعبی ابن سیرین حسن بصری عطاء اور ابن مسیّب تک پہنچتا ہے تو میں بھی ان کی طرح اجتہاد سے کام لیتا ہوں۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ جو بات کتاب اللہ میں نہیں پاتا تو پھر سنت رسول اور احادیث صحیحہ پر عمل کرتا ہوں جو ثقہ راویوں کے یہاں عام طور سے شائع ہیں۔" (مفتاح الجنۃ ص ۳۴)

جس معاملہ میں کتاب و سنت اور اقوالِ صحابہ موجود نہ ہوں اس میں امام ابو حنیفہ کا اجتہاد قیاس پر مبنی ہوتا تھا۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک قیاس کی ایک قسم استحسان بھی ہے۔ استحسان کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ قیاس جلی کے مقابلہ میں ایک طرح کا قیاس خفی ہوتا ہے۔

امام ابو حنیفہ کے خلاف شور و غوغا:

یہ ہیں فقہ و اجتہاد کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہ کے اصولِ عامہ! یہ وہ اصول ہیں جو دیگر آئمہ

اور خصوصاً ائمہ ثلاثہ کے افکار و آراء سے ہم آہنگ ہیں۔ قرین حق و انصاف یہ تھا کہ امام ابوحنیفہ کی عظمت و جلالت اور ان کی خدمات جلیلہ کی بناء پر آپ کا نام نامی اور اسم گرامی تاریخ کے اوراق میں زندہ جاوید اور ہمیشہ کے لیے تابندہ و درخشندہ ہوتا۔ مگر صد حیف! کہ اس کے عین برعکس نہ صرف آپ کے عصر و عہد میں بلکہ آپ کے بعد بھی آپ کے خلاف شور و غوغا برپا ہوتا رہا۔ لوگ آپ کے بارے میں دو دھڑوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ آپ کی مدح و ستائش میں رطب اللسان اور آپ کے علم و فضل کا ثنا خواں تھا۔ یہ جمہور اہل اسلام تھے۔ دوسرا گروہ آپ کے خلاف آتش غیظ و غضب سے بھرا ہوا تھا اور لوگوں کو آپ کی فقہ سے نفرت دلا رہا تھا۔ یہ لوگ نہ صرف آپ سے بلکہ آپ کے اصحاب و تلامذہ سے بھی بدظن تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس میں کیا راز پنہاں تھا؟ اور یہ طعنہ باز اور زبان دراز کون لوگ تھے؟

آپ کے خلاف شور و شغب کے اسباب:

(۱)۔ آئمہ عصر میں ابوحنیفہ اولین امام تھے جس نے فقہی استنباط کے دائرہ کو بڑھایا اور پھیلایا۔ اصول سے فروع و جزئیات اخذ کرنے میں وسعت پیدا کی۔ ایسے حوادث فرض کیے جو ہنوز وقوع پذیر نہ ہوئے تھے۔ قبل ازیں علماء مفروضہ حوادث کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے حل میں وقت ضائع کرنے کو وقت کا ضیاع اور لوگوں کو ایسے مشاغل میں الجھانا تصور کرتے تھے جو قطعی طور پر بے کار ہے۔

حضرت زید بن ثابتؓ سے جب ایسا کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وہ پوچھتے کہ کیا "یہ وقوع میں آچکا ہے؟ اگر لوگ کہتے کہ نہیں تو آپ فرماتے "ابھی ٹھہر جاؤ اس کو وقوع میں آنے دو!" امام ابوحنیفہ کا زاویۂ نگاہ اس سے یکسر مختلف تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مجتہد کا کام لوگوں کے لیے فقہ کی ترتیب و تدوین ہے۔ اگرچہ یہ حوادث ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئے مگر ان کے رونما ہونے کی قوی امید ہے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ کی جلد ۱۳، ص ۳۴۸ پر جناب امام کے نقطۂ نظر کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

"جب قتادہ وارد کوفہ ہوئے تو امام ابوحنیفہ نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا "آپ اس شخص کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں جو اپنی بیوی سے کئی سال غائب

رہا۔ بیوی نے سمجھا کہ میرا خاوند مر چکا ہے۔ چنانچہ اس نے دوسری شادی کر لی۔ پھر پہلا خاوند لوٹ آیا۔ آپ اس کے مہر کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے تلامذہ سے کہہ رکھا تھا کہ اگر اس کے جواب میں قتادہ نے حدیث بیان کی تو ہم اس کی تردید کریں گے۔ اور اگر اپنی رائے سے فیصلہ کیا تو اس کی غلطی واضح کریں گے۔ قتادہ نے کہا کیا یہ واقع ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا نہیں" قتادہ نے کہا "پھر ایسے مسئلہ کے بارے میں کیوں پوچھتے ہو جو ابھی واقع ہی نہیں ہُوا؟ امام ابوحنیفہ نے فرمایا" ہم مصیبت کے آنے سے پہلے اس کا انتظام کرتے ہیں۔ جب یہ واقعہ پیش آئے گا تو ہمیں اس میں داخل ہونے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کا راستہ معلوم ہوگا"

امام ابوحنیفہ کے مدرسۂ فکر کو "اَرَأَیْتِیِیْن" یعنی فرضی مسائل گھڑنے والوں کے نام سے پکا را جاتا تھا۔ یہ کہا کرتے تھے "اَرَأَیْتَ لَوْحَصَلَ کَذَا" (اگر یوں ہُوا تو پھر کیا کریں گے؟) امام مالک کے بعض تلامذہ نے آپ سے ایک سوال کیا جس کا جواب آپ نے دیدیا تلمیذ نے کہا "اگر یوں ہو تو پھر کیا ہوگا؟ امام مالک سخت ناراض ہوئے اور فرمایا" آپ فرضی مسائل گھڑنے والے گروہ سے تو تعلق نہیں رکھتے؟ کہیں آپ عراق سے تو نہیں آ رہے؟

ابن عبدالبر نے امام مالکؒ سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا "میں نے اسلامی دیار و بلاد کے لوگوں کو دیکھا ہے وہ زیادہ سوال وجواب کو پسند نہیں کرتے" ابن وھب کہتے ہیں کہ امام مالک کی مراد اس سے کثرتِ مسائل ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں:

"لوگ جو سنتے اور جانتے ہوتے تھے اس کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے، آج کل جو باتیں ہو رہی ہیں، وہ ہم نے پہلے نہیں سنیں"

امام مالک روایت کرتے ہیں کہ عبدالملک بن مروان نے امام زھری سے کوئی مسئلہ پوچھا۔ امام زھری نے دریافت کیا، امیرالمومنین! کیا ایسا ہوا ہے؟ عبدالملک نے کہا "نہیں" زھری نے کہا "چھوڑیئے! جب ایسا ہوگا تو اللہ تعالیٰ

اس کا حل بھی پیدا کر دیں گے۔" (جامع بیان العلم، ج ۲-ص ۱۴۳)

امام مالک اپنی سند کے ساتھ امام شعبی سے روایت کرتے ہیں۔ شعبی عراق کے ائمہ حدیث میں سے تھے۔ فرماتے ہیں:

"ان لوگوں کی وجہ سے مجھے مسجد سے نفرت ہو گئی ہے حتیٰ کہ وہ مجھے اپنے کوڑے کے ڈھیر سے بھی زیادہ بُری معلوم ہوتی ہے۔ میں نے عرض کیا ابو عمرو! وہ کون لوگ ہیں؟ کہا "فرضی مسائل گھڑنے والے۔ نیز فرمایا حکم حماد اور اس کے اصحاب بھی ان میں شامل ہیں۔ حماد ابو حنیفہؒ کے استاد تھے۔"

امام شعبی سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا "فرضی مسائل گھڑنے سے میرے نزدیک اور کوئی چیز مذموم تر نہیں۔" (جامع بیان العلم، ج ۲-ص ۲۴۳)

تفریع و استنباط میں امام ابو حنیفہ نے جو وسعت پیدا کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول صاحب العنایہ فقہ حنفی کے مسائل کی تعداد بارہ لاکھ ستر ہزار سے بھی زیادہ تک پہنچ گئی۔

(النکت الظریفہ، ص ۵)

یہ بہت بڑی تعداد ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ تعداد مبالغہ آمیزی پر مبنی ہے تو اس میں شبہ نہیں، کہ دوسرے کسی امام سے اس قدر مسائل منقول نہیں ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے بعض ناقدین نے آپ کی کثرت تفریعات پر ان الفاظ میں اظہار غیظ و غضب کیا ہے۔

"آپ وقوع میں آمدہ مسائل کے بارے میں سب لوگوں سے زیادہ جاہل تھے اور جو مسائل ابھی وقوع میں نہیں آئے ان کے بارے میں سب سے بڑے عالم۔"

(۲) - امام ابو حنیفہ احادیث کے قبول کرنے میں نہایت تشدد سے کام لیتے تھے۔ چونکہ آپکے زمانہ میں وضع حدیث کا عام چرچا تھا اس لیے آپ نے احادیث کی جانچ پرکھ کے لیے نہایت کڑی شرائط عائد کی تھیں سرزمین عراق ان دنوں تمام عالم اسلامی میں فکری و انقلابی تحریکات کا سرچشمہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے عصر و عہد میں عراق وضع حدیث کا اوّلین مرکز و محور اور وضاعین کا ملجاء و ماویٰ تھا۔ یہی چیز تھی جو قبولیت احادیث میں آپ کے لیے حزم و احتیاط کی موجب بنی

چنانچہ آپ صرف وہی احادیث قبول کرتے تھے، جو علماء کی زبان زد عام تھیں۔ آپ اس ضمن میں محدثین سے بھی زیادہ تشدد و احتیاط سے کام لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے ایسی احادیث کو بھی ضعیف ٹھہرایا جو دوسروں کے یہاں صحیح اور مقبول تھیں۔"

(۳) ۔ دوسری طرف امام ابوحنیفہ احادیث مرسلہ سے بھی احتجاج کرتے تھے، بشرطیکہ ارسال کرنے والا ثقہ ہو۔ مگر جمہور محدثین ان کو ناقابلِ احتجاج سمجھتے تھے۔ نتیجہ کے طور پر جناب امام ایسی احادیث سے بھی استدلال کرتے تھے۔ جو دوسرے محدثین کے یہاں ضعیف اور غیر معمول بہا تھیں۔

(۴) ۔ صحتِ حدیث کے لیے امام ابوحنیفہ نے جو کڑی شرائط مقرر کی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبولیتِ احادیث کا دائرہ نہایت سکڑ گیا اور آپ رائے و قیاس کو استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے۔ خداوند کریم نے آپ کو اس ضمن میں عدیم النظیر اہلیت و صلاحیت سے نوازا تھا اس میں شک نہیں کہ آپ نے قیاس و رائے کے دامن میں جو وسعت پیدا کی تھی اس نے آپ اور اہل الحدیث کے مابین اختلاف کی خلیج کو اسی طرح وسیع کر دیا جس طرح ان فقہاء کے درمیان بُعد واقع ہوا تھا جو قیاس و اجتہاد کو شاذ و نادر ہی استعمال کرتے تھے۔

(۵) ۔ استنباطِ مسائل میں امام ابوحنیفہ کا مسلک حیرت انگیز حد تک دقت آفرینی پر مبنی تھا۔ آپ ہر مسئلہ میں رائے و اجتہاد کے لیے ایسے وجوہ و اسباب ڈھونڈھ نکالتے جو دوسروں کے لیے حیرت و استعجاب کے موجب ہوتے۔

ابن ابی العوام نے اپنی سند کے ساتھ محمد بن حسن سے روایت کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ جب بغداد لائے گئے تو آپ کے اصحاب و تلامذہ جمع ہوئے جن میں قاضی ابو یوسف، زفر، اسد بن عمرو اور آپ کے اصحاب میں سے فقہائے متقدمین بھی موجود تھے۔ ایک مسئلہ زیر بحث تھا۔ وہ کہنے لگے جونہی امام ابوحنیفہ یہاں پہنچیں ان سے یہ مسئلہ دریافت کیا جائے۔ جب آپ بغداد پہنچے تو سب سے پہلے یہ مسئلہ آپ سے دریافت کیا گیا۔ آپ نے جو جواب دیا وہ ان کی رائے سے مختلف تھا۔ حاضرین مجلس پکار اُٹھے ابوحنیفہ! وطن کی دُوری نے آپ کے اوسان خطا کر دیے ہیں فرمایا "ٹھہریے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ لوگوں نے کہا آپ نے مسئلہ غلط بتایا ہے امام

کہنے لگے "کیا دلیل کی بنا پر یہ بات کہتے ہو یا بلا دلیل؟" لوگوں نے کہا "دلیل کی بنا پر" امام نے فرمایا "دلیل پیش کیجیے" چنانچہ آپ نے ان سے مناظرہ کیا اور ان کو اپنی بات کا قائل کر لیا لوگوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ امام نے کہا "کیا اب تم اصلی بات سمجھ گئے ہو؟ لوگوں نے کہا "جی ہاں!" آپ نے فرمایا "اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جو بات تم کہتے ہو وہی درست ہے تو اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" وہ کہنے لگے "ایسا نہیں ہو سکتا" چنانچہ آپ نے پھر ان کے ساتھ مناظرہ کر کے ان پر اس قول کی غلطی واضح کی۔ لوگ کہنے لگے ابو حنیفہ! آپ نے ہم پر ظلم کیا دراصل ہم حق پر تھے۔ امام ابو حنیفہ کہنے لگے "اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اب جو بات تم نے تسلیم کی ہے وہ غلط ہے، پہلی بات بھی غلط تھی دراصل ایک تیسری بات حق ہے تو اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ لوگ کہنے لگے یہ ممکن نہیں۔ فرمایا سنیے چنانچہ آپ نے تیسرا قول بتایا اور مناظرہ کر کے ان کو اپنے ساتھ متفق کر لیا۔ وہ کہنے لگے "ہمیں بتائیے کہ تینوں اقوال میں سے صحیح تر کون سا ہے؟ فرمانے لگے "دراصل پہلا قول ہی صحیح ہے اور اس کی وجہ یہ ہے۔ اس مسئلہ میں تین احتمالات ہیں۔ ہر احتمال پر ایک فقہی مسلک کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ تم پہلا قول اختیار کر لو اور باقی دو اقوال کو چھوڑ دو۔

غور فرمائیے کہ جو شخص ایک ہی مسئلہ میں لوگوں کے افکار و نظریات کو اسی طرح تبدیل کرنے کی قدرت سے بہرہ ور ہو بلاشبہ وہ سب لوگوں سے زیادہ بالغ النظر دقیقہ رس اور استنباطِ نصوص میں سب سے زیادہ گہرائی رکھنے والا ہوگا۔ علاوہ ازیں اس کا قوی الحجت اور زور بیان سے موصوف ہونا بھی ایک درخشاں حقیقت ہے۔ بنابریں یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ امام مالک کے اس قول میں کوئی مبالغہ نہیں کہ :۔

> "امام ابو حنیفہ کے زور بیان اور قوتِ استدلال کا یہ عالم ہے کہ اگر پتھر کے اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں"

یہ بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ اگر بعض مسائل میں امام ابو حنیفہ کا استنباط دیگر علماء اور جمہور محدثین کے خلاف ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس لیے کہ اکثر محدثین ظواہرِ نصوص پر عمل کرتے تھے اور ان میں علت نکالنے کے قائل نہ تھے۔ سب سے بڑھ کر

یہ کہ اہل حدیث کے زمرہ میں ایسے عوام بھی تھے، جن کے بارے میں یحییٰ بن یمان کہتے ہیں:

"ان میں سے اکثر حدیثیں لکھتے اور ان کو سمجھنے پر قادر نہ تھے جب ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو خاموش بیٹھے رہتے۔"

(جامع بیان العلم، ج ۲- ص ۱۲۱)

یہ درست ہے کہ محدثین میں ایسے لوگ بھی تھے جو سوچ بچار اور طرز بود وماند میں نہایت پسماندہ تھے۔ کم علمی کی بناء پر اکثر ان سے غلطیاں سرزد ہوتیں اور بعض مسائل کے سلسلہ میں مضحکہ خیز جواب دیتے۔ چند واقعات ملاحظہ ہوں:

ایک شخص نے استنجاء کرنے کے بعد وضو کیے بغیر وتر پڑھ لیے اور دلیل میں یہ حدیث پیش کہ "من استجمر فلیوتر" اس نے اس حدیث سے نماز وتر مراد لی۔ حالانکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ طاق ڈھیلوں سے استنجاء کرنے چاہیے۔ مثلاً ایک یا تین۔

ایک شخص کے بارے میں منقول ہے کہ اس نے جمعہ کی نماز سے پہلے چالیس سال تک حجامت نہ بنوائی اور اس حدیث سے احتجاج کیا کہ "نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْحِلَقِ قَبْلَ الصَّلٰوةِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ" (آپ نے جمعہ کے روز نماز سے پہلے حلقہ باندھنے سے منع فرمایا) اس نے "الحِلَق" (حلقہ) کو "الحَلْق" (سر منڈوانا) سمجھا۔

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

نَهٰى اَنْ يَّسْقِيَ الرَّجُلُ مَاءَهٗ زَرْعَ غَيْرِهٖ۔	آپ نے منع کیا کہ آدمی دوسرے کی کھیتی کو سیراب کرے یعنی حاملہ عورت سے مجامعت کرنے سے آپ نے منع فرمایا۔

ایک شخص نے حدیث کا مطلب یہ سمجھا کہ پڑوسی کے باغ کو سیراب نہیں کرنا چاہیے۔

ایک صاحب حدیث بیان کر رہے تھے۔ کسی نے پوچھا اگر مرغی کنویں میں گر جائے تو کیا کرنا چاہیے؟ اس نے سائل سے کہا آپ نے کنویں کو ڈھانپ کیوں نہ دیا تاکہ اس میں کوئی چیز گرنے نہ پائی۔ ایک شخص سے فرائض (علم وراثت) کا کوئی مسئلہ دریافت کیا گیا۔ اس نے جواب میں لکھا "اللہ تعالیٰ کے فرائض کے مطابق تقسیم کیا جائے۔"

اس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں کہ ایسے عوام محدثین امام ابوحنیفہ کی دقت استنباط اور نصوص میں غوطہ زن ہو کر ان سے استخراج احکام میں آپ کی دقیقہ رسی کو سمجھنے سے قاصر تھے یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے آپ سے بدگمان ہونے آپ سے اعراض و انحراف کرنے آپ کی دین داری کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے اور احادیث کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کے بارے میں آپ پر الزام عائد کرنے میں جلد بازی سے کام لیا۔[1]

(۶) - امام ابوحنیفہ کے معاصر اقران و اماثل موجود تھے۔ بنی نوع انسان میں رشک و حسد کے جذبات فطری ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جو شخص فہم و شعور میں ممتاز ہو یا لوگوں میں زیادہ مشہور اور مقبول ہو۔ انسان اس سے کڑھتا اور دل تنگ ہوتا ہے۔ بہت کم انسان اس عیب سے پاک ہوتے ہیں۔ علماء تک اس میں مبتلا ہوتے ہیں۔ الاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کے دل سے اس نقص و عیب کو دور کر دے۔ اس کے دل کو نور حکمت سے بھر دے۔ اور اس کو انبیاء کی ہدایت اور تصدیق و یقین کی طمانیت سے بہرہ یاب فرما دے۔

محدث ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم کی ایک خاص فصل میں علماء کے باہمی رشک و رقابت اور اس کے نتائج کے بارے میں ان کے اقوال ذکر کیے ہیں۔

---

[1] مقام حیرت ہے کہ ایک طرف تو مصنف نے جناب امام کو اتہامات اور بدگمانیوں سے بری الذمہ ثابت کرنے کے سلسلہ میں ایک نیک کام کی طرح ڈالی۔ مگر اس کے عین برخلاف تحفظ حدیث کے سلسلہ میں خدمات جلیلہ انجام دینے والوں کو کم عقل اور احمق قرار دیا۔ مصنف نے کم عقل محدثین کے جتنے افسانے بیان کیے ہیں ان میں یحییٰ بن یمان کے قول کے سوا کسی کا حوالہ نہیں دیا۔ نہ جانے ایسے خفیف العقل محدثین کس زمین پر بستے اور کس آسمان کے سایہ تلے گزر بسر کرتے تھے۔ فہم و ادراک میں غلطی کس سے سرزد نہیں ہو سکتی۔ اگر محدثین سے حدیث فہمی میں غلطیاں ہوئی ہیں تو فقہاء کا دامن کب اس سے پاک ہے۔ مولانا شبلی نعمانی سے زیادہ امام ابوحنیفہ کا مداح اور کون ہو سکتا ہے۔ مگر انہوں نے بھی "سیرت النعمان" کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی اجتہادی غلطیوں کے صرف امکان کا دعویٰ ہی نہیں کیا جا سکتا.... بلکہ عملاً بھی آپ سے فقہی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ پھر انہوں نے فقہ حنفی کے وہ مسائل گنائے ہیں جن کی کوئی وجہ جواز نہیں اور جن کو کسی تاویل کی بنا پر بھی صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ محدثین ہوں یا فقہاء کوئی بھی غلطیوں سے منزہ نہیں، (باقی برصفحہ ۵۷۴)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

"علماء کی علمی باتیں سنیئے اور ایک دوسرے کے بارے میں ان کی باتوں پر اعتماد نہ کیجیے خدا کی قسم وہ باہم اس سے زیادہ بغض و عناد رکھتے ہیں جو ایک مینڈھے کو دوسرے کے خلاف ہوتا ہے۔" (جامع بیان العلم، ج ۲-ص ۱۰۱)

اس کے بعد ابن عبد البرؒ نے علماء کے بغض و عناد کے عجیب و غریب واقعات بیان کیے ہیں مثلاً محمد بن اسحاق کے بارے میں امام مالک کا قول اور یحییٰ بن معین کی رائے امام شافعی کے بارے میں۔ حماد اور زھری کا قول اہل مکہ سے متعلق۔

امام ابو حنیفہ نے اس قدر بلند منصب و مقام اور عظمت و شہرت حاصل کر لی تھی کہ آپ کے بعض معاصرین بھری مجالس میں آپ کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے لگے۔ وہ خلیفہ تک ایسی باتیں پہنچاتے جو خلافِ واقعہ ہوا کرتی تھیں۔ اس کی حد یہ ہے کہ ایسے لوگوں میں سے ایک یعنی اپنے معاصر کوفہ کے قاضی عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے بارے میں امام صاحب نے فرمایا:

"ابن ابی لیلیٰ میری اس چیز کو بھی مباح خیال کرتا ہے جو میں کسی حیوان کے بارے میں بھی تصور نہیں کر سکتا۔" (مناقب ابی حنیفہ)

سابق الذکر عوامل و محرکات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے ابو حنیفہ سے ایسی باتیں نقل کرنا شروع کر دیں جن کا حق و صداقت کے ساتھ دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ بعض باتیں وہ تھیں جن کے بارے میں لوگ آپ کے طریقِ اجتہاد سے ناواقف ہونے کی وجہ سے آگاہ ہی نہ تھے۔ یہ باتیں ان علماء کے کانوں تک بھی پہنچیں جو آپ سے دُور سکونت پذیر تھے۔ اسی طرح آپ کے وہ مسائل و فتاویٰ بھی ان کے علم میں آئے جو ان کے خلاف تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ اس مخالفت کی وجہ کیا ہے البتہ وہ یہ جانتے تھے کہ ہمارے پاس جو دلائل و آثار موجود ہیں۔ وہ امام ابو حنیفہ کے نقطۂ نگاہ کے خلاف ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زبان سے بعض اوقات ایسی باتیں صادر ہوئیں جو اس امر کی غماز تھیں کہ وہ آپ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ مگر جونہی وہ آپ سے مل کر آپ کے

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۵۷۲) سہو و نسیان سے پاک صرف خداوند علیم و خبیر ہے۔ غلام احمد حریری رحمہ اللہ و غفر لہٗ

زاویۂ نگاہ سے باخبر ہوتے اور آپ کے عمق فکر و نظر سے اطلاع پاتے تو جلد ہی حق کی جانب لوٹ آتے اور آپ کی مدح و ثناء میں رطب اللسان ہوتے۔

مشہور کتاب الخیرات الحسان کے مصنف نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب امام ابوحنیفہ کی شہرت پھیلنے لگی تو ملاقات سے پہلے امام اوزاعی ان سے بدظن ہو گئے۔ ایک دفعہ اوزاعی نے عبداللہ بن مبارک سے کہا "یہ کون بدعتی شخص ہے جو کوفہ میں نمودار ہوا ہے اور اسے ابوحنیفہ کہتے ہیں؟ ابن مبارک نے کوئی جواب نہ دیا۔ بخلافِ ازیں چند مشکل مسائل میں ان کا طرز فہم و ادراک اور ان کے بارے میں فتویٰ کا ذکر کیا۔ اوزاعی نے کہا یہ فتویٰ کس نے دیا ہے؟ ابن مبارک نے کہا ایک شیخ نے جس کو میں عراق میں ملا تھا" اوزاعی نے کہا "وہ بڑا بلند پایہ شیخ ہے جا کر اس سے استفادہ کیجیے"۔ ابن مبارک نے کہا "وہ ابوحنیفہ ہیں" پھر اوزاعی اور ابوحنیفہ مکہ میں ملے۔ اوزاعی نے ابن مبارک کے بیان کردہ مسائل ذکر کیے۔ امام ابوحنیفہ نے ان پر روشنی ڈالی۔ جب جدا ہونے تو اوزاعی نے ابن مبارک سے کہا "اس شخص کی کثرت علم و عقل پر مجھے رشک آتا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ سے اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔ میں سخت غلطی میں مبتلا تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر استفادہ کیجیے۔ جو باتیں میں نے اس کے بارے میں سنی تھیں وہ درست نہ تھیں"۔

(الخیرات الحسان۔ ص ۳۳)

امام مالک اور دیگر علماء کے اقوال امام ابوحنیفہ کے بارے میں:

اب ہم امام ابوحنیفہ کے کبار معاصر علماء کے متناقض اقوال ان کے بارے میں نقل کرتے ہیں:
امام مالک ثوری اوزاعی سفیان بن عُیَینہ عبداللہ بن مبارک اور دیگر علماء سے مختلف قسم کے اقوال امام ابوحنیفہ کے بارے میں منقول ہیں۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں جو مختلف روایات امام ابوحنیفہ کی مدح و مذمت کے بارے میں متعدد ائمہ سے نقل کی ہیں ان سے یہ حقیقت خوب کھل کر سامنے آتی ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں ہمارا ذاتی زاویۂ نگاہ وہی ہے جو ملک معظم عیسیٰ بن ابوبکر ایوبی نے اپنی کتاب "السہم المصیب فی کبد الخطیب" میں بیان کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ کی جرح و قدح پر مشتمل روایات جھوٹی ہیں۔ تاہم عین ممکن ہے کہ ان میں سے بعض باتیں فی الواقع انہوں نے کہی ہوں۔ اور اس کی وجہ وہی ہے جو ہم قبل ازیں اوزاعی اور امام ابوحنیفہ کی ملاقات کے سلسلہ میں

بیان کر چکے ہیں۔

امام ابوحنیفہ کی مذمت کے بارے میں ان کے ہم عصر علماء سے جو اقوال منقول ہیں میری ذاتی حد تک ان کا صحیح محمل و موقف یہی ہے۔ میں کامل وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان علماء نے آپ کے بارے میں جو آخری بات کہی وہ یہی تھی کہ انہوں نے آپ پر مدح و ستائش کے پھول نچھاور کیے۔ آپ پر اعتماد کیا۔ اور آپ کے علم و فضل کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہوئے۔ یہ اس وقت ہوا جب جناب امام نے متعدد مرتبہ مکہ مدینہ اور بصرہ و بغداد کا سفر اختیار کیا۔ نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے پچپن ۵۵ مرتبہ حج کیا۔ ہر دفعہ آپ علماء سے ملتے۔ باہم تبادلۂ افکار کرتے۔ اپنے نظریات سے ان کو آگاہ کرتے اور ان کے خیالات سے مستفید ہوتے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاصر علماء آپ کے طریق اجتہاد سے آگاہ ہوئے اور ان کو پتہ چل گیا کہ آپ نے جن اخبار و احادیث سے احتجاج نہیں کیا اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کے بعد یہ بات بین قرین عقل و قیاس تھی کہ وہ آپ کے علم و فضل کا اعتراف کرتے اور اس بات کی شہادت دیتے کہ آپ اسی صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ جس پر علمائے سلف رواں دواں رہے ہیں۔

قاضی عیاض نے المدارک میں نقل کیا ہے کہ مدینہ میں ایک روز امام مالک و ابوحنیفہ کی ملاقات ہوئی۔ جب امام مالک مجلس سے باہر نکلے تو بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ لیث بن سعد نے کہا "آپ کا پسینہ بہہ رہا ہے"۔ امام مالک نے کہا "ابوحنیفہ سے مل کر مجھے پسینہ آگیا ان کے فقیہ ہونے میں کوئی شک نہیں"۔

امام مالک کے بارے میں منقول ہے کہ آپ امام ابوحنیفہ کی تصانیف کا مطالعہ کیا کرتے تھے یعنی وہ کتب جو آپ کے تلامذہ نے آپ سے روایت کر کے مرتب کی تھیں۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس ساٹھ ہزار مسائل جمع ہو گئے تھے۔ جیسا کہ ابن ابی العوّام سعدی ابوعبداللہ بن مُوَفّق خوارزمی اور دیگر علماء نے امام مالک سے نقل کیا ہے۔ (تانیب الخطیب ص ۳)

امام مالک کے اصحاب و تلامذہ اور مالکی فقہ کے مصنفین کبار نے اعتراف کیا ہے کہ امام مالک امام ابوحنیفہ کی مدح و ستائش کیا کرتے تھے۔ امام مالک سے امام ابوحنیفہ کی مذمت سے متعلق جو اقوال منقول ہیں مالکیہ نے ان کے مختلف جوابات دیے ہیں۔ امام ابوجعفر داؤدی مصنف

"التاجی علی الموطا" یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ امام مالک نے یہ باتیں غصہ کی حالت میں کہی تھیں عالم غصہ کی حالت میں ایک بات کہہ دیتا ہے اور بعد ازاں اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے۔

امام ابن عبدالبر کا خیال ہے کہ امام ابوحنیفہ کے جرح و نقد پر مشتمل روایات امام مالک کے ان تلامذہ سے منقول ہیں جو اصحاب الحدیث کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان میں جو اصحاب فقہ ہیں ان سے ایسی کوئی روایت منقول نہیں۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ابو الولید باجی نے شرح موطا میں امام مالک کی جانب ایسے اقوال کی نسبت سے انکار کیا ہے فرماتے ہیں:

"امام مالک نے فقہاء کے بارے میں سرے سے کچھ کہا ہی نہیں۔ البتہ آپ نے بعض راویوں کے حفظ و ضبط پر نقد و جرح کی ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ امام مالک عبداللہ بن مبارک کا بے حد احترام کرتے تھے حالانکہ وہ امام ابوحنیفہ کے خصوصی اصحاب میں سے تھے۔"

امام شافعی سے جو اقوال امام ابوحنیفہ کی مذمت کے سلسلہ میں منقول ہیں وہ سب جھوٹ ہیں اس لیے کہ امام شافعی نے ان کا زمانہ ہی نہیں پایا۔ البتہ امام شافعی آپ کے بعض اصحاب خصوصاً محمد بن حسن شیبانی سے ملے اور ان کے علم و فضل سے متاثر ہوئے تھے۔ امام شافعی کا مقولہ ہے:

"جب محمد بن حسن نے بغداد کو خیر باد کہا ساکنانِ شہر آپ کے ایک بار شتر علم سے مستفید ہو چکے تھے۔"

اس لیے یہ بات کس طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ نے امام ابوحنیفہ کی مذمت کی ہو۔ امام شافعی کا مشہور قول ہے:

اَلنَّاسُ عِيَالٌ فِي الْفِقْهِ عَلٰى اَبِيْ حَنِيْفَةَ۔ — لوگ فقہ میں امام ابوحنیفہ کے محتاج ہیں۔

امام احمد نے بھی امام ابوحنیفہ کا زمانہ نہیں پایا۔ البتہ آپ قاضی ابو یوسف کے زمانہ میں بقید حیات تھے اور آغاز طالب علمی میں ان کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے تھے۔

امام احمد کا مقولہ ہے:

"میں نے قاضی ابو یوسف سے تین سال میں اس قدر معلومات جمع کیے جن سے
تین الماریاں بھر جائیں ۔"

امام احمد نے محمد بن حسن کی کتب سے استفادہ کیا تھا۔ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ یہ علمی جوابات آپ نے کہاں سے سیکھے تو فرمایا محمد بن حسن کی تصنیفات سے۔

(حسن التقاضی فی سیرۃ ابی یوسف القاضی، ص ۲۸ تانیب الخطیب ص ۱۸۰)

البتہ اس میں حیرت واستعجاب کی کوئی بات نہیں کہ امام احمد سے امام ابو حنیفہ کے فقہی مسلک کے بارے میں کوئی بات منقول ہو نہ کہ ان کی ذات کے بارے میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث نبوی سے اخذ واستدلال کے بارے میں دونوں کے نقطہ ہائے نظر مختلف تھے۔ اگرچہ حدیث دونوں کے نزدیک بالاتفاق اسلامی قانون کا ماخذ ہے۔

امام احمد فرمایا کرتے تھے:

"میرے نزدیک ضعیف حدیث آدمیوں کی رائے سے بہتر ہے۔"

بخلاف ازیں امام ابو حنیفہ قبولیتِ حدیث میں تشدد سے کام لیتے اور اسی حدیث سے استدلال کرتے تھے جو ثقہ راویوں سے منقول ہو۔ مگر ایسے اختلاف کو دوسرے شخص پر نقد وطعن قرار نہیں دیا جا سکتا ؎

وللناس فیما یعشقون مذاہبُ

جدال ونزاع کے ثمرات:

یہ ہیں اسباب و محرکات اس شور وشغب کے جو امام ابو حنیفہ کے عصر وعہد میں ان کے خلاف اٹھا اور جس نے چاروں طرف سے آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ نتیجہ کے طور پر ایسے افکار ونظریات کو آپ کی جانب منسوب کیا گیا جن کے آپ سرے سے قائل ومعتقد تھے ہی نہیں۔ بعض لوگوں نے آپ کو مرجیہ قرار دیا اور بعض نے قدریہ۔ بعض لوگوں کی رائے میں آپ قائل تناسخ تھے اور بعض کے نزدیک منکر حدیث۔ بہت سے لوگ آپ کو خدا کے دین میں عقل ورائے سے کام لینے والا اور خواہشات کا پیرو تصور کرتے تھے۔

امام ابو حنیفہ کی وفات اور ان کے فقہی مسلک کے ذیوع وشیوع کے بعد یہ الزامات

صفحۂ کائنات سے محو ہو گئے اور ان کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔ البتہ آپ کے اعداء و خصوم کے عائد کردہ اتہامات میں سے دو باتیں ہنوز باقی ہیں جن کی وجہ گروہی تعصب اور ائمہ کے طرقِ اجتہاد سے ناآشنائی ہے۔ یہ اسی بہتان طرازی کا نتیجہ ہے کہ عصر حاضر کے منکرین حدیث نے اس سے فائدہ اٹھایا اور امام ابو حنیفہؒ کا حوالہ دے کر حدیث کو مشکوک قرار دیا۔ فجر الاسلام کے مصنف احمد امین نے یہی شیوہ اختیار کیا ہے۔

وہ الزامات یہ ہیں کہ:۔

(۱)۔ امام ابو حنیفہ حدیث نبوی میں کم سواد تھے۔

(۲)۔ آپ حدیث صحیح کے مقابلہ میں رائے و قیاس کو ترجیح دیتے تھے۔

اب ہم ان دونوں الزامات پر بحث کر کے بتائیں گے کہ یہ کس تاریخی دلیل و برھان پر مبنی ہیں؟ نیز ہم فقہ حنفی کے حقائق اور امام ابو حنیفہ سے منقول فقہی و اجتہادی مسائل کے ساتھ ان کا موازنہ کر کے ان کی حقیقت واضح کریں گے۔

کیا امام ابو حنیفہ حدیث میں کم مایہ تھے؟

خطیب بغدادی نے متعدد علماء سے نقل کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ علم حدیث میں کم مایہ اور کمزور تھے۔ مندرجہ ذیل اقوال ملاحظہ ہوں:

نام قائل	قول
(۱) عبداللہ بن مبارک۔	امام ابو حنیفہ یتیم فی الحدیث تھے۔
(۲) ابن قطن۔	آپ علم حدیث میں اپاہج تھے۔
(۳) یحییٰ بن سعید القطان۔	ابو حنیفہ محدث نہ تھے۔
(۴) یحییٰ بن معین۔	امام ابو حنیفہ کے پاس علم حدیث تھا ہی کہاں کہ آپ ان سے حدیث کے بارے میں سوال کریں؟
(۵) احمد بن حنبل۔	آپ کے پاس نہ رائے تھی اور نہ حدیث۔
(۶) ابوبکر بن داؤد۔	ابو حنیفہ سے صرف ایک سو پچاس (۱۵۰) احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے نصف میں آپ سے غلطی سرزد

ہوتی ہے۔

(۷) عبدالرزاقؒ: میں نے ابوحنیفہؒ سے روایت صرف اپنے شیوخِ حدیث کی تعداد بڑھانے کے لیے کی ہی۔ میں نے بیس سے کچھ اوپر احادیث آپ سے روایت کی ہیں۔

(۸) ابوالمدینی۔ امام ابوحنیفہؒ نے پچاس حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان میں سے بعض میں آپ سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔

(تاریخ خطیب بغدادی ۔ ج ۱۳ ۔ ص ۴۴۴)

ہم مذکورہ صدر اقوال کی سند پر نقد و تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ محققین ان کی اسانید پر جرح و قدح کر کے ان کا ضعف ثابت کر چکے ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ خطیب نے ان کی نقل در روایت میں انصاف سے کام نہیں لیا۔ البتہ ہم اس زاویۂ نگاہ کو نقد و تبصرہ کا موضوع بنانا چاہتے ہیں جس کو امام ابوحنیفہ کے اعداء و خصوم اور منکرین حدیث ہمیشہ دہراتے چلے آتے ہیں۔ بعض مورخین نے حسنِ نیت کے ساتھ بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ابن خلدون نے مقدمہ میں بصیغۂ تمریض (قیلَ) ذکر کیا ہے کہ آپ کی مرویات کی تعداد سترہ[۱۷] ہے۔ علامہ کوثری نے اپنی کتاب "تانیب الخطیب علی ماساق فی ترجمۃ ابی حنیفۃ من الاکاذیب" میں ان اقوال کو شدید نقد و جرح کا نشانہ بنایا ہے۔

ہم اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں کا ایک عظیم امام جس کا فقہی مسلک تمام فقہی مذاہب و مسالک سے فروع و استنباط کے لحاظ سے وسیع تر ہو۔ کائناتِ ارضی کے لاکھوں مسلمان آپ کے حلقہ بداماں ہوں اور علم حدیث میں ان کی کم مائگی کا یہ عالم ہو کہ ان کو کل سترہ[۱۷] یا ایک صد پچاس احادیث یاد ہوں۔ یہ بات کیوں کر درست ہو سکتی ہے ؟

(۱) سب موافق و مخالف اس بات پر متفق ہیں کہ ابوحنیفہ ایک مجتہد امام تھے۔ مجتہد کے لازمی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ احادیثِ احکام پر حاوی ہو۔ ایسی احادیث ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ بعض حنابلہ کے مطابق ان کی کم از کم تعداد کئی سو ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اجتہاد کی ایک ضروری شرط کے فقدان کے باوجود آپ مسندِ اجتہاد پر فائز ہوتے۔ مزید یہ کہ

ائمہ دین نے آپ کے اجتہاد و فقہ پر کیوں کر اعتماد کیا؟ وہ کیوں کر اسے نقل و روایت کرتے چلے آئے اور اپنی تحریر و تقریر میں اس پر روشنی ڈالتے رہے حالاں کہ وہ کسی اساس پر قائم نہ تھی؟

(۲) ۔ امام ابوحنیفہ کے فقہی مسلک کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اس مذہب کے سینکڑوں مسائل احادیث صحیحہ کے موافق ہیں۔ شارح قاموس سید مرتضیٰ زبیدی نے ایسی احادیث کو اپنی کتاب "اَلْجَوَاہِرُ الْمُنِیْفَۃُ فِیْ اَدِلَّۃِ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ" میں جمع کر دیا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اگر جناب امام کو صرف چند احادیث یا پچاس ۵۰ اور یا ایک سو پچاس ۱۵۰ احادیث یاد تھیں۔ جن میں سے آدھی غلط تھیں تو پھر آپ کا اجتہاد سینکڑوں احادیث صحیحہ سے کیوں کر ہم آہنگ ہوا؟

(۳) ۔ محدث ابن ابی شیبہ نے اپنی کتاب مصنف میں ایک باب باندھا ہے جس میں وہ مسائل گنائے ہیں جن میں امام ابوحنیفہ نے احادیث صحیحہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ ان کی تعداد ایک سو پچیس ۱۲۵ ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ابن ابی شیبہ کی یہ تنقید صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ امام ابوحنیفہ سے علاوہ ازیں جو مسائل منقول ہیں وہ موافق حدیث ہیں۔ جو مسائل آپ سے مروی ہیں ان کی کم از کم تعداد تراسی ہزار بتائی جاتی ہے۔ بعض روایات کے مطابق ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ابن ابی شیبہ نے جن مسائل کو خلاف حدیث بتایا ہے ان کے علاوہ لاتعداد دیگر مسائل کو وہ موافق حدیث قرار دیں گے یا نہیں۔ قطع نظر اس سے کہ ان کے بارے میں کوئی حدیث مروی ہو یا نہ ہو۔ اگر ان سب یا بعض کے بارے میں احادیث منقول ہوں گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ امام ابوحنیفہ کے یہاں سینکڑوں بلکہ ہزاروں احادیث موجود ہیں۔ اور اگر ان مسائل میں سے کسی کے بارے میں بھی کوئی حدیث منقول نہ ہو تو اُس کا مطلب یہ ہوگا کہ احادیث کی تعداد ایک سو پچیس ۱۲۵ سے زائد نہیں ہے۔ حالانکہ ائمہ اہل اسلام اور محدثین میں سے کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں۔

(۴) امام ابوحنیفہ کا شمار ان لوگوں کے زمرہ میں ہوتا ہے جن کے افکار و آراء کو اصطلاحات حدیث کے سلسلہ میں ذکر کیا جاتا ہے۔ پھر آپ حدیث کے فن میں کم مایہ کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ فن حدیث کے علماء کے نزدیک آپ کو ان آئمہ میں شامل کیا جاتا ہے، جن کے نظریات کو حدیث کے

قواعد رجال کے سلسلہ میں نہ صرف ملحوظ رکھا جاتا بلکہ آپ کے مذہب و مسلک پر اعتماد کیا جاتا اور احادیث کے ردّ و قبول میں معیار ٹھہرایا جاتا ہے۔

(۵) ۔ امام ابو حنیفہ نے چار ہزار شیوخِ حدیث سے استفادہ کیا تھا حتّٰی کہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں آپ کو "ثقہ اور حافظ حدیث" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یحییٰ بن نصر کہتے ہیں:

> "میں امام ابو حنیفہ کے گھر گیا تو اُسے کتابوں سے لبریز پایا۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے ؟ فرمایا یہ کتبِ حدیث ہیں۔ میں نے ان میں سے صرف وہی حدیثیں روایت کی ہیں جن سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔"

(۶) امام ابو حنیفہ نے اگرچہ دیگر محدثین کی طرح حدیث نبوی کی تدریس کے لیے کوئی حلقۂ درس قائم نہیں کیا اور نہ ہی امام مالک کی طرح حدیث کی کوئی کتاب مرتب کی۔ تاہم آپکے تلامذہ نے آپ کی روایت کردہ احادیث کو کتب و مسانید میں جمع کیا۔ جن کی تعداد دس[۱] سے زائد ہے۔ اس ضمن میں مشہور ترین کتب حسب ذیل ہیں۔

۱ ۔ کتاب الآثار ابو یوسف۔

۲ ۔ کتاب الآثار المرفوعہ محمد بن حسن۔

۳ ۔ الآثار المرفوعۃ والموقوفۃ محمد بن حسن۔

۴ ۔ مسند حسن بن زیاد۔

۵ ۔ مسند حماد بن امام ابی حنیفہ۔

مسانید ابی حنیفہ مرتب کرنے والوں میں مندرجہ ذیل اہل علم کے نام شامل ہیں:

(۱) ذہبی (۲) بخاری (۳) حارثی (۴) ابن المظفر (۵) محمد بن جعفر (۶) ابو نعیم اصبہانی (۷) قاضی ابو بکر انصاری (۸) ابن ابی العوام سعدی (۹) ابن خسرو بلخی۔

بعد ازاں قاضی القضاۃ ابو المؤید محمد بن محمود خوارزمی متوفی ۶۶۵ھ نے تمام مسانید کو ایک ضخیم کتاب میں یکجا کر دیا، اور اسے "جامع المسانید" کے نام سے موسوم کیا۔ خوارزمی نے اس کتاب کو فقہی ابواب پر مرتب کیا۔ مکررات کو حذف کر دیا۔

خوارزمی کتاب مذکور کے خطبہ میں لکھتے ہیں:

"میں نے دیارِ شام میں بعض ایسے جہلاء سے سُنا جو اپنے علمی مرتبہ و مقام سے آگاہ نہیں کہ امام ابو حنیفہ حدیث نبوی میں کم سواد ہیں۔ اس نے دلیل یہ دی کہ امام شافعی نے مسند اور امام مالک نے مؤطا مرتب کی مگر امام ابو حنیفہ نے کوئی مسند مدوّن نہ کی۔ آپ صرف چند احادیث روایت کرتے تھے۔ یہ سن کر دینی غیرت نے مجھے آلیا اور میں نے چاہا کہ ان پندرہ مسانید کو یکجا کر دوں جن کو بلند پایہ علماء نے مرتب کیا تھا۔"

یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے اور آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

جن علماء نے مذکورہ صدر مسانید کو قراءۃً دکتابۃً و سماعاً روایت کیا ہے ان میں دیارِ شام کے حافظ حدیث شمس الدین بن طولون اور سرزمین مصر کے عظیم محدّث حافظ محمد بن یوسف کے اسماء شامل ہیں موخّر الذکر اپنی کتاب "عقود الجمان" میں رقم طراز ہیں:

"امام ابو حنیفہ عظیم حافظِ حدیث اور محدّثین کے سرخیل تھے۔ اگر آپ حدیث نبوی سے شغف نہ رکھتے ہوتے تو فقہی مسائل کا استنباط آپ کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ ذہبی نے آپ کو حفاظِ حدیث میں شامل کیا ہے اور بہت اچھا کیا ہے۔ کثرتِ احادیث کے باوجود آپ نے حدیثیں کم روایت کیں اس لیے کہ آپ استنباطِ مسائل میں منہمک رہا کرتے تھے۔ امام مالک و شافعی سے کثرت احادیث کے باوجود قلتِ روایت کی وجہ بھی یہی ہے۔ جس طرح حضرت ابو بکر و عمر جیسے کبار صحابہ نے وسعتِ علم کے باوصف کم حدیثیں روایت کیں۔ حالانکہ دیگر صحابہؓ کی مرویات ان سے بہت زیادہ ہیں۔"

آگے چل کر حافظ محمد بن یوسف نے ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کو بکثرت احادیث یاد تھیں۔ پھر آپ نے جناب امام کی ان اسانید کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو سترہ مسانید کے جامعین نے ذکر کی ہیں۔ اسی طرح حافظ ابن طولون نے اپنی کتاب "الفہرست الاوسط" میں مذکورہ سترہ۱۷ مسانید میں بیان کردہ امام صاحب کی اسانید پر روشنی ڈالی ہے۔

خطیب بغدادی نے جب دمشق کا سفر اختیار کیا تو دار قطنی اور ابن شاہین کی مسند ابی حنیفہ ان کے ہمراہ تھی۔ علاوہ ازیں خطیب کی اپنی مسند ابی حنیفہ بھی ان کے پاس موجود تھی۔ یہ سابق الذکر

مسانید کے علاوہ ہیں۔

علامہ بدر الدین عینی نے اپنی تاریخ کبیر میں ذکر کیا ہے کہ ابن عقدہ کی مسند ابی حنیفہ ایک ہزار سے زائد احادیث پر مشتمل ہے۔ یہ مسند بھی سابق الذکر مسانید ستہ الگ ہے۔ امام سیوطی "التعقیبات" میں لکھتے ہیں کہ ابن عقدہ عظیم حافظ حدیث تھے۔ وہ ثقہ تھے اور ان کی تضعیف وہی شخص کرتا ہے جو متعصب ہو۔

امام ابو حنیفہ کے شاگرد رشید زفر نے بھی ایک "کتاب الآثار" مرتب کی ہے اور اس میں بکثرت احادیث امام صاحب سے روایت کی ہیں۔ اس کا ذکر حاکم نے اپنی کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں کیا ہے۔

یہ ہے امام ابو حنیفہ کے قلیل الحدیث ہونے کے بارے میں صحیح قول!

(تانیب الخطیب، ص ۱۵۶)

جس طرح حدیث میں آپ کے کم مایہ ہونے کا بہتان غلط ثابت ہوا۔ اسی طرح دوسرے الزام کا بطلان بھی ثابت ہو جائے گا کہ آپ کے نزدیک صرف دس سے کچھ اوپر احادیث صحیح تھیں اس الزام کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ کسی معتبر کتاب میں مذکور نہیں۔ اور صرف ابن خلدون نے اس کو ذکر کیا ہے۔ ابن خلدون کی عبارت مبہم و مجمل ہے۔ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ آپ کی مرویات کی تعداد اتنی ہے، مگر یہ بات غلط ہے۔ جن مسانید کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں اور فقہ حنفی میں جو احادیث مذکور ہیں ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفید جھوٹ ہے اور اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔

غالباً ابن خلدون کے قول کا منشاء یہ ہے کہ محمد بن حسن نے امام مالک سے موطا روایت کی اور اس میں تیرہ احادیث کا اضافہ کیا جو انہوں نے امام ابو حنیفہ سے روایت کی تھیں۔ چار احادیث ابو یوسف کی روایت سے اس میں شامل کر دیں۔ جہلاء نے سمجھا کہ امام ابو حنیفہ کے یہاں صرف یہی احادیث صحیحہ تھیں۔ تاہم اس امر کی تحقیق ضروری ہے کہ ابن خلدون نے کس ماخذ سے یہ بات اخذ کی ہے؟

ہم ناظرین کو بعض مصنفین کی اس غلطی سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جس میں شاہ ولی اللہ دہلوی

جیسے اکابر بھی مبتلا ہو گئے۔ جیسا کہ آپ نے حجۃ اللہ البالغہ میں بیان کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے یہاں قلت حدیث کی وجہ یہ تھی کہ کوفہ ان دنوں دارالحدیث نہ تھا یہ فاش غلطی ہے جس کا بڑا سبب اس حقیقت سے بے خبری ہے کہ کوفہ کو امام صاحب کے زمانہ میں ایک علمی شہر کا مقام حاصل تھا۔ نیز یہ کہ امام ابوحنیفہ نے مختلف اسلامی دیار و امصار کی جانب علمی سفر اختیار کر کے اپنے علم و فضل میں اضافہ کیا تھا۔

کوفہ کی بنا ۱۷ھ میں پڑی۔ یہ اس وقت ہی سے کبار صحابہؓ کا مرکز و محور چلا آتا تھا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو کوفہ بھیجا تاکہ وہاں کے رہنے والوں کو قرآن و فقہ کی تعلیم دیں۔ اسلام لانے والوں میں آپ کا چھٹا نمبر تھا۔ ان کو کوفہ بھیجتے وقت حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"میں نے عبداللہ کو تمہارے پاس بھیج کر تم کو اپنی ضرورت پر ترجیح دی ہے۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ اتنے بڑے عالم تھے کہ خلیفہ بھی اپنے دارالحکومت میں ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

"جو شخص قرآن کو اسی طرح تازہ پڑھنا چاہے جس طرح وہ اترا تھا تو وہ عبداللہ بن مسعودؓ کی طرح پڑھے۔"

حضرت عمرؓ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا:

"عبداللہ بن مسعودؓ علم کا بھرا ہوا کوٹھا ہیں۔"

خلاصہ یہ کہ بکثرت اخبار و آثار میں آپ کے علم و فضل کی مدح و ستائش کی گئی ہے۔ ایسا جلیل القدر صحابی خلافت فاروقی سے لے کر عثمانی خلافت کے اختتام تک کامل جدوجہد کے ساتھ اہل کوفہ کی تدریس و تربیت میں مشغول رہا۔ کوفہ کے لاتعداد قراء و فقہاء آپ کے سرچشمہ علم و فضل سے سیراب ہوئے۔ حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے فقہاء کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے تھے۔ آپ نے حضرت ابن مسعودؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

"تو نے اس بستی کو علم و فقہ سے بھر دیا۔"

آپ کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد چار ہزار تک پہنچ گئے تھے۔ یہ تمام لوگ کوفہ کے

تاباں و درخشاں ستارے تھے۔

جب حضرت علی اور دیگر کبار صحابہ کوفہ میں بس گئے تو اہل کوفہ کی تعلیم و تربیت میں اور ترقی ہوئی اس وقت حالت یہ تھی کہ کثرت محدثین و فقہاء اور ماہرین علوم القرآن و عربی لغت کے اعتبار سے پورے عالم اسلامی میں کوفہ کی نظیر نہ تھی۔ فصیح ترین عربی قبائل اور کبار صحابہ کے قیام اور بود و باش کی وجہ سے کوفہ کا شہر فصاحت و بلاغت میں بھی عدیم المثال تھا۔ اگر حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ کے کبار اصحاب و تلامذہ کے تراجم تحریر کیے جائیں تو اُن سے ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ عراق کے دیگر بلاد و دیار کو چھوڑ کر صرف کوفہ کے شہر میں ایک ہزار پانچ سو صحابہ کرام سکونت گزین تھے۔

مشہور تابعی مسروق بن اَجدع فرماتے ہیں:

"میں نے یوں پایا کہ اصحابِ محمدؐ کا علم مندرجہ ذیل چھ صحابہ پر ختم ہو جاتا ہے۔
حضراتؓ علی و عبدؓاللہ و عمرؓ و ابوالدرداءؓ و اُبَیؓ بن کعبؓ و زیدؓ رضی اللہ عنہم۔
پھر میں نے محسوس کیا کہ ان چھ صحابہ کا علم حضرت علی و ابن مسعودؓ میں محدود ہے۔" (حسن التقاضی)

جہاں تک امام ابو حنیفہ کے علمی سفر کا تعلق ہے آپ بصرہ و مدینہ میں دس دفعہ آئے۔ مکہ میں ۱۳۰ھ تا ۱۳۶ھ چھ سال مسلسل قیام فرمایا۔ مکہ و مدینہ میں رہ کر یہاں کے اکثر علماء اور بعض بیرونی فضلاء سے بھی ملے۔ مثلاً آپ امام اوزاعی سے ملے۔ آپ نے حضرت ابن عباس کا علم ان کے شاگردوں سے مکہ میں حاصل کیا اور حضرت عمر کا علم مدینہ میں ان کے تلامذہ سے سیکھا۔ آپ نے بعض آئمہ اہل بیت مثلاً زید بن علی زین العابدین محمد باقر اور ابو محمد بن عبداللہ بن حسن سے بھی استفادہ کیا۔ (مناقب ابی حنیفہ از مکی)

خطیب بغدادی نے تاریخ میں روایت کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ ایک دن خلیفہ منصور کے پاس تشریف لائے۔ وہاں عیسٰی بن موسٰی بھی تھے انہوں نے منصور سے کہا "یہ عصرِ حاضر کے سب سے بڑے عالم ہیں" خلیفہ منصور نے کہا "نعمان! آپ نے علم کس سے حاصل کیا؟" فرمایا "حضرت عمر و علی و ابن مسعود رضی اللہ عنہم کے اصحاب و تلامذہ سے، حضرت ابن عباس کے

زمانہ میں ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا۔ امام ابوحنیفہ نے ابن عباس کے تلامذہ سے بھی کسب فیض کیا تھا۔ منصور نے کہا "آپ نے اپنے اطمینان کا سامان مہیا کر لیا"

(تاریخ بغداد، ج ۱۴، ص ۳۳۴)

قابل غور بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ جیسا شخص جس نے مشہور ترین صحابہ کے علم کو اپنے سینہ میں جمع کر لیا ہو اس کے بارے میں یہ عذر کیوں کر صحیح ہے کہ وہ کوفہ کے قلیل الحدیث شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ حالاں کہ کوفہ حضرات صحابہ و علماء سے بھرپور تھا اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علی جیسے اکابر صحابہ وہاں توطن پذیر تھے۔

کیا امام ابوحنیفہ رائے کو حدیث سے مقدم سمجھتے تھے؟

ہم آپ کے اس فقہی ضابطہ پر روشنی ڈال چکے ہیں کہ جب صحیح حدیث موجود ہو اور وہ ثقہ راویوں کے یہاں مشہور بھی ہو۔ تو امام ابوحنیفہ اس کے ہوتے ہوئے کسی رائے قیاس یا استحسان کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ابن ابی العوام نے مسند میں قاضی ابویوسف سے روایت کیا ہے کہ:

"جب امام ابوحنیفہ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو پوچھتے کیا اس مسئلہ میں آپ کے یہاں کچھ آثار موجود ہیں؟ جب ہم وہ آثار بیان کر دیتے اور آپ اپنے اقوال ذکر کر چکتے تو دیکھتے اگر دونوں میں سے کسی قول کے بارے میں زیادہ آثار ہوتے تو اُن پر عمل کرتے۔ اگر دونوں طرف برابر آثار ہوتے تو اُن میں سے جو اُسے چاہتے منتخب کر لیتے" (تانیب الخطیب ص ۸۶)

موفق خوارزمی اپنی سند کے ساتھ سمرقندی کی "کتاب العالم والمتعلم" میں ابوحنیفہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

"جو بات سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہو، وہ ہم نے سنی ہو یا نہ سنی ہو، بسر و چشم تسلیم ہے۔ ہم اس پر ایمان لائے اور شہادت دیتے ہیں کہ وہ اسی طرح ہے جیسے آپ نے فرمائی"

ابن عبدالبر نے اپنی کتاب "الانتقاء" میں امام ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"رسول کریمؐ کی خلاف ورزی کرنے والے پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے۔ انہی کی وجہ سے

اللہ نے ہم کو عزت بخشی اور عذاب جہنم سے رہائی دلائی"۔

امام بیہقی نے المدخل میں عبداللہ بن مبارک سے نقل کیا ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہ کو فرماتے سنا کہ:

"جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات مروی ہو تو ہم بسر و چشم اس کو قبول کریں گے۔ جب صحابہ سے کوئی بات منقول ہو تو ہم اُس میں سے اپنا پسندیدہ قول منتخب کریں گے۔ جب تابعین سے کوئی قول منقول ہو تو ہم اُن کا مقابلہ کریں گے"۔ (مفتاح الجنۃ، ص ۳۱)

امام ابن عبدالبر نے محمد بن حسن شیبانی کا قول نقل کیا ہے:

"علم کی چار قسمیں ہیں۔ ان کے علاوہ دوسری کوئی قسم نہیں ہے۔

(۱) جو بات قرآن کریم میں مذکور ہو یا اس سے ملتی جلتی ہو۔

(۲) جو بات حدیث رسولؐ میں موجود ہو یا اس کے مماثل ہو۔

(۳) جس پر صحابہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہو یا اس سے ملتی جلتی ہوئی بات۔

(۴) وہ بات جس میں صحابہ کے یہاں اختلاف پیدا ہوا ہو اور اس کے کسی نہ کسی پہلو کے بارے میں کسی صحابی کا قول موجود ہو۔

اور اگر ان اقوال میں سے کسی قول کو منتخب کر لیا گیا ہو تو ہم پیش آنے والے مسائل کو اس پر قیاس کریں گے۔ (جامع بیان العلم، ج ۲۔ ص ۲۶ نیز اصول السرخسی، ج ۱ ص ۳۱۸)

امام شعرانی نے میزان میں مندرجہ ذیل اقوال امام ابوحنیفہ سے نقل کیے ہیں:

(۱)۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں وہ افترا پردازی سے کام لیتا ہے۔ نص کی موجودگی میں قیاس کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(۲)۔ ہم شدید ضرورت کے بغیر قیاس نہیں کرتے۔ ہم کسی مسئلہ کی دلیل کتاب و سنت یا فتاویٰ صحابہؓ میں تلاش کرتے ہیں جب وہاں کوئی دلیل نہیں ملتی تو ہم قیاس سے کام لیتے ہیں۔

(۳)۔ ہم پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتے ہیں، پھر حدیث رسول پر اور پھر صحابہ کے اجماعی فیصلہ جات پر اگر صحابہ مختلف الرائے ہوں تو ہم دو مسئلوں میں اتحاد علت کی بناء پر قیاس کرتے ہیں۔

(۴)۔ جو بات رسول کریمؐ سے مروی ہو وہ سر آنکھوں پر۔ میرے ماں باپ اُن پر فدا ہوں ہم آپؐ

کی مخالفت نہیں کر سکتے۔ جو بات صحابہ سے منقول ہو ہم اس ضمن میں اپنا پسندیدہ قول چن لیتے ہیں۔ اور جو بات صحابہ کے علاوہ دوسروں سے منقول ہو تو ہم بھی آدمی ہیں اور وہ بھی آدمی ہیں

(یہ چاروں اقوال میزان شعرانی ج ۱۔ ص ۵۱ سے ماخوذ ہیں)

امام محمد نے المبسوط میں ایک فصل اخبارِ آحاد سے اخذ و احتجاج کے سلسلہ میں منعقد کی ہے۔ اس ضمن میں آپ نے متعدد احادیث نبویہ اور عمل صحابہ سے استدلال کیا ہے۔ یہی دلائل امام شافعی نے اپنی کتاب "الرسالۃ" میں بیان کیے ہیں۔ ان دلائل سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ امام ابو حنیفہ حدیث کے مقابلہ میں رائے کو ترجیح نہیں دیتے تھے، خواہ وہ رائے کیسی اور کسی شخص کی بھی ہو۔ یہاں تک کہ امام ابن حزم جیسا شخص اس بات پر فقہائے عراق کا اجماع نقل کرتا ہے کہ حدیث ضعیف قیاس کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے۔

امام ابن قیم اعلامُ المُوَقِّعین میں لکھتے ہیں:

"اصحاب ابی حنیفہ کا اس امر پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ امام صاحب کے نزدیک ضعیف حدیث قیاس و رائے سے افضل ہے۔ فقہ حنفی کی اساس اسی پر رکھی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل مسائل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) جس حدیث میں قہقہہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ ضعیف ہے۔ تاہم امام صاحب نے اس کو قیاس پر ترجیح دی ہے۔

(۲) حالت سفر میں نبیذ کے ساتھ وضو کرنے کی اجازت پر مشتمل حدیث ضعیف ہے۔ تاہم آپ نے اس کو قیاس پر ترجیح دی ہے۔

(۳) جب چور دس درہم سے کم چرائے تو بقول ابو حنیفہ اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ حالانکہ اس میں وارد شدہ حدیث ضعیف ہے۔

(۴) امام ابو حنیفہ نے حیض کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک ضعیف حدیث کے مطابق دس دن مقرر کی ہے۔

(۵) ایک ضعیف حدیث کے پیش نظر آپ نے جمعہ کے لیے مصر کی شرط ٹھیرائی ہے۔

(۶) کنوئیں کے مسائل سے متعلق صرف غیر مرفوع آثار کی بنیاد پہ آپ نے قیاس کو چھوڑ دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ و احمد بن حنبل کی رائے میں حدیث ضعیف اور اقوالِ صحابہ کو قیاس کے مقابلہ میں ترجیح دی جاتی ہے۔ علمائے سلف جب کسی حدیث کو ضعیف کہتے ہیں تو اس کے وہ معنی نہیں ہوتے جو متاخرین کے یہاں مراد ہیں۔ بخلاف ازیں متاخرین جس حدیث کو حسن کہتے ہیں متقدمین اسی کو ضعیف کہہ دیتے ہیں؛ (اعلام ابن قیم)

میں کہتا ہوں کہ جن احادیث پر امام ابو حنیفہ نے اپنے مسلک کی بنیاد رکھی ہے اور وہ دیگر محدثین کے نزدیک خواہ علمائے سلف کی اصطلاح کے مطابق ضعیف ہی ہوں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ امام ابو حنیفہ کے یہاں بھی وہ ضعیف ہوں۔ بخلاف ازیں آپ کے اصولِ عامہ کے مطابق وہ احادیث صحیح ہوں گی۔ احادیث کی تصحیح و تضعیف میں اختلاف ایک طبعی امر ہے۔ ایک امام جس حدیث کو صحیح قرار دیتا ہے دوسرے کے نزدیک وہ صحیح نہیں ہوتی۔

بہرکیف احناف کی تردید میں سرگرم حصہ لینے والے ہر دو کا بر امام ابن حزمؒ ابن قیمؒ کا مندرجہ صدر بیان اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ امام ابو حنیفہ قیاس و رائے کے مقابلہ میں حدیثِ ضعیف کو ترجیح دیتے تھے۔ مزید براں ہم بیان کر چکے ہیں کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک مراسیل لائقِ احتجاج اور قیاس کے مقابلہ میں قابلِ ترجیح ہیں۔ امام شافعی چند شرائط کے ساتھ حدیثِ مرسل کو قبول کرتے ہیں جب کہ تمام محدثین بالاتفاق اس سے احتجاج نہیں کرتے۔ مراسیل کے بارے میں جناب امام نے جو موقف اختیار کیا ہے اس سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ آپ قیاس کی پناہ اس وقت لیتے ہیں جب کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے اور کوئی قابلِ اعتماد حدیث و اثر موجود نہ ہو۔ پھر یہ بات کیونکر درست ہو سکتی ہے کہ آپ حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح دیتے تھے؛

خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں متعدد راویوں سے نقل کرتے ہیں کہ وہ چند احادیث لے کر امام ابو حنیفہ کے یہاں گئے مگر آپ نے قبول نہ کیا۔ خطیب بغدادی یوسف بن اسباط سے

روایت کرتے ہیں کہ ابو حنیفہ نے چار صد سے زائد احادیث کو رد کر دیا۔ اس نے چار سو میں سے صرف چار حدیثیں ذکر کیں۔ خطیب نے وکیع کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"امام ابو حنیفہ ۔ دو صد احادیث کی مخالفت کی۔"

حماد بن سلمہ کہتے ہیں:

"ابو حنیفہ احادیث و آثار کو اپنی رائے کے مقابلہ میں ٹھکرا دیا کرتے تھے۔"

ان اقوال کی نسبت ان کے قائلین کی جانب صحیح ہو یا غلط، یہ حقیقت کہ ان میں سے بعض آپ کے شاگرد اور رفیق بھی تھے، اس امر کو واضح کرتی ہے کہ یہ اقوال آپ کے فرمودہ نہیں ہیں۔ بلاشبہ آپ کے بعض معاصر محدثین آپ پر یہ تنقید کرتے تھے کہ جو آثار ان کے نزدیک صحیح ہیں ابو حنیفہ ان کو رد کر دیتے ہیں۔

محدث ابن ابی شیبہ نے امام ابو حنیفہ پر یہ حرف گیری کی ہے کہ آپ نے ایک سو پچیس مسائل میں حدیث کی خلاف ورزی کی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ امام صاحب نے ایسا کیوں کیا؟ حالانکہ امام شافعی نے اس بات پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے حدیث صحیح کی مخالفت جائز نہیں۔ خود امام ابو حنیفہ نے فرمایا تھا:

"جو بات آنحضور سے منقول ہو سر آنکھوں پر۔"

اس کا جواب حسب ذیل ہے:

(۱) کسی حدیث کی تصحیح و تضعیف میں بعض اوقات مختلف خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایک محدث مثلاً ابو حنیفہ ایک راوی کو عادل و ثقہ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ دوسروں کے نزدیک وہ مجروح ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امام ابو حنیفہ نے اپنے جن شیوخ سے استفادہ کیا وہ ان کو ان محدثین سے بہتر جانتے تھے جنہوں نے اگلے ادوار میں ان کو ہدف تنقید بنایا۔ وہ زمانہ کے اعتبار سے بھی متقدم تھے۔ بسا اوقات ان کے اور صحابی کے درمیان صرف دو راویوں کا واسطہ ہوتا ہے۔ اندریں حالات قرب عہد کی وجہ سے وہ ان دو راویوں پر آسانی کے ساتھ جرح کر سکتے ہیں۔ نیز اس لیے کہ ان کے جاننے

والے لوگ بھی اس وقت موجود تھے جن سے امام ابوحنیفہ ان کے بارے میں دریافت کر سکتے تھے۔ البتہ حجاز و شام کے وہ راوی جو آپ کے استاذ نہ تھے ان کے معاملے میں اکثر توقف کیا جاتا ہے۔

ان کے بارے میں ایسے نظریات کا اظہار بھی کیا جاتا ہے جو ان کے تلامذہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے بعض ایسی احادیث پر عمل نہیں کیا جو دوسروں کے نزدیک صحیح تھیں۔ اسی طرح دیگر محدثین نے بعض ایسی احادیث کو متروک العمل ٹھیرایا جو امام صاحب کے نزدیک صحیح تھیں۔

(۲) بعض اوقات ایک حدیث ایک مجتہد اور دیگر محدثین کے نزدیک صحیح ہوتی ہے۔ مگر مجتہد کسی دوسری دلیل کی وجہ سے اس کو ظاہر پر محمول نہیں کرتا۔ یا کسی پوشیدہ علت یا اس سے قوی تر معارض دلیل کی بنا پر اس پر عمل کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ یا راوی کے وہم کا اعتقاد رکھتا ہے۔ یا حدیث کو منسوخ قرار دیتا یا عام کی تخصیص اور مطلق کی تقیید کا قائل ہو کر اس پر عمل کرنا ترک کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محدثین اور دوسرے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ حدیث متروک العمل ہے۔ لیث بن سعد نے امام مالک کو جو خط لکھا تھا اس میں ستر احادیث صحیحہ گنائی تھیں جن کو امام مالک نے متروک العمل ٹھیرایا تھا۔ حالانکہ وہ احادیث مؤطا میں مندرج ہیں۔ (جامع بیان العلم، ج ۱، ص ۱۴۸)

شاذ و نادر ہی کوئی امام ایسا ہوگا جس نے اپنے نزدیک ثابت شدہ احادیث کو دیگر دلائل کے پیش نظر ترک نہ کیا ہو۔ ایک محدث نہ ایسے مقامات سے واقف ہو سکتا ہے اور نہ ان کے راز سے آگاہ و آشنا ہو سکتا ہے۔ اس لیے امام ابوحنیفہ نے محدث اور فقیہ کے مابین یہ فرق و امتیاز روا رکھا ہے کہ:

"جو شخص احادیث کا طالب ہو مگر ان کے فہم و ادراک پر قادر نہ ہو اس کی مثال اُس عطار کی ہے جو ادویہ جمع کرتا ہو اور جانتا نہ ہو کہ یہ کس کس مرض کے لیے ہیں۔ حتیٰ کہ طبیب آکر اس کو آگاہ کرتا ہے۔ اسی طرح محدث بھی احادیث سے بہرہ ور نہیں ہوتا اور فقیہ اُسے آکر سمجھاتا ہے۔" (مناقب ابی حنیفہ از موفق مکی۔ ج ۲۔ ص ۹۱)

اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جس کو ابن عبد البر نے قاضی ابو یوسف کے بارے میں نقل کیا ہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں اعمش نے مجھ سے ایک مسئلہ پوچھا۔ ہم دونوں تنہا تھے۔ میں نے اس کا جواب دے دیا۔ اعمش نے کہا "اس کی دلیل کیا ہے"؟ میں نے کہا وہی حدیث جو آپ نے مجھے سنائی تھی۔ پھر میں نے وہ حدیث بیان کر دی۔ اعمش نے کہا "یہ حدیث مجھے اس وقت سے یاد ہے جب آپ ہنوز پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس کا مطلب آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔

ابن عبد البر نے اپنی سند کے ساتھ عبید اللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ میں اعمش کی مجلس میں موجود تھا۔ ایک شخص نے آپ سے ایک مسئلہ پوچھا۔ اعمش نے کوئی جواب نہ دیا دیکھا تو ابو حنیفہ موجود تھے۔ کہا "نعمان! اس کا جواب دیجیے"۔ آپ نے جواب دے دیا۔ اعمش نے کہا "اس کی دلیل کیا ہے"؟ فرمایا "وہی حدیث جو آپ نے مجھے سنائی تھی"۔ اعمش نے کہا "ہم عطار ہیں اور آپ طبیب"۔ (جامع بیان العلم ج ۲۔ ص ۱۳۱)

۳۔ اس حقیقت سے مجالِ انکار نہیں کہ بعض احادیث امام ابو حنیفہ تک نہ پہنچ سکیں اور آپ کی نگاہ سے پوشیدہ رہیں۔ اس لیے کہ صحابہ شہروں میں بٹ گئے تھے۔ ایک شہر والوں کے پاس جو احادیث تھیں وہ دوسروں کے پاس نہ تھیں۔ صحابہ و تابعین کے عصر و عہد میں اور ان کے بعد کسی شخص نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ جملہ احادیث پر حاوی ہے۔ امام شعبی کے پاس ایک نوجوان آیا۔ اس نے بات چیت کی تو شعبی نے کہا "ہم نے یہ بات کبھی نہیں سنی"۔ نوجوان نے کہا "کیا آپ نے سب علمی باتیں سن لی ہیں"؟ شعبی نے کہا "نہیں"۔ نوجوان نے کہا "تو کیا آپ نے نصف علم کا احاطہ کیا ہے"؟ شعبی نے کہا "نہیں"۔ نوجوان نے کہا "تو پھر اس کو بھی نصف ثانی میں شامل کر لیجیے جو آپ نے نہیں سنا"۔ (تدریب الراوی، ص ۱۰۸)

یہ حقیقت ہے کہ قربِ عہد کے باوصف چند جلیل القدر صحابہ کو بعض احادیث کا علم حاصل نہ ہو سکا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مجوس پر جزیہ عائد کرنے سے متعلق حدیث اور حرمتِ ربا پر مشتمل حدیث کا پتہ نہ چل سکا۔ یہاں تک کہ حضرتِ عبد الرحمٰن بن عوف

نے ان کو دونوں حدیثوں سے آگاہ کیا۔

(۲) اسی طرح جناب فاروق رضؓ کو کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اجازت سے متعلق حدیث کا پتہ نہ چلا اور حضرت ابو موسیٰ اشعری ؓ نے اُس کا احساس دلایا۔

(۳) جناب فاروق و ابن مسعود رضی اللہ عنہما کو تیمم پر مشتمل حدیث کا پتہ نہ چل سکا اور حضرت عمار بن یاسر اور دیگر صحابہ اس سے واقف تھے۔

(۴) حضرت عائشہ ؓ و ابن عمرؓ و ابو ہریرہ ؓ حدیث مسح سے بہرہ ور نہ تھے جبکہ حضرت علیؓ و حذیفہ ؓ اس سے آگاہ تھے۔

(۵) حضرت عمرؓ اور زید بن ثابتؓ اس مسئلہ سے باخبر نہ تھے کہ حائضہ دورانِ حج آخری طواف سے پہلے جا سکتی ہے۔ حالانکہ ابن عباسؓ اور ام سُلیمؓ اس کو جانتے تھے۔

(۶) حضرت ابن عباس ؓ نکاحِ متعہ کی حرمت سے واقف نہ تھے۔ اور صحابہؓ نے آپ کو اس سے آگاہ کیا۔

(۷) حضرت طلحہ و ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سونے چاندی کی بیع سے متعلق حدیث سے بے بہرہ تھے۔ جب کہ حضرت عمرؓ و ابو سعید و دیگر صحابہ اسے جانتے تھے۔

(الاحکام ابن حزم، ج ۲ - ص ۱۲۷)

ایسے واقعات عہد صحابہ میں بکثرت وقوع پذیر ہوئے، مگر کسی نے ان پر حرف گیری نہ کی اور نہ کسی نے یہ کہا کہ یہ لوگ حدیث رسول سے ناواقف ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ انہوں نے حدیث معلوم ہونے سے قبل اس کے خلاف فتویٰ دے دیا۔ جب صحابہ سے ایسی غلطیاں صادر ہو سکتی ہیں تو امام ابو حنیفہ اس امر کے زیادہ مستحق ہیں کہ آپ کو معذور قرار دیا جائے۔

(۴) چونکہ امام جلیل کے عصر و عہد میں حدیث نبوی میں دروغ گوئی کا آغاز ہو گیا تھا اس لیے آپ نے خدا کے دین میں حزم و احتیاط کے پیش نظر قبولیت حدیث کے لیے کڑی شرطیں عائد کیں اور مقابلۃً سختی سے کام لیا۔ آپ کی عائد کردہ شرائط حسب ذیل ہیں۔

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ حدیث ان اصول و ضوابط کے خلاف نہ ہو جو شرعی مآخذ کی چھان بین کے بعد آپ نے مقرر کیے تھے۔ جب خبر واحد ان سے معارض ہو گی تو اُسے چھوڑ کر دونوں

دلیلوں میں سے جو اقویٰ ہے اس پر عمل کیا جائے گا۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ حدیث ظواہر کتاب اور اس کے عمومات سے متصادم نہ ہو۔ جب حدیث ان کے خلاف ہو گی تو ظاہر کتاب پر عمل کیا جائے گا اور حدیث متروک العمل ٹھہرے گی۔ البتہ جب حدیث کسی مجمل قرآنی حکم کی وضاحت کرے یا جدید حکم کی تصریح پر مشتمل ہو تو اس پر عمل کیا جائے گا۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ حدیث کسی قولی یا فعلی حدیثِ مشہور کے خلاف نہ ہو۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ کسی اپنی ہم مرتبہ حدیث کے خلاف نہ ہو۔ اگر دونوں باہم متعارض ہوں گی تو ان میں سے ایک کو ترجیح دی جائے گی۔ مثلاً دونوں راوی صحابہ میں سے ایک فقیہ زیادہ ہو یا ایک فقیہ اور دوسرا غیر فقیہ ہو یا ایک نوجوان اور دوسرا بوڑھا ہو۔ کیوں کہ اس میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے، اس لیے حدیثِ مرجوح کے مقابلہ میں راجح پر عمل کیا جاتا ہے۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ راوی کا عمل اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً ابوہریرہؓ کی یہ روایت کہ جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال دے تو اُسے سات مرتبہ دھویا جائے۔ یہ ان کے اپنے فتویٰ کے خلاف ہے۔

(۶) حدیث کے متن یا سند میں کوئی ایسا اضافہ نہ ہو جو کسی دوسری روایت میں موجود نہ ہو۔

(۷) حدیث کا تعلق کسی ایسے معاملہ سے نہ ہو جو لوگوں میں کثیر الوقوع ہو۔ اس لیے کہ اندریں صورت حدیث کا مشہور یا متواتر ہونا ضروری ہے۔

(۸) جب کسی مسئلہ میں دو صحابہ کے یہاں اختلاف پایا جاتا ہو تو دونوں میں سے ایک نے اس حدیث کے ساتھ احتجاج کرنا ترک نہ کر دیا ہو جس کو ان میں سے ایک نے روایت کیا ہو۔ اس لیے کہ اگر وہ حدیث ثابت ہوتی تو اُن میں سے ایک ضرور اس سے احتجاج کرتا۔

(۹) علمائے سلف میں سے کسی نے اس حدیث پر تنقید نہ کی ہو۔

(۱۰) جب حدود و عقوبات کے بارے میں روایات مختلف ہوں تو اس روایت کو معمول بہا بنایا جائے جس میں خفیف سزا کا حکم دیا گیا ہو۔

(۱۱) ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ راوی نے جب کوئی حدیث سُنی ہو اس وقت سے لے کر
اس کو آگے پہنچانے تک وہ حدیث اسے یاد رہی ہو اور درمیان میں وہ اسے بھول
نہ گیا ہو۔

(۱۲) صحابہ و تابعین اس حدیث پر بلا تخصیص دیار و بلاد عامل رہے ہوں۔

(۱۳) راوی اپنی تحریر کی بجائے اپنے حافظہ پر اعتماد کرے۔

یہ ہیں وہ شرائط جو امام ابوحنیفہ نے خبر واحد کی صحت اور اس کے معمول بہ ہونے کے لیے ضروری قرار دیے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ محدثین مذکورہ صدر شرائط میں سے اکثر میں آپ کے ساتھ متفق نہیں۔ دیگر ائمہ بعض شرائط میں آپ کے خلاف ہیں۔ ہم یہاں نہ آپ کے نظریات کا دفاع کرنا چاہتے ہیں اور نہ آپ کی نصرت و حمایت کے درپے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف یہ بیان کرنا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے بعض اخبارِ آحاد پر عمل کیوں نہیں کیا۔

مندرجہ صدر بیانات اس صداقت کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ پر یہ الزام کہ آپ حدیث کو چھوڑ کر رائے پر عمل کرتے تھے اگر بنا بر اجتہاد تھا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں متقدمین و متاخرین اس طرح کرتے چلے آئے ہیں۔ اور اگر یہ ہوائے نفس اور ضد و عناد کی بناء پر تھا تو یہ بات ہرگز ممکن نہیں کہ امام ابوحنیفہ جیسا شخص اس امر کا مرتکب ہوتا۔ حالاں کہ آپ کا ورع و تقویٰ اور آپ کی اطاعت و انقیاد شک و شبہ سے بالا ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نقطۂ فکر و نظر کی چند مثالیں :

ذیل میں ہم آپ کے اجتہاد کی چند امثلہ بیان کرتے ہیں، جن میں آپ نے بظاہر بعض احادیث کی خلاف ورزی کی ہے :

(۱) ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کی ملاقات ہوئی تو آپس میں یوں تبادلۂ افکار کرنے لگے :۔

اوزاعی :۔ آپ رکوع کو جاتے اور اس سے اُٹھتے وقت رفع الیدین کیوں نہیں کرتے ؟

ابوحنیفہ :۔ اس لیے کہ اس ضمن میں کوئی صحیح حدیث وارد نہیں ہوئی۔

اوزاعی :۔ آپ یہ کیا فرما رہے ہیں، مجھے زہری نے سالم سے اور اس نے اپنے باپ سے سُن کر

بتایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز شروع کرتے وقت رکوع کو جاتے اور اس سے اُٹھتے وقت رفع الیدین کیا کرتے تھے۔

ابو حنیفہ:۔ مجھے حماد نے ابراہیم نخعی سے اس نے علقمہ و اسود سے اور انہوں نے عبداللہ بن مسعودؓ سے سن کر بتایا کہ رسول کریم صرف نماز شروع کرتے وقت ہاتھ اُٹھاتے تھے اور پھر نہیں اُٹھاتے تھے۔

اوزاعی:۔ میں آپ کو زھری، سالم اور ابن عمر جیسے راویوں کی نقل کردہ حدیث سناتا ہوں اور آپ حماد اور ابراہیم نخعی کا نام لیتے ہیں۔

ابو حنیفہ:۔ حماد زھری سے بڑے فقیہ تھے۔ ابراہیم نخعی سالم سے بڑھ کر فقہ دان تھے اور علقمہ عبداللہ بن عمر سے کم نہ تھے۔ اگرچہ ابن عمر صحابی تھے تاہم اسود بھی بڑے پایہ کے آدمی تھے۔ اور دوسری روایت میں یوں مذکور ہے کہ ابراہیم نخعی سالم سے فقیہ تر تھے۔ اگر ابن عمر صحابی نہ ہوتے تو میں کہتا کہ علقمہ عبداللہ بن عمر سے بڑے فقیہ تھے۔ اور عبداللہ بن مسعود تو آخر عبداللہ بن مسعود ہیں۔ یہ سن کر اوزاعی خاموش ہو گئے۔ (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱-ص ۳۲۱)

(۲) ۔ سفیان بن عیینہ ابو حنیفہ سے ملے اور پوچھا کیا آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ جب بائع اور مشتری سودا کی بات چیت چھوڑ کر کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں تو سودا پکا ہو جاتا ہے اور ان کو سودا فسخ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ اگرچہ وہ ایک ہی جگہ مقیم ہوں؟ امام ابو حنیفہ نے کہا "جی ہاں!" سفیان نے کہا "آپ اس حدیث کی مخالفت کیوں کر کرتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا کہ جب تک بائع و مشتری جدا نہ ہوں ان کو بیع فسخ کرنے کا اختیار ہے" امام ابو حنیفہ نے کہا "بتائیے اگر بائع و مشتری کسی کشتی یا قید خانہ یا سفر میں ہوں تو پھر کیوں کر الگ ہوں گے؟

آپ دیکھ رہے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث کو رد نہیں کیا بلکہ جدا ہونے سے موضوع کلام میں تبدیلی مراد لی ہے جسمانی طور پر الگ ہونا مراد نہیں لیا۔ امام ابو حنیفہ نے حدیث کا جو مفہوم مراد لیا ہے۔ اس میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ دو شخص جو ایک ہی کشتی میں سفر کر رہے ہوں یا باہم رفیق سفر ہوں یا ایک ہی قید خانہ میں ہوں سب اس میں شامل ہیں۔ ایسے اشخاص باہم کئی

کئی دن اور کئی ماہ تک یکجا رہتے ہیں تو کیا ان کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ جب تک وہ ایک ہی جگہ میں مقیم ہیں ان کا سودا پختہ نہیں ہوا اور وہ جب چاہیں اس کو فسخ کر سکتے ہیں ؟

تفرق (علحدگی) کا لفظ کتاب و سنت میں موضوع سخن کی تبدیلی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو تھام لو اور علحدگی اختیار نہ کرو۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِفْتَرَقَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰى۔ یہود و نصاریٰ جُدا جُدا ہو گئے۔

اس استنباط میں جو شخص امام ابو حنیفہ کی دِقّت آفرینی و ژرف نگاہی پر غور نہیں کرتا وہ یہ پکار اُٹھے گا کہ امام صاحب یہ فتوی دیتے ہیں کہ بائع و مشتری اگر ایک ہی مجلس میں بیع کو پکا کر دیں تو انہیں فسخ کا اختیار باقی نہیں رہے گا۔ اندریں صورت وہ فی الفور یہ فیصلہ صادر کر دے گا کہ امام صاحب نے حدیث کی خلاف ورزی کی۔ حالانکہ دراصل معاملہ یوں نہیں ہے۔

(۳) محدث ابن ابی شیبہ نے جناب امام کو جن اعتراضات کی آماجگاہ بنایا ہے ان میں ایک وہ حدیث ہے جو ابن ابی شیبہ نے بسند خود محمد بن نعمان بن بشیر سے روایت کی ہے کہ ان کے والد نعمان نے ان کو ایک غلام عطا کیا اور آنحضور کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو اس پر گواہ بنانے کی استدعا کی۔ سرکار دو عالم نے فرمایا: کیا آپ نے اپنے ہر بیٹے کو ایک ایک غلام هدیہ کیا ہے ؟ نعمان نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا تو پھر یہ بھی واپس لے لو۔ ابن ابی شیبہ نے اس حدیث کو دو مختلف سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور ان کے الفاظ بھی ایک جیسے نہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں "امام ابو حنیفہ کا قول ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں"۔

علامہ کوثری اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نعمان بن بشیر کی روایت کردہ حدیث کے الفاظ باہم دیگر اس قدر مختلف ہیں کہ فقہاء کے لیے اس میں اجتہاد کی گنجائش نکل آتی ہے۔ چنانچہ جمہور فقہاء کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ اولاد کو عطیہ میں مساوی رکھنے کا حکم بنا بر استحباب ہے فرض و واجب کے

مدعبہ میں نہیں - امام مالک شافعی لیث ثوری ، ابو حنیفہ کا مسلک یہی ہے - ان کے
نزدیک عطیہ دینے میں سب اولاد کی مساوات ضروری نہیں - البتہ بعض اس کو
ناپسند کرتے ہیں - مساوات سب کے نزدیک ایک پسندیدہ امر ہے - بعض علماء
حدیث کے ظاہر الفاظ کے پیش نظر مساوات کو واجب قرار دیتے ہیں ، عبداللہ
بن مبارک ، امام احمد اور ظاہر یہ اسی کے قائل ہیں - پہلے اسحاق بھی ان کے
ہم خیال تھے پھر جمہور کے ہمنوا بن گئے - علماء کا اس بات پر اجماع کہ ایک شخص اپنا
مال اجنبی کو دے سکتا ہے جمہور کی رائے کا مؤید ہے - جب نص میں احتمال
پیدا ہو جائے تو وہ نص ہی نہیں - اس لیے یہ قول بے معنی ہے کہ "موردِ اجتہاد
میں قیاس کا کوئی امکان نہیں ہوتا "

محدث بیہقی نے اس بات کی تائید میں دس وجوہ بیان کیے ہیں کہ مساوات کا حکم استحباب
پر مبنی ہے - اگرچہ بعض وجوہ دیگر علماء کے نزدیک مخدوش ہیں -

مذکورہ صدر حدیث میں مساوات کے وجوب و ندب کے سلسلہ میں فقہاء کے مابین جو اختلاف
رونما ہوا ہے ، اس کی بڑی وجہ اس کے الفاظ کا فرق و اختلاف ہے - اس کے بعض الفاظ سے
ندب و استحباب کا اثبات ہوتا ہے اور بعض الفاظ وجوب پر دلالت کرتے ہیں - قاضی عیاض
مالکی فرماتے ہیں :

"اس ضمن میں وارد شدہ احادیث میں جمع و تطبیق کی کوشش کرنا اس بات سے
زیادہ موزوں ہے کہ کسی روایت کو بالکل ہی رد کر دیا جائے یا اسے مضطرب کہا
جائے - تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جملہ روایات کو استحباب پر محمول کیا جائے "

قاضی صاحب نے اپنی شرح صحیح مسلم میں ان احادیث کو استحباب پر محمول کرنے کی وجہ بھی بیان کی ہے -

موضوع زیر قلم کے سلسلہ میں ہم مزید کسی تفصیل کی حاجت نہیں سمجھتے - اس لیے کہ اس مسئلہ
میں امام ابو حنیفہ منفرد نہیں ہیں بلکہ جمہور فقہاء آپ کے ہمنوا ہیں - امام شافعی نے تصریح کی ہے ، کہ
حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اور حضرت عمرؓ نے عاصم کو عطیہ جات کے سلسلہ میں دیگر اولاد
پر ترجیح دی تھی - دیگر صحابہ سے بھی یہ فعل ثابت ہے - ان کا یہ اقدام اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ

مسادات کا حکم استحباب پر محمول ہے۔ (النکت الطریفہ، ص ۲۱-۲۲)

محدث ابن ابی شیبہ نے امام ابو حنیفہ کو جن ایک سو پچیس[125] اعتراضات کا نشانہ بنایا اور یہ ثابت کرنا چاہا تھا کہ ان مسائل میں امام نے حدیث نبوی کو ترک کر دیا ہے یہ ان میں سے ایک مثال ہے۔ ہمارے جواب سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ جناب امام نے رائے کو ترجیح دے کر حدیث کو ترک نہیں کیا بلکہ اپنے اجتہاد پر اعتماد کیا تھا۔ اس ضمن میں آپ کو اسی طرح معذور قرار دینا چاہیے جس طرح ہر مجتہد کو اس کے اجتہاد کے بارے میں۔

یہ امر بھی نظر انداز نہ کیا جائے کہ بقول محدث ابن ابی شیبہ امام ابو حنیفہ نے جن مسائل میں اپنے اجتہاد کی اساس پر حدیث کی مخالفت کی تھی اس میں وہ منفرد نہیں ہیں بلکہ جمہور ائمہ میں سے کسی ایک یا زیادہ اماموں نے آپ کی حمایت کی ہے۔

امام ابو حنیفہ کا علمی حلقہ :

اجتہادِ مسائل کے ضمن میں امام ابو حنیفہ کا اپنے تلامذہ کے ساتھ جو طرز و انداز تھا۔ جو شخص اس سے آگاہ ہے وہ یقین رکھتا ہے کہ آپ جیسے شخص کی طرف ایسی باتوں کی نسبت کسی طرح درست نہیں۔

مغیرہ بن حمزہ کا قول ہے کہ امام ابو حنیفہ کے جن تلامذہ نے آپ کے ساتھ مل کر کتبِ فقہ مرتب کی تھیں وہ چالیس آدمی تھے، اور وہ سب عظیم الشان تھے۔

اسد بن فرات کہتے ہیں کہ ان چالیس[40] اشخاص میں سے دس آدمی اخص الخواص تھے۔ ان[10] دس میں قاضی ابو یوسف زُفر داؤد طائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد اور یحیٰی بن زکریا بن ابی زائدہ جیسے فضلاء شامل تھے۔ یحییٰ تیس[30] سال تک یہ مسائل لکھتے رہے۔ اسد بن فرات کا بیان ہے کہ امام ابو حنیفہ سے کسی سوال کا جواب طلب کیا جاتا تو مختلف تلامذہ اس کا جواب دیتے پھر آپ سے دریافت کیا جاتا تو آپ برجستہ فتویٰ دیتے۔ تین روز تک اس مسئلہ پر بحث جاری رہتی۔ پھر اس کو رجسٹر میں قلمبند کر لیا جاتا۔

اسحاق بن ابراہیم کا بیان ہے کہ اصحابِ ابی حنیفہ آپ کے ساتھ مل کر زیر بحث مسئلہ پر غور کرتے۔ اگر عافیہ بن یزید موجود نہ ہوتے تو امام صاحب فرماتے جب تک عافیہ آنہ جائیں نقدو

بحث کو جاری رکھیے۔ جب عافیہ آتے اور ان کے ہم خیال ہوتے تو ابو حنیفہ فرماتے اس مسئلہ کو درج کر لو۔ اور اگر متفق نہ ہوتے تو فرماتے اس مسئلہ کو تحریر نہ کیجیے۔

یحییٰ بن نعیم معرفۃ التاریخ والعلل میں فضل بن دُکین سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے زُفر سے سُنا وہ کہتے تھے ہم امام ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ہمارے ہمراہ قاضی ابو یوسف اور محمد بن حسن بھی ہوتے تھے۔ ہم ان سے مسائل سن کر لکھ لیا کرتے تھے۔ زُفر کا بیان ہے کہ ایک دن امام ابو حنیفہ نے ابو یوسف سے کہا یعقوب! جو بات تم مجھ سے سنتے ہو وہ لکھ نہ لیا کرو آج میری ایک رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے ترک کر دیتا ہوں۔ اور کل ایک رائے قائم کرتا ہوں اور پرسوں اس سے رجوع کر لیتا ہوں۔

مذکورہ صدر بیان سے امام ابو حنیفہ کے سیرت نویس الموفق مکی کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے فقہی مسلک کی بنا شورائی پر رکھی تھی اور لوگوں پر اپنی رائے ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تاکہ دین اسلام کی بنیاد اللہ و رسول کے ساتھ اخلاص اور اہل ایمان کے ساتھ ہمدردی و تعاون پر رکھی جائے۔ (حسن التقاضی، ص ۱۲)

اس سے خطیب بغدادی کے بیان کا انجو بہ پن بھی عیاں ہوتا ہے۔ خطیب نے ابن کرامہ سے نقل کیا ہے کہ ہم ایک روز وکیع کے پاس بیٹھے تھے۔ ایک آدمی نے کہا "ابو حنیفہ سے غلطی سرزد ہوئی" وکیع نے کہا "ابو حنیفہ کیوں کر غلطی کر سکتے ہیں؟ ان کے ساتھ ابو یوسف اور زُفر جیسے ماہر قیاس و اجتہاد یحییٰ ابن ابی زائدہ حفص بن غیاث حبّان اور مندل جیسے حفاظ حدیث قاسم ابن معن جیسے لغوی و ادیب اور داؤد طائی و فضیل جیسے اصحاب زہد و ورع موجود ہیں جس کے ہم نشین اس قسم کے ارباب کمال ہوں اس سے غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ اور اگر بفرض محال غلطی ہو بھی جائے تو وہ اس کی تردید کر دیں گے۔ (تاریخ بغداد، ج ۱۴۔ ص ۴۷)

ہم اس ضمن میں وکیع کے ہمنوا نہیں ہیں کہ ابو حنیفہ سے غلطی کا صدور محال ہے۔ البتہ ہم اس بات میں ان کے ساتھ متفق ہیں کہ اس قسم کے ارباب دانش و بصیرت جس شخص کے مشیر ہوں جو شخص عہد صحابہ سے چنداں دور نہ ہو۔ جو شخص روشن دماغ اور خدا کے دین میں حد درجہ کوشاں ہو۔ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اس کے خلاف بلاوجہ حملہ کا آغاز کیا جائے جیسا کہ اس دور میں ہوا

اقران و اماثل رشک کرنے لگے۔ راویوں نے جہالت کا ثبوت دیا اور ظن و تخمین سے کام لینے والوں نے اس پر اور بھی ستم ڈھایا۔ پھر یہ فتنہ بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ فتنہ خلق قرآن کے ختم ہونے کے بعد اپنی انتہاء کو پہنچ گیا۔

ہُوا یوں کہ اکثر محدثین نے ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کو تنقید شدید کا نشانہ بنایا۔ معتزلہ نے محدثین پر جو ظلم ڈھائے تھے اس کا انتقام انہوں نے ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب سے لیا اور نقد و جرح کے تیروں سے ان کو گھائل کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جمہور معتزلہ فروعی مسائل میں فقہ حنفی کے پیرو تھے۔ یہ ہیں ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب پر قدیم و جدید حملہ کے اسباب و وجوہ!

خطیب بغدادی فرماتے ہیں:

"امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب میں سے ابویوسف محمد بن حسن زفر اور کسی اور نے بھی خلق قرآن کے بارے میں گفتگو نہیں کی تھی۔ خلق قرآن کے بارے میں گفتگو کرنے والے بشر مریسی اور ابن ابی داؤد وغیرہ تھے اور انہوں نے ہی اصحاب ابی حنیفہ کو بدنام کیا۔" (تاریخ بغداد، ج ۱۳۔ ص ۳۳۷)

انصاف کی بات:

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے جو بات اپنی کتاب "جامع بیان العلم" میں تحریر کی ہے وہ مجھے بہت پسند ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اصحاب الحدیث نے امام ابوحنیفہ کی مذمت میں مبالغہ آمیزی سے کام لیا اور اس ضمن میں حد سے تجاوز کر گئے۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ رائے و قیاس کو دلائل و آثار کے مقابلہ میں ترجیح دیتے تھے۔ حالانکہ اکثر اہل علم کہتے ہیں جب اثر صحیح موجود ہو تو قیاس باطل ٹھہرتا ہے" آپ تاویل کی بناء پر اخبار آحاد کو رد کر دیا کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے بعض پیش رو بھی ایسا کر چکے تھے اور دیگر اہل الرائے بھی آپ کے نقش قدم پر گام زن ہوئے۔ آپ نے زیادہ تر یہ اقدام اپنے اہل شہر کی پیروی میں کیا۔ مثلاً ابراہیم نخعی اور اصحاب ابن مسعود اسی ڈگر پر گامزن تھے۔ مگر آپ اور آپ کے اصحاب نے مفروضہ حوادث و نوازل کے گھڑنے اور ان کا

جواب دینے میں اغراق و مبالغہ سے کام لیا۔ نتیجہ کے طور پر اس میں اختلاف رونما ہوا اور ان کے مخالفین نے اس کو بدعت قرار دیا۔

میرے علم کی حد تک اہلِ علم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے کسی آیت کی خاص تاویل یا حدیثِ نبوی میں کسی خاص مسلک و مذہب کے پیشِ نظر کسی اور سنت کو بنا بر تاویل یا ادّعاءِ نسخ ردّ نہ کر دیا ہو۔ صرف اتنا فرق ہے کہ دوسروں کے یہاں یہ بات کم ہے اور . . . . امام ابو حنیفہ کے یہاں زیادہ۔ ابن عبدالبرؒ نے بتایا ہے کہ بقول لیث امام مالک نے بھی بہت سی احادیث کی خلاف ورزی کی تھی۔ علمائے اُمت میں سے کسی کا یہ حق نہیں ہے کہ جب اس کے نزدیک کوئی حدیث ثابت ہو جائے تو وہ اُسے ردّ کر دے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ وہ اس کے منسوخ ہونا کا دعویٰ کرے۔ یا اس کی سند کو مخدوش قرار دے یا ایسے عمل کی وجہ سے اس کو ردّ کر دے جس کی اطاعت ضروری ہو۔

جو شخص بلا دلیل کسی حدیث کو ردّ کر دے وہ ساقط العدالت ہو جاتا ہے۔
اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ایسے شخص کو امامت کے منصب پر سرفراز کیا جائے۔ ایسا شخص لازماً فاسق ٹھہرے گا۔ امام ابو حنیفہ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ فرقہ مرجیہ میں سے تھے۔"

(جامع بیان العلم، ج ۲۔ ص ۱۴۸)

میں کہتا ہوں آپ کا مُرجیہ ہونا اتباعِ سنت کے عین مطابق ہے۔ بہت سے اہلِ علم مُرجیہ کہلاتے تھے۔ مگر کسی کی مذمت اس طرح نہیں کی گئی جس طرح آپ کی۔ اس کی وجہ صرف آپ کی امامت تھی۔ اسی کے پیشِ نظر آپ کو حاسدانہ نگاہوں سے دیکھا جاتا اور وہ باتیں آپ کی جانب منسوب کی جاتی تھیں۔ علماء کی ایک جماعت نے آپ پر مدح و ستائش کے پھول نچھاور کیے ہیں۔

ابن عبدالبر امام ابو حنیفہ کے بارے میں علماء کی تعریف و توصیف ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:
"گزشتہ زمانہ میں اس بات کو کسی شخص کی شرف و عظمت کی دلیل سمجھا جاتا تھا کہ لوگ اس کے متعلق مختلف نظریات رکھتے ہوں۔ مثلاً حضرت علی کے بارے میں

کہا گیا ہے کہ ان کی وجہ سے دو شخص ہلاکت و بربادی سے ہمکنار ہوں گے۔

(۱) حد سے زیادہ محبت کرنے والا۔

(۲) مبالغہ کی حد تک نفرت کرنے والا۔

حدیث میں آیا ہے کہ دو شخص ان کی وجہ سے تباہ ہوں گے۔

(۱) تعریف میں مبالغہ کرنے والا۔

(۲) بغض و عداوت میں حد سے تجاوز کرنے والا۔

بلند پایہ لوگوں کی یہی خصوصیت ہے، جو شخص بھی دین یا دنیا میں امتیازی مقام حاصل کرتا ہے، وہ اسی مرحلہ سے گزرتا ہے۔"

۲۔ امام مالکؒ

۹۳ ــــــــــــ ۱۷۹ھ

آپ کا نام نامی واسم گرامی مالک بن انس اصبحی اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ آپ مدینہ منورہ کے امام و محدث تھے ۹۳ھ مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ابن الشیبانی نے تیسیر الوصول کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے کہ آپ کی ولادت ۹۳ھ میں ہوئی۔ مدینہ ہی میں پروان چڑھے اور ۱۷۹ھ میں بعمر ۸۶ سال خالق حقیقی سے جا ملے۔

اخذ و استفادہ:

آپ نے ربیعہ الرائی اور تابعین کے فقہائے کبار سے کسب فیض کیا۔ بقابلۃً زھری سے زیادہ مستفید ہوئے۔ امام مالک کا شمار زھری کے ارشد و اشہر تلامذہ میں ہوتا ہے۔ نافع مولیٰ ابن عمر سے بھی آپ نے بہت فائدہ اٹھایا حتیٰ کہ محدثین نافع سے آپ کی روایت کو "سلسلۃ الذہب" (سونے کی زنجیر) کہتے ہیں۔ یہ سند یوں ہے:

"مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ"

آپ طلب علم کی راہ پر رواں دواں رہے یہاں تک کہ امام حجاز کہلائے اور آپ کو علی الاطلاق "عالم المدینہ و امام دار الہجرۃ" کے القاب سے پکارا جانے لگا۔ آپ کا شہرہ دور دور تک پہنچ گیا اور اکناف ارضی کے طالبان علم پروانوں کی طرح اس شمع علم کے گرد منڈلانے لگے۔ آپ مسجد نبوی میں تدریس حدیث کے لیے باوقار مجلس منعقد کرتے خوشبو لگاتے عمدہ لباس پہنتے اور پھر حدیث پڑھاتے تھے۔ رسول کریمؐ کے ادب و احترام کے پیش نظر مسجد نبوی میں بلند آواز سے بولتے نہیں تھے۔

امام مالک حدیث و فقہ دونوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ ابوحنیفہ کی طرح آپ بھی حدیث مرسل سے احتجاج کرتے تھے۔ آپ نے متعدد مراسیل مؤطا میں شامل کی ہیں۔ آپ کے اصول مذہب وہی تھے جو دوسرے ائمہ کے یہاں معتبر ہیں یعنی کتابؒ۔ سنتؒ۔ اجماعؒ۔ قیاسؒ۔

آپ نے ان پر دو کا اضافہ کیا۔ (۱) تعامل اہل مدینہ (۲) مصالح مرسلہ۔
اکثر ائمہ مصالح مرسلہ کے قائل ہیں۔ باقی رہا اہل مدینہ کا تعامل تو اس سے صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل یا حالت کا پتہ چلتا ہے۔ اہل مدینہ کے عمل کو حجت اس وقت قرار دیا جائے گا جب اس پر ان کا اجماع منعقد ہو چکا ہو، اور ہر دور میں مدینہ کے رہنے والے اس پر عامل رہے ہوں۔ یہاں تک کہ یہ تسلسل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے۔ امام مالک فرماتے ہیں، اہل مدینہ کسی کام کا التزام اسی وقت کرتے ہیں جب وہ ایک شرعی امر ہو، عہد رسالت میں صحابہ اس پر عمل پیرا رہے ہوں اور آپ نے ان کی تائید فرمائی ہو۔ پھر بعد میں آنے والے اسی پر عمل پیرا رہے اور نسلاً بعد نسل اس کی پیروی کرتے رہے۔

امام مالک کی رائے میں اہل مدینہ کا تعامل خبر واحد سے قوی تر ہے۔ جب خبر واحد اور اہل مدینہ کا عمل باہم متعارض ہوں تو ان کے نزدیک مؤخر الذکر کو ترجیح دی جائے گی۔ نظر بریں لیث بن سعد نے امام مالک پر گرفت کی ہے کہ ستر احادیث ایسی ہیں جن کو انہوں نے مؤطا میں درج کیا ہے مگر ان سے احتجاج نہیں کیا۔ دیگر ائمہ و علماء نے ترک اخذ و احتجاج کے سلسلہ میں امام مالک کے ساتھ اتفاق نہیں کیا۔ امام شافعی نے بھی اس ضمن میں ان سے اختلاف کیا ہے۔

ازاں بعد امام مالک پر جرح و قدح کا سلسلہ جاری رہا۔ اہل مدینہ کے تعامل کو حجت قرار دینے کے سلسلہ میں جن لوگوں نے مخالفت کی اس میں امام ابن حزم کا نام پیش پیش ہے۔ ابن حزم نے اپنی کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں امام مالک پر شدید نکتہ چینی کی۔ اسی طرح اپنی کتاب "المحلیٰ" کے بیشتر مباحث میں ان پر لے دے کی ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ علمی مباحث کے سلسلہ میں مخالفین پر ابن حزم کی گرفت بڑی سخت ہوا کرتی ہے۔

(الاحکام، ج ۲، ص ۹۷-۱۲۰)

امام مالک کا فقہی مسلک بلاد اسلامی میں خوب پھیلا۔ دیار مغرب اور مصر میں مقابلۃً اس کی زیادہ اشاعت ہوئی۔

مؤطا مالک کا مقام مشمولہ احادیث و شروح:

جو بات امام مالک کی شہرت کی باعث بنی غالباً وہ آپ کی مشہور کتاب "مؤطا" تھی اس کتاب کو

آپ نے خلیفہ منصور کے ایماء پر مرتب کیا۔ جب منصور حج کے لیے گیا تو امام مالک سے ایک ایسی عملی کتاب مدوّن کرنے کی فرمائش کی جس میں نہ تو حضرت ابن عمر کی سی سختی پائی جائے اور نہ ابن عباس کی روائتی رخصتیں۔ گویا آپ اسے لوگوں کے لیے ایک پامال شاہراہ کی طرح بنا دیں جس پر لوگ گامزن رہیں۔ چنانچہ آپ نے یہ کتاب ترتیب دی اور اس کا نام "مؤطا" (پامال شدہ راہ) رکھا۔

جلال الدین سیوطی نے موطا کی ایک اور وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ امام مالک روایت کرتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب ستر۷۰ فقہائے مدینہ کے سامنے پیش کی اور سب نے میری تائید کی۔ چنانچہ میں نے اس کا نام "مؤطا" (تائید کردہ شدہ) رکھا۔ پھر خلیفہ مہدی حج کرنے گیا تو اس نے مؤطا آپ سے سُنی۔ مہدی نے امام مالک کو پانچ ہزار اور ان کے تلامذہ کو دس ہزار دینار عطا کیے بعد ازاں خلیفہ ہارون الرشید بچوں سمیت حج کرنے گیا تو اس نے آپ سے مؤطا سُنی۔ ہارون نے اس ارادہ کا اظہار کیا کہ موطا کو خانہ کعبہ سے آویزاں کیا جائے اور لوگوں کو اس کے مندرجات پر عامل ہونے پر مجبور کیا جائے۔ یہ سن کر امام مالک نے فرمایا:

"امیر المومنین! ایسا نہ کیجیے۔ رسول کریم کے صحابہ فروع دین میں مختلف نظریات رکھتے تھے اور الگ الگ دیار و امصار میں بس گئے تھے۔ اپنی جگہ سب حق پر تھے۔"

یہ سن کر خلیفہ اس ارادہ سے باز رہا۔ (ابو نعیم فی الحلیۃ)

خداوند کریم نے امام مالک کو حسن قبول سے نوازا تھا۔ لوگ درس و سماع کے لیے آپ کے یہاں حاضری دیتے تھے۔ جن مشہور ائمہ نے آپ سے مؤطا کا سماع کیا ان میں امام اوزاعی شافعی اور محمد بن حسن جیسے اکابر کے اسماء شامل ہیں۔ محمد بن حسن شیبانی نے اپنی روایت کے ساتھ مؤطا کا جو نسخہ نقل کیا ہے وہ معتبر اور مشہور تر نسخہ ہے۔

مؤطا کی ترتیب و تدوین انجام دیتے ہوئے احادیث کی چھان پھٹک کے سلسلہ میں امام مالک نے محنتِ شاقہ اٹھائی۔ کہا گیا ہے کہ آپ چالیس۴۰ سال تک اس کی ترتیب و تہذیب میں لگے رہے۔ سیوطی نے شرح مؤطا کے مقدمہ میں اوزاعی سے روایت کیا ہے کہ:۔

"ہم نے چالیس دنوں میں امام مالک کو مؤطا سنائی تو آپ نے فرمایا، میں نے جو کتاب چالیس سالوں میں مرتب کی تھی وہ تم نے چالیس دنوں میں پڑھ لی۔ تم نے بھا

کیا ہوگا ؟"

امام مالک نے مؤطا کو مختلف ابواب میں منقسم کیا ہے۔ ہر باب میں آنحضورؐ سے مروی احادیث کے علاوہ صحابہ وتابعین کے اقوال و آثار بھی نقل کیے ہیں۔ یہ سب اکابر مدینہ میں بود و باش رکھتے تھے۔ اس لیے کہ جنابِ امام مدینہ سے باہر طلبِ علم کے لیے کہیں گئے ہی نہیں۔ بعض اوقات الفاظ حدیث کی تشریح کرکے اس کا مطلب واضح کرتے ہیں۔ جس باب میں ایسی اخبار آحاد وارد ہوں جو اہل مدینہ کے تعامل کے خلاف ہوں وہاں اہل مدینہ کے عمل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مؤطا کا مرتبہ و مقام :

باقی رہی یہ بات کہ کتب حدیث میں موطا کو کیا درجہ حاصل ہے تو اس کے بارے میں علماء کے نظریات مختلف ہیں۔

(۱) علماء کی ایک جماعت یہ رائے رکھتی ہے کہ مؤطا صحیحین سے بھی مقدم ہے۔ اس لیے کہ امام مالک کو بھی آئمہ حدیث میں یہی درجہ حاصل ہے۔ علاوہ ازیں نقد و جرح کے اعتبار سے بھی آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ آپ نے چالیس سال میں مؤطا کو مرتب کیا۔ ابن العربی مالکی نے یہی نظریہ اختیار کیا اور مخالفین کا دفاع کیا ہے۔ جمہور مالکیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

(۲) بعض علماء مؤطا کو صحیحین کی ہم پلّہ قرار دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔ آپ نے کتاب مذکور میں کتب حدیث کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا اور مؤطا و صحیحین کو طبقۂ اولیٰ میں رکھا ہے۔

(۳) جمہور محدثین کے نزدیک مؤطا کا درجہ صحیحین سے فروتر ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> "مؤطا امام مالک اور ان کے مقلدین کے نزدیک صحیح تصور کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ آپ مرسل و منقطع روایات سے احتجاج کرنے کے قائل تھے۔"

آپ جان چکے ہیں کہ محدثین مرسل و منقطع روایات سے استدلال نہیں کرتے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مؤطا کا مرتبہ ان کے نزدیک صحیحین سے فروتر ہوگا۔

سابق الذکر ہر دو اقوال کے قائلین نے مؤطا میں مرسل و منقطع احادیث کے پائے جانے کا جواب یہ دیا ہے کہ دیگر طرق کے لحاظ سے یہ احادیث متصل السند ہیں۔ اس لیے ان کی صحت شک و شبہ سے بالا ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے مؤطا کی تمام مرسل منقطع اور منفصل روایات کو دیگر طرق سے موصولاً روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"امام مالک نے مؤطا میں جہاں جہاں "بلغنی" یا "عن الثقة" کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور احادیث کو موصولاً و مسنداً ذکر نہیں کیا ایسی کل اکسٹھ احادیث ہیں۔ یہ جملہ روایات امام مالک کی سند کے علاوہ دیگر طرق کے اعتبار سے موصول ہیں اور ان میں کوئی ارسال یا انقطاع موجود نہیں۔ البتہ چار روایات موصول نہیں ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) اِنِّیْ لَا اَنسیٰ وَلٰکِنْ اُنسّیٰ الخ

(۲) وہ حدیث جس میں مذکور ہے کہ آپ نے اپنی امت کی عمر کو چھوٹا خیال کیا۔

(۳) حضرت معاذ کو رسول کریم کی وصیت۔

(۴) اذا نشأت بحرية الخ

علماء نے مذکورہ صدر احادیث کی حمایت و دفاع کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کا مطلب صحیح ہے اور دیگر احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ مگر شیخ شنقیطی نے اپنی کتاب "اضاءة الحالك" میں ابن الصلاح سے نقل کیا ہے کہ موصوف نے ان احادیث کو موصولاً روایت کیا ہے۔ امام سیوطی لکھتے ہیں:

"مؤطا میں مندرجہ احادیث بلا استثناء صحیح ہیں۔ اس لیے کہ امام مالک اور بعض محدثین مراسیل سے بلا شرط احتجاج کرتے ہیں۔ دیگر یہ کہ مؤطا میں جو مراسیل موجود ہیں وہ ہمارے نزدیک بھی لائق احتجاج ہیں۔ اس لیے کہ جب حدیث مرسل کی تائید کسی اور سند سے ہو جائے تو ہم اس سے احتجاج کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ مؤطا میں جو مرسل روایات پائی جاتی ہیں ان کی مؤید احادیث موجود ہیں۔"

(شرح مؤطا سیوطی ص ۸)

امام ابن حزم کا دعویٰ ہے کہ مؤطا میں بعض ایسی احادیث بھی موجود ہیں جن کی علماء نے تضعیف

کی ہے۔ مگر مولانا عبدالحی لکھنوی نے اس پر یہ گرفت کی ہے کہ موطا میں مشمولہ احادیث ساقط الاعتبار اور موضوع نہیں ہیں۔ باقی رہا ابن حزم کا یہ کہنا کہ علماء نے موطا میں شامل بعض احادیث کو ضعیف کہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جس سند کے ساتھ وہ حدیثیں ان تک پہنچی ہوں وہ ناقابل اعتماد ہو۔ البتہ امام مالک کو جس سند کے ساتھ موصول ہوئیں۔ اس کی صحت شک و شبہ سے بالا ہے۔ ظاہر ہے کہ امام مالک اپنے شیوخ و اساتذہ کو بہتر طور پر جانتے تھے اس لیے ان کے بارے میں جناب امام کی رائے ہی صائب ہو سکتی ہے۔

موطا امام مالک تیس[30] مختلف طرق سے روایت کی گئی ہے۔ مشہور ترین نسخے حسب ذیل ہیں:

(۱) بروایت یحییٰ بن یحییٰ۔
(۲) موطا ابن بکیر۔
(۳) موطا ابی مصعب۔
(۴) موطا ابن وہب۔
(۵) موطا محمد بن حسن شیبانی۔

مذکورہ صدر نسخوں میں تقدیم و تاخیر اور نقص و زیادت کا فرق پایا جاتا ہے۔ فرق و اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ موطا کی روایت آپ سے مختلف اوقات میں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ آپ موطا کے مسودہ میں حسب رائے کمی بیشی کرتے رہتے تھے۔ متداول نسخوں کے فرق و اختلاف کی بناء پر موطا کی مشمولہ احادیث کی تعداد میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔

چنانچہ ابوبکر ابہری فرماتے ہیں:

"موطا میں جو احادیث نبویہ و اقوال صحابہ و تابعین پائے جاتے ہیں، ان کی کل تعداد ایک ہزار سات سو بیس[1720] ہے۔ ان میں سے چھ سو[600] مرفوع احادیث دو سو بائیس[222] مرسل چھ سو تیرہ[613] موقوف روایات اور دو سو پچاسی[285] اقوال تابعین ہیں۔"

موطا محمد:

موطا کا مشہور ترین نسخہ وہ ہے جو محمد بن حسن شیبانی نے امام مالک سے روایت کیا۔ یہ حرمین شریفین اور ارض ہند و پاک میں نہایت مشہور ہے۔ اس میں شامل احادیث مرفوعہ اور اقوال صحابہ و تابعین کی تعداد ایک ہزار ایک سو اسی[1180] ہے۔ اس میں مرفوع مرسل اور منقطع ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ ان میں امام مالک سے ایک ہزار پانچ[1005] امام ابوحنیفہ سے تیرہ[13] ابو یوسف

سے چار اور باقی دیگر ائمہ سے مروی ہیں۔

محدثین کرام شروع ہی سے مؤطا کی شرح و تخریج میں مشغول رہے ہیں۔ مشہور ترین شروح حسب ذیل ہیں:

حافظ ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ نے مؤطا کی دو شرحیں تحریر کیں۔

(۱) ایک شرح کا نام "التمہید لما فی المؤطا من المعانی والاسانید" ہے۔ اس میں حروفِ تہجی کی ترتیب سے امام مالک کے شیوخ و اساتذہ کے اسماء مرتب کیے ہیں۔ ابن حزم نے اس شرح کے بارے میں لکھا ہے:

"فقہ الحدیث کے موضوع پر اس جیسی کتاب مرتب نہیں کی گئی۔ اس سے عمدہ تر کتاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا"

(۲) دوسری شرح کا نام "الاستذکار فی شرح مذاہب علماء الامصار" ہے

(۳) مؤطا کی ایک شرح حافظ ابوبکر محمد بن العربی متوفی ۵۴۶ھ نے مرتب کی ہے۔

(۴) شرح جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ۔

(۵) شرح زرقانی مصری متوفی ۱۰۱۲ھ۔

(۶) شرح شاہ ولی اللہ محدث دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ۔

(۷) شرح شیخ علی قاری مکی متوفی ۱۱۳۲ھ۔

(۸) التعلیق الممجد علی مؤطا امام محمد از مولانا عبدالحی لکھنوی۔

مندرجہ ذیل علماء نے مؤطا کا خلاصہ تحریر کیا:

(۱) ابو سلیمان خطابی (۲۸۸ھ)

(۲) ابن عبدالبر (۴۶۳ھ)

(۳) ابن رشیق قیروانی (۴۵۶ھ)

اسی طرح مؤطا کے غریب الفاظ کی شرح اس کے شواہد و رجال اور اختلاف کے بارے میں متعدد کتب تصنیف کی گئیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ علماء نے اس عظیم الشان کتاب کو بے حد قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔

کیا مؤطا حدیث کی کتاب ہے یا فقہ کی؟

امام مالک نے جب سے مؤطا مرتب کی اس دور سے لے کر ہمارے عصر و عہد تک اس بات میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا کہ مؤطا حدیث کی اولین کتاب ہے جو دوسری صدی ہجری کے علمائے سلف کی تصانیف میں سے ہم تک پہنچی۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ علماء نے اس کتاب کے ساتھ بیحد اعتناء کیا ہے۔ جب علماء کتب حدیث کا ذکر کرتے ہیں تو مؤطا کا ذکر ضرور کرتے ہیں اور اس کے مرتبہ و مقام کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جب مستشرقین نے ہماری تاریخ ہمارے علماء اور صحابۂ رسول کے بارے میں زبان درازی سے کام لینے کا آغاز کیا۔ جیسا کہ آپ حدیث کی بحث میں دیکھ چکے ہیں۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ اپنے آپ کو مسلم کہنے والے برملا کہہ رہے ہیں کہ مؤطا فقہ کی کتاب ہے حدیث کی نہیں چنانچہ مشہور منکر حدیث ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے اپنی کتاب "نظرۃً عامۃ فی تاریخ الفقہ الاسلامی" میں یہی بات تحریر کی ہے۔

مؤطا کے کتابِ فقہ ہونے کی دلیل:

ڈاکٹر علی حسن اپنی مذکورہ صدر کتاب کے صفحہ ۲۴۴ - ۲۵۲ پر لکھتے ہیں:-

"اگر ہم زید کے مجموعہ کو نظر انداز کر دیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مؤطا فقہ کی پہلی کتاب ہے جو ہم تک پہنچی۔ امام مالک کی عظمت و جلالت کے علی الرغم مؤطا کو حدیث کی اولین عظیم کتاب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اصالۃً مؤطا کتبِ حدیث میں شامل ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ صحاح ستہ میں اس کو شمار نہیں کیا گیا۔ صرف اندلس کے رہنے والے اس کو کتبِ حدیث میں شامل کرتے ہیں مگر متاخرین گاہے مؤطا کو کتبِ صحاح میں شمار کرتے ہیں۔

صحیح معنی میں مؤطا حدیث کی کتاب نہیں۔ امام مالک کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ اس میں احادیث صحیحہ کو جمع کر دیا جائے۔ بخلاف ازیں وہ اہل مدینہ کے اجماع کے پیشِ نظر فقہ و قانون اخلاق و عادات اور ان کا تعامل غرض جملہ امور ذکر کرتے ہیں۔ امام مالک مسئلہ زیر بحث میں معتبر ائمہ کے فتاویٰ بھی ذکر کرتے ہیں

اگر آپ محدث ہوتے تو فتویٰ کے بجائے حدیث نقل کرتے ۔ پھر طویل بحث و تمحیص کے بعد لکھتے ہیں " ہم انہی وجوہ و اسباب کی بناء پر کہتے ہیں کہ امام مالک صرف احادیث کے جمع کرنے والے ہی نہ تھے ۔ بلکہ اس سے بڑھ کر عملی پہلو سے احادیث کی شرح و تفصیل پیش کرنے والے تھے ۔"

ڈاکٹر موصوف امام مالک کے گاہے رائے و قیاس سے استفادہ کا ذکر کر کے کہتے ہیں :

" نظر بریں ہم کہتے ہیں کہ امام مالک محدث نہ تھے ، اور حدیث آپ کے نزدیک تنہا موجب اعتماد نہ تھی ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ اہل مدینہ کے عمل کو بھی حجت قرار دیتے ہیں اگرچہ آپ حقیقی محدث نہ تھے تاہم آپ نے محدثین کو بے حد فائدہ پہنچایا ، اور تاریخی نقد و تبصرہ میں قیمتی اضافہ کیا ۔ اسناد کو بھی آپ ضروری نہیں سمجھتے تھے اس کی دلیل یہ ہے کہ مؤطا میں آپ نے مُرسل احادیث کو بھی شامل کر دیا ہے ۔"

ڈاکٹر عبد القادر کے طویل مذکرات کا خلاصہ حسب ذیل ہے ۔

(۱) امام مالک محدث نہ تھے ۔

(۲) مؤطا حدیث کے بجائے فقہ کی کتاب ہے ۔

مذکورہ صدر شبہہ کا جواب :

یہ بات کہ امام مالک محدث نہ تھے اخفاءِ حق اور علماء کے ایک مسلمہ اَمر کی خلاف ورزی ہے اس میں شک نہیں کہ جناب امام اپنے عصر و عہد کے عظیم محدث تھے ۔ درس حدیث کے لیے آپ کی مجالس مشہور تھیں اور اکنافِ ارضی کے طلبہ اخذ و استفادہ کے لیے اپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے ۔ یہ ایک ایسی معروف بات ہے جس کی مخالفت ایک جھگڑالو شخص ہی کر سکتا ہے ۔

مہارتِ حدیث کے ساتھ ساتھ آپ وقت کے ایک عظیم فقیہ بھی تھے ۔ جب آپ تدریس حدیث کے لیے بیٹھتے تو فقہِ حدیث پر بھی گفتگو کرتے ۔ مزید بر آں آپ اجتہادی مسائل کے بارے میں بھی اظہار خیال کرتے تھے ۔ خلاصہ یہ کہ آپ یحییٰ بن مَعین اور اعمش کی طرح صرف محدث نہ تھے اسی طرح اکثر تابعین حدیث و فقہ کے جامع تھے ۔ نظر بریں یہ استدلال کہ چونکہ آپ غیر منصوص مسائل میں اپنی رائے کو استعمال کرتے تھے اس لیے آپ محدث نہیں بلکہ فقیہ تھے ۔ محدثین کے میلانات و

رجحانات سے بے خبری کی دلیل ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ عظیم راوی ہونے کے پہلو بہ پہلو غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کیا کرتے تھے۔ بخلافِ ازیں حضرت ابن عمرؓ بھی محدث تھے اور صرف نصوص سے استدلال کرتے تھے اجتہاد نہیں کرتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اجتہاد و استنباط سے کام لینے والا حدیث کے دائرہ سے نکل نہیں جاتا۔ اسی طرح ہر محدث موجودہ نصوص میں اپنی رائے استعمال نہیں کرتا۔ تابعین میں مثال کے طور پر ہم ثوری اور اوزاعی کا نام پیش کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں بزرگ بہ یک وقت محدث بھی تھے اور فقیہ بھی۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حفظ و فہم کی دولت سے نوازا ہو اس کے لیے حدیث و فقہ دونوں میں مہارت و بصیرت رکھنا کچھ بھی مشکل نہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ امام مالک نے موطا میں مرسل احادیث کو جگہ دی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے نزدیک مرسل و منقطع روایات سے استدلال درست ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ محدثین کی طرح ماہر اسانید نہ تھے۔ امام مالک سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا :

"گاہے ایک شیخ ہمارے پاس بیٹھ جاتا اور دن بھر حدیثیں بیان کرتا رہتا مگر ہم اس سے صرف ایک ہی حدیث اخذ کرتے۔"

آپ کا مقولہ ہم قبل ازیں تحریر کر چکے ہیں کہ "علم چار آدمیوں سے اخذ نہیں کیا جاتا۔"

امام مالک کے محدث ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آپ کے اقران و اماثل آپ کے محدث اور امام فی الحدیث ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ سفیان بن عیینہ کا قول ہے :

"امام مالک صرف صحیح حدیث روایت کرتے ہیں اور ثقہ راویوں کے سوا کسی دوسرے سے استفادہ نہیں کرتے۔"

یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں :

"مالک امام حدیث تھے۔"

ابو قدامہ کا ارشاد ہے :

"امام مالک حفظِ حدیث میں یگانہ روزگار تھے۔"

(۲) جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ موطا حدیث کی کتاب نہیں یہ اس لیے غلط ہے کہ اعلاف

مذہب و مسلک کے باوصف علماء نے ہر دور میں اس کے ساتھ بے حد اعتناء کیا ہے۔ محمد بن حسن شیبانی کو لیجئے کہ اصحاب ابی حنیفہ کے زمرہ میں شامل ہونے کے باوصف آپ نے موطا کو اہتمام بلیغ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اوزاعی نے ایک مستقل فقہی مسلک کے بانی و مؤسس ہونے کے باوجود اس کی روایت کا بیڑا اُٹھایا۔ امام شافعی نے موطا براہِ راست جناب مالک سے پڑھی علمائے حنفیہ و شافعیہ اس کی شرحیں و خلاصے لکھتے رہے۔ البتہ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ مالکیہ نے اس کی جانب زیادہ توجہ مبذول کی اس لیے کہ یہ ان کے امام کی کتاب تھی۔

اور اگر مؤطا فقہ کی کتاب ہوتی تو مختلف فقہی مسالک کے علماء اس کو اپنی توجہات کی آماجگاہ نہ ٹھہراتے۔ باقی رہی یہ بات کہ مؤطا کو فقہی ابواب کی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مؤطا حدیث کی کتاب نہ ہو۔ صحیح بخاری کو دیکھئے جس کی تدوین و ترتیب صرف اسی لیے عمل میں آئی تھی کہ وہ حدیث کی کتاب ہو مگر بایں ہمہ اس کو فقہی ابواب پر مبوّب و مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے دوش بدوش امام مالک کی طرح صحیح بخاری میں صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ سنن ترمذی کے بارے میں بھی آپ یونہی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں تو امام ترمذی نے علماء کے اختلافی اقوال تک کو جگہ دی ہے۔ سنن ابی داؤد کا بھی یہی حال ہے۔

حدیث کی کسی کتاب میں اگر صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار کو شامل کر دیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ کتب حدیث کے زمرہ سے خارج ہو جائے۔ خصوصاً ان محدثین کی رائے میں جو لفظ حدیث کو وسیع معنوں میں لیتے ہیں اور اس میں احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ و تابعین سب کو شامل کرتے ہیں۔

مؤطا کو صحاح ستہ میں شامل نہ کرنے کی وجہ اس میں مراسیل کی بھرمار ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مراسیل امام مالک کی رائے میں معمول بہا ہیں مگر دیگر محدثین کے نزدیک نہیں۔ یہ بات مؤطا کو صحاح ستہ کے اندر شامل نہ کرنے کی موجب ہوئی۔ تاہم موطا کو شامل صحاح ستہ کرنے کا مسئلہ متنازع فیہا ہے۔ ہم قبل ازیں اس پر اظہار خیال کر چکے ہیں۔ ہمارے جلیل القدر محدث امام احمد بن حنبل کی مسند بالاتفاق حدیث کی کتاب ہے۔ مگر بکثرت علماء نے بوجوہ اس کو صحاح ستہ میں شامل نہیں کیا۔

یہ کہنا کہ "متاخرین کا تقویٰ ہی ہے جس نے ان کو اس بات کی تحریک دلائی کہ موطا کو کتب صحاح میں شامل کر دیا جائے" یہ مستشرقین کا اسلوب و انداز اور طرز تکلم ہے۔ ورنہ متاخرین کے تقویٰ کے کیا معنی ؟ کیا متقدمین کا تقویٰ اس امر کا محرک نہ ہو سکا ؟ پھر یہ کہ اس امر سے تقویٰ کا تعلق ؟

یہ بات امام شافعی کے مذکورہ ذیل قول کی موجودگی میں کیوں کر صحیح ہو سکتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں :

"میرے علم کی حد تک اس کائنات پر کوئی کتاب ایسی نہیں جو امام مالک کی کتاب سے صحیح تر ہو"

محدث ابن الصلاح نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ امام شافعی کا یہ قول اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب بخاری و مسلم عالم وجود میں نہیں آئی تھیں۔ (مقدمہ ابن الصلاح، ص ۹)

کیا اس سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے نہیں آتی کہ ہمارے متقدمین موطا کو کس قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کو فقہ کی نہیں بلکہ حدیث کی کتاب تصور کرتے تھے ورنہ ابن الصلاح نے امام شافعی کی جانب سے جو عذر پیش کیا ہے۔ اس کی ضرورت نہ تھی۔ اس کا صاف اور فطری جواب یہ تھا کہ موطا فقہ کی کتاب ہے اور صحیحین کتب حدیث میں شامل ہیں۔

۳-امام شافعی

۱۵۰ ——————— ۲۰۴ھ

نام ونسب :

نام ونسب محمد بن ادریس بن عباس بن شافع اور کنیت ابو عبداللہ ہے۔ آپ کا نسب قصی تک پہنچتا اور عبد مناف پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل جاتا ہے۔ آپ ملک شام میں بمقام غزہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ابھی آپ کی عمر دو سال کی تھی کہ والدہ ان کو مکہ لے آئیں جہاں آپ پروان چڑھے۔ وہاں آپ نے قرآن کریم پڑھا۔ ھُذیل کے فصیح ترین قبیلہ میں سکونت پذیر ہو کر خالص عربی زبان اور شعر ولغت میں مہارت حاصل کی یہاں تک کہ آپ قبیلہ ھُذیل کے اشعار کے معتمد ترین ماخذ قرار پائے۔

شیوخ وتلامذہ :

مروی ہے کہ مشہور ادیب ونقاد اصمعی امام شافعی سے اپنے اشعار کی تصحیح کیا کرتے تھے امام شافعی نے فقہ کا درس مسلم بن خالد زنجی مفتی مکہ سے لیا۔ پھر مدینہ کا رُخ کیا اور امام مالک کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ موطا بتمام وکمال امام مالک سے پڑھی۔ امام مالک نے ہونہار شاگرد میں فہم وذکاء قوتِ حافظہ اور عظمت وشرافت کے آثار دیکھے تو اس کا اکرام بجالانے لگے پھر امام شافعی کو یمن کے علاقہ میں ایک منصب تفویض کیا گیا۔ نتیجہ کے طور پر دشمنوں نے ہارون الرشید کے دربار میں چغلی کھائی اور امام شافعی کو تشیع اور اہل بیت کی طرف داری کے جرم میں بغداد حاضر کیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۸۴ھ میں پیش آیا۔ محمد بن حسن شیبانی کی یقین دہانی پر خلیفہ ہارون نے امام شافعی کو بے گناہ قرار دیا۔

اس واقعہ کے بعد امام شافعی اور محمد بن حسن کے آپس میں گہرے مراسم استوار ہو گئے۔ امام شافعی نے محمد بن حسن کے اصحاب ورفقاء کی تصانیف سے استفادہ کیا۔ امام شافعی خود فرماتے ہیں "میں جب بغداد سے نکلا تو محمد بن حسن کی بارِ شتر کے برابر تصانیف میرے ہمراہ تھیں"

بعدازاں امام شافعی مکہ لوٹ آئے عراق و حجاز کے بلاد و دیار میں گھومتے پھرتے رہے اور ۱۹۹ھ کو مصر میں سکونت گزین ہو گئے مصر ہی میں آپ نے شافعی فقہ مدون کی اور ۲۰۴ھ میں دنیا کو علم و اجتہاد سے معمور کر کے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

مصر و عراق میں آپ کے گرد طالبانِ علم اسی طرح منڈلاتے رہتے تھے جس طرح شمع کے گرد پروانے۔ سکانِ مصر کے دل آپ کی الفت و محبت اجلال و اکرام اور اعتراف جلالت و امامت سے لبریز تھے۔ امام شافعی مذدرجہ وسیع العلم شیریں کلام ذہین و فطین اور دقیقہ رس تھے۔ آپ علوم کتاب و سنت کے ماہر اور فنونِ لغت و آداب میں یکتائے روزگار تھے۔

علم حدیث میں امام شافعی کا مقام:

عظیم فقیہ ہونے کے ساتھ آپ محدثین میں بھی امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ آپ اولین شخص تھے جس نے روایت حدیث کے قواعد وضع کیے۔ حدیث نبوی کے دفاع کا فریضہ انجام دیا۔ اپنی اس رائے کا اعلان کیا جو امام مالکؒ ابو حنیفہ دونوں کے خلاف تھی۔ وہ رائے یہ تھی کہ جب حدیث صحیح سندِ متصل کے ساتھ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جائے تو اس پر عمل کرنا واجب ہے امام مالک نے تعامل اہل مدینہ کی جو شرط لگائی ہے، امام شافعی اس کے قائل نہ تھے اسی طرح امام ابو حنیفہ نے جو شروط عائد کی ہیں امام شافعی ان کو بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

نظر بریں امام شافعی کا شمار اہل الحدیث میں ہوتا ہے اور ان کو "ناصر السنۃ" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے حق بات تو یہ ہے کہ آپ نے اپنی کتاب "الرسالۃ" اور "الام" میں حدیث نبوی کی حجیت و اہمیت اس کے دفاع اور قانونِ اسلامی میں اس کے مرتبہ و مقام سے متعلق جو مباحث تحریر کیے ہیں وہ اس ضمن میں تحریر کردہ نہایت قیمتی سرمایہ میں سے ہیں۔ اصول حدیث اور کتاب و سنت کے کسی موضوع پر لکھنے والا شخص آپ کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ امام محمد بن حسن شیبانی نے کس قدر صحیح فرمایا ہے کہ:

"اہل الحدیث جو بات کہتے ہیں امام شافعی کی زبان سے کہتے ہیں"

علامہ زعفرانی فرماتے ہیں:

"اصحابِ حدیث سو رہے تھے امام شافعی نے ان کو جگا دیا!"

یہی وجہ ہے کہ علمائے حدیث آپ کی مدح وستائش میں رطب اللسان ہیں اور آپ کا ذکر بہت اچھے انداز میں کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

"ہر قلم و دوات پکڑنے والے کی گردن پر امام شافعی کا احسان ہے۔"

امام احمد مزید فرماتے ہیں:

"ہمیں امام شافعی کی صحبت میں بیٹھ کر مجمل و مفسر اور ناسخ و منسوخ کا فرق و امتیاز معلوم ہوا۔"

عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے:

"امام شافعی کی کتاب "الرسالۃ" دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں نے اس میں شافعی کو ایک دانش مند، فصیح اور ناصح شخص پایا۔ میں اکثر ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔"

علامہ کرابیسی کا قول ہے:

"ہمیں نہیں معلوم تھا کہ کتاب وسنت کیا چیز ہے۔ حتیٰ کہ امام شافعی سے مل کر ان کی حقیقت معلوم ہوئی۔ نہ میں نے شافعی جیسا کوئی شخص دیکھا اور نہ خود شافعی نے اپنا کوئی نظیر و مثیل ملاحظہ کیا۔ میں نے ان سے بڑا عالم اور فصیح شخص کبھی نہیں دیکھا۔"

متاخرین کی طرح آپ کے اصول مذہب بھی چار تھے:

کتاب۔ سنت۔ اجماع۔ قیاس۔

البتہ حدیث نبوی کا دائرہ ان کے نزدیک امام مالک و ابوحنیفہ سے کشادہ تر تھا۔ اس لیے کہ آپ اخبار آحاد سے بھی احتجاج کرتے تھے۔ ایک دوسرے اعتبار سے ان کے یہاں عمل بالحدیث کا دائرہ اس لیے تنگ تھا کہ آپ مراسیل سے صرف اس صورت میں احتجاج کرتے تھے جب حدیث مرسل کبار تابعین مثلاً سعید بن المسیب جیسے اشخاص سے مروی ہو۔ آپ "استصحاب حال" کو بھی ایک فقہی قاعدہ کی حیثیت سے تسلیم کرتے تھے۔ استصحاب حنفیہ کے نزدیک نفی و دفع کے سلسلہ میں حجت ہے کسی چیز کے اثبات کے سلسلہ میں نہیں۔

سنن شافعی اور مسند کے سوا آپ سے حدیث کی کوئی مستقل کتاب منقول نہیں۔ مسند کے

حاوی ابوالعباس اصم اور سنن کے طحاوی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو کتب آپ نے خود تالیف نہیں کیں بلکہ یہ آپ کے تلامذہ کی جہد وسعی کا حاصل ہیں۔ جو مسانید امام ابوحنیفہ کی جانب منسوب ہیں ان کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے محدثین کی طرح نہ اپنا حلقۂ درس قائم کیا اور نہ ہی روایات و اسانید کی جمع و تالیف کا اہتمام کیا۔ بخلاف ازیں آپ ایک مجتہد امام تھے اور صرف ان احادیث پر نقد و تبصرہ کرتے تھے جو اصول تشریع میں سے ایک اصل بننے کی حیثیت رکھتی ہیں گویا وہ حدیث کی طلب و تلاش اس لیے کرتے تھے کہ اس کو اپنے فقہ و اجتہاد کی اساس قرار دے سکیں اس لیے نہیں کہ ان سے اوراق و کتب کو بھر دیں۔ درحقیقت یہی بنیادی فرق و امتیاز ہے جو محدثین و فقہاء کے مابین پایا جاتا ہے۔ محدثین کی زندگی کا مرکز و محور روایتِ حدیث ہے اور بس۔ جب کہ فقہاء کا مطمح نظر فقہ و قانونِ اسلامی ہے، دگر ہیچ۔

---

۴ امام احمدؒ

۱۶۴ ــــــــــــ ۲۴۱ھ

نام ونسب :

آپ کا نام نامی واسم گرامی احمد بن محمد بن حنبل، کنیت ابوعبداللہ اور نسبت شیبانی ہے بغداد میں ۱۶۴ھ کو پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے۔ آغازِ طالب علمی میں سب سے پہلے قاضی ابویوسف کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے پھر حدیث نبوی کی جانب متوجہ ہوئے اور اسی کے ہو کر رہ گئے۔ آپ شیوخ واساتذہ سے ملتے اور ان سے حدیثیں لکھتے حتیٰ کہ حفظِ حدیث اور اس کے جمع واحاطہ مین آپ اوجِ کمال پر فائز ہوئے اور بلانزاع واختلاف اپنے زمانہ کے منفرد "امام سنت" قرار پائے۔

افادہ واستفادہ :

پہلے پہل امام شافعی سے فقہ کا درس لیا۔ پھر انہی سے حدیث نبوی پڑھنے لگے۔ آپ کے تلامذہ میں امام بخاری ومسلم جیسے محدثین کے اسماء شامل ہیں۔ آپ وَرع وزھد امانت ودیانت اور دینی غیرت وحمیت میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ خلقِ قرآن کے فتنہ میں مبتلا ہوئے اور خلیفہ مامون کے عہد خلافت سے متوکل کے زمانہ تک مبتلائے مصائب وآلام رہے۔ استقامت علی الحق کے سلسلہ میں آپ نے جو عمل مظاہرہ کیا تھا اس نے جمہور اہل اسلام کے دلوں کو حق وصداقت پر قائم کر دیا۔ لوگوں کے دلوں میں آپ کے لیے بے پناہ ادب واحترام اور الفت ومحبت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ سب لوگ بلانزاع واختلاف آپ کی امامت کا اعتراف کرتے تھے۔ آپ کے حق میں لاتعداد علماء کی شہادتیں موجود ہیں۔

آپ سے متعلق شافعی کا صرف ایک ہی قول کافی ہے :

"میں بغداد سے نکلا تو اپنے پیچھے کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا جو احمد بن حنبلؒ سے علم وفضل اور زھد وتقویٰ میں بڑھ کر ہو۔"

آپ نے ۲۴۱ھ کو بغداد میں وفات پائی۔ لاتعداد لوگوں نے آپ کے جنازہ میں شرکت کی۔
آپ کے اصول مذہب وہی تھے جو دیگر ائمہ کے یعنی کتاب و سنت۔ اجماع و قیاس آپ حدیث نبوی سے استدلال کے خوگر تھے۔ قبل ازیں آپ کا یہ قول ہم ذکر کر چکے ہیں کہ:

ضعیف الحدیث عندی احب الی من رائی الرجال — ضعیف حدیث میرے نزدیک لوگوں کی رائے سے افضل ہے۔

آپ اقوال صحابہ کی پیروی میں مشہور تھے۔ جب صحابہ کے کسی مسئلہ میں دو یا تین قول ہوتے تو آپ بھی وہ اقوال اختیار کرتے۔ اسی بناء پر بعض علماء نے آپ کو ائمہ فقہاء میں شامل نہیں کیا۔ چنانچہ ابن عبد البر نے اپنی کتاب "الانتقاء" میں اسی طرح کیا ہے۔ اگرچہ آپ پر حدیث کا رنگ غالب تھا۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ آپ کا امام فقیہ اور مجتہد ہونا شک و شبہ سے بالا ہے۔

علم حدیث میں مسند کا مقام:

مسند احمد علم حدیث میں آپ کی زندہ جاوید کثیر النفع اور انتہائی بابرکت کتاب ہے۔ اس میں تقریباً چالیس ہزار احادیث ہیں۔ جن میں دس ہزار مکرر ہیں۔ آپ کو سات لاکھ پچاس ہزار احادیث یاد تھیں جن میں سے آپ نے یہ کتاب مرتب کی۔ کتاب کی تالیف و ترتیب میں آپ کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک ہی باب میں ایک صحابی کی جملہ مرویات یکجا کر دیتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے حضرت ابو بکر کی روایت کردہ تمام احادیث کو اختلاف مبحث و موضوع کے باوصف ایک باب میں جمع کر دیا ہے۔

اس امر میں علمائے حدیث کا اختلاف ہے کہ مسند کو کتب حدیث میں کیا مقام حاصل ہے۔

(۱) ابو موسیٰ مدینی اور ان کے ہمنوا یہ کہتے ہیں کہ مسند میں موجود جملہ احادیث صحیح اور قابل احتجاج ہیں امام احمد خود مسند میں فرماتے ہیں:

"جب کسی حدیث میں تمہارے یہاں اختلاف پیدا ہو تو مسند کی طرف رجوع کرو۔ اگر اس میں موجود ہو تو صحیح ہے ورنہ حجت نہیں۔"

(۲) علماء کی ایک جماعت کے نزدیک مسند میں صحیح ضعیف اور موضوع ہر قسم کی روایات ہیں۔ ابن جوزی نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ اور اپنی موضوعات میں مسند کی انتیس (۲۹) احادیث شامل کیں اور ان کو موضوع قرار دیا ہے۔ حافظ عراقی نے مسند کی موضوعات میں نو (۹) احادیث کا

اضافہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک مسند میں ۳۸ موضوع احادیث موجود ہیں۔ حافظ عراقی نے ان علماء کی تردید کی ہے جو کہتے ہیں کہ امام احمد نے یہ شرط عائد کی ہے کہ وہ مسند میں صرف احادیث صحیحہ کو جگہ دیں گے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ امام احمد کے مذکورہ صدر قول کا مطلب یہ ہے کہ :

"جو حدیث مسند میں مذکور نہیں وہ حجت نہیں، یہ مطلب نہیں کہ مسند میں جو حدیث بھی مذکور ہے وہ حجت ہے۔"

(۳) علماء کی ایک تیسری جماعت نے مسند کے بارے میں معتدل موقف اختیار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسند میں احادیث صحیحہ اور ایسی ضعیف حدیثیں موجود ہیں جو حسن کے درجہ کی ہیں۔ امام ذہبی ابن حجر ابن تیمیہ اور سیوطی کا نقطہ نظر یہی ہے۔ ان علماء نے ابن جوزی اور عراقی پر سخت تنقید کی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ مسند میں موضوع احادیث بھی موجود ہیں۔ انہوں نے اس کے شواہد و امثلہ ذکر کر کے ان کا دفاع کیا ہے۔ مگر اس میں تکلف اور کھینچا تانی سے کام لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ حافظ ابن حجر کو مجبوراً یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مسند میں تین چار بے اصل روایات موجود ہیں۔ ابن حجر نے امام احمد کی جانب سے یہ معذرت کی ہے کہ آپ نے قبل از وفات ان روایات کو حذف کرنے کی وصیت کی تھی۔ مگر سہواً ایسا نہ ہو سکا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ احادیث مٹادی گئی ہوں اور پھر کسی نے ان کے نیچے دوبارہ وہی عبارت رقم کر دی ہو۔

آپ اس حقیقت سے آگاہ و آشنا ہیں کہ امام احمد احادیث فضائل میں سہل انگاری سے کام لیتے ہیں۔ جرح و تعدیل میں ان کا رویہ مبنی بر اعتدال ہے۔ نیز یہ کہ آپ کے بیٹے عبداللہ اور مسند کے راوی ابوبکر قطیعی نے مسند میں غیر ذمہ دارانہ طور پر کچھ اضافے کیے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسند احمد کا کتب حدیث میں کیا پایہ ہے۔ نیز یہ کہ بات وہی درست ہے جو محدث ابن جوزی اور حافظ عراقی نے کہی ہے۔ یہ دونوں بزرگ نقدِ حدیث میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور صرف سند پر ہی نقد و جرح نہیں کرتے بلکہ متن حدیث کو بھی جانچتے پرکھتے ہیں۔

حافظ ابن حجر اور سیوطی نے امام احمد کا جو دفاع کیا ہے وہ صرف دینی عصبیت و حمایت کے

پیش نظر ہے۔ اس سے امام احمد کو کچھ ضرر بھی لاحق نہیں ہوتا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ منہاج السنتہ میں لکھتے ہیں:

"امام احمد نے مسند میں یہ شرط لگائی ہے کہ وہ ان لوگوں سے روایت نہیں کرتے جو ان کے نزدیک معروف بالکذب ہیں۔ اگرچہ ان میں ضعیف راوی بھی ہوتے ہیں۔ مزید براں امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ اور مسند کے راوی ابوبکر قطیعی نے مسند میں ناروا قسم کے اضافے کیے ہیں جو اس کا بنددبن کر رہ گئے ہیں۔ یہ اضافات اکثر و بیشتر احادیث موضوعہ پر مشتمل ہیں۔ جہلاء نے یہ سمجھا کہ یہ امام احمد کی روایت سے ہیں۔"

۵-امام بخاری

۱۹۴ـــــــــــــــ۲۵۶ھ

نام ونسب اور تربیت :

نام محمد بن اسماعیل بن ابراہیم کنیت ابو عبداللہ اور لقب امام المحدثین ہے آپ علی الاطلاق اپنے عصر وعہد میں حفاظِ حدیث کے سرخیل تھے۔ آپ بخارا میں بروز جمعہ ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو پیدا ہوئے ابھی دس سال کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ حفظ حدیث کا آغاز کردیا۔ پھر اسی راہ پر گام زن رہے اور طلبِ حدیث میں عالم اسلامی کا کونہ کونہ چھان مارا۔ وہ خود فرماتے ہیں :

"میں سرزمین شام ومصر اور جزیرہ میں دو مرتبہ گیا۔ بصرہ میں چار مرتبہ گیا اور چھ سال حجاز میں مقیم رہا۔ ٹھیک یاد نہیں رہا کہ محدثین کی رفاقت میں کتنی مرتبہ کوفہ اور بغداد جانے کا اتفاق ہوا"

امام بخاری کو جس شیخ الحدیث کا پتہ چلتا اس کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے۔ آپ قوتِ حافظہ عِلَلِ اسانید ومتون کے فہم وادراک میں اپنی مثال آپ تھے۔ بغداد میں ان کے امتحان کا واقعہ اس قدر مشہور ہے کہ اس کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ واقعہ آپ کی قوت حافظہ اور فن حدیث کے امام ہونے کی زندہ دلیل ہے۔ حدیث نبوی کی تحصیل کے سلسلہ میں آپ نے جو تکالیف شاقہ اٹھائی تھیں اس کا ثمرہ بارگاہ ربانی سے آپ کو یہ ملا کہ آپ لوگوں میں ہر دلعزیز ہو گئے اور ہر طرف آپ کی مدح وستائش کے چرچے ہونے لگے۔

محمود بن ناظر بن سہل شافعی فرماتے ہیں :

"میں بصرہ، شام، حجاز اور کوفہ میں گیا اور وہاں کے علماء سے ملا۔ جب محمد بن اسماعیل بخاری کا ذکر آتا تو وہ ان کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے"

ایک مرتبہ امام بخاری نے اپنے استاد اسحاق بن راھَوَیہ کو سنا وہ اپنے تلامذہ سے کہہ رہے تھے :

"اگر تم احادیث صحیحہ پر مشتمل ایک مختصر کتاب جمع کر لو تو کتنا اچھا ہو"

امام بخاری فرماتے ہیں:

"یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں نے "الجامع الصحیح" کی جمع و ترتیب کا بیڑا اٹھایا"

امام محمد بن اسماعیل نے صحیح بخاری کی ترتیب و تہذیب میں سولہ سال کا عرصہ صرف کیا۔ ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کرتے اور دو رکعت نماز نفل ادا کرتے۔ پھر بارگاہِ ربانی میں استخارہ کرتے۔ صرف اسی حدیث کو بخاری میں جگہ دیتے جو صحیح اور متصل سند کے ساتھ رسول کریم تک پہنچ جاتی ہو اور اس کے رُواۃ و رجال ضبط و عدالت کی صفات سے موصوف ہوں۔ امام بخاری کے نزدیک صرف یہی بات کافی نہیں کہ تلمیذ اپنے شیخ کا ہم عصر ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ شاگرد اپنے استاد سے ملا ہو اور وہ اس سے حدیث کا سماع کر چکا ہو۔

نظر بریں صحیح بخاری حدیث کی پہلی کتاب تھی جو ان نازک شرائط کے مطابق مرتب ہوئی اور جس کا دامن ضعیف اور حسن روایات تک سے پاک تھا۔ یہ صرف احادیث صحیحہ کی جامع تھی۔ امام بخاری نے اس کو فقہی ابواب پر مرتب کیا۔ یہ تبویب استنباطِ مسائل میں آپ کی باریک بینی و ژرف نگاہی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ بعض اوقات ترجمۃ الباب اور اس میں مندرج حدیث میں موافقت و یگانگت بظاہر نظر نہیں آتی۔ گاہے یوں ہوتا ہے کہ آپ ایک باب میں کوئی خاص حدیث تلاش کرتے ہیں اور وہاں نہیں ملتی، بلکہ کسی دوسرے باب میں ملتی ہے۔ آپ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ یہ حدیث فلاں باب میں مل سکتی ہے۔

جناب امام نے صحیح بخاری میں تائیداً موقوف و معلق روایات صحابہ و تابعین کے فتاویٰ اور علماء کے اقوال بھی ذکر کیے ہیں۔ امام بخاری کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ آپ ایک ہی حدیث کو چند اجزاء میں تقسیم کر کے مختلف ابواب میں اس کا مناسب جزو شامل کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر مقدمہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ بخاری میں مندرجہ کل احادیث مع مکررات دبجز معلقات و متابعات و موقوفات کل سات ہزار تین سو ستانوے (۷۳۹۷) ہیں۔ اور اگر مکررات کو شامل نہ کیا جائے تو متصل السند احادیث کی کل تعداد دو ہزار چھ سو دو (۲۶۰۲) ہے۔

جب امام مکرم صحیح بخاری کی تالیف و تہذیب سے فارغ ہوئے تو اس کو احمد بن حنبل ابن معین اور ابن المدینی جیسے اکابر محدثین کے سامنے پیش کیا انہوں نے اسے پسند کیا اور چار احادیث کے علاوہ باقی کو صحیح قرار دیا۔ محدث عقیلی فرماتے ہیں کہ ان چار احادیث کے بارے میں امام بخاری کی رائے صائب ہے۔ جب اس کو لوگوں کے سامنے پیش کیا اور اس میں مندرج احادیث لوگوں کو سنائیں تو اس کا شہرہ دُور دُور تک پہنچ گیا۔ خطۂ ارضی کے دُور افتادہ کونوں سے لوگ جناب امام کی خدمت میں استفادہ کے لیے کشاں کشاں پہنچے۔ حتیٰ کہ آپ کے تلامذہ کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ صحیح بخاری کے نسخے تمام بلاد و امصار میں پھیل گئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ لوگوں نے صحیح بخاری کی خدمت کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں کسی نے شرح لکھی۔ کسی نے اس کا خلاصہ تیار کیا۔ کچھ اہل علم اس کے حفظ و درس میں لگ گئے صحیح بخاری کی وجہ سے اہل علم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ امام ذہبی فرماتے ہیں:

"صحیح بخاری قرآن کریم کے بعد اسلامی کتب میں سب سے افضل کتاب ہے اگر کوئی شخص تین ہزار میل کی مسافت طے کر کے اس کے سماع کے لیے جائے تو اس کی کاوش رائگاں نہ ہوگی"

حفاظِ حدیث نے صحیح بخاری کی ایک سو دس ۱۱۰ احادیث پر نقد و جرح کی ہے۔ ان میں سے امام مسلم نے بتیس ۳۲ احادیث صحیح مسلم میں روایت کی ہیں۔ اٹھتر ۷۸ احادیث کے روایت کرنے میں امام بخاری منفرد ہیں۔ ان ۷۸ احادیث کے بارے میں حافظ ابن حجر مقدمہ فتح الباری میں فرماتے ہیں:

"ان سب میں علّت قادحہ موجود نہیں۔ بخلاف ازیں بعض احادیث پر وارد کردہ اعتراض کا جواب آسانی سے دیا جاسکتا ہے۔ بعض میں جواب کا احتمال ہے۔ ان میں سے بہت کم روایات ایسی ہیں جن کا جواب دینے میں تکلف سے کام لینا پڑتا ہے۔ جو شخص احادیث منتقدہ پر غور و فکر کرے گا اور دیکھے گا کہ ان پر کیا اعتراض وارد کیا گیا ہے۔ اس پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ اس قسم کی تنقید سے ان کی صحت میں فرق نہیں آتا۔ دراصل یہ ایک قسم کی صُوری و

ظاہری تنقید ہے جس کا منشا و مصدر علماء کی شدتِ احتیاط اور حد سے بڑھی ہوئی بیدار مغزی اور مستعدی ہے۔

مثلاً کسی حدیث کے مرسل ہونے پر نقد و تبصرہ۔ حالانکہ وہ بظاہر مرسل اور در حقیقت موصول ہوتی ہے۔ یا وہ حدیث جس کو کسی راوی نے مرسلاً روایت کیا ہو اور اس کے اقران و اماثل اسی حدیث کو متصلاً روایت کرتے ہوں۔ امام بخاری کی یہ عادت ہے کہ وہ معاً دونوں روایتیں ذکر کر دیتے ہیں، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پہلی روایت میں ارسال کا جو وہم پایا جاتا ہے وہ دوسری روایت سے زائل ہو جائے۔ نیز یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ علت قادح نہیں ہے۔ یہ ہیں اس تنقید کے نظائر و امثلہ جو صحیح بخاری کی احادیث پر کی گئی ہے حافظ ابن حجر نے مقدمہ فتح الباری میں اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

جہاں تک صحیح بخاری کے رُواۃ و رجال کا تعلق ہے حفاظِ حدیث نے ان میں سے اسّی کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان میں سے اکثر امام بخاری کے وہ شیوخ و اساتذہ ہیں جن سے آپ ملے ان کی ہم نشینی اختیار کی اور ان کے اخلاق و عادات سے آگاہی حاصل کی۔ اس لیے وہی ان کے حالات سے زیادہ باخبر ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ تنقید۔ خواہ صحیح بخاری کی اسانید پر کی گئی ہو یا احادیث پر ——— صحیح بخاری پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ اس کی مقبولیت پر علماء کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ جمہور علماء اس ضمن میں یک زبان ہیں کہ کتاب ربانی کے بعد صحیح بخاری اس کائنات پر صحیح ترین کتاب ہے۔ البتہ یہ امر متنازع فیہ ہے کہ آیا بخاری کی احادیث سے قطعی علم حاصل ہوتا ہے یا ظنی؟ محدث ابن الصلاح یقینی علم کے قائل ہیں مگر نووی ظنی علم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ خواہ احادیث کا درجہ صحت کے اعتبار سے کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ جمہور کا مذہب بھی یہی ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے ۲۵۶ھ میں وفات پائی۔ (مقدمہ فتح الباری)

قرآن حکیم کے بعد علماء نے جو اعتناء صحیح بخاری کے ساتھ کیا اور کسی کتاب کے ساتھ

نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے بخاری کی شرح لکھی، اس کا خلاصہ تیار کیا یا اس کے رجال پر بحث کی، بے حد کثیر العدد ہیں۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق صحیح بخاری کی شروح کی تعداد بیاسی ۸۲ ہے۔ بخاری کی چار شروح نہایت مشہور ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) صحیح بخاری کی سب سے زیادہ مشہور اور مفید ترین شرح، حافظ ابن حجر ۸۵۲ھ کی فتح الباری ہے۔

(۲) علامہ بدر الدین عینی (۸۵۵ھ) کی عمدۃ القاری ہے۔

(۳) بدر الدین زرکشی (۷۹۴ھ) کی شرح جس کا نام التنقیح ہے۔

(۴) جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) کی شرح جس کا نام التوشیح ہے۔

۲۰۴ ——————— ۲۶۱ھ

نام ونسب :

نام نامی مسلم بن حجاج قشیری نیسابوری ہے۔ آپ علم حدیث کے یکتائے روزگار امام اور شہرۂ آفاق محدث تھے۔ آپ ۲۰۴ھ کو نیسابور میں پیدا ہوئے۔ عہد طفولیت ہی میں طلب علم کا آغاز کیا۔ پھر علم کی تلاش میں عالم اسلامی کا کونہ کونہ چھان مارا۔ آپ عراق و حجاز اور شام و مصر گئے اور وہاں کے شیوخ اور امام بخاری کے اساتذہ سے کسبِ فیض کیا۔ آپ امام بخاری کا بے حد احترام کرتے تھے۔ صحیح مسلم کی ترتیب و تہذیب میں آپ نے صحیح بخاری کو نمونہ قرار دیا۔ زندگی کے آخری ایام میں امام بخاری و مسلم کے تعلقات قدرے کشیدہ ہو گئے تھے۔ آپ نے نیسابور میں ۲۶۱ھ کو وفات پائی۔

آپ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "صحیح مسلم" مرتب کی۔ یہ نہایت قابل قدر اور صحیح بخاری کی طرح صحت کے اعتبار سے مشہور ترین کتاب ہے۔ اکثر علماء صحیح بخاری کو بوجوہ ذیل صحیح مسلم پر ترجیح دیتے ہیں۔

(۱) امام بخاری نے یہ شرط لگائی ہے کہ تلمیذ کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ اپنے شیخ کا ہم عصر ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ کم از کم اس سے ایک دفعہ ضرور مل چکا ہو۔

(۲) امام بخاری بڑے باریک بین فقیہ ہیں اور ان کی کتاب ایسے فقہی استنباطات کی حامل ہے جو صحیح مسلم میں مفقود ہیں۔

(۳) امام بخاری رُواۃ و رجال کے بارے میں بے حد محتاط ہیں۔ صحیح بخاری کے راویوں میں سے اسّی (۸۰) راوی ایسے ہیں جن پر نقاد حدیث نے نقد و جرح کی ہے۔ بخلافِ ازیں صحیح مسلم کے ایک سو ساٹھ (۱۶۰) راویوں پر جرح کی گئی ہے۔ حالانکہ نقادِ حدیث کی تنقید میں کلام کی گنجائش ہے۔ مزید برآں بخاری کے جن راویوں پر تنقید کی گئی ہے امام بخاری نے ان سے بہت کم

احادیث روایت کی ہیں۔ ان میں سے اکثر تو آپ کے وہ شیوخ و اساتذہ ہیں جن کے ذاتی حالات تک سے آپ آگاہ و آشنا ہیں۔

(۴) شذوذ و اعلال کے اعتبار سے صحیح بخاری کی احادیث منتقدہ صحیح مسلم کی نسبت بہت کم ہیں۔ بخاری میں ایسی احادیث ۷۸ ہیں جب کہ صحیح مسلم میں ایک سو تیس ہیں۔[۱۳]

مذکورہ صدر اسباب و وجوہ کے پیش نظر اکثر علماء صحیح بخاری کو صحیح مسلم پر ترجیح دیتے ہیں علماء کے یہاں اس بات پر کامل اتفاق پایا جاتا ہے کہ امام بخاری کا پایہ علم حدیث میں امام مسلم سے کہیں بلند ہے۔ امام مسلم خود بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں۔ امام مسلم نے بخاری سے روایت کی ہے مگر امام بخاری نے مسلم سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔ بایں وجہ امام مسلم امام بخاری کے شاگرد بھی ہوئے۔

البتہ بعض فنی امور کے اعتبار سے جن کا تعلق تالیف و ترتیب کے ساتھ ہے صحیح مسلم کو بخاری کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔ مثلاً یہ کہ امام مسلم کسی حدیث کو اجزاء میں تقسیم نہیں کرتے اور نہ ہی سند کو مکرر لاتے ہیں۔ بخلاف ازیں امام مسلم پوری حدیث کو ایک ہی جگہ نقل کر دیتے ہیں۔ مزید براں اس حدیث کے جتنے مختلف طرق و اسانید ہیں اور جن مختلف الفاظ کے ساتھ وہ مروی ہوتی ہے وہ سب یکجا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم کے لیے صحیح مسلم سے اخذ و استفادہ صحیح بخاری کی نسبت آسان تر ہے ——— کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

قالوا لمسلم فضلٌ ـ قلت البخاری اعلیٰ قالوا المکرر فیہ ـ قلت المکرر احلیٰ

(۱) لوگوں نے کہا مسلم افضل ہے اور میں نے کہا بخاری اعلیٰ ہے۔
(۲) وہ کہنے لگے بخاری میں مکرر حدیثیں ہیں، میں نے کہا مکرر شیریں ہیں۔

صحیح مسلم کی تمام احادیث مع مکررات ۷۲۷۵، بحذف مکررات چار ہزار ہیں۔ بکثرت علماء نے اس کی شرحیں تحریر کی ہیں۔ صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق اس کی شروح کی تعداد پندرہ ہے۔[۱۵] مشہور ترین شرح حافظ ابو زکریا یحییٰ بن شرف نووی شافعی (م ۶۷۶ھ) نے تحریر کی بہت سے علماء نے مسلم کا خلاصہ لکھا مشہور ترین خلاصہ ...... احمد بن عمر قرطبی متوفی ۶۵۶ھ نے تحریر کیا اسی طرح حافظ زکی الدین عبد العظیم منذری متوفی ۶۵۶ھ کا خلاصہ مسلم بھی بہت مشہور ہے۔

(تہذیب الاسماء للنووی، ج ۲، ص ۸۹ و مفتاح السنۃ ص ۳۱)

۷۔ امام نسائیؒ

۲۱۵ ——————— ۳۰۳ھ

نام ونسب :

آپ کا اسم گرامی احمد بن شعیب کنیت ابوعبدالرحمٰن اور نسبت نسائی ہے۔ آپ یگانہ روزگار محدث اور جرح وتعدیل کے امام تھے۔ آپ ۲۱۵ھ کو خراسان کے مشہور شہر نساء میں پیدا ہوئے آپ نے خراسان، حجاز، عراق، مصر وشام اور جزیرہ کے محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ آپ بہت بڑے عابد شب زندہ دار تھے۔ علوم الحدیث کے ماہر وجامع تھے۔ حتیٰ کہ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ امام مسلم سے بھی بڑے حافظِ حدیث تھے۔ آپ نے رملہ کے مقام پر ۳۰۳ھ میں وفات پائی۔

سُنن نسائی :

امام نسائی نے پہلے سنن کبریٰ مرتب کی جس میں صحیح ومعلول ہر قسم کی حدیثیں تھیں۔ بعدازاں سننِ صغریٰ کی صورت میں اس کا خلاصہ لکھ کر "المجتبیٰ" کے نام سے موسوم کیا۔ اس کا درجہ صحیحین کے لگ بھگ ہے۔ اس لیے کہ بخاری ومسلم کے بعد اس میں سب سے کم ضعیف حدیثیں پائی جاتی ہیں۔ جلال الدین سیوطی نے اس کی مختصر شرح "زہر الربیٰ علی المجتبیٰ" نامی تحریر کی۔ اسی طرح ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی حنفی متوفی ۱۱۳۸ھ نے ایک مختصر شرح مرتب کی جس میں صرف ضبطِ الفاظ اور ایضاحِ الفاظ غریبہ پر اکتفاء کیا جس کی قاری اور مدرس دونوں کو شدید ضرورت ہوتی ہے۔

(تہذیب الاسماء للنووی ومفتاح السنۃ، ص ۹۷)

۸۔ امام ابو داؤد

۲۰۲ ــــــ ھ ــــــ ۲۷۵

نام و نسب:

نام نامی سلیمان بن اشعث بن اسحٰق اسدی سجستانی ہے۔ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور طلبِ علم کی خاطر عراق و شام اور مصر و خراسان کی دشت گردی و صحرا نوردی اختیار کی۔ ان دیار و بلاد کے اساتذہ سے حدیثیں لکھیں۔ امام بخاری و مسلم کے شیوخ مثلاً امام احمد ابن ابی شیبہ قتیبہ بن سعید وغیرہم کے سامنے بھی زانوئے ادب تہہ کیا۔ امام نسائی اور دیگر محدثین نے آپ سے استفادہ کیا۔ اہل علم ان کے علم و فضل فہم و ادراک اور تدین و تشرع کے ثنا خواں تھے۔ محدث حاکم فرماتے ہیں:

"ابو داؤد بلا نزاع اپنے عصر و عہد میں اہل حدیث کے امام تھے۔"

۲۷۵ھ میں بمقام بصرہ وفات پائی۔

امام ابو داؤد نے سنن کو پانچ لاکھ احادیث سے منتخب کر کے مرتب کیا اس میں کل چار ہزار آٹھ سو احادیث ہیں۔ سنن ابی داؤد صرف احادیثِ احکام کی جامع ہے۔ بدیں اعتبار اسلامی احکام کے سلسلہ میں حدیث کی یہ پہلی کتاب ہے۔ سنن ابی داؤد ایسی تمام احادیث پر مشتمل ہے جن پر فقہاء نے احکام کی اساس رکھی تھی۔ اسی لیے امام سلیمان خطابی معالم السنن میں رقم طراز ہیں:

"خوب جان لیجئے کہ سنن ابی داؤد بہترین کتاب ہے۔ علم دین میں ایسی کتاب تا ہنوز تصنیف نہیں کی گئی۔ سب لوگوں کے یہاں اس کو خلعتِ قبول سے نوازا گیا ہے علماء کے سب گروہ اور فقہاء کے تمام طبقات اختلافِ مذاہب و مسالک کے باوجود اس کو حکم مانتے ہیں۔ علماء میں اس کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہے اہل عراق و مصر بلاد مغرب اور اکثر دیار و امصار کے لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں۔ البتہ اہل خراسان صحیحین اور ان کتب کے شیفتہ و فریفتہ ہیں جو ان دونوں کی شرط کے مطابق تحریر کی

البتہ ابوداؤد وضع و ترتیب کے اعتبار سے بہت عمدہ کتاب ہے اور اس میں زیادہ فقاہت پائی جاتی ہے۔ امام ابوعیسیٰ ترمذی کی کتاب بھی بہت اچھی ہے اور ان کا طرز و انداز وہی ہے جو انہوں نے خود بتایا۔"

محدث ابن الصلاح اپنے مقدمہ میں امام ترمذی سے نقل کرتے ہیں :

"میں نے اپنی کتاب میں احادیث صحیحہ لکھیں اور جو ان سے ملتی جلتی ہیں۔ جس حدیث میں شدید قسم کا کوئی وہم پایا جاتا تھا اس کو بیان کر دیا۔ جس حدیث پر میں نے کوئی تنقید نہیں کی وہ لائق احتجاج ہے۔ اور بعض حدیثیں دوسری احادیث سے زیادہ صحیح ہوا کرتی ہیں۔" (مقدمہ ابن الصلاح، ص ۱۸)

محدث ابن مندہ امام ابوداؤد کے بارے میں فرماتے ہیں :

"ابوداؤد ضعیف حدیث اس وقت روایت کرتے ہیں جب اس ضمن میں دوسری کوئی حدیث موجود نہ ہو۔ اس لیے کہ ضعیف حدیث اشخاص و رجال کی رائے سے بہرحال قوی تر ہے۔"

حال ہی میں قاہرہ میں امام ابوداؤد کا مکتوب بنام اہل مکہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے سنن ابی داؤد کے طریق تالیف اور انتخاب احادیث کے طرز و انداز پر روشنی ڈالی ہے۔

بکثرت اہل علم نے سنن ابی داؤد کی شرحیں تحریر کیں۔ مندرجہ ذیل کے اسماء قابل ذکر ہیں :

(۱) امام سلیمان خطابی نے معالم السنن لکھی۔

(۲) قطب الدین یمنی شافعی (۶۵۲ھ)

(۳) شہاب الدین رملی (۸۴۴ھ)

(۴) حافظ منذری (۶۵۶ھ) نے ابوداؤد کا خلاصہ لکھا۔ پھر ابن قیم (۷۵۱ھ) نے اس خلاصہ میں مزید کانٹ چھانٹ کی۔

(۵) ہمارے معاصرین میں سے شیخ محمود خطاب سبکی نے ابوداؤد کی مفصل شرح تحریر کی۔

۹۔ امام ترمذی

۲۰۹ ــــــــــــــــــــ ۲۷۹ھ

نام و نسب :

اسم گرامی محمد بن عیسیٰ بن سورہ کنیت ابو عیسیٰ اور نسبت ترمذی ہے۔ آپ ترمذ کے شہر میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ تیسیر الوصول کے مقدمہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ آپ کی ولادت ۲۰۰ھ میں ہوئی۔ بکثرت محدثین سے استفادہ کیا جن میں مندرجہ ذیل کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں :

(۱) امام محمد بن اسماعیل بخاری۔

(۲) قتیبہ بن سعید۔

(۳) اسحاق بن موسیٰ۔

(۴) سفیان بن وکیع و دیگر شیوخ و اساتذہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

طالب علمی :

طلب علم کی خاطر آپ نے ملک ملک کی خاک چھانی۔ محدثانِ خراسان، عراق، حجاز کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ یہاں تک کہ بلا نزاع و اختلاف آپ امام حدیث ٹھہرے۔ آپ حافظ و ثقہ نہایت متقی اور زہد و ورع سے بہرہ ور تھے۔

ابو یعلیٰ خلیلی فرماتے ہیں :

"امام ترمذی بالاتفاق ثقہ تھے۔ آپ کی توثیق و تائید کے لیے یہی امر کافی ہے کہ امام المحدثین محمد بن اسماعیل بخاری ان پر اعتماد کرتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے"

امام ترمذی نے ۲۷۹ھ کو ترمذ میں وفات پائی۔

جامع ترمذی :

امام ترمذی نے اپنی کتاب کو فقہی ابواب کے مطابق مرتب کیا اس میں صحیح حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں موجود ہیں۔ جناب امام ہر حدیث کا درجہ ساتھ ہی بیان کر دیتے ہیں اور وجہ ضعف پر

بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ آپ نے ہر باب سے متعلق صحابہ اور علماء بلاد و امصار کے مذاہب و مسالک بیان کیے ہیں۔ جامع ترمذی کی عظیم خصوصیت یہ ہے کہ جناب امام نے اس کے آخر میں علل کے ذکر و بیان کے لیے ایک الگ رسالہ مرتب کیا ہے جس میں حدیث سے متعلق اہم قواعد ذکر کیے ہیں۔ اکثر علماء نے ترمذی کی شرحیں تحریر کی ہیں۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل علماء کے اسماء قابل ذکر ہیں:

(۱) ابوبکر بن العربی (۵۴۶ھ)

(۲) جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ)

(۳) ابن رجب حنبلی (۷۹۵ھ)

و دیگر محدثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ۔

(تہذیب الاسماء واللغات نووی و میزان الاعتدال ذہبی، ج ۳ - ص ۱۱۷)

۱۰ـ ابن ماجہ

۲۰۷ ـــــــــــ ۲۷۳ھ

نام و نسب:

نام مبارک محمد بن یزید بن ماجہ کنیت ابو عبداللہ اور نسبت قزوینی ہے۔ آپ ۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔ حدیث نبوی کی طلب و تلاش میں عرصہ دراز تک بادیہ پیمائی کی۔ یہاں تک کہ اصحاب مالک اور لیث بن سعد سے حدیثیں سنیں۔ ان گنت لوگ آپ کے بحرِ علم سے سیراب ہوئے۔ محدث ابو یعلیٰ قزوینی آپ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"آپ زبردست محدث اور صاحبِ تصانیف کثیرہ تھے۔ آپ کی تاریخ اور سنن بہت مشہور ہیں۔ آپ نے عراقِ عرب و عجم اور مصر و شام کا طویل سفر کر کے علمی استفادہ کیا۔"

مفسر ابن کثیر کا ارشاد ہے:

"سنن ابن ماجہ نہایت مشہور کتاب ہے۔ یہ کتاب امام ابن ماجہ کے تبحّر علمی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اصول و فروع میں سنت کے کس قدر متتبع تھے۔"

سنن ابن ماجہ بتیس (۳۲) کتب ایک ہزار پانچ سَو (۱۵۰۰) ابواب اور چار ہزار احادیث کی جامع ہے چند احادیث کو چھوڑ کر باقی صحیح ہیں۔ آپ نے ۲۷۳ھ میں وفات پائی۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۱۱ ص ۵۲)

سنن ابن ماجہ کا مقام:

بکثرت متقدمین و متاخرین کے نزدیک حدیث کی بنیادی کتب مندرجہ ذیل پانچ ہیں:

بخاری[۱] ـ مسلم[۲] ـ نسائی[۳] ـ ابو داؤد[۴] ـ ترمذی[۵] ـ

بعض متاخرین نے ابن ماجہ کو مفید کتاب سمجھ کر ان میں شامل کر دیا۔ حافظ ابو الفضل طاہر المقدسی (۵۰۷ھ) اولین محدث تھے جس نے ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شامل کیا۔ بخلاف ازیں

بعض نے ابن ماجہ کے بجائے سنن دارمی کو ان میں شامل کیا۔ اس لیے کہ ابن ماجہ نے ایسے راویوں سے بھی حدیثیں روایت کی ہیں جو متہم بالکذب اور حدیث میں سرقہ کرنے والے تھے۔ علماء کی ایک جماعت کے نزدیک مؤطا کو اس کی صحت و جلالت کے پیش نظر صحاح ستہ میں شامل کرنا چاہیئے سنن ابن ماجہ کا درجہ سنن نسائی سنن ابی داؤد اور سنن ترمذی سے فروتر ہے۔ امام سیوطی المجتبیٰ کی شرح میں لکھتے ہیں:

"ابن ماجہ ایسے راویوں سے حدیثیں روایت کرنے میں منفرد ہیں جو متہم بالکذب اور حدیث میں سرقہ کا ارتکاب کرنے والے تھے۔ بعض احادیث صرف انہی سے منقول ہیں۔ مثلاً حبیبؓ بن ابی حبیب کاتب مالک۔ علاءؒ بن زید۔ داؤدؒ بن المجبر۔ عبدالوہابؒ بن ضحاک وغیرہم"۔

بکثرت علماء نے سنن ابن ماجہ کی شرحیں تحریر کیں۔ ان میں محمد بن موسیٰ الدمیری (۸۰۸ھ) اور امام سیوطی (۹۱۱ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔ امام سیوطی نے "مصباح الزجاجہ علی سنن ابن ماجہ" کے نام سے اس کی شرح تحریر کی۔ خداوند کریم کی اعانت و توفیق سے یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

فللّٰہ الحمد فی الاولیٰ والآخرۃ۔ وصلی اللہ علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ وسلم۔ والحمد للّٰہ رب العالمین۔

خادم حدیث رسولؐ

غلام احمد حریری۔

یکم جون ـــــ ۱۹۶۷ء

ڈی ـــ ۶۱ ـــ پیپلز کالونی ـــــ لائل پور

فہرست مصادر و مآخذ

کتاب	مطبوعہ
۱۔ تفسیر ابن جریر طبری	قاہرہ
۲۔ الدر المنثور للسیوطی	"
۳۔ الاتقان فی علوم القرآن سیوطی	"
۴۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری ابن حجر	"
۵۔ مقدمہ فتح الباری ابن حجر	"
۶۔ قسطلانی شرح بخاری	"
۷۔ کرمانی شرح بخاری	"
۸۔ شرح مسلم للنووی	"
۹۔ معالم السنن للخطابی	"
۱۰۔ الفتح الربانی علی مسند الامام احمد	"
۱۱۔ شرح مؤطا از علامہ باجی	"
۱۲۔ سنن نسائی	"
۱۳۔ سنن ابن ماجہ	"
۱۴۔ نصب الرایہ زیلعی	"
۱۵۔ تاویل مختلف الحدیث ابن قتیبہ	"
۱۶۔ فتح الملہم شرح صحیح مسلم مولانا شبیر احمد عثمانی	پاکستان
۱۷۔ جامع المسانید خوارزمی	"
۱۸۔ زاد المعاد فی ھدی خیر العباد ابن قیم	"
۱۹۔ شروط الائمۃ الخمسۃ حازمی	قاہرہ
۲۰۔ القول المسدد فی الذب عن مسند احمد۔ ابن حجر	بھارت
۲۱۔ مفتاح السنۃ عبد العزیز الخولی	قاہرہ
۲۲۔ اسباب ورود الحدیث علامہ محمود حمزہ مفتی شام	دمشق
۲۳۔ الرسالۃ امام شافعی	قاہرہ
۲۴۔ الام امام شافعی	"
۲۵۔ المبسوط سرخسی	"
۲۶۔ الموافقات شاطبی	"
۲۷۔ الہدایۃ مرغینانی	"
۲۸۔ الدرر المنیفہ سید مرتضیٰ زبیدی	"
۲۹۔ الاحکام علامہ آمدی	"
۳۰۔ الاحکام فی اصول الاحکام ابن حزم	"
۳۱۔ اعلام الموقعین ابن قیم	"
۳۲۔ المیزان شعرانی	"
۳۳۔ تبصرۃ الحکام ابن فرحون مالکی	"
۳۴۔ المستصفیٰ امام غزالی	"
۳۵۔ الاسنوی شرح المنہاج	"
۳۶۔ التقریر شرح التحریر	"
۳۷۔ التیسیر شرح التحریر	"

کتاب	مطبوعہ
۳۸۔ مسلم الثبوت	قاہرہ
۳۹۔ شرح مسلم الثبوت	″
۴۰۔ ارشاد الفحول شوکانی	″
۴۱۔ حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح	″
۴۲۔ النکت الطریفۃ کوثری	″
۴۳۔ المحصول امام رازی	مخطوط
۴۴۔ اصول الفقہ للخضری	قاہرہ
۴۵۔ تاریخ التشریع الاسلامی للخضری	″
۴۶۔ مذکرہ تاریخ التشریع الاسلامی	″
۴۷۔ نظرۃ عامۃ فی تاریخ الفقہ الاسلامی ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر	″
۴۸۔ معرفۃ علوم الحدیث للحاکم	″
۴۹۔ مقدمہ علوم الحدیث ابن الصلاح	بھارت
۵۰۔ الباعث الحثیث ابن کثیر	مصر
۵۱۔ شرح التقریب حافظ عراقی	″
۵۲۔ فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث عراقی	″
۵۳۔ تدریب الراوی جلال الدین سیوطی	″
۵۴۔ مفتاح الجنۃ ″ ″	″
۵۵۔ توجیہ النظر شیخ طاہر الجزائری	″
۵۶۔ قواعد التحدیث للقاسمی	دمشق
۵۷۔ الرفع والتکمیل مولانا عبدالحی لکھنوی	″

کتاب	مطبوعہ
۵۸۔ الثقات حافظ ابن حبان	قلمی نسخہ مصر
۵۹۔ الجرح والتعدیل ابن ابی حاتم رازی	مصر
۶۰۔ میزان الاعتدال ذہبی	″
۶۱۔ تہذیب الاسماء واللغات نووی	″
۶۲۔ طبقات المحدثین سیوطی	قلمی نسخہ مصر
۶۳۔ تہذیب التہذیب ابن حجر	ہند
۶۴۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ابن حجر	″
۶۵۔ الاستیعاب ابن عبدالبر	مصر
۶۶۔ تذکرۃ الحفاظ ذہبی	″
۶۷۔ موضوعات ابن جوزی	ہند
۶۸۔ اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ سیوطی	مصر
۶۹۔ تذکرۃ الموضوعات للفتنی	″
۷۰۔ قانون الموضوعات للفتنی	″
۷۱۔ جامع بیان العلم ابن عبدالبر	″
۷۲۔ تاریخ دمشق حافظ ابن عساکر	دمشق
۷۳۔ تاریخ الاسلام ذہبی	قلمی نسخہ
۷۴۔ الطبقات الکبریٰ ابن سعد	″
۷۵۔ البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر	بیروت
۷۶۔ تاریخ بغداد۔ خطیب بغدادی	مصر
۷۷۔ مقدمہ ابن خلدون	″
۷۸۔ العقد الفرید لابن عبد ربہ	″

۷۹۔ وفیات الاعیان ابن خلکان	مطبوعہ مصر	
۸۰۔ الخیرات الحسان ابن حجر الہیتمی	"	
۸۱۔ مناقب ابی حنیفہ للموفق المکی	"	
۸۲۔ الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء ابن عبد البر	"	
۸۳۔ تانیب الخطیب کوثری	"	
۸۴۔ حسن التقاضی فی سیرۃ ابی یوسف القاضی کوثری	"	
۸۵۔ بلوغ الامانی فی سیرۃ محمد بن الحسن الشیبانی کوثری	"	
۸۶۔ شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید	"	
۸۷۔ فجر الاسلام احمد امین		
۸۸۔ ضحی الاسلام احمد امین	مطبوعہ مصر	
۸۹۔ منہاج السنۃ امام ابن تیمیہ	"	
۹۰۔ الفرق بین الفرق بغدادی	"	
۹۱۔ عقیدۃ الشیعۃ	"	
۹۲۔ مجلہ المنار شیخ رشید رضا مرحوم	"	
۹۳۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ	"	
۹۴۔ اصول السرخسی	"	
۹۵۔ الانوار الکاشفۃ استاذ عبد الرحمن یمانی	"	
۹۶۔ ظلمات ابی ریہ استاذ محمد عبد الرزاق حمزہ	"	
۹۷۔ مکتوب امام ابو داؤد بنام اہل مکہ	"	